خواتین اور دوشیزاؤں کیلئے اپنی طرز کا پہلا ماہنامہ
خواتین ڈائجسٹ
اپریل 2021
الگرہ نمبر

خواتین ڈائجسٹ

خط و کتابت کا پتہ

خواتین ڈائجسٹ

37- اردو بازار کراچی

MEMBER APNS CPNE
رکن آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی
رکن کونسل آف پاکستان نیوز پیپرز ایڈیٹرز

بانی و مدیرِ اعلیٰ ـــــ محمود ریاض

مدیرہ ـــــ شادرہ خاتون

مدیر ـــــ آذر ریاض

نائب مدیرہ ـــــ رضیہ جمیل

مدیرہ خصوصی ـــــ امت الصبور
بلقیس بھٹی

نفسیات ـــــ عدنان

اشتہارات ـــــ خالدہ جیلانی

قانونی مشیر ـــــ نور الدین سرکی اینڈ کمپنی
ایڈووکیٹس اینڈ لیگل کونسلرز

واٹس اپ
03172266944

آپ سے کیا پردہ

خاتون کی ڈائری

خصوصی مضمون

انٹرویو

ناول

مکمل ناول

ناولٹ

افسانے

اپریل 2021
جلد 48 شمارہ 12
قیمت 70 روپے

زرِ سالانہ بذریعہ رجسٹری

پاکستان (سالانہ) .... -/840 روپے
ایشیا، افریقہ، یورپ .... 18,000 روپے
امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا - 20,500 روپے
سالانہ خریداری کے لیے ای میل کریں
subscriptions@khawateendigest.com

خط و کتابت کا پتہ: خواتین ڈائجسٹ، 37 - اردو بازار، کراچی۔

پبلشر آزر ریاض نے ابن حسن پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔ مقام: بی 91، بلاک W، نارتھ ناظم آباد، کراچی
Phone: 32721777, 32726617 Fax: 92-21-32766872 0317 2266944
Email: info@khawateendigest.com Website www.khawateendigest.com

جوں جوں زندگی آگے بڑھتی جاتی ہے، وقت کی دھند میں بہت کچھ دھندلا جاتا ہے۔ لیکن کبھی پیچھے مڑ کر دیکھیں تو ذہن کے پردوں پر خوشیوں کے کتنے جگنو جھلملاتے ہیں۔ انسان دکھوں کو بھول جانا چاہتا ہے لیکن خوشیوں کے پل ہمیشہ یاد رکھتا ہے۔ خواہش کرتا ہے کہ یہ پل اس کی زندگی میں بار بار آئیں۔ اپریل کا مہینہ ایسی ہی ایک خوشیوں بھری یاد لے کر آتا ہے۔

اپریل سنہ 1972ء جب محمود ریاض صاحب نے ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی بنیاد رکھی اور خواتین ڈائجسٹ کا پہلا شمارہ منظرِ عام پر آیا۔ اللہ تعالیٰ نے کامیابی دی اور خواتین ڈائجسٹ وقت کے ساتھ ساتھ کامیابی کی منازل طے کرتا رہا۔ رب کریم کے حضور سر بسجود ہیں کہ خواتین ڈائجسٹ کا سالگرہ نمبر پیش کر رہے ہیں۔

49 واں سالگرہ نمبر۔

تقریباً نصف صدی پر محیط یہ طویل مسافت بڑی کامیابی سے طے ہوئی۔ جو مقصد لے کر چلے تھے اسے پورا کرنے کی کوشش میں بہت حد تک کامیاب رہے۔

آج خواتین ڈائجسٹ جس مقام پر ہے، اس میں ہماری مصنفین کا بڑا حصہ ہے۔ جن کی مثبت، منفرد اور بامقصد تحریروں نے قارئین کی ہر قدم پر رہنمائی کی۔ ہم تہہ دل سے اپنی مصنفین کے ممنون ہیں۔

خواتین کی ایک خوش نصیبی یہ بھی ہے کہ مصنفین کے ساتھ ساتھ اسے بہت ذہین اور باشعور قارئین کا ساتھ میسر آیا۔ ہماری قارئین ہماری رہنمائی کرتی رہیں۔ انہوں نے مثبت تحریروں کو سراہا اور جہاں کوئی کمی محسوس کی ہماری رہنمائی کی۔

محمود ریاض صاحب، محمود بابر فیصل، محمود خاور، ایم سلطانہ فخر، آسیہ رزاقی اور دوسری بہت سی مصنفین جو آج ہمارے ساتھ نہیں ہم ان کی مغفرت کے لیے دعاگو ہیں۔ اللہ تعالیٰ انہیں جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے۔ آمین۔

اپریل —— میں رحمت اور مغفرت والے مہینے رمضان المبارک کا آغاز ہو رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر بہت مہربان ہے۔ وہ موقع دیتا ہے کہ بندے اپنے نامۂ اعمال میں زیادہ سے زیادہ نیکیوں کا اضافہ کر سکیں۔ رمضان المبارک ہمیں اسی لیے عنایت کیا گیا ہے، جہاں تک ممکن ہو اس ماہ میں اپنے وقت کا بہترا استعمال کریں۔ تسبیحات، استغفار اور دعا یقیناً وقت کا بہترین استعمال ہے۔

سروے عید نمبر،

اگلا شمارہ جو عید سے پہلے آئے گا، عید نمبر ہوگا۔ عید نمبر میں حسب روایت قارئین سے سروے بھی شامل ہوگا۔

سوالات یہ ہیں۔

1۔ چاند رات اور عید کا دن کیسے گزارتی ہیں؟

2۔ کبھی ایسا ہوا کہ چاند نہیں ہوا اور آپ مایوس ہو کر سو گئیں۔ اچانک چاند ہونے کا اعلان ہو گیا۔ اس وقت آپ کے تاثرات کیا تھے، آپ نے کیسے عید کی تیاری کی؟

ان سوالوں کے جواب اس طرح بھجوائیں کہ 24 اپریل تک ہمیں موصول ہو جائیں۔

اس شمارے میں،

- عنیزہ سید کا مکمل ناول۔ سوئے صفر،
- نعیمہ ناز کا مکمل ناول۔ تم مجھ سے نہ کہنا،
- سارہ پیرزادہ کا مکمل ناول۔ زنجیر ایام،
- نازیہ رزاق اور منشاء محسن علی کے ناولٹ،
- قرۃ العین خرم ہاشمی، شمائلہ دالعباد اور کشف بلوچ کے افسانے،
- راحت جبیں اور نمرہ احمد کے ناول،
- آپ کی پسندیدہ مصنفہ قانتہ رابعہ سے ملاقات،
- کرن کرن روشنی۔ احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا سلسلہ،
- ہمارے نام، نفسیاتی ازدواجی الجھنیں اور مستقل سلسلے شامل ہیں۔

قرآن پاک زندگی گزارنے کے لیے ایک لائحہ عمل ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی قرآن پاک کی عملی تشریح ہے۔ قرآن اور حدیث دین اسلام کی بنیاد ہیں اور یہ دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم وملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں۔
قرآن مجید دین کا اصل ہے اور حدیث شریف اس کی تشریح ہے۔
پوری امت مسلمہ اس پر متفق ہے کہ حدیث کے بغیر اسلامی زندگی نامکمل اور ادھوری ہے، اس لیے ان دونوں کو دین میں حجت اور دلیل قرار دیا گیا۔ اسلام اور قرآن کو سمجھنے کے لیے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کا مطالعہ کرنا اور ان کو سمجھنا بہت ضروری ہے۔
کتب احادیث میں صحاح ستہ یعنی صحیح بخاری، صحیح مسلم، سنن ابوداؤد، سنن نسائی، جامع ترمذی اور موطا مالک کو جو مقام حاصل ہے، وہ کسی سے مخفی نہیں۔
ہم جو احادیث شائع کررہے ہیں، وہ ہم نے ان ہی چھ مستند کتابوں سے لی ہیں۔
حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کے علاوہ ہم اس سلسلے میں صحابہ کرام اور بزرگان دین کے سبق آموز واقعات بھی شائع کریں گے۔

کرن کرن روشنی

ادارہ

صبر اور شکر

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی حضرت سنان بن سنہ اسلمی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
"کھانے والے شکر گزار کے لیے صبر کرنے والے روزہ دار جتنا ثواب ہے۔"
(مسند احمد)

فوائد و مسائل:
1۔ صبر اور شکر دونوں اسلام کی اخلاقی تعلیمات میں اہم مقام رکھتے ہیں۔ مسلمان کو نعمت پر شکر، مصیبت پر صبر اور نیکی پر ثابت قدمی اختیار کرنا چاہیے۔
2۔ کھانا کھا کر شکر ادا کرنا بھی ایک نیکی ہے جب کہ کھانا حلال طریقے سے حاصل کیا گیا ہو اور وہ چیز خود بھی حلال ہو۔
جس طرح مردار اور خنزیر کا گوشت حرام ہے، اسی طرح چوری، ڈاکے، دھوکے اور جھوٹ کے ذریعے سے یا تصویر سازی، شراب نوشی اور سودی کاروبار وغیرہ سے کمایا ہوا رزق بھی حرام ہے۔ ایسا رزق کھا کر زبان سے شکر کا لفظ کہہ لینے سے شکر ادا نہیں ہوتا۔
3۔ روزے کی افضلیت اس لیے ہے کہ وہ صبر پر مشتمل ہے۔ اللہ کے منع کیے ہوئے کاموں سے اجتناب کرنا بھی صبر ہے اور نیکی کی راہ پر قائم رہنا بھی صبر ہے۔
4۔ شکر اور روزہ دونوں کے الگ الگ روحانی اور قلبی فوائد ہیں، اس لیے مومن کو دونوں طرح کے اعمال کا اہتمام کرنا چاہیے۔

شب قدر

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، انہوں نے فرمایا:
"ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رمضان کے درمیانی عشرے کا اعتکاف کیا، پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:
"مجھے شب قدر دکھائی گئی تھی، پھر بھلا دی گئی۔ اسے آخری دہائی کی طاق راتوں میں تلاش کرو۔"
(صحیح بخاری)

فوائدومسائل:

1۔شب قدر سال کی سب سے افضل رات ہے۔اس ایک رات کی عبادت ہزار مہینے کی عبادت سے زیادہ فضیلت کی حامل ہے۔(القدر ۹۷:۳)

2۔شب قدر کی فضیلت حاصل کرنے کے لیے اعتکاف کرنا سنت ہے، البتہ جو شخص اعتکاف نہ کر سکے، اسے بھی راتیں عبادت میں گزارنے کی کوشش کرنا چاہیے۔

3۔شب قدر بھلائے جانے کا مطلب یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ بات یاد نہ رہی کہ اس سال کون سی رات شب قدر ہے۔ ہر سال اسی رات میں ہونا ضروری نہیں۔

4۔شب قدر آخری عشرے کی طاق راتوں میں سے کوئی ایک رات ہوتی ہے، اس لیے جو شخص دس راتیں عبادت نہ کر سکے، اسے یہ پانچ راتیں ضرور عبادت اور تلاوت و ذکر میں گزارنا چاہئیں۔ تاکہ شب قدر کی عظیم نعمت سے محروم نہ رہے۔

5۔اگرچہ علمائے کرام نے شب قدر کی بعض علامتیں بیان کی ہیں لیکن ثواب کا دارومدار اس چیز پر نہیں کہ عبادت کرنے والے کو یہ رات معلوم ہوئی ہے یا نہیں، اس لیے اس پریشانی میں مبتلا نہیں ہونا چاہیے کہ ہمیں فلاں فلاں علامت کا احساس نہیں ہوا۔

آخری عشرے کی فضیلت

ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے، انہوں نے فرمایا۔

''نبی صلی اللہ علیہ وسلم آخری دس دنوں میں اتنی محنت کرتے تھے، جتنی اور دنوں میں نہیں کرتے تھے۔''

فوائدومسائل:

1۔افضل ایام میں نیک اعمال کا زیادہ اہتمام کرنا چاہیے۔

2۔رمضان کے آخری دس دن سب کے سب افضلیت کے حامل ہیں۔ اسی طرح شب قدر کے علاوہ آخری عشرے کی باقی راتیں بھی رمضان کی دوسری راتوں کی نسبت افضل ہیں، اس لیے ان ایام میں ذکر و تلاوت اور صدقات و خیرات جیسی نیکیوں میں پہلے سے اضافہ کر دینا چاہیے۔

آخری عشرہ

ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے، انہوں نے فرمایا۔

''جب آخری عشرہ شروع ہوتا تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم راتوں کو جاگتے، کمر کس لیتے اور گھر والوں کو بھی بیدار کرتے۔(صحیح بخاری)

فوائدومسائل:

1۔کمر کسنے سے مراد عبادت اور نیکی میں مزید محنت اور کوشش ہے۔

2۔آخری عشرے کی اگر سب ہی راتیں عبادت میں گزاری جائیں تو بہت بہتر ہے، ورنہ طاق راتوں کا تو اہتمام کرنا ہی چاہیے۔

3۔نیکی کے کاموں میں اہل و عیال کو بھی شریک کرنا چاہیے تاکہ وہ بھی عظیم ثواب سے محروم نہ رہیں اور اللہ کے ہاں بلند درجات حاصل کر سکیں۔

4۔جاگنے کا مقصد عبادت، ذکر اور تلاوت میں مشغول ہونا ہے۔ بعض لوگ یہ فضیلت والی راتیں فضول بات چیت میں گزار دیتے ہیں، یہ انتہائی محرومی اور بدقسمتی کی بات ہے، خاص کر مسجد میں شوروغوغا، عبادت کرنے والوں کے لیے بھی پریشانی کا باعث بنتا ہے۔

5۔بہت سی مساجد میں طاق راتوں میں اور خاص طور پر ستائیسویں رات کو وعظ و تقریر کا پروگرام ہوتا ہے جس کی وجہ سے رات کا کافی حصہ اسی مصروفیت میں گزر جاتا ہے۔ اسی طرح ختم قرآن کے موقع پر مٹھائی تقسیم کی جاتی ہے، جس کی وجہ سے بچے اور بڑے سب ہی عبادت و تلاوت کو بھول کر مسجد کے آداب کو نظر انداز کرتے ہوئے شور شرابے میں لگے رہتے ہیں جس سے نہ صرف عبادت کرنے والوں کو پریشانی ہوتی ہے بلکہ یہ انتہائی قیمتی وقت فضول کاموں میں ضائع ہو جاتا ہے۔

اعتکاف

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، انہوں نے فرمایا۔

"نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہر سال دس دن کا اعتکاف کرتے تھے، جب وہ سال آیا جس میں آپ کی وفات ہوئی تو آپ نے بیس دن اعتکاف کیا۔ اور آپ پر ہر سال ایک بار قرآن پیش کیا جاتا تھا، جس سال نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوئی، اس سال آپ کو دو بار قرآن کا دور کرایا گیا۔" (صحیح بخاری)

فوائد و مسائل:

1۔ قرآن پیش کرنے سے مراد قرآن مجید کا دور کرنا ہے۔ حضرت جبریل علیہ السلام ہر سال رمضان میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ، جس قدر قرآن نازل ہو چکا ہوتا تھا، اس کا دور کرتے تھے۔ (صحیح البخاری)

2۔ آخری سال بیس دن اعتکاف کرنے کی وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے زندگی کے آخری حصے میں عبادت میں زیادہ جانفشانی سے کام لیا اور اعتکاف بھی چونکہ ایک عبادت ہے، اس لیے اس میں بھی اضافہ فرمایا اور یہ بھی ممکن ہے کہ ایک عشرہ فتح مکہ کے سال کے اعتکاف کی تلافی ہو کیوں کہ فتح مکہ کا غزوہ رمضان ۸ ھ میں پیش آیا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ۱۷ رمضان کو فاتحانہ طور پر مکہ میں داخل ہوئے۔ اور انیس دن مکہ مکرمہ میں قیام پذیر رہے، اس لیے اس سال اعتکاف نہیں ہو سکا، چنانچہ رمضان ۱۰ھ میں بیس دن اعتکاف کیا۔ واللہ اعلم۔

اعتکاف شروع کر کے چھوڑ دینا اور اعتکاف کی قضا

ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے، انہوں نے فرمایا۔

"نبی صلی اللہ علیہ وسلم جب اعتکاف کرنا چاہتے تھے تو صبح کی نماز پڑھ کر اس جگہ داخل ہوتے جہاں آپ کا اعتکاف کرنے کا ارادہ ہوتا۔ (ایک بار) آپ نے رمضان کے آخری عشرے کا اعتکاف کرنے کا ارادہ فرمایا۔ آپ نے حکم دیا تو آپ کے لیے خیمہ لگا دیا گیا، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے بھی ایک خیمہ لگانے کا حکم دیا تو ان کے لیے بھی لگا دیا گیا۔ حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا نے بھی ایک خیمہ لگانے کا حکم دیا تو ان کے لیے بھی لگا دیا گیا۔ جب حضرت زینب رضی اللہ عنہا نے ان دونوں کے خیمے دیکھے تو انہوں نے بھی ایک خیمہ لگانے کا حکم دیا اور ان کے لیے بھی خیمہ لگا دیا گیا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب یہ چیز دیکھی تو فرمایا۔

"کیا تم نیکی کا ارادہ رکھتی ہو؟"

چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے رمضان میں اعتکاف نہیں فرمایا، اور شوال میں دس دن اعتکاف کر لیا۔

فوائد و مسائل:

1۔ اعتکاف کے لیے مسجد میں ایک جگہ پردہ کر کے اس میں اعتکاف کرنا مسنون ہے۔

2۔ اعتکاف مسجد میں ہوتا ہے۔

3۔ عورت بھی اعتکاف کر سکتی ہے لیکن ان کے لیے بھی جائے اعتکاف مسجد ہی ہے، تاہم مسجد سی ہو جہاں عورتوں کے لیے مردوں سے الگ ہر چیز کا معقول انتظام ہوتا کہ مردوں کے ساتھ کسی بھی مرحلے میں ان کا اختلاط نہ ہو۔

4۔ عورتوں میں ایک دوسرے کی ریس کرنے کی عادت ہوتی ہے، خاص طور پر سوکنیں ایک دوسرے سے رشک رکھتی ہیں۔ اگر اس سے کوئی مسئلہ پیدا ہو جائے تو اسے حکمت سے حل کر لینا چاہیے۔

5۔ اعتکاف کا پختہ ارادہ کر کے مسجد میں جگہ بنالی گئی ہو، پھر کوئی عذر پیش آ جائے تو اعتکاف چھوڑا جا سکتا ہے۔

6۔ رمضان کے اعتکاف کی قضا کسی دوسرے مہینے میں بھی دی جا سکتی ہے۔

ایک دن یا ایک رات کا اعتکاف

حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے قبول اسلام سے پہلے ایک رات کے

اعتکاف کی نذر مانی تھی (جو اسلام لانے تک پوری نہ کر سکے تھے) چنانچہ انہوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے مسئلہ دریافت کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں اعتکاف کرنے کا حکم دیا۔

فوائد و مسائل:

1۔ اعتکاف ایک دن یا ایک رات کا بھی ہو سکتا ہے۔

2۔ اگر کوئی شخص اسلام قبول کرنے سے پہلے کسی نیک کام کا ارادہ کرے تو اسلام قبول کرنے کے بعد وہ کام کر لینا چاہیے، البتہ اگر کسی غیر شرعی کام کا ارادہ کیا ہو تو اسے پورا نہیں کرنا چاہیے۔

3۔ اللہ کے لیے نذر ماننا عبادت ہے، لہذا ایسی نذر پوری کرنا ضروری ہے۔

اعتکاف کرنے والا مسجد میں ایک جگہ رہے

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رمضان کے آخری دس دن اعتکاف کیا کرتے تھے۔

اعتکاف کی جگہ

حضرت نافع رحمتہ اللہ نے فرمایا۔

"حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے مجھے وہ جگہ دکھائی تھی جہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اعتکاف کیا کرتے تھے۔"

فوائد و مسائل:

1۔ اگرچہ اعتکاف کا مطلب مسجد میں رکے رہنا ہے، تاہم سنت سے معلوم ہوا کہ مسجد میں بھی ایک جگہ مقرر کر کے اعتکاف کا وقت اسی جگہ گزارنا چاہیے۔

2۔ اعتکاف کے لیے پردہ کر کے جگہ بنانے کا مقصد بھی یہی ہے کہ زیادہ سے زیادہ وقت اسی خیمے میں گزارا جائے۔

3۔ اگر ایک شخص مسجد کے ایک ہی حصے میں ہر سال اعتکاف کرتا ہے تو یہ جائز ہے جب کہ نماز کے لیے مسجد میں ایک جگہ خاص کر لینا درست نہیں۔ گھر میں یہ بھی جائز ہے۔

اعتکاف

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم جب اعتکاف کرتے تو ستون توبہ کے قریب آپ کا بستر بچھا دیا جاتا، یا آپ کی چارپائی وہاں بچھا دی جاتی۔

فائدہ:

"توبہ کے ستون" سے مراد مسجد نبوی کا ایک خاص ستون ہے۔ حضرت ابولبابہ رضی اللہ عنہ سے ایک غلطی ہو گئی تھی جس کا احساس ہونے پر انہوں نے اپنے آپ کو مسجد نبوی کے اس ستون سے باندھ لیا تھا کہ جب تک اللہ تعالیٰ مجھے معاف نہیں کرے گا میں یہیں بندھا رہوں گا۔ تین دن کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو وحی کے ذریعے سے حضرت ابولبابہ رضی اللہ عنہ کی توبہ قبول ہونے کی بشارت دی گئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تشریف لا کر خود انہیں کھولا۔

مسجد میں اعتکاف کرنا

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک ترکی قبے میں اعتکاف فرمایا جس کے دروازے پر چٹائی کا ایک ٹکڑا تھا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ہاتھ سے چٹائی پکڑی اور اسے ہٹا کر قبے میں ایک طرف کر دیا، پھر اپنا سر (خیمے سے) باہر نکال کر لوگوں سے بات کی۔

فوائد و مسائل:

1۔ اعتکاف کے لیے جگہ خیمے کے انداز میں بھی بنائی جا سکتی ہے، خصوصاً جب اعتکاف مسجد کے صحن میں کیا جائے اور دھوپ وغیرہ سے بچاؤ کے لیے سائے کی ضرورت ہو۔

2۔ اعتکاف کے دوران میں لوگوں سے ضروری بات چیت کی جا سکتی ہے۔

3۔ غیر مسلم ممالک کا بنا ہوا کپڑا یا دوسری چیز استعمال کرنا جائز ہے، بشرطیکہ اس میں کوئی ایسی بات نہ ہو جو ہماری شریعت میں ممنوع ہو، مثلاً: ایسا مردانہ

لباس جو ریشم کا بنا ہوا ہو، استعمال کرنا جائز نہیں۔

بیمار کی عیادت، جنازے میں شرکت

ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے، انہوں نے فرمایا۔

"میں حاجت کے لیے گھر میں داخل ہوتی اور وہاں کوئی بیمار ہوتا تو میں چلتے چلتے ہی اس کی خیریت پوچھ لیتی تھی"۔ انہوں نے فرمایا۔

"جب لوگ اعتکاف میں ہوتے تھے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم گھر میں داخل نہیں ہوتے تھے مگر قضائے حاجت کے لیے۔" (بخاری)

فوائد و مسائل:

1۔ اعتکاف کرنے والے کا بلا ضرورت مسجد سے نکلنا منع ہے۔ قضائے حاجت کے لیے مسجد سے باہر نکلنا جائز ہے۔ اگر مسجد کے ساتھ بیت الخلا کا انتظام نہ ہو تو اعتکاف والا اس غرض کے لیے گھر جا سکتا ہے۔

2۔ غسل بھی ایک ایسی ہی حاجت ہے جس کے لیے مسجد سے نکلنا ضروری ہے، لہٰذا معتکف اس مقصد کے لیے بھی باہر نکل سکتا ہے۔

3۔ مریض کی بیمار پرسی کے لیے اعتکاف سے نکلنا درست نہیں لیکن اگر کسی جائز سبب سے باہر نکلا ہو اور راستے میں مریض مل جائے تو اس سے حال پوچھنا جائز ہے، تاہم اس کے پاس بات چیت کے لیے رک جانا درست نہیں۔

4۔ اعتکاف والا جنازے کے ساتھ جا سکتا ہے اور بیمار کی بیمار پرسی کر سکتا ہے۔"

اعتکاف کرنے والا سر دھو سکتا ہے اور کنگھی کر سکتا ہے

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے، انہوں نے فرمایا۔

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اعتکاف میں بیٹھے ہوتے تو اپنا سر میرے قریب کر دیتے، میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا سر مبارک دھو کر کنگھی کر دیتی، میں اپنے حجرے میں ہوتی تھی اور ایام سے ہوتی تھی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم مسجد میں ہوتے تھے۔"

فوائد و مسائل:

1۔ اعتکاف کے دوران نہانا اور سر دھونا جائز ہے۔

2۔ اعتکاف کی حالت میں اگر جسم کا کوئی حصہ مثلاً: سر مسجد سے نکالا جائے تو اعتکاف میں فرق نہیں آتا۔

3۔ جب عورت کے حیض کے ایام ہوں تو وہ مسجد میں داخل نہیں ہو سکتی، البتہ ہاتھ بڑھا کر مسجد میں سے کوئی چیز اٹھا سکتی ہے۔

4۔ اعتکاف کی حالت میں معتکف کی بیوی اس کی خدمت کر سکتی ہے۔

5۔ ام المومنین کو اس انداز سے اس لیے خدمت انجام دینے کی ضرورت پیش آئی کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اعتکاف کی وجہ سے گھر نہیں آ سکتے تھے اور ام المومنین خاص ایام میں ہونے کی وجہ سے مسجد میں داخل نہیں ہو سکتی تھیں۔

اعتکاف کا ثواب

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اعتکاف کرنے والے کے بارے میں فرمایا۔

"وہ گناہوں کو روک دیتا ہے۔ اور اس کے لیے ساری نیکیاں انجام دینے والے کی طرح نیکیاں جاری کی جاتی ہیں۔"

دونوں عیدوں کی راتوں کا قیام

حضرت ابو امامہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"جس نے اللہ سے ثواب حاصل کرنے کی نیت سے عیدین کی دونوں راتوں میں قیام کیا، اس کا دل نہیں مرے گا، جس دن (لوگوں کے) دل مر جائیں گے۔"

☆

غزل

انشاء جی

شامِ غم کی سحر نہیں ہوتی
یا ہمیں کو خبر نہیں ہوتی

ہم نے سب دکھ جہاں کے دیکھے ہیں
بے کلی اس قدر نہیں ہوتی

نالہ یوں نارسا نہیں ہوتا
آہ یوں بے اثر نہیں ہوتی

بے قراری سہی نہیں جاتی
زندگی مختصر نہیں ہوتی

ایک دن دیکھنے کو آجاتے
یہ ہوس عمر بھر نہیں ہوتی

چاند ہے، کہکشاں ہے، تارے ہیں
کوئی شے نامہ بر نہیں ہوتی

اک جاں سوز و نامراد خلش
اس طرف ہے اُدھر نہیں ہوتی

رات آکر گزر بھی جاتی ہے
اک ہماری سحر نہیں ہوتی

حُسن سب کو خدا نہیں دیتا
ہر کسی کی نظر نہیں ہوتی

دل پیالہ نہیں گدائی کا
عاشقی در بہ در نہیں ہوتی

بات تعلق کی ہے

سمیرا حمید

بات تو تعلق کی ہے......

موسم سرد ہے۔ کچھ بارش کا امکان ہے، ٹھنڈی ہوائیں اور رنگ بدلتا آسمان دل بہلا رہا ہے۔ یہ ملائیشیا ہے۔ میٹرو ٹرین میں بیٹھی لڑکی کے اسٹائلش کپڑے کے تھیلے میں سے اس کی شاپنگ جھانک رہی ہے۔ دیسی عادت، روایتی عادت، چپکے چپکے ایک نظر میں سب دیکھ لینے والی عادت کے تحت، نظر تھیلے کی طرف پھسل گئی۔ خواتین ڈائجسٹ کا کونا دکھائی دے گیا۔

"یہ کہاں سے ملا؟" ڈائجسٹ کی طرف ہاتھ سے اشارہ کر کے پوچھ بھی لیا۔

"پاکستانی اسٹور سے......دو مہینے پرانا ہے......پر مل گیا، کہہ رہے تھے، ایک ہفتے تک نئے بھی آجائیں گے۔"

"آپ پڑھتی ہیں؟"

"کبھی کبھی۔ لیکن یہ میں اماں کے لیے لے کر جا رہی ہوں، وہ پچھلے تین سال سے یہاں بڑے بھائی کے پاس ہیں۔ ان کا تو یہاں دل ہی نہیں لگتا تھا۔ پہلے تو کہتی تھیں، واپس جانا ہے، پھر ہزار جتنوں سے روکا انہیں۔ یہ ڈائجسٹ ان جتنوں میں سے ایک جتن ہے۔"

وہ ہنس دی۔

"اپنی جوانی سے ڈائجسٹ پڑھ رہی ہیں، کہتی ہیں بات تو تعلق کی ہے، تعلق توڑے تھوڑی جاتے ہیں، وہ تو نبھائے جاتے ہیں۔ ہر مہینے یہ ڈائجسٹ مل جائیں تو بہت خوش ہوتی ہیں۔ ایک ایک رسالے کو کئی کئی بار پڑھتی ہیں۔ کہتی ہیں، اپنوں سے بات ہو جاتی ہے۔"

"اپنوں سے تو فون پر بھی بات ہو جاتی ہو گی۔"

"ان کے "یہ والے اپنے" صرف ڈائجسٹ میں ہی آتے ہیں۔ خط بہت شوق سے پڑھتی ہیں، سب بہنوں کے نام اور حالات معلوم ہیں۔ جس دن نیا ڈائجسٹ پڑھتی ہیں، کئی بار بہنوں کا ذکر کرتی ہیں۔ میرے ہزبینڈ کہتے ہیں، یہ ان کا ڈائجسٹی خاندان ہے۔" ڈائجسٹ کی طرف اشارہ کیا اور مسکرا دی۔

"اور ہر مہینے اس خاندان سے ملاقات کے لیے وہ بے قرار بھی رہتی ہوں گی؟"

"بہت زیادہ! ٹی وی وہ دیکھتی نہیں ہیں۔ اخبار پڑھتی ہیں یا پھر یہ ڈائجسٹ۔ کئی بار مجھ سے خط بھی لکھوائے کہ ان کی فلاں فلاں بہن کا پوچھوں کہ اس کا خط کیوں نہیں آرہا، سب خیریت تو ہے۔ دل کے تار ہیں، لفظوں سے بندھے ہیں......دوری ہے......ملنا ملانا نہیں لیکن محبت تو ہے......"

"لیکن محبت تو ہے......"

وہ ڈائجسٹ کو کچھ دلچسپی اور زیادہ حیرانی سے الٹ پلٹ کر دیکھ رہا ہے، کہ کہاں سے شروع کرے۔ یہ لاہور لائبریری ہے۔ ہال میں خاموشی ہے، کھڑکیوں سے روشن دن کا سندیسہ ملتا ہے۔ پرندوں کی آوازیں بہار کی سنگت لیے نئے گیت گا رہی ہیں۔

"محبت ہی تو ہے، ہمارا نکاح ہو چکا ہے، کہتی ہے کہ میں ڈائجسٹ کی ہیروئن جیسی ہوں، مجھے جاننا ہے تو وہ والا ناول پڑھ لو۔"

"ہاہاہا......" میری بے ساختہ ہنسی۔

"آپ ہنس رہی ہیں......!" کچھ خفگی، کچھ حیرت۔

"ہاں میں ہنس رہی ہوں، تھوڑا سا شام میں ہنسوں گی، باقی دوسروں کو بتاتے ہوئے ہنسوں گی۔ اچھا یہ بتائیں کہ اس نے یہ تو نہیں کہا کہ میں اس ہیروئن جیسی ہوں تو تم بھی اس کہانی کے ہیرو کی طرح ٹیسٹ کر رہا؟"

وہ کان کھجانے لگا۔ "آپ کو کیسے معلوم ہوا؟"

بے ساختہ ہنسی ہال میں بکھر گئی۔

اور پھر یہ ہنسی گاؤں کے صاف ستھرے، خوب صورت صحن میں اتری۔ دیوار کی منڈیر پر باجرہ بکھرا ہے، چڑیاں دعوت عام میں مصروف ہیں۔ دور لہلہاتے درخت دکھائی دیتے ہیں، جو سبز ہیں، خوب صورت ہیں۔ کیسی سہانی شام ہے۔ لکڑی کا کواڑ کھلا ہے، کہ آنے والوں کو خوش آمدید۔ کیسا خوب صورت گاؤں ہے کہ رہنے والوں کو سلام۔ کیسی خوب صورت رنگین پایوں کی چارپائی ہے۔ جس پر پیاری دلاری دادی بیٹھی ہیں۔ پر تھوڑی خفا سی لگتی ہیں۔

"ناول پڑھنے والی لڑکیاں خوابوں خیالوں میں رہتی ہیں، ہماری تو سنتی ہی نہیں۔" خفگی سے ہاتھ لہرایا۔

"عمر کے ایک مخصوص حصے میں ہر انسان خوابوں و خیالوں میں رہتا ہے دادی! یہ تو انسانی فطرت ہے۔ ڈائجسٹ حقیقتوں سے بھی روشناس کرواتا ہے۔ زندگی کی مشکلوں سے نبٹنے کا حوصلہ بھی دیتا ہے۔ کیا آپ نے ان پڑھنے والیوں میں اچھی والی تبدیلی محسوس نہیں کی؟"

"کچھ عقل کی باتیں کرتی تو ہیں، پر یہ بھی کہتی پھرتی ہیں کہ بہت سارا پڑھنا ہے۔ دیکھنا پتر! پڑھ لکھ کر نخریں کریں گی۔"

"کبھی تو آپ بھی بہت سارا پڑھنا چاہتی ہوں گی دادی! یاد کریں۔ علم شعور دیتا ہے، جسے شعور مل جائے، وہ نخریلا نہیں رہتا، عاجزی آجاتی ہے اس میں۔ سمجھ سے کام لیں گی سب کی سب۔ تھوڑا یقین رکھیں ان پر۔"

دادی کی خفگی زائل ہونے لگی۔

"مجھے اسلامی باتیں بڑی اچھی لگتی ہیں، یہی پڑھ پڑھ کر سناتی رہتی ہیں۔ مجھے تو مطلب بھی سمجھاتی ہیں، سیانی ہو رہی ہیں۔"

ہاتھ سے کھینچ کر پلو کان کے پیچھے ٹکایا۔ سونے کی پتلی چوڑیاں لہرا کر کہنی تک کھسک گئیں۔ پتلی سی کلائی، پتلی سی دادی۔

"سیانی تو وہ اس اعتماد سے ہوں گی جو آپ انہیں دیں گی۔ گھر کے بزرگ چھاؤں بھی ہوتے ہیں اور ڈھال بھی۔ وہ خواب ضرور دیکھیں، انہیں یہ اجازت دیں۔ لیکن پاؤں زمین پر ہی رکھیں کہ زمین ہی نہ کھسک جائے۔ کہ خواب ان ہی کے پورے ہوتے ہیں جو اپنی بنیاد اور شناخت پر مضبوطی سے جمے رہتے ہیں۔ آپ کے پاس تجربہ ہے، ان کے پاس خواب ہیں۔ دونوں ساتھ ساتھ چلیں گے تو سب اچھا رہے گا دادی۔"

"تمہیں کتنی باتیں بنانی آتی ہیں۔" دادی ہنس دیں۔ ہونٹ کے کنارے کان کی لو کی طرف کھنچ گئے۔ کتنی کیوٹ ہیں دادی۔

"آپ جیبین بنوائیں، مجھے وہ پینی بھی آتی ہے۔"

"تم کیا پیو گی؟" پتھریلی اینٹوں پر بیل لگے ہیں۔ دور سمندر کا کنارا دکھائی دیتا ہے۔ یہ اسپین ہے۔

"چائے......کڑک......ٹرکوں والی ...... پتی ٹھوک کر، دودھ روک کروالی......"

"وہ یہاں کہاں ملے گی یار! میں کبھی کبھی تھرماس میں بھر کر لے آتی ہوں، اور سمندر کے کنارے بینچ پر بیٹھ کر ڈائجسٹ پڑھتے ہوئے پیتی ہوں۔"

"ڈائجسٹ......اور چائے......کوئی پرانی یاد تازہ کرتی ہو۔"

"ہاں! جب پاکستان میں تھی تو سارے کاموں سے فارغ ہونے کے بعد، چائے کا مگ بھر کر، کھڑکی کے پاس بیٹھ کر پڑھتی تھی۔ کیا مزے کے دن تھے یار! سردیوں میں لحاف میں دبک کر، ورنہ ہیٹر کے سامنے چوکڑی مار کر...... جس دن ڈائجسٹ آتا تھا میں اعلان کر دیتی تھی کہ آج مجھے کوئی ڈسٹرب نہ کرے، مابدولت سارا ڈائجسٹ ہضم کر کے ہی کمرے سے باہر نکلیں گی۔"

"یہاں تمہاری اتنی ٹف لائف ہے، مجھے حیرت ہے کہ تم ڈائجسٹ کے لیے وقت نکال لیتی ہو؟"

"یہ تو تعلق کی بات ہے! ٹی وی دیکھتی ہوں، سنیما جاتی ہوں، اور سیزن پر سیزن بھی دیکھتی ہوں لیکن اس سے ڈائجسٹ سے لگاؤ میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ملک اور کلچر سے دور، ہم ہر ایسی چیز کو تھام کر رکھتے ہیں جو دیس سے ہمارے تعلق کو مضبوط کرے۔ سوندھی سوندھی خوشبو آتی رہے۔ ایک خاص انسیت محسوس ہوتی ہے۔ یہ تو بچپن کے ان کھلونوں جیسا ہے جنہیں سنبھال کر رکھا جاتا ہے۔ یو نو! پہلے امی اتنا بولتی تھیں کہ کیا ہر وقت ڈائجسٹ پڑھتی رہتی ہو، اب یہی امی پہلی فرصت میں مجھے یہاں ڈائجسٹ بھجواتی ہیں۔ دیکھو دیس سے ہوئے پردیس، لیکن دیس نہیں چھوٹتا۔ ڈائجسٹ کے کئی صفحات پر امی نے پنسل سے لکھا ہوتا ہے کہ یہ لائن پڑھو، یہ دیکھو بے چاری کے ساتھ کیا ہو گیا۔ امی سے ویڈیو کال پر بات کرنے کے باوجود پنسل سے لکھے ان کے کمنٹ مجھے امی کی موجودگی کا حقیقی احساس دلاتے ہیں۔ ماں کا لمس...... یہ ماں بیٹی کی دوستی جیسا ہے۔

ماں بیٹی......

یہ ماں کی ایک ٹین ایجر بیٹی ہے جو اپنے ٹیبلٹ پر ڈائجسٹ پڑھ رہی ہے۔ اس کے چہرے کے تاثرات بتاتے ہیں کہ کچھ چیزیں سمجھنے میں اسے مسئلہ ہو رہا ہے۔ یہ فرانس ہے اور وہ فوڈ کورٹ میں بیٹھی آئس کریم کھا رہی ہے، اور ساتھ آن لائن ڈائجسٹ پڑھ رہی ہے۔

"تمہیں اردو پڑھتے ہوئے دیکھ کر خوشی ہوئی۔" میری جھانک کر دیکھنے والی عادت اتنی بری نہیں ہے ویسے۔ اس سے انفارمیشن میں اضافہ بھی ہو جاتا ہے، اور پھر بات وات کرنے کے لیے "راستہ" کھل جاتا ہے۔ (نوٹ: اس عادت کو اپنی ذمہ داری پر اپنایا جائے، اور وہ لوگ اپنائیں جو خطروں سے کھیلنا پسند کرتے ہیں۔)

"ماما کہتی ہیں کہ دنیا ادھر کی اُدھر ہو جائے مجھے اچھی والی اردو سیکھنی ہی ہے۔" اس کا فرنچ اردو لہجہ بہت کیوٹ تھا۔

"تو سیکھ رہی ہو؟"

"ہاں! اور یہ بھی کہ ماما کے ملک کا کلچر، لوگ، اور زندگی کیسی ہے......"

"وہ تمہارا بھی ملک ہے......"

"جب بھی میں ماما کے سامنے کہتی ہوں "ماما کا ملک" تو وہ بھی مجھے فوراً ٹوک دیتی ہیں، کتنے پکے ہیں آپ سب لوگ۔" وہ زور سے ہنسی۔ شاید وہ ایسے ہی سب کو تنگ کیا کرتی تھی۔

"بیٹیاں ماؤں کا رنگ اوڑھ لیتی ہیں، تم بھی اوڑھ لوگی۔"

"ویسے مجھے یقین نہیں آتا کہ لوگ چھتوں پر اوپن ایئر میں ستاروں کو دیکھتے ہوئے سوتے ہیں، ماما کہتی ہیں، گاؤں کے رہنے والے نیچر کے بہت قریب رہتے ہیں۔ ان کا زیادہ وقت، کھیتوں، باغوں، چھتوں اور صحنوں میں گزرتا ہے۔"

"ہاں اور خواتین کا ہمسائیوں کے سنگت میں...... لڑکیوں کا سہیلیوں کے جمگھٹوں میں...... اکثر کا کھانا اس وقت تک ہضم نہیں ہوتا جب تک وہ اپنی سہیلی کو سارا دن کی روداد نہ سنا دے۔ گاؤں کے ماحول میں بیگانگی نہیں ہوتی، وہاں چیزوں اور سہولتوں کی کمی ہو سکتی ہے لیکن باہمی تعلقات کی نہیں۔ کسی ایک گھر میں لگا تندور، سب کا تندور ہے، آؤ، روٹی لگاؤ، کچھ کہہ جاؤ، کچھ سن جاؤ، اور راضی

باضی رہو۔ایک رونے والے کو دس چپ کروانے والے ہیں۔یہی دس ''کان کھینچ'' کر سیدھا کرنے والے بھی ہیں، کوئی نہیں روکتا کہ میرے بچے کو کیوں ڈانٹا۔''

وہ ہنسی ''واؤ! میری نالج میں کافی اضافہ ہو رہا ہے۔اسے پڑھ کر میری اردو بھی بہت اچھی ہو رہی ہے ۔ شروع میں مشکل لگی تھی پر اب کافی بہتر ہے۔ماما سے مطلب پوچھ لیتی ہوں۔ ویسے ''بونگا'' کسے کہتے ہیں؟''

''بونگا اسے کہتے ہیں جو بونگیاں مارے......'

''اور بونگیاں مارنا کسے کہتے ہیں؟''

''وہی جو چار سہیلیاں مل کر مارتی ہیں، ہاتھ پر ہاتھ مار کر مارتی ہیں......''

اور وہ ٹیبل پر پین مار رہے ہیں۔یہ تجزیہ نگاروں کی، سوال اٹھانے والوں کی، اعتراض رکھنے والوں کی ٹیبل ہے۔

''اس میں سستی کہانیاں آتی ہیں، جن کا ادب سے کچھ لینا دینا نہیں ہے۔'' یہ پہلا نکتہ ہے۔

''اس میں سستی کہانیاں آتی ہیں کہنے والوں نے کبھی اسے غور سے اور توجہ سے پڑھا ہی نہیں۔ انہوں نے ان لوگوں کو بھی نہیں پڑھا جو دور دراز، چھوٹے شہروں میں ساری دنیا سے کٹ کر رہتے ہیں۔ جو سادہ لوح، معصوم اور بڑے بھلے لوگ ہیں۔ وہ ان رسالوں سے زندگی کے کچھ گر سیکھ لیتے ہیں۔ اپنے معاملات کی کچھ صلاح لے لیتے ہیں۔ وہ یہ نہیں جانتے کہ زندگی میں انہیں کس سمت جانا ہے، لیکن کہانیاں پڑھ کر، کسی کردار سے متاثر ہو کر وہ اپنی سمت متعین کر لیتے ہیں۔ وہ لڑکیاں جو ہر حال میں گھر بسا کر رکھنا چاہتی ہیں، وہ تحریروں سے رشتے بنائے رکھنے کا حوصلہ لے لیتی ہیں۔

یہ ناامیدوں کو امید، اور پڑھنے والوں کو نئی منزلوں کے نشاں دیتا ہے۔ایک ڈائجسٹ کئی سمتوں میں بہتری میں سرگرم عمل ہے، کئی ذہنوں کی سوچ بدل رہا ہے۔

''پھر بھی اس کا ادب، زبان و بیاں سے کچھ لینا دینا نہیں ہے۔''

''دنیا میں بے شمار ایسے میگزین شائع ہوتے ہیں جو ایک ہی صنف تک محدود ہیں، اگر ڈائجسٹ پاپولر صنف تک محدود ہے تو اس میں اتنی دہائیاں کس لیے؟ ساری دنیا میں پاپولر فکشن لکھا جاتا ہے، وہ ملک جنہیں ہم علمی سطح پر اولین رکھتے ہیں، ان ملکوں میں بھی پاپولر فکشن بہت زیادہ پڑھا جاتا ہے۔ فکشن کی ایک صنف دوسری کو کمتر کیسے بنا سکتی ہے۔یہ پڑھنے والے کی پسند پر ہے کہ وہ کیا پڑھنا چاہتا ہے۔ہم لکھنے اور پڑھنے والوں کو محدود نہیں کر سکتے۔

انڈیا میں اردو بولنے والوں کی تعداد سب سے زیادہ ہے، انڈیا میں اردو پر سب سے زیادہ کام ہو رہا ہے۔

اس کے باوجود اردو میں سب سے زیادہ ناول نگار، افسانہ نگار، ڈرامہ رائٹرز، حتیٰ کہ فلم رائٹرز تک وجود میں لانے کا کریڈٹ ایک ادارے، ڈائجسٹ کے سر پر ہے۔کیا یہ زبان کی خدمت نہیں ہے؟

پوری دنیا میں ایسا کوئی ادارہ نہیں جس نے اتنی بڑی تعداد میں رائٹرز کو واسطہ اور بلاواسطہ لکھنے کی تکنیکی ٹریننگ دی ہو۔ اور انہیں کئی کتابوں، ڈراموں اور فلموں کا اونر بنا دیا ہو۔تین مہینے کے رائٹنگ کے کورس بھی کرنے جائیں تو ہزاروں لاکھوں روپے لگتے ہیں اور تب بھی لکھنے کی صرف الف ب سمجھ میں آتی ہے۔ٹیلنٹ کا ہونا قدرتی ہے، لیکن اس ٹیلنٹ کے لیے پلیٹ فارم مہیا کرنا ہے۔

یہ قدرت کی طرف سے انعام ہوتا ہے جو کسی شخص کی کوششوں سے ایسے ادارے عمل میں آجائیں جو ٹیلنٹ کے لیے بڑا پلیٹ فارم بن کر ابھریں۔

دنیا میں بہت سے ملک، شہر ایسے ہیں کہ جہاں جب درخت کٹتا ہے تو لوگ سڑکوں پر لیٹ جاتے ہیں کہ درخت نہیں کٹنے دیں گے لیکن کیا وجہ ہے کہ پانچ دہائیوں سے زبان کی، افراد کی، فکشن کی خدمت

کرنے والے ادارے جب مسائل کا شکار ہوتے ہیں تو کوئی آگے بڑھ کر ان مسائل کو حل کرنے کی کوشش نہیں کرتا؟

ہمیں اپنی پہچان، اپنے اداروں پر فخر کیوں نہیں ہے؟

یہ ٹھیک ہوگا کہ کہانیوں کی صنف کے سلسلے میں پڑھنے والوں کو کچھ اعتراضات ہوں گے، لیکن بہتری وہیں واقع ہوتی ہے جہاں کام ہوتا رہے۔

تبدیلیاں ایک دم سے نہیں آتیں، تبدیلیاں اداروں پر صرف انگلیاں اٹھا کر بھی نہیں آتیں بلکہ اداروں کے ساتھ کام کر کے آتی ہیں۔ ہمیں اپنی چیزوں، اپنے افراد کی کارکردگیوں پر فخر ہونا چاہیے۔ ہمیں انہیں اون کرنا چاہیے۔

"آپ رائٹر ہیں، اس لیے فیور کر رہی ہیں۔"

"ہم سب کو ہی اپنی چیزوں کے مثبت پہلوؤں کی حمایت کرنی چاہیے، لیکن میں وہ پہلو دکھانے کی کوشش کر رہی ہوں جسے دیکھنے کی بہت سے لوگوں نے کوشش ہی نہیں کی۔ ڈائجسٹ نے علاقائی زبان بولنے والوں کے ذخیرہ الفاظ میں اضافہ کیا ہے۔ انہیں نئے الفاظ سے روشناس کروایا ہے۔ کیا یہ بڑا معرکہ نہیں کہ ڈائجسٹ زبان و بیاں کے سلسلے میں مسلسل کوششوں میں رواں ہے۔ امریکا تک جیسے ملک میں یہ ایک بڑا مسئلہ بنتا جا رہا ہے کہ عام اور خاص امریکی کا ذخیرہ الفاظ بہت کم ہوتا جا رہا ہے، اور یہ گھٹتے گھٹتے بہت سے الفاظ کو نگل رہا ہے۔ وہاں کے زبان دان پریشان ہیں کہ اگر ایسا ہی رہا تو زبان سمٹ کر محدود ہو جائے گی۔ پھر سوشل میڈیا نے زبان و بیاں کو برباد کر دیا ہے۔ لیکن ڈائجسٹ پڑھنے والوں کا ذخیرہ الفاظ بہت زیادہ ہوتا ہے۔ کیونکہ وہ ہر طبقہ فکر سے تعلق رکھنے والے کردار کے الفاظ پڑھتے ہیں۔ ایک ڈائجسٹ پڑھنے والے قاری اور نہ پڑھنے والے کی زبان و بیاں اور ذخیرہ الفاظ میں واضح فرق ہوگا۔ یہ زبان کے لیے ایک بڑی کاوش ہے۔ ہمیں اپنے لوگوں کی کاوشوں کو سراہنا چاہیے، اعتراضات کی تلواریں اپنے لوگوں پر چلائیں گے تو اپنے تمغوں کے سر ہی قلم کریں گے۔"

ٹیبل کی سطح پر بکھرے کاغذات پھڑ پھڑائے۔ جیسے کئی پرندے...... جو ایک ساتھ دوستی کے کئی پیغامات لے کر آئے ہوں......

ایک سہیلی...... ایک اکیلی......

وہ درخت سے کمر لگائے گھاس پر بیٹھی ہے۔ ذرا دور اس کے دو چھوٹے بچے سائیکلنگ کر رہے ہیں۔ اس کا درخت کے نیچے بیٹھنا ایسا ہی ہے جیسے وہ پاکستان کا کوئی گاؤں ہو، جبکہ یہ یورپ کا گاؤں ہے، لندن...... یہ ایک چھوٹا سا پارک ہے۔ پانی کی بوتلیں قریب رکھی ہیں، اور ہاتھ میں ڈائجسٹ پکڑا ہوا ہے۔

"آپ کو دیکھ کر مجھے بڑا "دیسی دیسی" گماں ہوا۔" اس بار میں نے تانک جھانک نہیں کی، سب سامنے ہی تو تھا۔ (ہی ہی)

وہ مسکرائی، "ہم دیہہ کے رہنے والے ہیں، ہمارا اندروں میں بڑا دل گھبراتا ہے۔ وہاں تو زیادہ وقت چھت، یا صحن میں گزرتا تھا۔ ٹیلوں پر بھی نکل جاتے تھے۔ اس لیے میں یہاں آکر بیٹھ جاتی ہوں۔"

"کتنے سال سے واپس نہیں گئیں؟"

"چار سال سے......" وہ اداس ہوگئی۔

"یاد نہیں آتی......؟"

"آتی ہے نا...... بہت آتی ہے...... یہ ڈھارس اپنے ساتھ رکھتی ہوں۔ میرا تو کوئی ہمسایہ بھی پاکستانی نہیں ہے۔ کوئی اپنی زبان بولنے والا نہیں ہے۔ گرمیوں کی دوپہروں میں ہم کزنیں مل کر پڑھا کرتی تھیں پھر گھنٹوں تبصرے کرتی تھیں۔ ہماری لڑائی بھی بہت ہوتی تھی۔ ایک بار فضیلت نے ولن کی حمایت کر دی، ہم نے تو اس کا ناک میں دم کر دیا۔ اور وہ سونیا ڈائجسٹ کی اچھی اچھی باتیں یاد کر لیتی تھی اور تایا جی کو سناتی رہتی تھی۔ وہ بڑا خوش ہوتے تھے، اسے پیسے بھی دیتے تھے کہ بیٹی بڑی اچھی باتیں

کرتی ہے۔ بڑی چالاک تھی۔ ہمسائے میں ایک سہیلی رہتی تھی، وہ پڑھنے کے لیے ڈائجسٹ لے جاتی تھی، ایک بار رسالہ واپس کرنے آئی تو کچھ صفحوں کے کنارے پھٹے ہوئے تھے، چائے سالن کے داغ بھی لگے ہوئے تھے۔ ہماری تو اچھی خاصی تو تو، میں میں ہو گئی۔ بھلا کوئی ایسا حال کرتا ہے ڈائجسٹ کا۔"

"ظالم سہیلی...... ناداں سہیلی...... معاف کردیں اسے......"

"کب کا کردیا...... اب میں یہاں اکیلی بیٹھ کر پڑھتی ہوں، پھر فون کر کر کے تبصرے کرتی ہوں۔"

"تو ڈائجسٹ واحد سہیلی ہے جو لندن تک ساتھ آئی، آپ کا ساتھی، آپ سے باتیں کرتا ہے۔"

"ہاں جی! یہ اچھے وقتوں اور یادوں کا تعلق ہے۔ ایک گانٹھ ہے جو ہمارے سہانے وقتوں پر لگی ہے۔ دیکھیں نا! اتنی یادیں جڑی ہیں اس سے، ایک بار ابا جی غصہ ہو گئے، ہم نے سالن جلا دیا تھا۔ کہتے اب دوبارہ کسی لڑکی کے ہاتھ میں رسالہ نہ دیکھوں۔ جی پورے دو ہفتے ہم نے جی جان لگا کر ابا جی کی پسند کا سالن بنایا، خوب محنت کی۔ میٹھی سویاں بنائیں، بیسن، سوجی کے حلوے بنائے، بڑے جتن کیے کہ اگلے مہینے کا ڈائجسٹ آنے تک ابا جی راضی ہو جائیں۔"

"تو ہوئے راضی......"

"اگلے مہینے کا ڈائجسٹ وہ خود لائے، کہتے ہیں کہ اس میں جن کھانوں کی ترکیبیں لکھی ہیں وہ بھی پکا کر کھلاؤ۔"

"واللہ...... کتنی ذہین تھیں آپ سب......"

"اور سنیں! میری ایک کزن کی شادی تھی، وہ مایوں بیٹھی تھی، چچی جی کہتی رہیں اپنا حلیہ سنوار لے، پر نا جی وہ ڈائجسٹ پر کور چڑھا کر انہیں جہیز میں ساتھ لے جانے کی تیاریاں کر رہی تھی۔"

"کام ویسے وہ بہت اہم کر رہی تھی، جس سے لگاؤ اور محبت ہو، وہی کل اثاثہ ہوتا ہے۔"

"اور سنیں کہ ایک بار ہم سب کزنوں کا ٹولہ بیٹھا ناول کی قسط پڑھ رہا تھا......"

"ایک منٹ...... سب ایک ساتھ؟"

"ہم بڑی ہوشیاری سے ایسی پوزیشن میں بیٹھتی تھیں کہ سب ایک ساتھ پڑھ لیتی تھیں۔ تین نیچے، دو اوپر موڑھے پر، بس ڈائجسٹ کا اینگل رکھنے میں مسئلہ ہوتا تھا، وہ سونیا سنبھال لیتی تھی۔"

"واللہ! کانفرنس آف دا ڈائجسٹ......"

(کانفرنس آف دی براڈز کی نقل)

"خیر! پھر یہ کہ ہم سانس روکے ناول کی اگلی قسط پڑھ رہی تھیں کہ میرا بھائی آیا، ڈائجسٹ چھینا، اور گھر سے باہر بھاگا کہ پھینکنے جا رہا ہوں۔ ہم چیختی چلاتی ہوئی اس کی طرف بھاگیں۔ سونیا نے جو ہاتھ لگا اس کی کمر پر دے مارا۔ چھیل کر رکھ دی اس کی کمر۔ ہمارے ہمسائے گھبرا گئے، سمجھے خدانخواستہ آسمان ہی گر پڑا کہ ہم دیوانوں کی طرح بھائی کی جان کو لپکیں۔"

"آہ! بھائی بے چارے کی جان بچ گئی......"

"اتنی سی تو بچ ہی گئی کہ دوبارہ کبھی ایسی حرکت کرنے کی جرات نہیں کی......"

کیسے کرتا بے چارا!" ہم دونوں ہنسیں......

ہم ہنسیں اس تعلق سے جڑے جو لفظوں سے شروع ہوتا ہے...... جو کیفیات کی گہرائی سے بنا ہے...... جو پردیسوں کا "دیس" ہے اور دیسیوں کی "سانجھ" ہے۔

تعلق محبت کا......

تعلق سنگت کا......

تعلق خواتین ڈائجسٹ کا......

☆☆☆

میری تحریروں کا پہلا بڑا پردہ اسکرین...... خواتین ڈائجسٹ...... تمہیں سالگرہ مبارک ہو۔ تم مجھے اتنے ہی عزیز ہو، جتنی مجھے میری تحریریں۔

☆

مقبول مصنفہ

قانتہ رابعہ سے ملاقات

شاہین رشید

نام ہی کافی ہے...... بلاشبہ قانتہ رابعہ کے لیے یہ ہی کہا جاسکتا ہے۔ ان کا نام ان کی پہچان ہے۔ ان کے بارے میں کچھ لکھنا سورج کو چراغ دکھانے کے مترادف ہے۔ انہوں نے اب تک سینکڑوں افسانے، ناولٹ لکھے ہیں۔ افسانوں کے درجن بھر سے زیادہ مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ حج کا سفر نامہ بھی لکھ چکی ہیں اس کے علاوہ ان کے مختلف موضوعات پر مضامین کے مجموعے بھی آ چکے ہیں۔

قانتہ رابعہ کی امتیازی خصوصیت ان کی تحریروں کا مثبت پہلو ہے۔ وہ لکھتے ہوئے مذہبی اقدار کے ساتھ ساتھ معاشرتی اقدار کا بھی خیال رکھتی ہیں۔ ان کی تحریروں میں خاص طور پر مذہبی پس منظر نظر آتا ہے۔ یہ حیرت انگیز بات ہے کہ اتنا زیادہ لکھنے کے باوجود انہوں نے کبھی بھی حدود کو کراس نہیں کیا اور لکھتے ہوئے دین کے احکامات سے تجاوز نہیں کیا۔ اتنا زیادہ لکھنے والی مصنفہ کے لیے یہ بہت بڑی بات ہے۔ آج ہم قانتہ رابعہ سے آپ کی ملاقات کروا رہے ہیں۔

س: اپنا فیملی بیک گراؤنڈ بتایئے۔

میں 13 نومبر 1963ء کی درمیانی شب ضلع خانیوال اور اس وقت کے ضلع ملتان کے شہر جہانیاں میں حکیموں کے خاندان میں پیدا ہوئی......

میرے نانا جان حکیم محمد عبداللہ برصغیر کے بہت مشہور حکیم تھے۔ فن خطابت میں بڑا نام تھا ان کا...... اور حکمت کے آغاز ہی میں 1935ء میں بذریعہ بحری جہاز حج کے لیے روانہ ہوئے۔ بندرہ گاہ پر ہی شاہ سعود کے خاص لوگ ملاقات کے لیے موجود تھے۔

پتا چلا کہ شاہ سعود کو خواب میں نبی کریم حضرت محمد صلی اللہ علیہ والہ وسلم کی زیارت ہوئی ہے اور حکم ملا ہے کہ حکیم الشفاء الملک آ رہے ہیں۔ ان کا بہترین استقبال کیا جائے۔

اس وقت بطور طبیب ان کی شروعات تھی ۔ مگر نبی کریم کے دیے لقب کا حق ادا کیا کہ واقعی ان کے ہاتھ میں اللہ نے شفا رکھی تھی۔ نبض پہ ہاتھ رکھ کر مرض بتا دیتے تھے...... اور یہ ایسا فن تھا کہ جب حج پر گئے تو بطور اعتراف ”معلم امین عطاس“ کی خوش دامن نے خانہ کعبہ کی کنجیاں جو اپنے داماد کو بھی نہیں دکھائی تھیں۔ میرے نانا ابو کے ہاتھ پر رکھ دیں۔

وہ ادیب تھے، خطیب تھے، مگر شاعر ہنگامی طور پر بنے تھے...... وفات سے کچھ عرصہ قبل (2 دسمبر 1974ء) حج پر گئے تو ہر زیارت اور ہر موقع پر فی البدیہہ اشعار رواں ہوتے گئے۔ اللہ کے خاص منتخب بندوں میں سے تھے۔ وفات سے ایک دن قبل نعت کہی۔

میرا اس طرح سے حساب ہو
میرے لب پہ نعت جناب ہو

2 دسمبر کو لاہور سے میرے ماموں اپنے دوست زاہد غازی کے ہمراہ جو جامعہ کراچی کی یونین کے صدر تھے اچانک ملنے آئے۔ نانا ابو کے کچھ دوست بھی موجود تھے۔ چائے پلاتے ہوئے نعت سنانا شروع کی، سریلے شعر کا پہلا مصرعہ پڑھا۔ سامنے کی طرف دیکھا۔ لمحاتی خاموشی کے بعد ”انا اللہ وانا الیہ راجعون“ کے الفاظ کے ساتھ ہی روح پرواز کرگئی۔ نانا کی بہن میری دادی تھیں، وہ بھی شاعرہ تھیں۔ ان کی بہنیں بھی فارسی میں شاعری کرتی

تھیں۔ میرے ماموں بھی مشہور مصنف تھے اور میرے والد بھی صاحب کتاب تھے ...... ادب دوست ماحول کی وجہ سے مجھے بھی اپنی صلاحیتیں استعمال کرنے کا موقع ملا۔"

"آپ کا نام قانتہ رابعہ ہے "قانتہ" کا کیا مطلب ہے، والدین کیا کرتے تھے؟"

"میرا نام "قانتہ" ہے۔ نون کے نیچے "زیر" آتا ہے قرآن پاک میں بار بار "والقانتون والقانتات" آیا ہے...... مطلب، فرماں برداری میں قائم رہنے والی، دوسرا حصہ رابعہ ہے، یہ وضاحت کرتا ہے کہ میرا اپنے سات بہن بھائیوں میں "چوتھا" نمبر ہے۔ میری والدہ گھر داری میں ماہر اور درس وتدریس سے شغف رکھتی تھیں اور میری امی مطالعہ کی اتنی شوقین تھیں کہ جب "جہانیاں" میں بجلی کی سہولت نہیں تھی تو وہ چاندنی راتوں میں یا پھر لالٹین کی روشنی میں مطالعہ کرتی تھیں۔ نسیم حجازی کے سارے ناول انہوں نے اس وقت پڑھ لیے جب بچے ان کی گود میں تھے۔ گفتگو میں انہیں ملکہ حاصل تھا۔ ابا کی اپنی دکانیں تھیں، اپنا کاروبار تھا۔ اور ان کی اپنی ایک لائبریری تھی جس میں ہزاروں کی تعداد میں کتابیں تھیں۔ ہر فن مولا اور درویش صفت انسان تھے۔"

"آپ کی شادی؟"

"جی میں شادی شدہ ہوں...... 1989ء میں میری شادی ہوئی۔ پانچ بچے ہیں۔ چار بیٹیاں اور ایک بیٹا...... بڑی بیٹی مومنہ اشتیاق میڈیکل کے شعبے سے وابستہ ہے تین بچوں کی اماں بھی ہے۔ دوسری بیٹی مزنہ فاطمہ ایم فل بائیوکیمسٹری ہے تیسری بیٹی محسنہ مریم جس کی ایم ایس سی کے دوران ہی شادی ہوگئی۔ چھوٹی بیٹی ذروہ تحریم اور بیٹا محمد داؤد عبداللہ زیر تعلیم ہیں۔ میاں پروفیسر اشتیاق احمد حال ہی میں انیسویں گریڈ سے ریٹائر ہوئے ہیں وہ شعبہ سائیکولوجی میں ایسوسی ایٹ پروفیسر تھے۔"

"بچپن کیسا گزرا؟"

"میرا بچپن بھی میرے نام اور خاندان کی طرح منفرد تھا۔ میرے نانا کی چار شادیاں ہوئی تھیں...... اور یہ ایک دلچسپ داستان ہے۔ بتا اس لیے نہیں سکتی کہ یہ انٹرویو میرا ہے، میرے نانا کا نہیں۔ بچپن میں سب ہی کھیل کھیلے۔ ہمارے ایج گروپ میں چودہ پندرہ کزنز اور ہماری ایج کی خالائیں اور ماموں بھی تھے، ان سب کے ساتھ مل کر ہم نے لڑکوں والے کھیل کھیلے اور لڑکوں نے ہمارے ساتھ لڑکیوں والے گیمز کھیلے...... بچپن میں نہ ڈاکو تھے نہ چور...... نہ عزتیں لوٹی جاتی تھیں...... نہ اغوا برائے تاوان ہوتا تھا۔ بچپن کا ہر لمحہ، ہر کھیل خوب انجوائے کیا۔ البتہ سر شام گھر لوٹنے کی تلقین تھی اگر کبھی دیر ہو جاتی تو گھر پہنچنے تک "ذہن" کہانی بنانے میں مصروف رہتا، جھوٹ بولنا آتا نہیں تھا اور سچ میں مار پڑنے کا اندیشہ ہوتا تھا۔ تو نئی نئی کہانیاں ہی امی کو مطمئن کر سکتی تھیں اور یہی کہانی بنانے کے عمل کا آغاز تھا۔ کون سی نئی بات ہو جو ہمیں مار سے بچا سکے۔"

"لکھنے کا عمل کب سے شروع ہوا؟ اور کیسے اندازہ ہوا کہ لکھنے کی صلاحیت ہے؟"

"اس کا جواب تو 90 فیصد لوگوں کے اس بے ساختہ تبصرے میں ہے کہ ہم آپ کو بچپن سے پڑھ رہے ہیں۔ مجھے یاد ہے کہ کراچی "حریم ادب کنونشن" میں مجھے بہترین رائٹر کے ایوارڈ کے لیے مدعو کیا گیا تو ایوارڈ لینے کے بعد اسٹیج سے نیچے اتری تو ایک ستر بہتر سالہ خاتون نے آگے بڑھ کے مجھے کہا "بیٹا میں آپ کو بچپن سے پڑھتی آرہی ہوں۔" تو سننے والوں کا قہقہہ اس پر بہترین ردعمل تھا۔ یہ محبتوں کا اظہار ہے...... اور مجھے یہ بھی یاد ہے کہ نانا ابو فوت ہوئے تو میرے ابو جی جو نانا کے بھانجے بھی تھے نے ایک نظم ان کی یاد میں لکھی کہ۔

کیسے تھے اچھے نانا
کیسے تھے پیارے نانا
جنت میں ان کو یارب

اچھا ملے ٹھکانہ

چونکہ نظم بچوں کی زبان میں تھی تو ابا جی نے میرے نام سے بچوں کے رسالہ ''نور'' میں بغرض اشاعت بھیج دی اور وہ نظم میرے نام سے شائع بھی ہوگئی۔ تو جب اپنا نام شائع ہوئے دیکھا تو یقین کریں یہ خوشی اس آٹھ دس سالہ زندگی کی اچھوتی خوشی تھی۔ یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ میرا نام شائع ہوا ہے اور پھر اس شوق نے فوری طور پر قلم اٹھانے پر مجبور کر دیا۔

مگر با قاعدہ لکھنے کا آغاز کب ہوا اس سے پہلے میں یہ بتانا چاہوں گی کہ ہمارے گھر میں بچپن سے ہی ''بتول'' اردو ڈائجسٹ، سیارہ ڈائجسٹ، ایشیاء اور اسی طرح کے دیگر بہت سے رسائل و جرائد آتے تھے۔

والدین کو دیکھ کر مجھے بھی پڑھنے اور لکھنے کا شوق ہوا ...... اور جب لکھنا شروع کیا تو کہانی کس طرح لکھی جاتی ہے، ان سب باتوں سے نا آشنا تھی۔ لیکن پھر بھی نماز میں کن چیزوں کا دھیان رکھنا چاہیے کے موضوع پر ایک تحریر لکھ کر نور رسالے میں بھیج دی۔

پھر جسارت کے بچوں کے صفحہ کے ایڈیٹر جناب نیاز مدنی صاحب کو خط لکھا اور دلچسپ بات یہ کہ میرے چھوٹے سے ذہن میں یہ بات آئی کہ مدیر تو بہت معمر لوگ ہوتے ہیں۔ میں نے انہیں چچا جان کہہ کر مخاطب کیا۔ اس پر ان کا ردعمل بھتیجی جان کہہ کر سامنے آیا۔

اور مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ''چچا'' دکان سے واپس جاتے ہوئے اخبار لائے۔

''قانتہ تمہارا خط چھپا ہے۔''

میں نے کانپتے ہاتھوں سے اخبار تھاما۔ وہ لمحات جیسے صدیوں پر پھیل گئے تھے۔ خط ڈھونڈا جواب پڑھا...... خوشی، تتلی، جگنو یہ سب محدود مفہوم رکھتے ہیں آنکھوں میں خوشی سے پانی جم سا گیا۔ میرا نام چھپا ہے۔ بالی عمریا جو تھی۔

''اِب آیئے اس بات پر کہ پہلی باضابطہ تحریر کب لکھی تو پہلی باضابطہ تحریر جسارت کے ہی صفحے پر کہانی ''صبح نو'' اور ساتھ ہی افسانہ ''اجالے کی کرن'' اور مزاحیہ مضمون لکھ مارا، ماہنامہ بتول میں یہ دونوں تحریریں شائع ہوئیں۔ بعد ازاں مزاحیہ مضمون ''اخبار خواتین'' میں بھی شائع ہوا پہلا افسانہ اس وقت لکھا جب میں اسکول کی طالبہ تھی اور پہلا افسانہ میں ایک بے پردہ لڑکی کا باپردہ ہونے کی داستان پر مشتمل تھا۔

اس کے بعد ''بتول'' کی مدیرہ سلمٰی یاسمین نجمی کے علاوہ اصلاحی ادب سے وابستہ کچھ نام تھے مثلاً محترمہ نیر بانو...... محترمہ بنت الاسلام صاحبہ نے مجھے قابو میں کر لیا۔ جلد ہی قلمی دوستی کے نام پر کراچی یونیورسٹی شعبۂ تاریخ کی ڈاکٹر نگار سجاد جو اس وقت نگار سلطانہ تھیں۔ محترمہ سمیعہ سالم اور راحت جو بہت اچھا لکھتی تھی (مگر قدرت نے اس کی زندگی مختصر لکھی تھی) اور حریم ادب کا پلیٹ فارم جس نے مجھے بنانے سنوارنے اور نکھارنے میں مدد دی۔ بتول کی ادارت میں مجھے بہترین رہنما دوست ملے جنہوں نے میری انگلی پکڑ کر مجھے لکھنا سکھایا۔

پروفیسر فروغ احمد (مرحوم) مشہور نقاد تھے ان سے خط و کتابت نے بہت کچھ سکھایا...... مجھے یہ مخلص لوگ ہر دم تازہ رکھتے تھے خاص طور پر جہانیاں کا وہی جاگیردارانہ نظام جہاں لڑکیوں کا ہی نہیں لڑکوں کا بھی کالج جانا ان جاگیرداروں کی اولادوں کے راستے کی رکاوٹ تھا۔ میٹرک تک تعلیم حاصل کرنے کی سہولت تھی۔ ہاسٹل جانے کی اجازت نہیں تھی۔ تو گھر میں کیا کرتی سوائے مطالعہ اور لکھنے لکھانے کے......''

''گھر میں کتابیں لانے کا ذریعہ کون بنا؟''

''میرے ماموں عبدالوحید سلیمانی لاہور اردو بازار میں پبلشر تھے اور کرنل اشفاق حسین کی جنٹلمین سیریز کے علاوہ بھی بہت سی مشہور کتب شائع کر چکے تھے۔ تو میرے ماموں نے مجھ پر یہ عنایت کی ''اردو بازار'' یا اردو ادب میں جب کسی نئی کتاب کا اضافہ

ہوتا تو اس کی ایک جلد مجھے فوری طور پر بھیج دیتے اور پھر اس پر تبصرہ بھی مانگتے ...... اور میری ہر اوگی بونگی تحریر پر خوب داد بھی دیتے تھے۔ کلاسک ادب میں نے اپنی چچی "رشیدہ قطب" جن کا تعلق لکھنو سے تھا ان کی صحبت میں پڑھا، تاریخ میں شاید ہی کسی چچی بھتیجی کی اتنی دوستی ہوگی جتنی میری ان سے تھی۔ عصمت چغتائی اور شاہد احمد دہلوی کے قصے، قمر جلالوی کی شاعری، جوش کی یادوں کی بارات" بہت کچھ زیر بحث آتا اور گھنٹوں بیت جاتے باتیں کرتے۔"

"ہر ایک کو پڑھا...... متاثر کس سے تھیں؟"

"جس کو پڑھتی اسی سے متاثر ہو جاتی تھی۔ نشاط فاطمہ کا افسانہ "آنسو جو بہہ نہ سکے" پڑھا تو اگلے چار افسانے اسی انداز میں لکھ ڈالے۔ اگر کسی مزاح نگار کو پڑھا تو اسی کا رنگ چڑھ گیا۔ ہاں جب ترقی پسند ادب کا مطالعہ شروع کیا اور "ڈگری کا عذاب"، "وجود کی موت" جیسے افسانے لکھے تو پھر میری روحانی ماں محترمہ نیر بانو نے میری گرفت کی اور مجھے سمجھایا کہ "انتشار نہیں سکون" عمر کچی تھی۔ تحریر بھی کچی۔ مگر بات پہلے سے باندھ لی ...... یہ ان کی کوششوں اور دعاؤں کا اثر ہے کہ پھر اپنا انداز بدلا اور پھر سب کچھ ہی بدل گیا...... زندگی کا مفہوم سمجھ میں آ گیا۔"

"لڑکیاں جب ٹین ایج میں آتی ہیں تو ان میں بہت سی تبدیلیاں آتی ہیں۔ رومانس اچھا لگتا ہے...... اس وقت کی عمر میں کیا لکھنے کا دل چاہتا تھا؟"

"میرا خیال ہے کہ میں اردو ادب کی ایسی افسانہ نگار ہوں جس کی افسانوں کی بارہ کتابیں، جس میں تین سو کے لگ بھگ افسانے اور ناولٹ ہیں ان میں کوئی ہیرو نہیں کوئی ہیروئن نہیں میرے کسی بھی افسانے یا ناولٹ میں کوئی رومانس نہیں ہے یہ نہیں کہ میں رومانس کی قائل نہیں ہوں۔ لیکن میں سمجھتی ہوں کہ رومانس سے ہٹ کر بھی بہت سے موضوعات ہیں جن پر لکھا جا سکتا ہے اور میں نے لکھا ہے۔ میری تحریروں میں معاشرتی مسائل ہیں، اردگرد کی کہانیاں ہیں۔ میرے چاروں اطراف میں ہونے والے واقعات ہیں ...... اور میری تحریروں کی منفرد بات ان واقعات اور مسائل کا حل "قرآن" سے جڑنا ہے۔ میری زندگی اور میرا تعارف ہی قرآن ہے۔"

میں اپنے شہر میں ہفتہ وار قرآنی کلاسز لیتی رہی ہوں۔ میں اپنے اردگرد کے حالات کو قرآن کے تناظر میں دیکھتی ہوں۔ اور مسائل کا حل اسی قرآن سے پیش کرتی ہوں۔ میرے پڑھنے والوں کا حلقہ ماشاء اللہ دن بہ دن بڑھ رہا ہے ...... اور میرے پڑھنے والے میری تحریر کو اتنا پہچانتے ہیں کہ میری تحریر میں شوہر نے بیوی کی چوڑیوں کو بھی محبت سے ہاتھ لگایا تو میرے قارئین چیخ پڑیں گے کہ یہ قانتہ کی تحریر نہیں ہے۔ میں مختصر بلکہ مختصر ترین لکھتی ہوں۔ دو چار صفحات ہی بس۔"

"پلاٹ کب ذہن میں آتا ہے؟"

"میری زندگی قرآن مبلغ کی سی ہے اور ساری زندگی انہونیوں سے بھرپور گزری ہے ...... میں اگر یہ کہوں کہ میں نے ساری زندگی کبھی پلاٹ پر کہانی نہیں لکھی تو غلط نہ ہوگا۔ میں نے مکالمے نہیں سوچے میں نے آغاز یا اختتام پر لمحہ بھر بھی غور نہیں کیا تو یہ غلط نہ ہوگا۔ بس چلتے پھرتے، کام کرتے، درس دیتے۔ مہمانوں کی موجودگی میں ایک کلک ہوتا ہے اور میرے دماغ میں کہانی یا افسانے کا مکمل خاکہ موجود ہوتا ہے۔ اسی ایک لمحہ کو قابو کرنے کی صلاحیت بھی اللہ نے دی ہے، قلم ہاتھ میں لیتی ہوں تو کہانی مکمل کر کے قلم رکھتی ہوں۔ میں نے کبھی دو قسطوں میں کہانی نہیں لکھی ہاں جب صحت تھی تو ایک قسط میں تین چار افسانے لکھے ہیں۔"

"منفرد انداز تو اعزاز یہ بھی منفرد ہوتا ہوگا؟"

"اعزاز یہ ڈائجسٹ کی طرف سے ملا۔ مگر اعزازیہ کبھی بھی طلب نہیں کیا۔ منفرد کا تو سوال ہی نہیں اور میرا جس گھرانے سے تعلق ہے، اس کی پہچان دین ہے ...... میں نے سورۃ قلم میں قلم کی

حرمت کا پڑھا ہے، بچپن سے ہی ہمیں بتا دیا گیا کہ زندگی اللہ کے لیے وقف ہونی چاہیے...... الحمدللہ ساری زندگی فی سبیل اللہ ہی لکھا۔ بتول، عفت، پکار، نور، ساتھی۔ خواتین ڈائجسٹ میں میرے تین سو سے زیادہ افسانے شائع ہوئے میرا قلم اگر اللہ کے دین میں اتنا سا مددگار ہو جائے تو یہ سعادت ہے میرے لیے۔"

میں نے مفروضوں یا امکانات پر نہیں بلکہ زمینی حقائق اور انسانی مسائل پر لکھا ہے...... اور ہر مسئلہ کا حل خواہ وہ حق پر ہو یا ورثے کی تقسیم۔ بے جوڑ شادیاں ہوں یا وقت کو ضائع کرنا سب پر قرآن کے پیغام کی روشنی میں لکھا۔ میں نے عشق نبی پر بہت افسانے لکھے ہیں اور ایک تحقیق کے مطابق پاکستان میں نعتیہ افسانے کی میں بانی ہوں۔"

"کبھی اپنی ہی تحریر پر رونا آیا؟"

"عشق نبی پر جب بھی لکھا بہت روئی...... اپنے اوپر طاری کر کے لکھنا بہت کربناک ہوتا ہے اور یہ کرب مجھے دن میں کئی بار بھگتنا پڑتا ہے۔ "کالی کملی والا"، "پل صراط کے نیچے" اور ایسے ہی بہت سے افسانے ہیں جنہیں لکھتے ہوئے میں روئی۔ ہاں! مسکرانے کا عمل مزاحیہ تحریروں میں جاری رہتا ہے۔"

"اب تک جو لکھا آپ نے، بتایئے؟"

"میرے افسانوں کے بارہ مجموعے شائع ہوئے...... بچوں کی بارہ کتابیں، کالموں کے دو مجموعے، ایک سفرنامہ، حج زہے مقدر کے علاوہ میرے لیکچرز بھی کتابی شکل میں شائع ہو چکے ہیں۔ جن کی تعداد سات ہے اور الحمدللہ ہر کتاب کے دو سے زیادہ ایڈیشن شائع ہوتے ہیں۔ مختلف یونیورسٹیز میں بچوں کی کتب اور دیگر تخلیقات پر کام ہو رہا ہے۔ افسانوں پر جی سی یونیورسٹی فیصل آباد سے ایم فل ہو چکا ہے...... اور میرے لیے یہ اعزاز کسی ایوارڈ سے کم نہیں کہ میرا کام حکومتی سطح پر تسلیم کیا جا چکا ہے...... میری بچوں کی کتابیں پنجاب گورنمنٹ کی طرف سے مڈل اسکولز کی لائبریریوں کا حصہ ہیں، مجھے جو قارئین ملے وہ مجھے رسپانس دینے میں کنجوس نہیں ہیں۔ مجھے بے حد شرم محسوس ہو رہی ہے "میں" کا لفظ بار بار استعمال کرتے ہوئے۔ مگر جاننے والے جانتے ہیں کہ میری زندگی تکون ہے یعنی قاف سے قانتہ، قلم اور قرآن...... تو جو محبت میری تحریر یا تقریر پر ملتی ہے دراصل وہ قرآن سے محبت ہے۔ اس کے خالق سے محبت ہے۔"

"آپ نے کہا کہ میں نے ہمیشہ فی سبیل اللہ ہی لکھا۔ تو اگر قلم کو ذریعہ معاش بنانا پڑتا تو پھر؟"

"قلم تو ذریعہ معاش کسی متعلقہ جاب سے بھی ہو سکتا تھا۔ الحمدللہ اس کی نوبت نہیں آئی۔ اللہ نے ہمیشہ اوپر والا ہاتھ ہی رکھا۔ اس وقت میں "عفت" ساتھی، بتول، پکار" میں اور کئی دیگر رسائل میں لکھ رہی ہوں جہاں اعزازیہ کا تصور بھی نہیں ہے۔ ایک مقامی کالج میں بھی میں نے پڑھایا ہے۔ مگر وہاں بھی پڑھائی کو ذریعہ معاش نہیں بنایا...... وہاں میں نے تقریباً پانچ سال پڑھایا۔"

"گوگل میں آپ کا ذکر ہے...... اچھا لگا تفصیلات پڑھ کر، سوشل میڈیا سے پھر بھی دور نظر آتی ہیں۔ وجہ؟"

"میں سوشل میڈیا سے بہت دور ہوں...... آپ کہہ رہی ہیں کہ گوگل میں میرا نام موجود ہے تو ہو گا۔ مگر میں گوگل سرچ نہیں کرتی۔ میری کوئی ویب سائٹ نہیں ہے۔ انسٹاگرام پر پیج نہیں بنایا...... میں تو فیس بک پر بھی نہیں ہوں...... ہاں میری سوشل زندگی واٹس ایپ what`s app سے شروع ہو کر واٹس ایپ پر ہی ختم ہوتی ہے۔ جاننے والے جانتے ہیں کہ میری روٹین کیا ہے...... اور میری روٹین آج کے دور سے ہٹ کر ہے۔

"کچھ ہاتھ نہیں آتا بن آہ سحر گاہی"
کی قائل ہوں۔ سحر گاہی ہی میں گھر کے آدھے کام دھندے نپٹ جاتے ہیں۔

''ٹی وی ڈراموں سے دوری بھی اسی وجہ سے ہے کہ آپ مذہب کے بہت قریب ہیں؟''

''درحقیقت ٹی وی والوں کو اپنے ڈراموں کے لیے جس رومانس یا مرچ مسالے کی ضرورت ہے وہ میری تحریر میں نہیں ...... میری تحریریں بس اصلاح معاشرہ کے لیے، دلوں کو جوڑنے کے لیے اور زندگی کی گتھیاں سلجھانے کے لیے ہیں ...... تو بھلا کون رابطہ کرے گا۔ ہاں برسوں پہلے ''کالی کملی والا'' افسانہ لکھا تو ادھر ادھر سے پیغام ملے کہ اسے ڈراما ٹائز ہونا چاہیے۔ میرا جواب ایک ہی تھا ''جوں کا توں'' مقصدیت کے ساتھ اس لیے کہ شہرت سے اب کیا غرض اور دولت۔ اللہ نے قناعت وافر دی ہے۔''

''قارئین نے تو آپ کی تحریروں کو بہت پسند کیا ...... گھر والوں سے کتنی پذیرائی ملی؟''

''میرے ابو، میرے ماموں اور میری چچی نے میری بہت حوصلہ افزائی کی ...... اگرچہ میرے ابو نے کبھی یہ نہیں کہا کہ تم بہت اچھا لکھتی ہو لیکن میری تحریر پڑھ کر ان کا چہرہ خوشی سے لال ہو جاتا تھا۔ لکھنے کے لیے ضروری تمام چیزیں مہیا کرتے تھے۔ چاہے وہ کاغذ قلم لانا ہو یا تحریریں بھیجنے کے لیے ڈاک کا خرچ میرے والد نے میری ہر ضرورت پوری کی۔''

''اور سسرال والوں نے؟''

''میرا سسرال آؤٹ آف فیملی ہے اور ہمارا رشتہ دین کے تعلق کی بنا پر ہی قائم ہوا۔ ہمارے یہاں دین اور لڑکے کی نمازوں کے بارے میں بھی پہلے پوچھا جاتا ہے۔ شادی کے بعد شروع میں کچھ وقت مشکلات کا سامنا کیا لیکن پھر اللہ نے بہت کرم کیا اور میرے شوہر نے میرے ساتھ بہت تعاون کیا بلکہ اگر میں یہ کہوں کہ سب سے زیادہ تعاون ہی میرے شوہر نے کیا تو غلط نہ ہوگا۔ میرے لکھے کی فوٹو کاپی کروانا اسے سپرد ڈاک کرنا اور جب تحریر شائع ہو جائے تو رسائل و جرائد لا کر دینا بھی میرے میاں صاحب کا ہی کام ہے۔''

''آپ کے بچوں میں آپ کا اثر آیا؟''

''کتاب پڑھنے کے جراثیم تو ساری اولاد میں ہیں اور لکھنے کے بھی ہیں۔ بڑی بیٹی کو شعر و شاعری سے لگاؤ ہے دوسری بیٹی بھی بہت اچھا ادبی ذوق رکھتی ہے۔ لیکن اسکرین کے غلبے کے اس دور میں اب آہستہ آہستہ باقی بچے کتاب کے بجائے اسکرین پر پڑھنا پسند کرتے ہیں ...... اور میری اس بات سے جان جاتی ہے۔ میں نے بہت سی عادات اپنے والدین سے لیں۔ والدین کا بہترین ادبی ذوق تھا۔ میں نے بھی شادی سے قبل بہت پڑھا۔ جو کتاب ملی پڑھ کے ہی ہاتھوں سے نکلی۔ ابا شب زندہ دار تھے متقی تھے، عالم باعمل تھے لیکن خشک مزاج نہیں تھے۔ انہیں مزاح میں شفیق الرحمٰن پسند تھا تو ہمیں گھول کے پلا دیا۔ ابو نے کسی مدرسے سے حفظ نہ کیا مگر ہر وقت قرآن کی تلاوت نے مکمل حفظ کی سعادت بخشی ...... انتقال ہوا تو انگلیاں ذکر کی حالت یعنی انگوٹھا تسبیح پکڑنے کے انداز میں تھا۔''

''اپنے آپ پر فخر ہوتا ہے؟''

''کس بات پر؟ ...... میں نے کہا نا کہ ہم تو رب کی طرف سے دہاڑی دار مزدور ہیں اور مزدوری ملنا بھی سعادت ہے میری مزدوری۔ ''بول کر اللہ کا پیغام پہنچانے اور لکھ کر تبلیغ کی لگ گئی ہے'' فخر تو نیکیوں کو کھا جاتا ہے۔ گو کہ مجھے زندگی میں آئے دن ایسے لوگ ملتے ہیں جو مجھ سے والہانہ محبت کا اظہار کرتے ہیں۔

''آپ کے درس سے ہماری سوچ بدل گئی، ہماری زندگی با مقصد ہو گئی ہے۔''

جیسے جملے سننے کو ملتے ہیں مگر آنکھیں شاید مسکراتی ہوں۔ مگر دل دھک دھک کر کے ''ربنا تقبل منا'' ہی دہائی دیتا ہے ......

مجھے بہت سی نامور شخصیات نے ''حرم'' سے فون کیا کہ ''ہم خانہ کعبہ میں بیٹھے آپ کا سفرنامہ حج زہے مقدر پڑھ رہے ہیں۔ اور آپ کے لیے دعا گو ہیں ......''

ایک شام ایک اجنبی خاتون ملنے آئیں کہ مجھے بس آپ کو دیکھنا ہے...... خواب میں فلاں ہستی کی زیارت ہوئی۔ حکم ہوا کہ فلاں شہر کی "قانتہ" سے ملو۔ وہ آپ کو آپ کے مسئلہ کا حل بتائیں گی۔ انہوں نے جس ہستی کی زیارت کا نام لیا۔ سن کر میرا وجود پانی پانی ہوگیا۔ اتنی بڑی ہستی اور میں گناہ گار...... میرا رواں رواں لرز اٹھا......

خواتین تو خواتین ہیں، مجھے تو مرد قارئین کے تبصرے بھی موصول ہوتے ہیں۔ اور میری تحریریں عشق نبی کی آگ سلگاتی ہیں تو یہ بھی میرے لیے اعزاز ہے...... اور چونکہ میرا تعلق "حریم ادب" سے ہے جو حلقہ خواتین جماعت اسلامی کا ادبی پلیٹ فارم ہے تو الحمدللہ کسی بھی رائیٹر کے لیے پلیٹ فارم میسر ہونا اور وہ بھی مثبت پیغام والا تو یہ بہت بڑا انعام ہے...... اور اسی وجہ سے الحمدللہ میرے قارئین کا اچھا خاصا حلقہ ہے...... حالانکہ میں "فیس بک" یا ٹوئیٹر پر نہیں ہوں۔ پھر بھی آج کے بچے بچیاں مجھے پڑھتے ہیں اور یہی میرا ٹارگٹ ہے۔

نوجوان نسل کو صحیح سوچ دینا اور قرآن سے جوڑے رکھنا۔ باقی یہ کہ مسائل کہاں نہیں ہوتے۔ دنیا تو ہے ہی قید خانہ۔ دارالعمل ...... آخرت کا دروازہ...... جس نے اس گھاٹی کو آسانی سے پار کیا۔ ان شاء اللہ اگلے مراحل بھی آسان ہوتے چلے جائیں گے۔"

"عموماً خیال ہے کہ بہت مذہبی لوگ نہ صرف خشک مزاج ہوتے ہیں بلکہ دنیاوی ایکٹیوٹی سے بھی دور ہوتے ہیں۔ جیسے سیاست اور دیگر؟"

"لوگوں کا یہ خیال کہ مذہب سے وابستہ لوگ خشک ہوتے ہیں غلط ہے...... الحمدللہ ہمارے خاندان میں حس مزاح کا لیول بہت ہی شان دار رہا ہے۔

سیاست ہمارا اوڑھنا بچھونا تھی۔ میرے ماموں حکیم احمد سعید سلیمانی۔ جاوید ہاشمی کے قریبی ساتھیوں میں سے تھے۔ خود بھی بلدیہ کے وائس چیئرمین رہے۔ مشرف کے دور میں ڈسٹرکٹ کونسلر رہے۔ شادی کے فوراً بعد میرے میکے میں ایم این اے اور ایم پی اے کا انتقال ہوا تو ضمنی الیکشن کے لیے میاں نواز شریف سمیت تمام قیادت وہاں موجود تھی خواتین کی کمپیئن کے لیے ایم پی اے اور ایم این ایز، تہمینہ دولتانہ، بشریٰ رحمٰن، سمیت بہت سی خواتین موجود تھیں۔

جہانیاں کی نمائندگی کے لیے میں ان کے ہمراہ تھی۔ جہانیاں سے جاتے جاتے تہمینہ دولتانہ نے مجھے اچھے عہدہ کی پیش کش کرتے ہوئے مسلم لیگ جوائن کرنے کو کہا۔ میں نے انکار کردیا۔ ظاہر ہے ہماری کمٹ منٹ "جماعت اسلامی" سے ہے۔ سو ہم ہنس دیے اور مسکرا بھی دیے۔

"اور چلتے چلتے آخری سوال کہ اس انٹرویو کے ذریعے کچھ کہنا چاہیں گی؟"

"بس یہی کہنا چاہوں گی کہ یہ دنیا فانی ہے اور عارضی ہے جس میں ہم وقت بہت ضائع کرتے ہیں اور جتنا دکھ مجھے سنتوں کے ضیاع پر ہوتا ہے اور کسی بات پر نہیں ہوتا۔ سنتوں کو ہم نے صرف مدرسوں کی حد تک رکھا ہوا ہے یا پھر اس حد تک کہ دائیں ہاتھ سے کھالو اور جمعہ کو ناخن کاٹ لو۔ لیکن جلدی سونا' جلدی اٹھنا اور سب سے بڑی سنت جو جہاد کی ہے۔ ان چیزوں کو ہم نے اپنی زندگی سے نکال دیا ہے۔ ہم دنیا کی دل فریبیوں میں آگے آگے ہیں۔ پیغام یہی ہے کہ آنکھیں کھولیں' بصارت کے ساتھ۔ بصیرت کے ساتھ اور دشمنوں کے وار کو پہچانیں۔"

اور اس کے ساتھ ہی ہم نے "قانتہ رابعہ" سے اجازت چاہی شکریہ کے ساتھ کہ انہوں نے ہمارے ڈائجسٹ کے لیے انٹرویو دیا۔

کہانی کا آغاز کب ہوا، پہلی کہانی کب لکھی گئی؟

یہ کہنا تو مشکل ہے لیکن جو حکایتیں اور کہانیاں سامنے آئی ہیں ان سے ایک بات کا پتا ضرور چلتا ہے کہ زمانہ قدیم سے کہانی صرف دل بہلانے کا ذریعہ نہیں۔ اس میں علم و دانش کے قیمتی موتی چھپے ہوتے ہیں۔ آج بھی تخلیق کار لفظوں کا جہان آباد کر کے اپنے پڑھنے والوں کو زندگی برتنے کا سلیقہ سکھاتا ہے۔ وہ اپنی کہانیوں سے زندگی کی مثبت قدروں سے روشناس کراتا ہے۔ اپنے لفظوں سے زخمی دلوں کو سکون دیتا ہے۔ اس کی تخلیقی صلاحیت دوسروں کے لیے رہنما بھی بنتی ہے اور سہارا بھی۔

خواتین ڈائجسٹ بے شمار تخلیق کاروں کی صلاحیتیں سامنے لانے کا ذریعہ بنا۔ انہوں نے اپنی تحریروں کے ذریعے خود کو منوایا۔ شہرت اور مقبولیت حاصل کی۔ آج ملک میں اور بیرون ملک لاکھوں لوگ ان کی تحریریں پڑھتے ہیں۔

یوں تو مصنف کی تحریر ہی اس کی شخصیت کا آئینہ ہوتی ہے لیکن پھر بھی ہر قاری کے ذہن میں کچھ سوالات ابھرتے ہیں جو وہ اپنی پسندیدہ مصنفہ سے کرنا چاہتی ہیں۔

لاکھوں کی تعداد میں قارئین کی اپنی پسندیدہ مصنفہ سے ملاقات یا بات چیت ممکن نہیں۔ اس لیے ہم نے اس بار سالگرہ نمبر میں قارئین کو موقع دیا ہے، وہ اپنی پسندیدہ مصنفہ سے سوال پوچھ سکیں۔ ہم نے صرف ایک سوال کہا تھا لیکن قارئین نے اتنی تعداد میں سوال بھیجے کہ ہم نے تین سوال شامل کیے ہیں۔

آیئے دیکھتے ہیں قارئین نے کیا سوال کیے اور مصنفین نے ان کے کیا جواب دیے ہیں۔

سوال یہ ہے

ادارہ

نعیمہ ناز سلطان

س: "صدف ناصر کا سوال ہے کہ "کیا حقیقی زندگی میں بھی آپ اپنی تحریروں کی طرح سگھڑ اور گھریلو ہیں؟""

ج: "سگھڑاپے کے بارے میں تو بعد میں بتاؤں گی۔ پہلے یہ کہ جی ہاں میں گھریلو ہوں۔ مجھے گھر اور گھر داری سے دلچسپی ہے اور گھریلو کام منہ بنائے بغیر کر لیتی ہوں۔ میرے گھر میں کوئی ماسی نہیں آتی۔ ہم سات افراد ہیں۔ میرے سسر، ہم میاں بیوی اور ہماری تین بیٹیاں اور نند کا ایک بیٹا۔ میں سب کی ذمہ داریاں بخوبی نبھا لیتی ہوں۔ اپنے گھر والوں کے لیے کام کرنا اچھا لگتا ہے۔ بس کپڑے سینے کا زیادہ شوق نہیں ہے۔ ویسے مجھے سلائی آتی ہے۔ شادی سے پہلے یہ کام کر لیتی تھی۔ پھر شادی کے بعد، یکے بعد دیگرے بچوں کی ذمہ داریاں، تب بھی کچھ عرصہ یہ کام کیا لیکن میری چھوٹی بہن راحت نے اس معاملے میں مجھے بالکل ہی نکما کر دیا۔ جیسے ملے یوں، وہ کھیتی کرے کیوں؟ میرے اور بچوں کے بہت کپڑے سی کر دیے ہیں اس نے۔

سگھڑاپے کا جہاں تک سوال ہے تو سچ یہ ہے کہ اس معاملے میں ففٹی ففٹی ہوں۔ میرا گھر ہر وقت آئینے کی طرح نہیں چمکتا اور چمک بھی نہیں سکتا۔ گھر میں بالترتیب نو اور دس سال کی تین عدد بے چین روحیں ہیں۔ جنہیں اپنے کھلونے سجانے کے لیے گھر کا ہر کمرا، ہر گوشہ موزوں لگتا ہے اور کچھ لاک ڈاؤن کے دوران کچھ موبائل کی لت سے بچانے کے لیے انہیں کتابیں اور پڑھنے کا شوق دلا دیا۔ اب کھلونوں کے ساتھ جگہ جگہ نونہال، ساتھی تعلیم و تربیت اور خصوصاً لطائف کی کتابیں یا بچوں کی دیگر دوسری کتابیں نظر آتی ہیں۔ کھلونوں اور

کتابوں کے علاوہ، گھر میں ہر شے کی جگہ مقرر ہے اور وہ تمام اشیا ٹھکانے پر ہی رہتی ہیں۔

کچن صاف رہنے اور رکھنے میں میرے شوہر کا بہت تعاون ہے۔ گھر اور کچن وغیرہ کی تفصیلی صفائی وہی کرتے ہیں۔ اتنی اچھی صفائی میں بھی نہیں کر سکتی۔ ایمان داری کی بات یہ ہے کہ بہت زیادہ نفاست پسند ہونے کی وجہ سے مجھ سے زیادہ سگھڑ تو "یہی" ہیں۔ پہلے کبھی کبھار مجھ سے ہنڈیا جل جاتی تھی۔ شکر ہے کہ اب ہنڈیا تو نہیں جلتی مگر چائے میں اکثر چولہے پر رکھ کر بھول جاتی ہوں اور جب بو آنے کے ساتھ ساتھ کچن سے دھواں اٹھتا دکھائی دے تو ...

اور دو بار تو ایسا بھی ہوا کہ ایک بار پتیلی جل کر کوئلہ ہونے کے بعد دوسری بار چائے چڑھائی اور وہ خشک ہو کر پھر وہی......

اس دن پہلی بار ہمارے سیدھے سادے اور اللہ میاں کی گائے جیسے مجازی خدا نے ایک ہی سوال کیا تھا مجھ سے۔

"گھر سے ہی ایسی آئی تھیں یا شادی کے بعد یہ حال ہوا ہے؟"

اب آپ لوگوں سے کیا پردہ۔ شادی سے پہلے بھی میں کچھ کم غائب دماغ نہیں تھی لیکن بہر حال اب یہ ہے کہ رات کے کھانے کے بعد جب معمول کے مطابق چائے بنانے کے لیے رکھتی ہوں تو کمرے میں آ کر اعلان کر دیتی ہوں۔ میاں جی اور بچوں کے سامنے کہ یاد دلا دینا چولہے پر چائے ہے اور کچھ میاں صاحب کو بھی کان ہو گئے ہیں، چولہے پر چائے ہو یا کچھ بھی، چیک کر لیتے ہیں۔

باقی یہ کہ کہانیوں کی طرح بالکل سگھڑ نہ سہی مگر ایسی پھوہڑ، کاہل اور کام چور بھی نہیں ہوں۔"

س: "دوسرا سوال حبیبہ خان نے کیا ہے کہ آپ کی کہانیوں میں مشرقی اقدار کو بہت دل کشی سے بیان کیا جاتا ہے اور معاشرے کے وہ بزرگ افراد جنہیں عام طور پر نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ آپ انہیں روایتی عزت و احترام دیتی ہیں۔ یہ تربیت کا نتیجہ ہے یا گھر کا ماحول؟"

ج: "بات یہ ہے کہ ہماری مشرقی اقدار، تہذیب، معاشرت، طور طریقے، خوب صورت ہی نہیں، خوب سیرت بھی ہیں۔ ان میں وہ سب کچھ ہے جو کسی بھی معاشرے کو زندہ اور توانا رکھنے کے لیے ضروری ہے۔ مضبوط خاندانی نظام معاشرے کی اکائی ہے۔ مغرب نے اپنی ترقی اور چکا چوند کی قیمت ان اقدار اور خاندانی نظام کی قربانی دے کر حاصل کی ہے۔ ہم خوش نصیب ہیں مگر قدر نہیں کرتے۔ اس خزانے کی کس کے ہم مالک ہیں۔

میں نے اپنے گھر اور خاندان میں بڑوں کا ادب و احترام اور وضع داری کی فضا دیکھی ہے۔ صرف گھر والوں اور سگے رشتے داروں کا ہی نہیں بلکہ منہ بولے رشتوں اور محلے داروں کا بھی ادب کیا جاتا تھا۔ خیال رکھا جاتا

تھا۔ مجھے ذاتی طور پر عمر رسیدہ افراد کی صحبت بہت پسند ہے۔ وہ لوگ جو ایک عمر گزار چکے ہوتے ہیں، ان کے پاس زندگی کے بڑے قیمتی اور دلچسپ تجربات ہوتے ہیں۔

اب دھیرے دھیرے بہت کچھ معدوم ہوتا جا رہا ہے۔ ننھیال، ددھیال دونوں جگہ بہت خوب صورت اور قیمتی رشتے اور قیمتی لوگ ہوتے ہیں۔ ان رشتوں کی مضبوطی اور دلکشی کم ہوتی جا رہی ہے۔ وجوہات بہت ساری ہیں۔ میں اپنی کہانیوں میں کوشش کرتی ہوں کہ ان روایتی بزرگوں اور رشتوں کو ویسے ہی بیان کروں جیسے کہ یہ کبھی تھے اور جیسے اب ہونے چاہئیں۔"

س: "تیسرا سوال خنساء احمد کا ہے......

"آپ کی اردو بہت اچھی ہے۔ آپ اپنی کہانیوں میں ایسے محاورے استعمال کرتی ہیں، جو عام طور پر نہیں بولے جاتے۔ اردو زبان سے محبت اور اس کا استعمال کہاں سے سیکھا؟"

ج: "میں نے جب ہوش سنبھالا تو کچھ اس قسم کے مکالمات سنتی تھی۔ ابا سینس آف ہیومر کے مالک اور اماں ان کی نسبت ذرا مذہبی اور سنجیدہ۔ اماں ہم بچوں کو کسی کتاب یا اخبار سے کوئی اچھی بات پڑھ کر سنا رہی ہوتیں، ابا بیچ میں کود پڑتے۔

"تو گدھی کمہار کی تجھے رام سے کیا کام"

"ارے! ہمیں کیوں ہوتا رام سے کام؟ ہم مسلمان ہیں۔ اللہ سے واسطہ ہمارا۔" اماں بھڑک جاتیں۔ ابا مزید جلتی پر تیل ڈالتے۔

"کانٹری بنی، رام رام، یہی لڑائی کے پینترے"

"میں بچوں کو کام کی باتیں بتا رہی ہوں، آ گئے اپنے رام رام لے کر بیچ میں۔"

"اچھا، تو آپ کو معلوم ہے کہ بھیڑ کی دم کدھر ہے؟" ابا کا سوال بڑا معصوم سا ہوتا تھا مگر......

"ہاں، سب تمہیں ہی معلوم ہے، ہمیں تو کچھ پتا ہی نہیں۔"

"تو اور کیے، آوے نہ جاوے، چڑیا گیت گاوے"

ہم اماں کا کسی بات پر کہنا نہ مانتے تو ان الفاظ میں ڈانٹتی تھیں کہ......

"بھلے گھوڑے کو ایک چابک اور بھلے انسان کو ایک بات کافی ہوتی ہے۔"

سردیوں میں اماں روٹی پکاتیں تو باورچی خانے میں ہی سامنے بٹھا لیتی تھیں اور روٹی پکا پکا کر دیتی جاتیں۔ ہم بہن بھائی آوازیں بلند کرتے۔ اماں پہلے مجھے...... پہلے مجھے......

ابا آواز لگاتے۔ "ہاتھ کی میری، گھائی کی تیری"

کبھی ہم اماں کے آتے آتے پہلے ہی باورچی خانے میں گھس کر لائن سے پیڑھیوں پر بیٹھ جاتے تو ابا جان فرماتے۔

"پینٹھ جڑی نہیں، گٹھ کترے پہلے آ گئے"

اماں ہمیں گفتگو کے آداب سکھاتیں تو کہتی تھیں۔ "بنیا گڑ نہ دے، گڑ کی سی بات کہہ دے"

نصیحت ہوتی تو ان الفاظ میں "بڑا نوالہ کھالو، بڑا بول نہ بولو" یا پھر "ایک آنکھ لڑائی کی رکھو تو ایک ملنے کی رکھو" اور ہر وقت کا ایک سبق یہ تھا۔ "کام پیارا ہوتا ہے، چام پیارا نہیں ہوتا۔"

اماں کھانا پکا رہی ہوتیں۔ ابا ٹپک پڑتے۔ "گھی سنوارے سالنا بڑی بہو کا نام" کبھی فرمائش ہوتی۔ بھئی وہ پکاؤ۔

"چھلے دار شوربا، لچھے دار چپاتی۔"

جب بھی دال پکتی، ابا اپنی نوابیت بگھارتے۔

"بھئی ہمارے ہاں تو اشرفیوں کا بگھار لگتا تھا دال میں۔ یہ پیاز اور لہسن کے بگھار تو بنگال میں لگتے ہیں۔" (میری اماں بنگال کی تھیں)۔

"کبھی دیکھی بھی ہیں اشرفیاں یا بس نام لینا آ گیا؟" اماں کا لہجہ تیکھا ہو جاتا۔

"پودینے کے باغ تھے ہمارے انڈیا میں۔" ابا کا فخر بھی بس......

"یہاں تو سبزی والے سے لینی پڑتی ہے پودینے کی گڈی۔ باغ تھے یا کھیت، سب وہیں رہ گئے۔"

''اچھا چلو، اسی بات پر ایک کپ چائے پلا دو۔ لڑائی جھگڑا ختم کرو۔'' ابا سفید پرچم لہرا دیتے۔
''یہ لو، میں شروع کرتی ہوں لڑائی جھگڑا؟''
''نہ، آپ تو اللہ میاں کی گائے ہو۔ میں ہی ہوں بھس کی گانٹھ۔'' ابا اتنے مزے سے اعتراف کرتے کہ اماں ہنس پڑتیں اور چائے کا پانی رکھ دیتیں۔
سلائی میں میرا زیادہ دل نہیں لگتا تھا۔ اماں تلقین کرتی تھیں کہ کوئی بھی کام سیکھنے کے لیے پتا جمانا پڑتا ہے یا پتا مارنا پڑتا ہے۔
دادی اور ابا کی گفتگو میں محاوروں کی آمیزش تھی۔ میری کہانیوں میں جو بزرگ کردار بامحاورہ زبان استعمال کرتے ہیں، وہ فرضی نہیں حقیقی ہے۔ اماں بنگال کی تھیں۔ بہت چھوٹی عمر میں بیاہ کر دادی کے کنبے میں آئیں اور ان کی اپنی چھاپ تلک سب چھن گئی۔ جہاں آئی تھیں ان ہی کے رنگ میں رنگ گئیں۔ ان ہی کی بولی اختیار کرلی۔ مجھے اس زبان سے، اس تہذیب سے عشق ہے۔ اپنی بولی سے ہم محبت نہیں کریں گے، تو کون کرے گا؟ ہم اسے نہیں اپنائیں گے اور آئندہ نسلوں تک نہیں پہنچائیں گے تو پھر یہ کس کا کام ہے؟''
س: ''حمرہ خان کا سوال ہے کہ آپ کی پسندیدہ مصنفین کون ہیں؟''
ج: ''بہت ساری ہیں مگر صرف ڈائجسٹ کے حوالے سے بات کروں تو عنیزہ سید، عالیہ بخاری، راحت جبیں بہت پسند ہیں۔ عالیہ اور راحت کی کہانیاں عام سے لوگوں اور عام سی زندگی سے جڑی ہوتی ہیں۔ میرا مزاج اور طرز تحریر اسی انداز کے قریب ہے۔ ''ادن دھتی رائے'' گاڈ آف اسمال تھنگز میں لکھتی ہے کہ......
''خدا کو یقیناً عام سے لوگ پسند ہیں، تب ہی اس نے انہیں بڑی تعداد میں پیدا کیا ہے۔''
عنیزہ سید کی کہانیوں میں ایک خاص رکھ رکھاؤ اور فلسفہ ہوتا ہے جو میرے دل کو چھوتا ہے۔ ان کے علاوہ نمرہ، عمیرہ اور سمیرا کی تحریروں کا مجھے بھی شدت سے ویسا ہی انتظار رہتا ہے جیسا کہ آپ سب قارئین کرتے ہیں۔
س: ''آخری سوال ثوبیہ قطب کا ہے۔ آپ کس وقت لکھتی ہیں؟ کیا آپ کے شوہر آپ سے تعاون کرتے ہیں؟''
ج: ''مجھے لکھنے کے لیے موڈ کی نہیں، وقت کی ضرورت ہوتی ہے کیونکہ ہم قلم کے مزدور ہیں اور یہ فقط شوق اور شغل نہیں بلکہ ضرورت بھی ہے۔ عموماً میں صبح کے وقت لکھتی ہوں جب بڑے اپنے کاموں پر اور بچے اسکول میں ہوتے ہیں۔ دن مصروف گزرتا ہے کیونکہ گھر کے سارے کاموں کے علاوہ میں اپنے بچوں کو ٹیوشن اور قرآن بھی خود پڑھاتی ہوں۔ زینب اور صبا تو اپنا قرآن ختم کرنے کے بعد دہرا رہی ہیں۔ چھوٹی مریم کا نواں پارہ ہے اور چونکہ میں نے ابھی

تک وانی فائی نہیں لگوایا لہٰذا مجھے لکھنے، مطالعہ کرنے، گھر کے کام کرنے، بچوں کی فرمائش پر انہیں قصے کہانیاں سنانے، سسر صاحب کے ساتھ کچھ وقت گزارنے اور اپنوں سے ملنے ملانے کے لیے وقت اور مواقع سب میسر ہو جاتے ہیں۔

ہمارے معاشرے میں خصوصاً متوسط طبقے کی لڑکی، عورت گھر داری کے علاوہ کچھ اور کرنا چاہے تو گھر کے مردوں کے تعاون کے بغیر بہت مشکل ہوتی ہے۔ میرے شوہر بہت تعاون کرتے ہیں۔ کاغذ قلم لا دیتے ہیں۔ گھر کے بہت سے کاموں (سوائے کوکنگ کے) میں مدد کر دیتے ہیں۔ تحریر کو وقت پر مستقل تک پہنچا دیتے ہیں۔ بنفس نفیس خود جا کر دے آتے ہیں۔ ڈائجسٹ میں چھپا میرا نام دیکھ کر خوش ہو جاتے ہیں اور کیا چاہیے؟"

فرزانہ کھرل

"زینب نور پوچھتی ہیں......

س: "کوئی بھی کہانی ایسی نہیں ہوتی جو رائٹر دل سے نہ لکھے مگر پھر بھی میں پوچھنا چاہتی ہوں کہ آپ نے کس کہانی کا کون سا کردار دل سے لکھا ہے۔ جس کو لکھتے ہوئے آپ کے دل نے درد محسوس کیا؟"

ج: "زینب نور! میں نے ہر کردار دل سے ہی لکھا ہے لیکن وادی ظلتر میں جہاں ہم مینو کے ساتھ روئے وہیں شہرام کے درد کو بھی دل کی گہرائیوں سے محسوس کیا (اجنبی کون ہو تم)۔ آیت کی آنکھ سے پھسلنے والے آنسوؤں کو اپنے رخسار پر بہنے سے روک نہیں پائی۔"

فرزانہ بھٹی چتوکی سے پوچھتی ہیں......

س: "فرزانہ جی! کچھ لوگ محبت گزیدہ ہو کر بھی محبت کو امر کرنے پر یقین نہیں رکھتے۔ مگر مجھے لگتا ہے آپ محبت گزیدہ نہ ہو کر بھی محبت کو امر کرنے پر یقین رکھتی ہیں۔ کیا ایسا ہے؟"

ج: "فرزانہ بھٹی! میں محبت کو روح کی چاشنی میں دیکھتی ہوں، جہاں فنا ممکن ہی نہیں، شاید میرے قلم کو الف سے ے تک، سارے لفظ میری روح نے لکھنے سکھائے ہیں۔ محبت بارش ہے، یہ شفاف پانی آسمان سے بہتا ہے اور مٹی میں مل کر مٹی ہو جاتا ہے۔ بارش اور مٹی امر ہیں تو پھر محبت امر کیوں نہیں ہو سکتی۔"

تیسرا سوال صدف ناصر نے کیا ہے، وہ پوچھتی ہیں......

س: "آپ اتنا شان دار لکھتی ہیں مگر اتنے زیادہ کردار کیوں ہوتے ہیں کہ آپ کی ہر تحریر میں بار بار صفحات آگے پیچھے الٹنے پڑتے ہیں کہ کون کس کا کیا لگتا ہے؟"

ج: "صدف ناصر! جب میرا شمار صرف قارئین میں ہوتا تھا تو مجھے زیادہ کرداروں پر مبنی ناول پسند تھے مگر اب میرے قاری اس چیز کو پسند نہیں کرتے تو میری تحریروں میں کرداروں کی بھرمار اب کم ہوتی جا رہی ہے۔"

سمیرا حمید

سوال: نورین ظفر خان نے سوالات کی لڑی پروتے ہوئے طواف عشق کے حوالے سے سوال کیا ہے۔

"وہ کیا نقطۂ آغاز تھا، سوچ کی وہ کون سی پہلی کرن تھی، احساس کا کون سا پہر تھا، ادراک کا وہ کیا پل تھا، خیال کا وہ پہلا موتی کیا تھا جسے ہاتھ میں لے کر آپ نے اس خوب صورت ناول کی مالا پرو ڈالی۔ خطۂ زمین کے انجان وطنوں میں بے تحاشا گزرے وقتوں کے ان دیکھے، ان سنے کردار، آپ نے کیسے کھوج نکالے؟

جنت، آمنہ اور عزیزہ کی شبیہ آپ کے دریچۂ ذہن میں کیسے لہرائی؟ رات کے کس پہر آپ نے ان کی دعاؤں کو قرطاس پر منتقل کیا؟ اور دن کے اجالے میں ان کرداروں کی آزمائش کو کیسے الفاظ کے قالب میں ڈھالا؟ اونچے محلوں کی رونق چھوڑ کر تپتی صحرا کی ریت پر جلتے پاؤں تک...... سربازار حقیر ترین قیمت کے عوض بکنے سے لے کر رب کریم کی خوشنودی تک......بس سفر کا نقطۂ آغاز جاننے کی خواہش ہے۔ سارے دھاگے سوچ کے الجھے ہیں بس کوئی سرا تھما دیں۔"

صفحہ نمبر 249

تک وانی فانی نہیں لکھوایا لہٰذا مجھے لکھنے، مطالعہ کرنے، گھر کے کام کرنے، بچوں کی فرمائش پر انہیں قصے کہانیاں سنانے، سسر صاحب کے ساتھ کچھ وقت گزارنے اور اپنوں سے ملنے ملانے کے لیے وقت اور مواقع سب میسر ہو جاتے ہیں۔

ہمارے معاشرے میں خصوصاً متوسط طبقے کی لڑکی، عورت گھر داری کے علاوہ کچھ اور کرنا چاہے تو گھر کے مردوں کے تعاون کے بغیر بہت مشکل ہوتی ہے۔ میرے شوہر بہت تعاون کرتے ہیں۔ کاغذ قلم لا دیتے ہیں۔ گھر کے بہت سے کاموں (سوائے کوکنگ کے) میں مدد کر دیتے ہیں۔ تحریر کو وقت پر محل (اقمل) تک پہنچا دیتے ہیں۔ بنفس نفیس خود جا کر دے آتے ہیں۔ ڈائجسٹ میں چھپا میرا نام دیکھ کر خوش ہو جاتے ہیں اور کیا چاہیے؟"

فرزانہ کھرل

"زینب نور پوچھتی ہیں......

س: "کوئی بھی کہانی ایسی نہیں ہوتی جو رائٹر دل سے نہ لکھے مگر پھر بھی میں پوچھنا چاہتی ہوں کہ آپ نے کس کہانی کا کون سا کردار دل سے لکھا ہے۔ جس کو لکھتے ہوئے آپ کے دل نے درد محسوس کیا؟"

ج: "زینب نور! میں نے ہر کردار دل سے ہی لکھا ہے لیکن وادی نلتر میں جہاں ہم مینو کے ساتھ روئے وہیں شہرام کے درد کو بھی دل کی گہرائیوں سے محسوس کیا (اجنبی کون ہو تم)۔ آیت کی آنکھ سے پھسلنے والے آنسوؤں کو اپنے رخسار پر بہنے سے روک نہیں پائی۔"

فرزانہ بھٹی پتوکی سے پوچھتی ہیں......

س: "فرزانہ جی! کچھ لوگ محبت گزیدہ ہو کر بھی محبت کو امر کرنے پر یقین نہیں رکھتے۔ مگر مجھے لگتا ہے آپ محبت گزیدہ نہ ہو کر بھی محبت کو امر کرنے پر یقین رکھتی ہیں۔ کیا ایسا ہے؟"

ج: "فرزانہ بھٹی! میں محبت کو روح کی چاشنی میں دیکھتی ہوں، جہاں فنا ممکن ہی نہیں، شاید میرے قلم کو الف سے ے تک، سارے لفظ میری روح نے لکھنے سکھائے ہیں۔ محبت بارش ہے، یہ شفاف پانی آسمان سے بہتا ہے اور مٹی میں مل کر مٹی ہو جاتا ہے۔ بارش اور مٹی امر ہیں تو پھر محبت امر کیوں نہیں ہو سکتی۔"

تیسرا سوال صدف ناصر نے کیا ہے، وہ پوچھتی ہیں......

س: "آپ اتنا شاندار لکھتی ہیں مگر اتنے زیادہ کردار کیوں ہوتے ہیں کہ آپ کی ہر تحریر میں بار بار صفحات آگے پیچھے الٹنے پڑتے ہیں کہ کون کس کا کیا لگتا ہے؟"

ج: "صدف ناصر! جب میرا شمار صرف قارئین میں ہوتا تھا تو مجھے زیادہ کرداروں پر مبنی ناول پسند تھے مگر اب میرے قاری اس چیز کو پسند نہیں کرتے تو میری تحریروں میں کرداروں کی بھرمار اب کم ہوتی جا رہی ہے۔"

سمیرا حمید

سوال: نورین ظفر خان نے سوالات کی لڑی پروتے ہوئے طواف عشق کے حوالے سے سوال کیا ہے۔

"وہ کیا نقطۂ آغاز تھا، سوچ کی وہ کون سی پہلی کرن تھی، احساس کا کون سا پہر تھا، ادراک کا وہ کیا پل تھا، خیال کا وہ پہلا موتی کیا تھا جسے ہاتھ میں لے کر آپ نے اس خوب صورت ناول کی مالا پرو ڈالی۔ خطۂ زمین کے انجان وطنوں میں بے تحاشا گزرے وقتوں کے ان دیکھے، ان سنے کردار، آپ نے کیسے کھوج نکالے؟

جنت، آمنہ اور عزیزہ کی شبیہ آپ کے دریچۂ ذہن میں کیسے لہرائی؟ رات کے کس پہر آپ نے ان کی دعاؤں کو قرطاس پر منتقل کیا؟ اور دن کے اجالے میں ان کرداروں کی آزمائش کو کیسے الفاظ کے قالب میں ڈھالا؟ اونچے محلوں کی رونق چھوڑ کر تپتی صحرا کی ریت پر جلتے پاؤں تک...... سر بازار حقیر ترین قیمت کے عوض بکنے سے لے کر رب کریم کی خوشنودی تک...... بس سفر کا نقطہ آغاز جاننے کی خواہش ہے۔ سارے دھاگے سوچ کے الجھے ہیں بس کوئی سرا تھما دیں۔"

صفحہ نمبر 249

زمین اسکول میں پڑھنے والی ایک غریب لڑکی ہے۔ اس کا باپ شکر قندی اور مونگ پھلی کی ریڑھی لگاتا ہے۔ بیوی کی بیماری کی وجہ سے وہ اپنی دکان منشی اکرم کے پاس گروی رکھتا ہے اور سود بھرتا ہے۔

زمین اور افشاں اسکول سے واپسی پر باتیں کرتی آتی ہیں، راستے میں مراد کا رکشہ کھڑا ہوتا ہے۔ وہ اس میں بیٹھ کہتی ہے، میں تو رکشہ چلاؤں گی۔ اسی وقت سامنے والے گھر کا دروازہ کھلتا ہے، مراد کے باہر نکلنے پر دونوں بھاگ جاتی ہیں۔ زمین اپنا بیگ بھول جاتی ہے۔

گھر پہنچ کر بیگ کا خیال آتا ہے۔ وہ ماں سے کہتی ہے کہ کتا پیچھے لگ گیا تھا، بیگ گر گیا راستے میں۔ فرخ کے ہمراہ ثمینہ اسے بیگ لینے بھیجتی ہے لیکن وہاں رکشہ نہیں ہوتا۔ فرخ کہتا ہے کہ وہ لا دے گا، رکشہ والا اس کا استاد ہے۔

مراد اس کا بیگ گھر دے جاتا ہے لیکن بیگ کھولنے پر اسے زمین کا نام پتا چل جاتا ہے۔ وہ زمین کے بہن بھائی کو پیسے دیتا ہے مونگ پھلی کھانے کے لیے۔

وہ فرخ کے گھر جاتی ہے۔ فرخ کے کمرے کے دروازے میں آٹومیٹک لاک لگا ہوا ہے، وہ بند ہو جاتا ہے۔ زمین ایک دم چیختی ہے۔ ثمرین جو بہن کو بلانے آتی ہے اس کی چیخ سن کر گھر سے باہر نکلتی ہے، جہاں خالد آرہی تھیں، وہ ان کو بتاتی ہے۔

راحت جبین

زندگی ہم تجھے گزاریں گے

منشی اکرم، انور حسین کے گھر آتا ہے جہاں زمین کو دیکھ کر اس کی نیت پھسل جاتی ہے۔ وہ اس کو پانچ سو روپے دے کر جاتا ہے اور انور حسین سے اس کا رشتہ مانگتا ہے۔ انور حسین انکار کر دیتا ہے۔
ہوٹل میں مراد کو انور حسین ملتا ہے، وہ اسے اپنے رکشہ پر گھر چھوڑ دیتا ہے۔

زمین افشاں اور ان کی امی کے ساتھ بازار جاتی ہے جوتا خریدنے، وہاں مراد اسے دیکھتا ہے وہ جس چیز کو دیکھتی ہے، ہاتھ میں لے کر وہ سب خرید کر اس کے گھر دے جاتا ہے۔
افشاں رکھ لیتی ہے لیکن زمین ڈر کے مارے ثمینہ کو سب بتا دیتی ہے۔
مراد کاکے سے کہتا ہے کہ وہ شادی کرنا چاہتا ہے۔ کاکا کہتا ہے کہ وہ اور منشی رشتہ لے جائیں گے۔
ملک صاحب کے بیٹی کی شادی میں پھاتا اور رشیداں کام کر رہی ہیں۔
ثریا کو تھر کتا دیکھ کر رشیداں کو غصہ آیا ہے۔
زمین پانچ سو کی ٹیوشن پڑھانے لگتی ہے۔ انور حسین ثمینہ کے منع کرنے کے باوجود اجازت دے دیتا ہے۔ وہ نمبردار کے گھر بھی ہو آتا ہے۔
ثریا ملک صاحب کے گھر سے کھانا چوری کر کے لے کر آتی ہے۔ وہاں اس کی ملاقات بشیر سے ہوتی ہے۔
رشیداں کو ملک صاحب کے گھر سے چاول ملتے ہیں۔ رفیق اسے گالیاں بکتا ہے۔
مراد کو بخار ہو جاتا ہے۔ کاکا اسے دیکھنے آتا ہے اور مشورہ دیتا ہے کہ اسے اب شادی کر لینی چاہیے۔ وہ انور حسین کی بیٹی زمین کا کہتا ہے۔ کاکا رشتے کے لیے منشی کو لے جانے کا بھی کہتا ہے۔ منشی ہامی بھر لیتا ہے۔
مراد اور کاکا، انور حسین کے گھر منشی کا انتظار کر کے چلے جاتے ہیں۔ منشی بھی وہاں پہنچ جاتا ہے۔ اسے پتا چلتا ہے کہ مراد کو بھی یہیں آنا تھا تو وہ انور حسین سے کہتا کہ تو نے یا تیری بیٹی نے مراد کو پھنسایا ہے۔
مراد منشی کو گھونسا مارتا ہے۔ اس کی ناک سے خون نکلتا ہے۔ کاکا زبردستی مراد کو لے جاتا ہے منشی بھی دھمکیاں دیتا چلا جاتا ہے۔
مراد فرخ کو بتاتا ہے کہ وہ زمین کے لیے رشتہ لے گیا تھا۔ اور منشی کا بھی بتاتا ہے۔ فرخ صدمے سے وہاں سے آجاتا ہے۔
ثریا بشیر سے ملنے باغ میں جاتی ہے وہ دوبارہ رشتہ لانے کی بات کرتا ہے۔
رشیداں ثریا کے لیے رشتہ دیکھتی ہے وہ لوگ آئے بیٹھے تھے کہ ثریا بشیر سے مل کر آتی ہے وہ انکار کر کے چلے جاتے ہیں۔ افشاں زمین کو زبردستی مراد کی گلی سے لے کر آتی ہے مراد کے ملنے پر اسے خوش خبری سناتی ہے کہ زمین کے ابا مراد کو ہاں کہنے والے ہیں۔
فرخ اپنی ماں سے زمین کی بات کرتا ہے وہ اسے ڈانٹ کر چپ کرا دیتی ہیں۔ وہ غصے میں زمین کے گھر جاتا ہے جہاں افشاں اسے زمین کی شادی کی خبر سناتی ہے۔
منشی انور حسین سے پورے پیسے دینے کا کہتا ہے۔ وہ پریشان گھر آتا ہے ثمینہ اسے کہتی ہے کہ فوراً مراد سے زمین کا نکاح کر دو، انور حسین منشی سے کچھ وقت مانگ لیتا ہے۔
رفیق رشیداں سے کہتا ہے کہ اسے اسپتال لے جائے۔ کیوں کہ اس کے زخم پک رہے تھے۔ زمین ٹیوشن پڑھانا چھوڑ دیتی ہے۔ مراد گھر پہنچتا ہے تو اس کا سامان باہر پڑا ہوتا ہے۔

پانچویں قسط

اس کا سامان بے یار و مددگار گلی میں پڑا تھا۔
ایک دن پہلے تک بھی مالک مکان نے نہیں بتایا تھا کہ وہ مکان بدر کیا جانے والا ہے۔
اس کے اندر طیش کی لہر اٹھی۔
وہ تیر کی طرح اندر لپکا۔ خالی کمرے میں دو مزدور دیواریں جھاڑ رہے تھے۔ فرش پر رنگ کی بالٹیاں رکھی

تھیں۔فرش پر پانی تھا۔اس نے پھسلتے پھسلتے دیوار کا سہارا لیا۔
"یہ کیا ہو رہا ہے......کون ہو تم لوگ؟"
"مزدور ہیں بھائی۔" ایک نے مڑ کر جواب دیا۔
"میرا سامان باہر کیوں نکالا ہے۔کس کے کہنے پر کیا ہے؟" غصے اور صدمے سے مراد کا برا حال تھا۔اب وہ ایک آدھ دن میں مکان کا بندوبست کہاں سے کرے گا۔
"مالکوں سے پوچھیں۔"
"مالکوں کی تو......" اس نے گالیاں دیتے دیتے لب بھینچ لیے۔مزدوروں کا کیا قصور تھا۔باہر آ کر اس نے بے بسی اور طیش سے اوندھے سیدھے پڑے سامان کو دیکھا۔دماغ ماؤف سا ہو گیا۔
"کیا بات ہے شہزادے! رنگ کیوں اڑا ہے؟" کاکے نے عقب سے اس کے کندھے پر ہاتھ مارا۔
"گردن توڑ دوں گا اس کم بخت کی۔" مراد نے دانت کچکچا کر بالٹی کو پیر مارا۔وہ لڑھک کر دور جا گری۔
"گردن کسی اور کی سہی،بالٹی تو اپنی ہے۔" کاکے نے بالٹی لا کر ٹھکانے پر کی۔
"کوئی ایک مہینہ بھی ایسا نہیں کہ میں نے کرایہ لیٹ دیا ہو۔تنگ کیا ہو یا گھر میں کوئی نقصان کیا ہو؟" گرے ٹراؤزر کی جیبوں میں انگوٹھے گھسائے مراد اضطراری انداز میں بولتا چلا گیا۔شکن آلود ماتھے پر بکھرے بال،ہلکی بڑھی شیو۔
"تھوڑا حلیہ تو درست کر لو،کیا حال بنا رکھا ہے۔"
مراد نے زچ ہو کر کاکے کو دیکھا۔
"میں آپ سے کیا کہہ رہا ہوں۔"
"کیا کہہ رہا ہے تو؟" کاکے نے مسکراہٹ دبائی۔
"میرے ساتھ چلیں۔" مراد نے فیصلہ کن انداز میں کہتے ہوئے بالوں میں انگلیاں چلائیں۔
"کہاں؟"
"مالک مکان سے بات کروں گا۔وہ اس طرح مجھے گھر سے نہیں نکال سکتا۔بغیر نوٹس دیے،میری شادی ہے۔اتنی جلدی مکان کہاں سے ڈھونڈوں،نرمین کو کہاں لاؤں گا...... یہاں سڑک پر۔"
"اس کو نہ لانا......تم چلے جانا،گھر داماد بن جانا۔" کاکا نہ جانے کس بات کا مزا لے رہا تھا۔
"کاکا......" مراد نے احتجاج بھرے غصے سے اس کو دیکھا۔"میرے ساتھ چل رہے ہو یا نہیں۔"
"نہیں......" کاکے نے ایک کرسی سیدھی کی اور تسلی سے بیٹھ گیا۔
"اور تو بھی جا......اپنا حلیہ درست کر۔کوئی پارلر شالر چلا جا،شکل و صورت تو اچھی ہے تھوڑا اور نکھر جائے گا۔"
مراد کو کاکے کا مشورہ ایک آنکھ نہ بھایا۔لب بھینچ کر مڑا۔
وہ مالک مکان سے اکیلے ہی نمٹ سکتا تھا۔
تب ہی ایک مزدور باہر آیا۔ایک نظر مراد کو دیکھ کر کاکے کی طرف مڑا۔
"پائین (بھائی جان) نیل لانا ہے۔"
"لے آ......اور جلدی ہاتھ چلا۔تیرے پاس بس آج کا ہی وقت ہے۔" کاکے نے جیب سے پیسے نکال کر دیے۔
"فکر نہ کریں،زیادہ کام نہیں ہے۔شام تک ایک دم فٹ کر کے فارغ کر دیں گے۔" مراد نے بے حد

حیرت سے کاکے کو دیکھا۔

"یہ کیا؟"

"اتنی گندی دیواروں والے گھر میں دلہن کو لائے گا۔ میں نے سوچا تھا، تیری شادی کی تصویر فریم کروا کے لگواؤں گا۔ سمجھو، اسی کے لیے دیواریں تیار کروا رہا ہوں۔" اس نے مزے سے بتایا۔

"حد ہے یار!" مراد شرمندہ سا ہو گیا۔ "اب میں کہاں جاؤں؟"

"اپنی سسرال۔"

مراد نے بھنویں اچکائیں۔

"کیا ہرج ہے، اسی بہانے دو تین گھنٹے وہاں گزار لے۔"

"اچھا لگے گا۔" مراد کے لہجے میں رضامندی بھرا تذبذب تھا۔ جیسے کہتا ہو، کاکا اسے اصرار کر کے بھیج دے اور کاکے نے تذبذب اپنی جیب میں بھر کے، اصرار اس کی ہتھیلی پر دھر دیا تھا۔

☆☆☆

نرمین نے چائے کی پتی والے پانی میں مہندی بھگوئی تھی۔ سنا تھا اس سے بالوں کا کلر بہت اچھا ہو جاتا ہے۔ افشاں نے بہت زور لگایا تھا کہ کالونی کے پارلر سے بھنویں بنوا لو مگر ماں نے اجازت نہیں دی۔

"اس سے منہ پر پکا پن آ جاتا ہے۔ ابھی تمہاری عمر ہی کیا ہے۔"

لیموں کے دو ٹکڑے کر کے اس نے مہندی میں نچوڑنے کے لیے ایک ٹکڑا اٹھایا ہی تھا کہ طلحہ اور حذیفہ آگے پیچھے دوڑتے ہوئے آئے۔

"ہا...... نمبو......" لیموں کی کھٹاس طلحہ کے منہ میں گھس کر چٹخارہ بن گئی۔

"آپا! نمبو پانی بنا دو۔"

نرمین نے پریشان ہو کر اکلوتے نمبو کو دیکھا۔

"ا...... ابھی کون سا نمبو پانی کا موسم آیا ہے۔"

"نمبو تو آیا ہے نا۔" حذیفہ نے ناک چڑھا کر جرح کی۔

"اچھا......" نرمین کو ہنسی آ گئی تو دو اسٹیل کے گلاس اٹھا کر پانی بھرا۔ آدھا آدھا نمبو نچوڑ کر چینی نمک ملایا۔ دونوں نے ایک ایک چمچہ ساتھ لیا اور بھاگ گئے۔ اب انہوں نے گھٹنوں دیوار کے ساتھ لگ کر بیٹھ جانا تھا۔ چمچہ گھما کر ایک گھونٹ بھرنا۔ پھر چمچہ ہلانا تھا اور نجانے یہ سلسلہ کب تک چلنا تھا۔

دستک زور سے ہوئی۔

اپنے کھیل میں مگن بچوں نے تو اٹھنا نہیں تھا۔ ثمرین اور فضہ افشاں کے گھر گئی تھیں۔ سو اسی کو جا کر دروازہ کھولنا پڑا۔

"کیا ہوا؟ آج کچھ لے کر نہیں آئے؟" فرخ کو خالی ہاتھ دیکھ کر نرمین نے مسکرا کر پوچھا۔

"آج......" فرخ نے تذبذب کے ساتھ دہلیز سے اندر قدم رکھے۔

"بارہ کیوں بج رہے ہیں شکل پر، لگتا ہے خالہ سے دھلائی ہوئی......"

"چاچی گھر پر ہیں۔" فرخ نے دیوار کے ساتھ لگ کر بیٹھے بچوں کو دیکھا۔ جواب ایک دوسرے کو اپنا شربت چکھا رہے تھے۔

"وہ تو بازار گئی ہے۔"

فرخ نے اچانک مڑ کر بیرونی دروازہ بند کر دیا۔

''کیا ہوا، تمہارے پیچھے پولیس لگی ہے۔''
فرخ نے اچانک اس کا ہاتھ پکڑا اور صحن کے دوسرے کونے میں لے گیا۔
زمین کو لگا کمرے میں آٹومیٹک لاک لگا ہے۔ اس نے سرعت سے اپنا ہاتھ چھڑایا۔
''کیا کر رہے ہو؟''
''تم مراد سے شادی مت کرو۔''
''کیوں......؟'' زمین نے تحیر بھری آنکھوں سے فرخ کو دیکھا جو بوکھلایا اور پریشان دکھائی دیتا تھا۔
''تمہیں جلدی کیا ہے، پہلے پڑھ لو۔ اچھی سی ڈگری لو، جاب کرنا، اپنے گھر کے حالات بدلنا...... یہی تو تمہارا خواب تھا۔''
''خوابوں کا کیا ہے، پورے ہوئے نہ ہوئے۔ امی ابو کا بوجھ کم ہو رہا ہے۔'' زمین نے نظریں چرائیں۔
''تمہارا دماغ خراب ہے۔'' وہ زور سے چلایا۔
بچے شربت چھوڑ کر انہیں دیکھنے لگے۔
''دیکھو، میری بات سنو۔ وہ مراد تمہیں کیا دے سکتا ہے۔ کچھ بھی نہیں۔ ایک ریڑھی والے کے گھر سے اٹھ کر ایک رکشے والے کی بیوی بنو گی، بس یہی ہے تمہاری زندگی۔''
''اپنا منہ بند رکھو۔'' زمین کو غصہ آ گیا۔
''زمین! ابھی مجھے پڑھنا ہے۔ جاب کرنی ہے۔ اس سب میں تھوڑا وقت لگے گا۔ تب تک تم بھی پڑھائی مکمل کر لو۔ پھر ہم دونوں شادی کر لیں گے لیکن ابھی نہیں یار! ابھی ہماری عمریں ہی کیا ہیں۔''
زمین ہکا بکا رہ گئی۔ ایک لمحے کو تو ہاتھ پاؤں ہی پھول گئے۔
''فرخ! تم پاگل تو نہیں ہو گئے۔ نکلو...... ابھی یہاں سے نکلو...... مجھے تم سے کوئی بات نہیں کرنی۔''
''میری بات تو سنو، سمجھنے کی کوشش کرو۔ میں تمہیں پسند کرتا ہوں۔'' وہ رونے والا ہو گیا۔ ''ہم دونوں پڑھیں گے، جاب کریں گے اور پھر شادی کر لیں گے ہم۔''
زمین نے اسے دھکے دے کر گھر سے نکالا اور کھٹاک سے دروازہ بند کر کے کنڈی چڑھا دی۔
جب مڑی تو حذیفہ اور طلحہ منہ کھولے اسے دیکھ رہے تھے۔
زمین سنبھل کر آگے بڑھی۔
''نموآپا! فرخ بھائی کیا کہہ رہے تھے؟''
''کچھ نہیں......'' زمین نے پلو سے ماتھے کا پسینہ صاف کیا۔
''آپ دونوں کی لڑائی کیوں ہوئی؟''
''بس ویسے ہی ہو گئی۔ تم امی سے کچھ نہ کہنا، نہیں کہو گے نا؟''
دونوں نے ایک ساتھ نفی میں گردنیں ہلائیں۔
تب ہی دستک دوبارہ ہوئی۔
زمین غصے سے سلگ گئی۔ تیر کی طرح جا کر دروازہ کھولا۔
''اب کیا تکلیف ہے؟''
''تکلیف تو بس اتنی ہے کہ جمعہ جلدی نہیں آ رہا۔''
''آپ......'' مراد کے آنے کی ایک فیصد بھی امید نہیں تھی۔
''ا......ابو گھر پر نہیں ہیں۔''

"تمہارے ابو سے ملنے کون آیا ہے؟" مراد نے چڑ کر کہا۔
"میں تو سارا راستہ یہی دعا کرتا آیا تھا کہ کاش چاچا ریڑھی لے کر گئے ہوں اور چاچی بازار...... اور دروازہ تم کھولو۔" گوہر مقصود کو سامنے دیکھ کر وہ شوخ ہوا۔
نرمین کی نگاہ جھک گئی۔
"ابو ریڑھی لے کر گئے ہیں اور امی بازار......"
مراد کھل کر ہنسا۔
"اندر آنے کو نہیں کہو گی؟"
"نہیں...... نہیں......" نرمین نے گھبرا کر نگاہ اٹھائی۔ "آپ اندر نہیں آسکتے۔"
"دل کے اندر تو آنے دو۔" مراد نے ذرا سا جھک کر سرگوشی کی۔
نرمین نے نچلا لب دانتوں تلے دبا لیا۔
"آ...... ہا...... مونگ پھلی والے بھائی جان آئے۔" دونوں بچے بھاگتے ہوئے پاس آئے۔
"کیا حال ہے، بچو! تمہاری آپا تو ہمیں اندر ہی نہیں آنے دے رہیں۔"
"آپ کیوں آئے ہیں؟"
"تمہیں لینے۔" ترنت جواب آیا۔ تب ہی اس کے عقب میں رکشہ رکا اور ثمینہ رکشے سے اتری۔ ساتھ میں افشاں کی امی بھی تھیں۔ ہونے والے داماد کو دروازے پر دیکھ کر ثمینہ ٹپٹا گئی۔
"سب خیر تو ہے بیٹا۔"
"جی، بس آپ سے کچھ بات کرنی تھی، اس لیے آ گیا۔"
"بچوں! بھائی جان کو بیٹھک میں بٹھاؤ، باہر کیوں کھڑا کیا ہے۔"
مراد نے مڑ کر دیکھا۔ نرمین چھلاوے کی طرح غائب ہو چکی تھی۔
"بیٹھک میں کیوں، میں کوئی مہمان ہوں۔" مراد ان کے ساتھ ہی اندر آ گیا۔ ہاتھ میں پکڑے شاپر صحن والی چارپائی پر رکھے، پھر رکشے سے باقی سامان اتار لایا۔ نرمین کے ماموں نے کچھ رقم بھجوائی تھی۔ اسی سے ثمینہ نے کچھ برتن اور کپڑے خریدے تھے۔ افشاں کی امی مراد کے سبھاؤ اور اخلاق کی تعریفیں کرتی اپنے گھر سدھاریں۔
"نمو...... نمو......" ثمینہ جلدی سے اندر آئیں۔ وہ پلنگ کے کنارے بیٹھی انگلیاں چٹخا رہی تھی۔
"جلدی سے چائے بناؤ، میں جلیبیاں لائی تھی۔ ہائے، ہاتھ میں بس واپسی کا کرایہ بچا تھا ورنہ ساتھ سموسے ہی منگوا لیتی۔"
"بھائی جان! یہ کیا ہے؟" بچوں کی ساری دلچسپی مراد کے لائے شاپرز میں تھی۔
"پیزا لایا ہوں۔"
"پچا......" طلحہ نے حذیفہ کو دیکھا۔
"وہ کیا ہوتا ہے؟"
"کبھی پیزا نہیں کھایا؟" مراد نے بے حد حیرت سے بچوں کے معصوم چہرے دیکھے۔
"پیزا گوشت اور سبزی والی روٹی کو کہتے ہیں۔" مراد نے آسان لفظوں میں سمجھایا۔
"ابھی امی دیں گی اور کھا کر دیکھنا، بہت مزے کا ہوتا ہے۔"
"اتنے پیسے لگا دیے، اتنے میں تو چار کلو گوشت آ جائے۔" چائے بناتی ثمینہ پیزا کی قیمت سن کر تاسف

سے ہاتھ ملنے لگی۔ جلیبیاں نکالتی زرمین مسکرادی۔
"یہ تو ہمارے لیے ہے نا، لوگ تو دبا کر کھاتے ہیں۔ جہاں میں ٹیوشن پڑھاتی تھی، وہ بچے تو لنچ باکس میں بھی یہی لے کر جاتے ہیں۔"
"امیروں کے چونچلے...... اس سے تو مزے دار سموسے ہوتے ہیں۔" ذرا سا ٹکڑا منہ میں ڈالتے ہی ثمینہ نے منہ بنایا۔ "قیمے والا نان بھی اس سے کرارا ہوتا ہے۔"
زرمین ہنسنے لگی۔ اس کی ہنسی میں بلا کی کھنک تھی۔
ہر اندیشے سے پاک بے ریا، خوشی سے لبریز ہنسی۔
"دل کا کھلا ہے، عیش کروائے گا تمہیں۔"
سب سے قیمتی کپ پرچ نکالتی زرمین نے چپکے سے صحن میں بیٹھے مراد کو دیکھا۔ جو صحن کی کیاری اور گملوں میں کھلے پیلے پھولوں کو دیکھ رہا تھا۔ گملے کیا؟ خالی ٹین کے ڈبے اور رنگ کی بالٹیاں تھیں۔ جنہیں رنگ کر کے بیج ڈال دیے گئے تھے۔
زرمین شرمندہ سی ہوگئی۔
مراد کیا سوچتا ہوگا؟
"لے بھی آؤ۔" ثمینہ کی آواز پر وہ جلدی سے مڑی۔
"امی! ابو بھی تو کھلے دل کے تھے۔"
ثمینہ چپ کی چپ رہ گئی۔ بیٹی نے بتا دیا تھا۔ عیش صرف دل کے کھلے ہونے سے نہیں، پیسے سے نصیب ہوتے ہیں۔ ثمینہ ٹرے اٹھا کر باہر چلی گئی۔ مراد نے جلدی سے اٹھ کر ٹرے ان کے ہاتھ سے پکڑ لی۔
"بیٹا! تم بیٹھک میں بیٹھ جاتے۔"
"یہاں اچھا لگ رہا ہے خالہ! گھر میں قلعی ہو رہی تھی تو میں نے سوچا......" مراد نے جلیبی کا کنارہ توڑ کر منہ میں رکھا اور مناسب الفاظ ترتیب دیے۔
"آپی! بھائی جان سبزی والی روٹی لائے ہیں۔" ثمرین اور فضہ بھاگتی ہوئی آئیں۔ زرمین کی سمجھ میں آیا، اچانک طلحہ اور حذیفہ کہاں غائب ہوگئے تھے۔
"ششش...... چپ کر کے بیٹھو۔"
تینوں لائن بنا کر باورچی خانے میں بیٹھ گئے۔
"وہ تو ٹھیک ہے، مگر......" ثمینہ تذبذب میں تھی۔ انور حسین گھر پر نہیں تھا اور مراد کی خواہش تھی وہ زرمین کو اس کی پسند سے شادی کا جوڑا اور باقی چیزیں لے دے۔ بچوں نے پیزا کھانا شروع کیا تو زرمین دروازے کے ساتھ آ لگی۔
"اس کے ابو گھر میں نہیں ہیں تو میں ان سے پوچھے بغیر کیسے......؟"
ثمینہ نے شرمندگی سے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔
"کوئی بات نہیں۔" مراد بجھ سا گیا۔ ہلکی سی نگاہ دروازے سے جھانکتے گلابی دوپٹے پر ڈالی۔
اسی لمحے افشاں سیڑھیوں سے تقریباً لڑھکتی ہوئی عین چارپائی کے پاس آرکی۔
"سلام دولہا بھائی۔"
ثمینہ نے گھور کر دیکھا تو منہ میں بدبدائی۔
"ہونے والے......"

"میں ٹھیک ہوں، تم کیسی ہو؟" مراد نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔
تازہ تازہ منہ دھو کر کریم لگائی تھی۔ اس نے جلدی سے منہ پر کپڑا پھیرا۔ کہیں لگی نہ رہ گئی ہو۔
"میں چلتا ہوں۔" ثمینہ کا جواب سنتے ہی وہ کھڑا ہو گیا۔
"رکو مراد!" ثمینہ نے بے اختیار اسے روک لیا۔

☆☆☆

نہر کے دونوں اطراف انتارش تھا مگر اسے لگتا تھا پوری دنیا خالی ہے۔ وہ اکیلا ہے جو نہر کا پل عبور کر رہا ہے۔ پھر وہ دائیں طرف مڑ گیا۔ تازہ گلابوں اور موتیے کی خوشبو نے اس کا ہاتھ پکڑنا چاہا مگر وہ گلاب کے گلدستوں اور پتیوں سے بھری چھابڑیوں سے بے نیاز جوس کارنر بھی عبور کر گیا۔
نہر کے گدلے پانی پر خشک پتے تیر رہے تھے اور کناروں پر جوس کے خالی ڈبے اور پھلوں کے چھلکے پڑے تھے۔
وہ خاموشی سے کنارے پر کھڑا پانی کو گھورتا رہا۔
اس کی اپنی آنکھیں لبالب بھری تھیں کہ نہر کا گدلا پن چھپ گیا تھا۔
وہ رونا چاہتا اور دل کھول کر رویا بھی۔
اس کا مان، اس کی ذات کا غرور سب ملیا میٹ ہو گیا تھا۔
وہ ٹھکرایا گیا تھا۔
دھکے دے کر گھر سے نکالا گیا تھا۔
اس کی ذات کو چند لمحوں میں دو کوڑی کا کر دیا، اس ریڑھی بان کی بیٹی نے۔ اس نے نفرت سے نہر کے پانی پر تھوک دیا۔ دونوں ہاتھوں سے چہرہ صاف کر کے سامنے دیکھا۔ چھوٹی سی نہر کے دوسری طرف ایک گاڑی گزر رہی تھی۔
بس چند لمحوں کی بات تھی۔
اس کی گاڑی نے نہر کا پل عبور کر کے گزر جانا ہے۔
یہ گاڑی یہاں سے نہیں گزرے گی۔
اس نے فیصلہ کر لیا تھا۔

☆☆☆

"نہیں مراد بھائی! مجھے یہ بتائیں، آپ کو نرمین میں نظر کیا آیا؟" افشاں مراد کو اکیلے دیکھ کر خواہ مخواہ شوخی ہو رہی تھی۔ "عام سی تو صورت ہے۔"
نرمین نے دروازے کی اوٹ سے اشارے کنایے سب کر کے دیکھ لیے۔ وہ جان بوجھ کر نظر انداز کیے پٹر پٹر بول رہی تھی۔ مراد نے دونوں ہاتھ عقب میں چارپائی پر پھیلائے اور مسکراہٹ دبا کر کچن کے دروازے کو دیکھا۔
"کوئی اسے میری نظر سے دیکھے تو سہی۔"
"ہائے......" افشاں نے دل پر ہاتھ رکھ لیا۔
"پہلی نظر میں محبت ہو گئی تھی۔"
"ہوں۔ پہلی نظر ہی آخری ثابت ہوئی۔ پکی چور ہے تمہاری دوست۔ ایک ہی نظر میں سب کچھ لوٹ کر لے گئی۔"
"میری آپا چور نہیں ہیں۔" ثمرین لپک کر باہر آئی۔

افشاں کھلکھلا کر ہنسی۔ مراد نے ہنستے ہوئے ثمرین کا بازو پکڑ کر پاس بٹھالیا۔
"تم کہاں سمجھو گی ننھی پری! چور کہاں قاتل ہے۔ تمہاری بہن قاتل...... تمہارے مراد بھائی کو مار ڈالا اس نے۔"
"دیکھیں، آپ بچوں کے سامنے فالتو کی باتیں مت کریں۔" زرمین سے رہا نہیں گیا۔
"آپا سے کہو، یہ بات سامنے آ کر کہیں۔" وہ مائل بہ شرارت تھا۔
ثمرین نے من و عن پیغام آگے نشر کر دیا۔
"نہیں جی، ہماری لڑکی مایوں بیٹھی ہے۔ آپ سے پردہ کرتی ہے۔" جس دروازے کی اوٹ میں زرمین کھڑی تھی، افشاں اسی سے ٹیک لگا کر کھڑی ہو گئی۔
"مطلب شاپنگ کرنے نہیں جائے گی۔" مراد کھڑا ہوا۔
"حجاب کر کے چلی جائے گی۔" افشاں نے فوراً حل نکال دیا۔
مطلب شاپنگ سے دست برداری گوارا نہ تھی۔
اور افشاں کی امی تو ہمیشہ سے شاپنگ کی دل دادہ تھیں۔ فوراً ہی دوبارہ بازار جانے کو آمادہ ہو گئیں۔
"دھیان رکھنا۔ زیادہ مہنگے کپڑوں پر ہاتھ نہ رکھنا۔ جو لے کر دے، بس ہنسی خوشی رکھ لینا۔" ثمینہ نے چپکے چپکے زرمین کو سمجھایا۔
"امی! آپ بھی ساتھ چلیں۔" زرمین گھبرا رہی تھی۔
"بچوں کو کس کے پاس چھوڑ کر جاؤں گی۔ پہلے تو تم گھر پر تھیں۔" وہ زرمین کو سمجھا بجھا کر باہر لے آئی۔
"چلیں۔" مراد نے ہلکی سی نگاہ سیاہ چادر میں لپٹے چاند چہرے پر ڈالی۔
"افشاں! دیکھو۔ تمہاری امی کو کتنی دیر ہے۔"
وہ دروازے کی طرف بھاگی۔ دروازہ کھولا اور اسی تیزی سے بند کر دیا۔ مڑی تو چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔
"کیا ہوا؟" ثمینہ نے حیرت سے اسے دیکھا۔ افشاں نے کنڈی لگائی اور بھاگ کر ثمینہ کے پاس آئی۔
"باہر...... وہ...... وہ آیا ہے۔"
"کون؟" مراد نے تحیر سے اس کی بوکھلاہٹ کو دیکھا۔
"م...... منشی...... منحوس منشی......"
مراد کی کنپٹیوں میں خون جوش مارنے لگا۔
مٹھی بھینچ کر وہ دروازے کی طرف بڑھنے کو تھا کہ زرمین بے ساختہ اور بے اختیار اس کے سامنے آ گئی۔
"آپ مت جائیں۔"
"مجھے اس سے بات کرنے دو۔ اس کی جرأت کیسے ہوئی، دوبارہ اس دروازے پر آنے کی۔ لگتا ہے اس کی ناک ٹھیک ہو گئی۔"
"نہیں، آپ جاؤ گے تو لڑائی ہو جائے گی۔ ابو بھی گھر پر نہیں ہیں...... امی......" زرمین نے گھبرا کر مدد کے لیے ماں کو دیکھا۔
وہ اس سے کہیں زیادہ گھبرائی ہوئی تھی۔
تب ہی دروازے پر زور سے دستک ہوئی۔
"اچھا۔ صرف بات کروں گا، جھگڑا نہیں کروں گا۔" مراد نے تسلی دی۔
"ابو کہتے ہیں، آپ کو غصہ بہت جلدی آ جاتا ہے۔" مراد کو اس کی معصومیت بھری پریشانی پر پیار آ گیا۔
"میں...... میں کچھ کرتی ہوں۔" ثمینہ کو اچانک احساس ہوا، وہ اس گھر کی بڑی ہے۔ سچویشن اس ہی کو

سنبھالنی ہوگی۔تب ہی دروازے کے عقب سے پوچھا۔
''کون ہے؟''
''انور حسین کہاں ہے؟''منشی کی آواز میں بلا کی رعونت تھی۔
مراد نے لب بھینچ لیے۔
''وہ......تو گھر پر نہیں ہیں۔''
''بیٹھک کھولو بی بی! میں اس کا انتظار کرلوں گا۔ ہونہہ......کیا وقت آ گیا ہے کہ ان ایرے غیروں کا انتظار کرنا پڑے گا۔''
ثمینہ نے بوکھلا کر مراد کو دیکھا۔
مراد نے نفی میں گردن ہلائی۔
''گھر میں کوئی نہیں ہے بھائی صاحب! وہ آئیں گے تو میں بھیج دوں گی۔''
''اس سے کہنا آ جائے، مجھے دوبارہ نہ آنا پڑے۔ دوبارہ آنا پڑا تو اچھا نہیں ہوگا۔''
''جی جی......میں کہہ دوں گی۔''ثمینہ نے تھوک نگلا۔
تھوڑی دیر کے بعد گاڑی اسٹارٹ ہونے کی آواز آئی۔
زرمین کا سانس بحال ہوا تو احساس ہوا وہ مراد کے عین سامنے کھڑی ہے تو پلٹ کر افشاں کے پاس آ کھڑی ہوئی۔ افشاں نے مسکرا کر اسے کہنی ماری۔
''آج تیری خاطر اس منشی کی جان لے لیتا۔''
''اس خبیث سے قرض لینے کی چاچا کو ضرورت کیا تھی۔''مراد نے دانت کچکچائے۔
''حالات مجبور کر دیتے ہیں۔''ثمینہ نے آہ بھری۔
منشی نے گلی کا موڑ مڑنے سے پہلے بیک مرر میں دیکھا اور پیر بریک پر آ گیا۔
طیش سے اس کی پتلی مونچھیں پھڑپھڑانے لگیں۔
نجانے کیوں......زرمین کے گھر سے دو گھر پیچھے پیپل کے درخت کے نیچے کھڑا رکشا اسے پہلے کیوں نظر نہ آیا تھا۔
☆☆☆
تینوں آگے پیچھے دکان میں داخل ہوئے۔ مراد کی غلطی تھی جو زرمین کے برابر بیٹھنے کی جسارت کر رہا تھا۔ افشاں کی اماں نے زور سے دھکا مار کر اسے تیسری کرسی پر منتقل کیا اور خود لڑکیوں کو پروں میں سمیٹ کر بیٹھ گئیں۔
مراد شرمندہ سا ایک طرف ہو کر بیٹھ گیا۔
''کس رینج میں چاہیے؟''دکان دار نے پوچھا۔
''جوان کو پسند آ جائے۔''مراد نے آنکھ سے زرمین کی طرف اشارہ کیا۔
''زیادہ مہنگا نہ ہو۔''وہ بڑبڑائی۔ ماں نے خوب سکھا کر بھیجا تھا۔ دکان دار نے گاہکوں کا تذبذب دیکھا تو خود ہی مناسب قیمت میں نکال کر دکھانے لگا۔ افشاں کی اماں کے اعتراضات ٹیپ کی طرح بجنے لگے۔
''ہائے ہائے۔ یہ کیسے پھیکے رنگ ہیں، کوئی شوخ رنگ دکھاؤ۔''
''لو، اس پر تو موتیوں کا کام ہے۔ استری کیسے کریں گے۔''
''ایسا نکما کام......سارے دھاگے ایک دوسرے میں پھنس رہے ہیں۔''
مراد کہنا چاہتا تھا کہ خالہ آپ کی نہیں، زرمین کی پسند کا جوڑا لینا ہے کہ نظروں کی گرفت میں آتشی گلابی جوڑا آ گیا۔
مراد نے مٹھی بھینچ لی۔

اس آتشی رنگ نے اس کے اندر آتش بھڑ کادی۔
اور وہی جوڑا افشاں کی اماں کو پسند آ گیا تھا۔
"ہرگز نہیں......" مراد کے منہ سے اتنی سختی سے نکلا کہ زرمین نے ہاتھ میں پکڑا دوپٹا چھوڑ دیا۔

☆☆☆

دھوپ سارے صحن میں پھیل گئی تھی۔ دیوار کے ساتھ لگے نیم کے چھتنار درخت کے سائے میں وہ بوری بچھا کر اپنی کتابیں لے کر بیٹھ گئی۔ جب اسے کچھ بھی کرنے کو نہ ملتا۔ وہ دوبارہ میٹرک کی کتابوں کو رٹا لگانے لگتی تھی۔ نیم کی ٹہنیوں پر جھولتے کوے خواہ مخواہ شور مچا رہے تھے۔ اقصیٰ سر اٹھا کر انہیں دیکھنے لگی۔ تب ہی رشیداں اندر سے بھاری صندوق کھینچ کر دھوپ میں لے آئی اور ڈھکن کھول دیا اور اندر سے کپڑے نکال کر چارپائی پر رکھنے لگی۔ اقصیٰ کا دل نہیں چاہا، وہ اٹھ کر ماں کی مدد کروا دے۔
"یہ کباڑ اب کسی کو دے بھی دو، کب تک دھوپ لگواتی رہو گی یا تیسرا کرنے کا ارادہ ہے۔" کیسی کڑوی کسیلی زبان تھی ثریا کی۔
"پر فکر نہ کرو، ابا اتنی جلدی نہیں مرے گا۔"
"تیرے جہیز میں دوں گی۔" رشیداں نے کلیجی رنگ کے جوڑے کو کلیجے سے لگایا جس پر سنہری موتی کالے ہونے لگے تھے اور چارپائی پر رکھ دیا۔
"میں کیوں لینے لگی، یہ سڑے بسے کپڑے۔ تمہارے پہلے شوہر کی نشانیاں۔ ابا کے لائے کپڑے تو کبھی اس طرح سنبھال کر نہ رکھے۔"
رشیداں تڑپی مگر سوال اقصیٰ نے کیا تھا۔
"ابا نے کبھی اماں کو کپڑے دلائے ہیں؟"
"چپ میننڈ کی۔ منہ بند کر۔" ثریا نے اتنی بری طرح ڈانٹا، کہ رشیداں نے سر اٹھا کر ثریا کو دیکھا تو نگاہوں کی گرفت میں دہکتے انگاروں جیسے لب آ گئے۔
"ثریا اتنی گوڑھی سرخی کیوں لگائی ہے؟"
"دل کر رہا تھا۔" ثریا نے ہاتھ میں پکڑی کالی سوئی دانتوں سے کھول کر بالوں میں اڑسی۔
"شادی ہو جاتی تو رج رج کر لگاتی۔" رشیداں تاسف سے بڑبڑائی۔
"شادی نہ ہو تو میں کیا سرخی لگانے کو بھی ترس جاؤں۔" اس نے ریشمی دوپٹا جھٹک کر اوڑھا۔
رشیداں نے صندوق میں سے کالے کپڑے میں لپٹا سوٹ نکالا۔
اور چارپائی پر رکھ دیا۔ اس میں ہمت نہ تھی کہ اس کالے کپڑے کی تہیں کھولے مگر یادیں بڑی ظالم ہوتی ہیں۔ ایک ایک تہ کھول دیتی ہیں۔
"اماں! یہ کیا ہے؟" وہ چارپائی کے ساتھ نیچے گھٹنوں کے بل بیٹھ کر اشتیاق سے پوچھ رہا تھا۔
"میرا جوڑا ہے۔" رشیداں نے بڑے پیار سے کالے کپڑے کی تہ کھول کر گلابی جوڑا نکالا۔ جس کا سنہری گوٹا ابھی بھی ماند نہیں پڑا تھا۔ بالکل علی بخش کی محبت کی طرح، جو اس کے دل میں اب بھی جگمگا رہی تھی۔
"پر تم نے کبھی پہنا تو نہیں۔"
"پہنا تھا اپنی شادی پر۔"
"نہیں پہنا تھا۔ تم نے اس دن کالا جوڑا پہنا تھا جس پر سفید پھول بنے تھے۔" ننھے ذہن میں ماں کے رفیق کے ساتھ نکاح کا دن تھا۔

"پگلے! اس دن شادی تھوڑی ہوئی تھی۔ اس دن تو جنازہ اٹھا تھا۔"
اسے ماں کی بات سمجھ میں نہیں آئی تھی مگر آنکھوں میں اترا پانی ڈسٹرب کر گیا تھا۔ تب ہی بات بدل دی۔
"اب کب پہنو گی؟"
"اب میں نہیں پہنوں گی، اب تمہاری دلہن پہنے گی۔"
"میری دلہن؟"
"ہاں، اب یہ جوڑا تمہاری دلہن کو دوں گی۔" وہ مسکائی۔
"اسے نیا جوڑا لے کر نہیں دو گی؟" اس نے معصومیت آمیز پریشانی سے بے ساختہ پوچھا تو رشیداں نے بے اختیار اپنے ذہین آنکھوں اور کمزور چہرے والے بیٹے کو گلے لگالیا۔
کسی نے بہت تیز کنڈی کھڑکھڑائی۔
رشیداں نے آنکھیں کھولیں۔ وہ کب سے جوڑے کو سینے سے لگائے زار زار رو رہی تھی۔ پتا بھی نہیں چلا۔
ثریا نے بھاگ کر کنڈی کھولی۔
"اوئے ہوئے، تو تو ابھی سے دلہن بن کر بیٹھ گئی۔"
بشیر نے اس کے گال پر چٹکی کاٹنا چاہی تو ثریا نے اس کے ہاتھ پر ہاتھ مارا اور آنکھ سے عقب میں اشارہ کیا۔ اقصیٰ مگر انہیں دیکھتی رہی۔
"بشیر! تو یہاں کیا کر رہا ہے؟" رشیداں بوکھلائی۔
"چاچے سے ملنے آیا ہوں، اندر ہیں۔"
"ہاں ہاں، اندر ہی ہیں۔" ثریا رشیداں سے پہلے بول اٹھی۔ "چلا جا۔ یہاں تو جب تک چالیسویں کا ختم نہ دلوالیا، اس نے یہاں سے اٹھنا نہیں۔" دونوں اندر چلے گئے۔
ہکا بکا رشیداں نے صندوق کا ڈھکن گرایا اور اقصیٰ کو دیکھا۔
"چائے کی پیالی بنا دے، رک گیا تو وہ پی لے گا۔ نہیں تو اپنے ابے کو دے دینا۔"
اقصیٰ اٹھی۔ چولہے میں راکھ کرید کر چنگاری سلگائی۔ دو اپلے رکھ کر اوپر دیگچی چڑھا دی مگر دیگچی اترنے سے پہلے ہی رفیق کے چیخنے چلانے کی آوازیں آنے لگیں۔
"دفع ہو جا، نکل یہاں سے...... میں مرتا مر جاؤں گا۔ پر اپنی بیٹی تیرے ساتھ نہیں رخصت کروں گا۔"
"تو پھر ایک ہی بار مجھے گلا گھونٹ کر مار دے۔" ثریا چلائی۔
دیگچی میں ابال آنے لگا تھا۔
"ہماری برادری ان کی برادری میں رشتے نہیں کرتی۔ تیری سمجھ میں کیوں نہیں آتا۔"
"سیدھے سیدھے میرا نکاح اس کے ساتھ کر دے، نہیں تو۔" بشیر نے دھمکی آمیز لہجے کے ساتھ بات ادھوری چھوڑ دی۔
"نہیں تو کیا...... میں تیری ٹانگیں توڑ دوں گا۔" رفیق چارپائی سے اچھل اچھل گیا تو زخمی ٹانگ دہائیاں دینے لگی۔
"پہلے اپنی ٹانگ سنبھال...... پھر میری توڑنا۔"
رشیداں اضطراری انداز میں اٹھی۔ پڑچھتی سے دو پیالیاں لا کر اقصیٰ کے پاس رکھیں۔
"اماں! اب کیا ہوگا؟"
"چائے نکال...... دونوں ماں دھی پیتے ہیں۔ یہ ان کے جھگڑے ہیں، خود ہی نبیڑیں۔" رشیداں لکڑی کی پیڑھی کھینچ کر خود بھی بیٹھ گئی۔
اندر سے غصے میں تن فن کرتا بشیر نکلا۔

ثریا نے بیرونی دروازے کے پاس جا کر اس کا بازو پکڑ کر روکا۔
"میری بات تو سن۔"
"میں نے ساری باتیں سن لیں، اب فیصلہ تیرے ہاتھ میں ہے۔ جو بھی ہو، بتا دینا۔" وہ کہہ کر لمبے لمبے ڈگ بھرتا چلا گیا۔ ثریا نے مڑ کر کینہ توز نظروں سے چولہے کے پاس بیٹھی ماں بیٹی کو دیکھا اور تیر کی طرح چھوٹ کر آئی۔
"یہ سب تیری وجہ سے ہوا ہے، تو سکھاتی ہے نا اِبے کو۔"
رشیداں نے اس کی بکواس سے بچنے کے لیے پیالی منہ کو لگائی۔
اور ثریا نے بات کرتے کرتے اسی پیالی کو ہاتھ مارا تھا۔
گرم چائے ہونٹوں، ٹھوڑی اور گردن سے ہوتی سینے تک آبلے ڈال گئی۔
رشیداں کی چیخ نے اندر کھولتے رفیق کو لرزا کر رکھ دیا۔

☆☆☆

"تو نے خواہ مخواہ بھیج دیا، اس کم بخت کی نظر پڑ گئی تو۔" انور نے ماتھے سے پسینہ صاف کیا۔
"بس وہ اتنی امید سے آیا تھا کہ مجھ سے رہا نہیں گیا۔" اس نے ڈرتے ڈرتے شوہر کے سامنے چائے کی پیالی اور پیزا کا پیس رکھا۔
"وہ تو ٹھیک ہے، بس یہ نہیں چاہتا، کسی کو پتا چلے۔"
"اب کیا کرو گے؟ منشی سے جا کر ملو گے؟"
"نہیں...... آج تو نہیں۔ کل نکاح کے بعد جاؤں گا۔" اس نے پیزا کے اوپر لگا زیتون کا ٹکڑا منہ میں رکھا۔
"پتا ہے، میں نے آج اس لڑکے کو قریب سے دیکھا ہے۔ مانو دل میں کھب سا گیا ہے۔ ہماری نمو کو اس سے اچھا لڑکا مل ہی نہیں سکتا تھا۔ ہماری نرمین فاطمہ بہت نصیب والی ہے۔" ثمینہ کے دل کا سکون اور اطمینان اس کے لہجے میں چھلک رہا تھا۔
"وہ نرمین کے سارے نخرے اٹھائے گا، اسے بہت خوش رکھے گا۔ میں نے دیکھ لیا ہے جی۔"
"نخرے تو میں نے بھی تمہارے، بہت اٹھائے تھے۔" انور نے ایک ٹکڑا توڑ کر ثمینہ کی طرف بڑھایا۔ اولین دنوں کی چاہت دونوں پر بن بادل برسنے لگی۔ اللہ نے کتنا خوب صورت رشتہ بنایا ہے۔ اس کائنات کی تخلیق سے بھی پہلے تخلیق ہونے والا رشتہ۔ نجانے انسانوں نے اسے اتنا مشکل اور تکلیف دہ کیوں بنا دیا تھا۔ تنگی ترشی، خوشی غمی...... انہوں نے ہر لمحہ یوں ایک دوسرے سے بانٹا تھا کہ انور حسین...... انور حسین نہ رہتا تھا اور ثمینہ...... ثمینہ نہیں رہتی تھی۔ دونوں مٹی اور بیج کی طرح اک مک ہو گئے اور ان کے وجود سے پھوٹتی شاخیں، ان کے بچے...... وہ ایک دوسرے میں فنا ہو کر گویا پھر سے جنم لے چکے تھے۔
"میں چاہتی ہوں، وہ نرمین کی اتنی ہی قدر کرے جتنی تم نے میری کی۔" وہ دونوں چھلاوے بھاگتے ہوئے اندر آئے۔
رکے...... ٹھٹکے...... پھر مڑ کر پکارنے لگے۔
"فضہ...... نمو...... دیکھو ابو جی! امی کو سبزی والی روٹی کھلا رہے ہیں۔"
ثمینہ دوپٹے میں منہ چھپا کر ہنسی تو انور حسین کا قہقہہ چھت پھاڑ تھا۔
"تیرا بیڑا پار...... ادھر آؤ۔ تمہیں بھی کھلاؤں۔"

☆☆☆

"فرخ...... فرخ......"
وہ کوئی تیسری بار آ کر اسے جگا گئی تھیں۔ اب جاگے کو کون جگائے، تب ہی وہ ڈھیٹ بنا لیٹا تھا۔

''کیا ہو گیا بیٹا جی! اب چلنا نہیں ہے۔ کیا وقت ہو گیا ہے؟''
فرخ نے غصے سے کروٹ بدلی۔ وہ سفید چکن کا سوٹ جس پر چھوٹی چھوٹی گلابی بوٹیاں بنی تھیں، پہنے، دوپٹے کی بکل مارے، کانوں میں سونے کے ٹاپس ڈالے تیار کھڑی تھیں۔
''مجھے نہیں جانا۔''
''چلا جاتا تو اچھا تھا۔ شادی والے گھر میں سو کام ہوتے ہیں۔''
''آپ چاہتی ہیں کہ میں اس کی شادی میں جا کر کرسیاں لگاؤں۔'' وہ بھڑک گیا۔
''ٹھیک ہی تو کہتا ہے، اسے وہاں لے جا کر خواہ مخواہ تکلیف کیوں دوں۔''
انہوں نے دل ہی دل میں سوچا۔
''اچھا ٹھیک ہے، تم سو جاؤ۔ میں دروازہ بند کر جاتی ہوں۔''
وہ واقعی دروازہ بند کر گئیں۔ فرخ نے غصے سے تکیہ اٹھا کر بند دروازے پر دے مارا۔

☆☆☆

نیا رنگ روغن، پلنگ پرانا مگر اس پر بچھی چادر نئی نکور تھی۔ ایک طرف کارنس پر نئے آرائشی گل دان رکھے تھے۔ پورا کمرہ گلاب، گیندے اور سفید کلیوں سے مہک رہا تھا۔ دروازے کے عین سامنے فرش پر گلاب کی پتیوں سے ویلکم لکھ کر دل بنایا گیا تھا۔
''ہم گاڑی لے آتے ہیں۔'' دوستوں نے بہت زور لگایا مگر اس نے ہنس کر ٹال دیا۔
''نہیں دلہن رکشے پر آئے گی۔''
''پاگل ہو۔''
''اسے رکشہ بہت پسند ہے۔''
دروازے کے باہر رکشہ پھولوں کی چادر اوڑھے کھڑا تھا، جسے چلانے کی خواہش زمین نے کی تھی۔
مراد نے خود پر پرفیوم چھڑک کر آئینہ دیکھا۔ سفید شلوار قمیص جس کے کالر اور آستینوں پر ہلکی سنہری کڑھائی تھی۔ پاؤں میں کھسہ...... سلیقے سے بنائے بال۔ اس نے مڑ کر پلنگ پر پڑے گلاب کے پھولوں اور سو سو کے نوٹوں والے ہار کو دیکھا تو لمحوں میں چک 69 کے سرکاری اسکول کے گراؤنڈ میں پہنچ گیا۔
ہیڈ ماسٹر کے گلے میں اتنے ہار تھے کہ ناک تک آتے تھے۔
ڈھول والا ڈھول پیٹ پیٹ کر پاگل ہو رہا تھا۔
سامنے میز پر مٹھائی کی پانچ کلو کی ٹوکری ہیڈ ماسٹر صاحب کے لیے اور کلو کلو کے ڈبے باقی استادوں کے لیے رکھے تھے۔
یہ سب شور شرابا اس لیے تھا کہ نمبر دار فاروق جٹ کے بیٹے نے کلاس میں تیسری پوزیشن لی تھی۔ اور وہ جو کلاس میں پہلے نمبر پر آیا تھا علی بخش ترکھان کا اکلوتا بیٹا اپنا رزلٹ کارڈ ہاتھ میں لیے خاموشی سے سب دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں کم مائیگی اور کم حیثیتی کا دکھ نمایاں انداز میں ہلکورے کھا رہا تھا۔ حالانکہ فاروق جٹ نے بڑی فراخ دلی سے مراد کو پاس بلا کر کندھے پر تھاپی دی تھی۔ اور جب یہ سارا ہنگامہ ٹھنڈا پڑنے لگا تب ابا آیا، چار خانوں والی دھوتی پر میلا لا کرتا پہنے، ہاتھ میں ایک گلاب کے پھولوں کا ہار اور لفافے میں پاؤ جلیبی، مٹھائی کی ٹوکری کے پاس پاؤ جلیبی کا لفافہ کتنا بے مایہ لگتا تھا۔ ماسٹر کے گلے میں مزید ہار کی گنجائش نہیں تھی اس لیے وہ ہار بھی میز پر رکھ دیا۔
مراد نظریں جھکائے رزلٹ کارڈ کو گھورتا رہا۔
مگر اس کی پاؤ جلیبی کا مول اس وقت بڑھ گیا۔ جب ماسٹر نے اس کے باپ کا اٹھ کر استقبال کرتے ہوئے فخریہ انداز میں کہا۔

"قسم ہے اس پاک ذات کی۔ یہ لڑکا کچھ کر کے دکھائے گا۔ میں اسے بورڈ کے امتحان کے لیے تیار کر رہا ہوں۔"
"کوئی بڑا کام نہ کر پایا ابا...... تیرا مراد علی نامراد ہی رہا۔" اس نے ہار واپس رکھ دیے۔
"اب شادی کر رہا ہوں۔ تو دیکھو...... کوئی کندھے پر تھاپی...... ماتھے پر دعا کا پھول بھی نہیں......"
"تو بن ماں کے پیدا ہوا تھا؟"
تیری بہن مر گئی تھی جو تیری کلائی پر گانا ہی باندھ دیتی۔" علی بخش دھوتی اٹھا کر اس پر پل پڑا۔
مراد نے دوڑ لگائی اور وہاں جا کر رکا۔ قبرستان کی آخری رو میں پرانی قبر کیکر کے پیلے پھولوں سے بھری ہوئی تھی۔
قبر پر تازہ پانی کا چھڑکاؤ تھا اور فضا میں اگربتی اور گیلی مٹی کی خوشبو گڈمڈ ہو رہی تھی۔ یہ خوشبو اتنی تیز تھی کہ گلابوں کی مہک پر حاوی ہونے لگی۔ مراد گھبرا کر کمرے سے باہر نکل آیا تو کاکے نے لپک کر اسے گلے لگا لیا۔
"کیا روپ آیا ہے میرے دولہا پر۔"
مراد جھینپ سا گیا۔
کاکے کو اس پر اتنا پیار آیا کہ بے ساختہ اس کی پیشانی چوم کر دعا دی۔
"اللہ، تیرے گھر کو محبت کی خوشبو سے ہمیشہ آباد رکھے۔"
"آمین......"
"کوئی کمی تو نہیں سب ٹھیک ہے نا......" کاکے نے کمرے کی آرائش کی طرف اشارہ کیا۔
"بہت اچھا ہے بھائی...... چلنا کب ہے۔"
"اوئے ہوئے اتنی بے چینی......" کاکے نے قہقہہ لگایا۔
"بے چینی تو ہے۔" مراد نے کان کھجاتے ہوئے اعتراف کیا۔
"چل تیری بے چینی کا خاتمہ کرتے ہیں۔ تو پہنچ...... میں باقیوں کو لے کر جاتا ہوں۔"
"بارات تو اس طرح جا رہی ہے مگر میں ولیمہ دھوم دھام سے کروں گا۔"
"جو دل چاہے کرنا، سارا انتظام ہو جائے گا۔ بس ایک بار خیر خیریت سے نکاح ہو جانے دے۔"
کاکا کہہ کر چلا گیا۔ مراد نے اندر جا کر اپنا والٹ اٹھایا...... کچھ اور رقم اس میں ڈالی۔ کیا پتا کون کون سی رسمیں ہوں۔ دروازے کو احتیاط سے لاک کیا۔ اور باہر نکل آیا۔
مگر ٹھٹک کر رک گیا۔
اس کے رکشے کے پاس ایک اور گاڑی آ کر رکی تھی۔
"پولیس کی گاڑی......"

☆☆☆

نہ نہ کرتے بھی شادی کا ماحول بن گیا تھا۔ خدیجہ خالہ نے نرمین کے جہیز کا محدود سا سامان ایک دن پہلے ہی مراد کے گھر بھیج دیا تھا۔ طلحہ اور حذیفہ کو نئی نیکر شرٹس اور فضہ، ثمرین کے لیے نئی فراک مراد نے خرید کر دیے تھے۔ جنہیں پہن کر وہ اترائے اترائے پھر رہے تھے۔
میرون شرارہ سوٹ جس کے دوپٹے پر سبز کامدار پٹی لگی تھی۔ ویسا ہی کام شرارے پر تھا۔ جیسے ہی سامنے آیا۔ نرمین کی آنکھیں چمک اٹھیں۔
"کوئی ضرورت نہیں۔ سادہ سوٹ لو تاکہ بعد میں بھی کہیں کام آ جائے۔ بس دوپٹے پر کام ہو کافی ہے۔" افشاں کی اماں نے ٹوکا تو دوپٹہ ہاتھ سے چھوڑ کر احتجاجاً کرسی سے ٹیک لگا لی۔ اس کی دلچسپی یک لخت ہر چیز میں ختم ہو گئی تھی۔ وہ سوٹ تھا ہی اتنا پیارا۔

افشاں پر بھی غصہ آ رہا تھا۔ جسے جوس پینے اور چپس کھانے سے ہی فرصت نہیں تھی۔ تب ہی کسی نے ہولے سے اس کا کندھا تھپتھپایا۔

زمین نے چونک کر گردن گھمائی۔

مراد اور زمین کے درمیان کی جگہ خالی تھی کیونکہ خالہ آگے کو جھکی کسی کپڑے کے کام کو بغور دیکھ رہی تھیں۔ ان کی کرسی پر بازو پھیلائے مراد زمین کو دیکھ رہا تھا۔ جیسے ہی وہ متوجہ ہوئی، اس نے آنکھ کے اشارے سے سوٹ کے بارے میں پوچھا۔ زمین ایک لمحے کو ٹپٹائی۔ پھر اثبات میں سر ہلا دیا۔

"بس...... بھائی یہی والا کر دیں......"

"ہیں......" خالہ سیدھی ہوئیں۔ مراد نے سرعت سے بازو ہٹایا۔

"اس کا کیا فائدہ، ایک بار پہننے کے بعد کیا کرے گی۔ اچھا شلوار سوٹ ہوگا تو جتنی بار مرضی پہنے۔"

"مجھے پسند ہے خالہ......!" مراد نے نرمی سے بات ہی ختم کر دی۔

"تم نے تو اپنی پسند کے لینے تھے۔" افشاں زمین کے کان میں گھسی۔

"اب ہماری پسند الگ تھوڑی ہے۔" زمین نے بھی سرگوشی میں بات ختم کر دی۔

غیر محسوس انداز میں دونوں کی کیمسٹری بن گئی تھی۔ جیسے وہ بنا کہے ایک دوسرے کو جاننے لگے تھے۔

"وہ کتنی آسانی سے میرے دل کی ہر بات جان لیتا ہے۔"

وہ بند آنکھوں سے مسکرائی۔

"اوئے ہوئے، کیا سوچ کر مسکرا رہی ہو۔" افشاں اس کی آنکھوں کا میک اپ کر رہی تھی۔ زمین نے آنکھیں کھولنا چاہیں۔ افشاں نے فوراً ٹوک دیا۔

"ابھی نہ کھولو، لائنر گیلا ہے۔ پھر کہوگی، بل بتوڑی کیوں بنا دیا۔"

"آپا...... اس کی کیا ضرورت تھی۔ مہمانوں کے لیے مٹھائی اور سموسے بنا لیے تھے۔" ثمینہ اور خدیجہ بات کرتے کرتے اندر آئیں...... کون سی زیادہ بارات تھی اس لیے خدیجہ بریانی کا دیگچہ پکا لائی تھیں۔

"جو کچھ کر رہی ہوں، اپنی بیٹی کے لیے کر رہی ہوں۔ تم ٹوکا نہ کرو۔"

خدیجہ نے مسکرا کر زمین کو دیکھا۔ تو دل میں ہوک سی اٹھی۔ بیٹے کی آنکھوں کا درد دل میں اتر گیا۔ شرارہ سوٹ پہنے، بنا دوپٹے کے وہ کرسی سے ٹیک لگائے آنکھیں موندے نیم دراز، کھلے بال دونوں اطراف سینے پر پڑے تھے۔

کیسی پریوں جیسی لگ رہی تھی۔

"اچھا سنبھل ہی جائے گا۔" انہوں نے اس کے لیے خود کو تسلی دی جو نہر کے کنارے دونوں گھٹنوں کے گرد ہاتھوں کی قینچی بنائے مانند بت ساکت وصامت بیٹھا سوچ رہا تھا۔

"وہ دلہن بن کر کیسی لگ رہی ہوگی۔"

"اتنی پیاری لگ رہی ہو بالکل گڑیا سی۔" دوپٹا اس پر سیٹ کر کے ثمینہ نے اس کی پیشانی چوم لی۔

"مجھے یقین ہی نہیں آ رہا۔ یہ میری نمو ہے۔"

"سارا میرے میک اپ کا کمال ہے۔" افشاں اب زور و شور سے اپنے منہ پر لیپا پوتی کر رہی تھی۔ طلحہ اور حذیفہ اس کے شرارے کے پائنچوں میں گھسے جا رہے تھے۔

"کیا کر رہے ہو؟" افشاں نے مڑ کر دونوں کو گھر کا...... دونوں ذرا ہٹ کر پھر سے اپنے اپنے بٹنے گننے لگے۔ ہر گنتی میں ایک بٹنا کم ہو جاتا تھا۔ دونوں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں اشارہ کیا۔ اور زمین کے شرارے کو کینہ توز نظروں سے دیکھا۔

"آپی...... گھبراہٹ ہو رہی ہے۔" زرمین نے اپنے ٹھنڈے ہاتھوں سے اماں کے ہاتھ تھامے۔
"تو کون سا دور جا رہی ہے۔ یہیں پاس ہی تو ہوگی۔ جب چاہے آ کر مل جانا۔" ثمینہ نے سارے آنسو پی لیے...... بیٹی عزت سے اپنے گھر کی ہو رہی تھی۔ طلحہ نے چٹکی سے اس کے شرارے کا پائنچہ اٹھایا۔
ثمینہ نے اس کی گردن پر دھپ لگائی۔
"یہ کیا بدتمیزی ہے۔"
"امی! میرا ابنٹا آپی کی دو ٹانگوں والی دھوتی کے نیچے آ گیا ہے۔" ابھی کچھ دیر پہلے تو اس نے حذیفہ سے پوچھا تھا۔
"آپی نے کیا پہنا ہے؟"
تو اس نے یہی جواب دیا تھا۔
اپنے سوٹ کی ایسی درگت دیکھ کر زرمین کی آنکھیں پھیل گئیں۔ فوارے کی طرح پھوٹتی ہنسی کے نتیجے میں افشاں کی لپ اسٹک خراب ہوگئی۔ زرمین احتجاجاً اپنا شرارہ سمیٹ کر پلنگ پر جا بیٹھی۔
مال مسروقہ برآمد کر کے دونوں خوشی خوشی باہر بھاگے۔
صحن میں تین چار پائیوں پر سفید کھیس اور سرہانے رکھے تھے۔ انور حسین وہیں بیٹھا تھا۔
"بارات کب تک آنی ہے؟" پیازی رنگ کے کڑھائی والے دوپٹے کی بکل مارے ثمینہ نے آ کر پوچھا۔
"بس آتے ہی ہوں گے...... انتظام تو پورا ہے۔"
"ہاں...... ہاں۔ سب پورا ہے۔ میں نے برتن بھی نکال دیے ہیں۔"
"بس اللہ خیر کرے...... وہ بھی آتے ہوں گے۔" انور حسین کے لہجے میں اطمینان تھا۔
بس ایک آدھ گھنٹے میں بیٹی محفوظ ہاتھوں میں جا رہی تھی۔ مراد اس کی حفاظت جان سے بڑھ کر کرے گا۔ اس بات کا دونوں میاں بیوی کو پورا یقین تھا۔
تب ہی دروازے کے باہر گاڑی رکنے کی آواز آئی۔
"یہ کون ہے؟" ثمینہ کا دل ڈوب کر ابھرا۔
"پاگلے۔ بارات آئی ہے اور کیا۔"
وہ اٹھ کر دروازے کی سمت چلا۔
اندر افشاں نے موبائل پر گانا لگا دیا تھا۔
سجدے کیے تھے لاکھوں، لاکھوں دعائیں مانگیں۔
پایا ہے میں نے پھر تجھے......
"کھڑی کیا دیکھ رہی ہو، تیل لے کر آؤ......" دروازے کے پاس پہنچ کر انور نے مڑ کر ثمینہ کو دیکھا تو وہ ہڑبڑا کر تیل کی شیشی لے کر بھاگی۔
انور حسین نے بسم اللہ پڑھ کر دروازہ کھولا۔
ثمینہ کا ڈھکن کھولتا ہاتھ شیشی پر ہی منجمد ہو گیا۔
سامنے کا منظر دیکھ کر انور حسین کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی تھی۔

☆☆☆

اقصیٰ نے سرسوں کے تیل میں وہ کالا پاؤڈر گھول کر ماں کے چھالوں پر لیپ کر دیا تھا جو حکیم صاحب نے دیا تھا۔ پتا نہیں تکلیف زیادہ تھی یا دل کا درد...... وہ دیوار اور نیم کے سائے میں چارپائی پر لیٹی روئے جاتی۔
رفیق نے ثریا کو بے نقط سنائی تھیں۔

وہ دل میں شرمندہ تھی، تب ہی ظاہر نہ کیا۔ بس منہ پھلائے مارے باندھے گھر کے کاموں میں لگ گئی۔
ایک بات جو سب سے عجیب ہوئی۔
رشیداں نے گھر کے کاموں سے ہاتھ کھینچ لیا تھا...... وہ اقصیٰ کو بھی اپنے پاس سے ہلنے نہ دیتی۔ اس سے بھی عجیب بات یہ تھی کہ رفیق اسے کچھ بھی نہ کہتا...... بس اپنی ٹانگ کے درد کو لے کر روتا رہتا۔ اقصیٰ کو اس گھر سے وحشت ہونے لگی۔ جہاں ہر کوئی روتا کرلاتا دہائی دیتا۔
رشیداں اپنے چھالوں کو، رفیق اپنی ٹانگ کو، ثریا اپنی محبت کو مگر کوئی کسی کے درد کا درماں نہ بنتا۔
اقصیٰ کا دل چاہتا وہ اس گھر سے بھاگ جائے۔
پھر ایک دن رشیداں نے رفیق کا موبائل منگوایا۔
"اماں! کس کو کال کرنی ہے۔"
"دیکھ شفیق کے نام سے نمبر ہوگا۔"
اقصیٰ نے نمبر ڈھونڈ کر کال ملائی اور ماں کو تھما دیا...... رشیداں نے کال ملتے ہی بس اتنا ہی کہا تھا۔
"آ کر اپنے بھائی کو لے جاؤ...... علاج کروا سکتے ہو تو کروا لو...... میرے بس سے باہر کی بات ہے۔ ورنہ کفن دفن تو میں بھی کروا دوں گی۔"
اقصیٰ تھرا کر رہ گئی۔
پوری زندگی میں یہ پہلی تلخ بات تھی جو اس نے ماں کے منہ سے سنی تھی۔
اور شفیق کے لہو نے بھی جوش مارا۔ جو صبح کی پہلی گاڑی پکڑ کر یہاں آ موجود ہوا۔ رشیداں نے درانتی پکڑی اور بھینس کے لیے چارہ لینے کھیتوں میں چلی گئی۔ شفیق اس کے اگلے پچھلوں کو کوستا۔ گالیاں دیتا رفیق کو چیچا وطنی کے سول ہسپتال لے گیا۔
انہوں نے ہاتھ لگانے سے بھی انکار کر دیا۔
"فوراً لاہور لے جاؤ...... ورنہ گینگرین پورے جسم میں پھیل جائے گا۔"
بھٹی میں آگ روشن تھی۔
روٹیاں ثریا پکا رہی تھی۔ اور آگ جلاتی اقصیٰ کو بار بار ڈانٹ رہی تھی کہ آگ کے پاس آنے سے رشیداں کے زخم رسنے لگتے۔
"ڈھنگ سے روٹی سینک...... ورنہ جلا دوں گی......"
"تجھے اس کے سوا اور آتا ہی کیا ہے آپا۔" اقصیٰ تڑخ کر بولی۔
"بتاؤں تجھے......" ثریا نے روٹی سینکنے والا چمٹا اٹھا لیا تو اقصیٰ ڈر گئی۔ اور خاموشی سے آگ ٹھیک کرنے لگی۔
"مجھے تو فون کرتا...... تیرا بھائی زندہ تھا...... کچھ نہ کچھ تو تیرے لیے کرتا......" شفیق چارپائی سے اچھل جاتا...... رشیداں، رفیق کی چارپائی کے پاس پیڑھی پر بیٹھی تھی۔
"تو تو خود بال بچے دار تھا...... کیا کہتا......"
"کم بخت عورت! تجھے بھی شوہر کا خیال نہ آیا۔"
"پچھلے خصم کی یادوں سے نکلے تو ہی خیال آئے......" لکڑی سے زیادہ ثریا چٹخی، رشیداں نے آگ برساتی نگاہوں سے ثریا کو دیکھا۔
"اپنے سارے اگلے پچھلوں کے ساتھ رابطے میں رہتی ہے۔ ایک فون چاچے کو بھی کر دیتی......"
اقصیٰ کے ہاتھ سے چمٹا گر گیا۔
ماں بولی تھی۔ پہلی بار اس کے اندر کی آواز باہر آئی تھی۔

''اس کو کچھ نہ کہو۔ رشیداں کو کچھ نہ بولو۔ میں گناہ گار ہوں۔ اس کا...... اس کی آہیں لے گئیں مجھے...... مراد علی...... مراد علی...... تو کہاں ہے؟ میرے سامنے آ...... میں ہاتھ جوڑ کر معافی مانگوں......''
رفیق بلکنے لگا اور مراد علی کے نام پر رشیداں پہلی پھٹک ہو گئی اس نے گردن موڑ کر رفیق کو دیکھا۔
پھر دونوں ہاتھ آنکھوں پر رکھ کر جو بلکی تو شفیق گھبرا کر گھر سے ہی نکل گیا تھا۔

☆☆☆

''تم لوگوں کو سانپ کیوں سونگھ گیا۔ بھر جائی تیل چواؤ، استقبال کرو۔ شادی والے گھر میں پہلے پہلے مہمان آئے ہیں۔''
''منشی صاحب......'' انور کے منہ سے پوری آواز بھی نہیں نکلی تھی۔ بارات کے استقبال کے لیے باہر آتی افشاں، اماں اور خدیجہ وہیں جم گئیں۔
''کیا ہوا، بارات ابھی نہیں آئی۔ اکرم! سامان اندر رکھو......'' وہ دونوں کو ہکا بکا چھوڑ کر اندر آیا اور چارپائی پر تکیہ کہنی تلے دبا کر بیٹھ گیا۔ منٹوں میں دوسری چارپائی سامان سے بھر گئی۔ پھل مٹھائیاں...... تحائف......
''تمہاری بیٹی کے لیے لایا ہوں۔ وہ میرے نصیب میں نہیں تھی۔ نہ سہی...... اوئے کم بخت...... یہ چارپائی کیوں بھر دی...... بارات تیرے سر پر بیٹھے گی......'' وہ خود ہی بولتا جا رہا تھا۔ باقی پورے گھر پر ہو کا عالم تھا۔
''وہ منشی صاحب......'' انور حسین آگے ہوا تو ثمینہ کو بھی ہوش آ گیا۔ جلدی سے اندر چلی گئی۔
''کوئی بات نہیں...... تیری بیٹی ہے اور تیرا فیصلہ...... مجھے کوئی حق نہیں کہ تجھے کسی بات کے لیے مجبور کروں...... بس اسی لیے آیا ہوں۔''
منشی نے سنجیدگی سے کہا تو انور نے بے یقینی سے منشی کو دیکھا۔
''اس طرح نہ دیکھ کہ میں اپنے آپ میں شرمندہ ہونے لگوں۔''
''چلو اچھا ہے، گدھے کو بھی عقل آئی۔'' خدیجہ خالہ باآواز بلند بڑبڑائیں اور اندر چلی گئیں۔ انور حسین نے گھبرا کر منشی کو دیکھا۔
''ٹھیک ہی تو کہہ گئی ہے...... میں گدھا ہی تھا جو خواہ مخواہ ایسی آس امید لگا کر بیٹھ گیا۔'' منشی نے منہ لٹکا لیا۔
''میں آپ کے لیے شربت لاتا ہوں......'' انور کو خود کو سنبھالنے کے لیے وقت چاہیے تھا۔
''ہائے خالہ! آپ نے اس کے منہ پر گدھا بول دیا۔'' زرمین نے حیرت سے پوچھا۔
''ہاں تو اور کیا؟''
''مزے کی بات یہ کہ اس نے مان بھی لیا۔'' افشاں ہنسی۔

☆☆☆

رشیداں نے قبر پر سے سارے کیکر کے پیلے پھول صاف کر کے پانی کا چھڑکاؤ کیا۔ کچھ گلابی پھولوں کے گچھے اور سبز شاخوں سے قبر کو ڈھانپنے لگی۔ تب ہی گورکن وہاں چلا آیا...... اسے دیکھتے ہی ماتھا پیٹ لیا۔
''کتنی بار کہا ہے رشیداں مائی! عورتیں قبرستان نہیں آتیں۔ اور پھر تیرا دوسرا نکاح ہو گیا ہے۔ اس سے اب تیرا کوئی تعلق نہیں۔''
''میرے بچوں کا باپ ہے۔ نہ میں نے اسے اپنی مرضی سے چھوڑا۔ نہ یہ اپنی مرضی سے مرا۔ تو تعلق کس طرح ٹوٹ گیا۔''
''تیری مت ماری گئی ہے......'' وہ ماتھے پر ہاتھ مار کر چلا گیا۔ یہ تو برسوں کا معمول تھا...... وہ کہاں سنتی تھی۔
قبرستان کی ٹھنڈک بھری خاموشی اس کے اعصاب بوجھل کرنے لگی...... اس کا دل چاہا، یہیں علی بخش کے

پہلو میں لمبی تان کر سو جائے۔

''اماں......اماں......اقصیٰ نجانے کیوں سرپٹ بھاگی آرہی تھی۔ رشیداں اپنا ڈول اٹھا کر کھڑی ہوئی۔

اقصیٰ چاردیواری کے پاس رک کر پھولی ہوئی سانس بحال کرنے لگی۔

''کیا ہوا؟'' رشیداں قبرستان سے باہر آئی۔

''فون آیا ہے......''

رشیداں کا دل دھک سے رہ گیا۔ اس نے مڑ کر پھولوں اور سبز پتوں سے ڈھکی قبر کو دیکھا۔

''ڈاکٹر نے اس کی ٹانگ کاٹ دی ہے۔''

اقصیٰ کا سانس اب بھی بحال نہ ہوا تھا۔

رشیداں کے چہرے پر کچھ بھی نہیں تھا۔ اس نے گویا چپ ہی سادھ لی تھی۔ ابھی پرسوں شفیق کی کال آئی تھی۔ علاج کے لیے بہت پیسے چاہئیں۔ جو مال ڈنگر موجود ہے۔ بیچ کر پیسے بھیجو...... '' مال ڈنگر کیا تھا۔ ایک مریل سی گائے اور تین بکریاں...... اس نے کھڑے کھڑے بیچ کر سب پیسے بھجوائے خود خالی ہو کر بیٹھ گئی۔

''اماں......'' اقصیٰ نے ڈر کر پکارا۔

''آہ...... قبرستان سے باہر جنازہ گاہ تھی۔ خوب صورت، گھاس، گیندے اور گلاب کے پھولوں سے مزین...... رشیداں وہیں ایک طرف بیٹھ گئی۔

''آج تاریخ کیا ہے؟''

''31 مارچ......''

''ہاں یہی تاریخ تھی۔'' رشیداں نے گھاس پر پھدکتے سبز ٹڈوں کو دیکھا۔

''علی بخش کو فوت ہوئے دوسرا سال تھا۔''

رشیداں کی آواز سرگوشی میں ڈھل گئی۔ مراد کا نتیجہ نکلنا تھا۔ رشیداں کو پتا تھا۔ ہمیشہ کی طرح وہ اس بار بھی اول نمبر پر ہی آئے گا۔ مگر اس بار اس کے لیے جلیبی لے کر جانے والا باپ نہیں تھا۔ اس نے رفیق سے کچھ پیسے مانگے تو وہ بکتا جھکتا گالیاں دیتا بغیر پیسے دیے گھر سے باہر نکل گیا۔ اس کے پاس رشیدہ کے بچوں کے لیے ایک روپیہ بھی نہیں تھا۔

رشیداں نے میلی اوڑھنی میں آنسو سمیٹے...... گڑ پانی میں گھولا۔ اس سے آٹا گوندھ کر میٹھی ٹکیاں بنائیں...... رومال میں لپیٹیں، میلے کپڑوں پر صاف دوپٹا اوڑھا اور اسکول جانے کو تیار ہوگئی۔

''مگر مجھے دیر ہوگئی تھی۔'' رشیداں نے ہوکا بھرا۔

وہ ابھی دروازے کے پاس پہنچی بھی نہیں تھی کہ رفیق مراد کو گھسیٹتا ہوا لایا۔ مراد نیچے گرا تھا اور اس کے ہاتھ رفیق کے قابو میں تھے۔ اور وہ اسی طرح گھسیٹتا اندر تک لایا تھا۔ جیسے وہ جیتا جاگتا انسان کا بچہ نہیں کوئی بے جان جھاڑی یا لکڑی کا ٹکڑا تھا۔

رشیداں کے ہاتھ سے ٹکیاں کچے فرش پر جا پڑیں۔

رفیق نے اسے صحن میں پٹخا اور لپک کر کونے میں پڑا ڈنڈا اٹھالیا۔ اور تابڑتوڑ مراد کی ٹانگوں پر برسانے لگا۔ مراد کی چیخیں آسمان کو چھونے لگیں۔ رشیداں مراد کو چھڑانے کی کوشش میں خود مار کھاتی مراد کے اوپر گر گئی۔

مراد کا قصور کیا تھا؟

اسکول سے گھر آتے اس نے رفیق کی بھینس کو ڈنڈے مارے تھے۔

''اماں! بھینس کھل گئی تھی، واپس نہیں آرہی تھی۔ میں تو اسے واپس لا رہا تھا۔'' ہچکیوں سسکیوں کے درمیان وہ بار بار بتاتا۔

اور رشیداں اس کی نیلو نیل ٹانگوں پر آہوں کے پھاہے رکھتی رہی...... بس وہ آخری مار تھی جو مراد نے رفیق کے

ہاتھوں کھائی تھی۔ کئی دن تو وہ چلنے کے قابل نہ رہا تھا۔ اور جب چلنے کے قابل ہوا تو ان کی حد سے ہی نکل گیا۔
''میں کئی دن پاگلوں کی طرح گاؤں کا ایک ایک بوہا (دروازہ) کھٹکھٹاتی رہی۔ وہ یہاں ہوتا تو ملتا...... کسی نے بتایا، وہ کسی گزرتی ٹرالی میں بیٹھ کر شہر چلا گیا تھا۔''
''اماں! بھائی واپس بھی تو آسکتا تھا۔''
''رب کی مرضی، اس کی مرضی ہوگی تو واپسی کا رستہ بھی دکھا دے گا۔'' رشیدہ نے پلو سے اپنا چہرہ صاف کیا۔
''وہ رفیق کی ٹانگوں کے زخم نہیں تھے۔ میرے مراد کی پنڈلیوں کے نیل تھے۔''
''اماں! تمہیں کوئی دکھ نہیں ہوا۔''
''کتنے دکھ پالوں۔'' رشیدہ نے اقصیٰ کو بے چارگی سے دیکھا۔
''تیرے باپ کے مرنے کا دکھ، پتر کی جدائی کا دکھ، یا رفیق کی ٹانگ کٹنے کا دکھ...... میں تھک گئی آں پتری...... دکھ پالتے پالتے تھک گئی آں......''
''اماں، شام ہو رہی ہے۔ گھر چلتے ہیں۔''
عقب میں قبرستان کے درختوں کے سائے گہرے ہونے لگے تو اقصیٰ خوف زدہ ہوگئی۔
''ہاں چلو......'' رشیدہ اس کے ہاتھ کے سہارے کھڑی ہوئی۔
دونوں ساتھ ساتھ چلتی گھر کے دروازے تک پہنچیں۔
دروازہ چوپٹ کھلا تھا۔
اور ثریا صحن میں بیٹھی بین ڈال رہی تھی۔
دوسرا فون اقصیٰ کے گھر سے نکلتے ہی آ گیا تھا۔
رفیق ٹانگ کٹنے کی تکلیف نہ سہہ سکا تھا۔ شفیق اس کی میت لے کر صبح تک گاؤں پہنچ جائے گا۔ رشیداں ثریا کو نظر انداز کر کے اندر کی طرف بڑھ گئی۔ میت کے آنے سے پہلے پہلے اسے کئی انتظام دیکھنے تھے۔

☆☆☆

پورے گھر میں سراسیمگی پھیل گئی تھی...... انور دروازے تک جاتا...... پھر لوٹ آتا...... ثمینہ بار بار پانی کا گھونٹ بھرتی۔
خدیجہ اور افشاں کی اماں ایک دوسرے کو دیکھ کر نظریں چرا لیتیں۔
''بارات کب آئے گی۔ میرا تو بھوک سے دم نکل رہا۔'' افشاں نے پوچھا تو زمین نے تھک کر پلنگ سے ٹیک لگالی۔
منشی چائے پی کر فارغ ہو گیا تھا اور اب تکیے سے ٹیک لگائے مزے سے سگریٹ پر سگریٹ پھونک رہا تھا۔
''میں خود دیکھ کر آتا ہوں۔'' انور کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔
اس سے پہلے کہ وہ باہر نکلتا۔ کاکا اندر داخل ہوا۔ اس کے قدم سست اور چہرہ بجھا ہوا تھا۔
''کاکے۔ کہاں رہ گئے ہو۔ مولوی صاحب بھی انتظار کر کے واپس چلے گئے کہ جب بارات آئے تو بلا لینا۔ اب بیٹھو تم لوگ، میں بلا کر لاتا ہوں۔''
کاکے کو دیکھ کر انور کی جان میں جان آ گئی تھی۔
''چاچا......'' کاکے نے انور کو بازو پکڑ کر روکا۔ ''مولوی صاحب کو بلانے کی ضرورت نہیں۔''
''تو نکاح کیا میں پڑھاؤں گا۔'' انور جھنجلا گیا۔ ایک تو پہلے ہی اتنی دیر ہو گئی تھی۔
''مراد کو پولیس پکڑ کر لے گئی ہے۔''

☆☆

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

قرۃ العین خرم ہاشمی

"نائلہ......"

دوسری منزل کے کونے والے، درمیانے سائز کے کمرے میں ایک مہینہ پہلے بیاہی دلہن نائلہ، نئے سامان سے بھرے اپنے کمرے میں میکے سے آئے مہمانوں کے ساتھ بیٹھی ہنس رہی تھی، جب کمرے کے دروازے پر دستک دے کر ہما اندر داخل ہوئی۔

یہ نائلہ کی بڑی جیٹھانی تھی۔ درمیانے قد اور جسامت کی مالک، خوش شکل ہما کا لہجہ اگرچہ نرم ہوتا مگر اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھیں تیزی سے آس پاس کا تفصیلی جائزہ بالکل ایکسرے کی طرح کرنے میں ماہر تھیں۔ ہما نے سوٹ سے ہم رنگ کر نکل شیفون کا دوپٹہ اوڑھا ہوا تھا۔

نائلہ کے میکے سے اس کا بھائی اور بھابھی ملنے آئے تھے۔ وہ نائلہ کے لیے بہت سارے پھل اور بیکری آئٹم لائے تھے۔ نائلہ کا بھائی گھر کے مردوں کے ساتھ ڈرائنگ روم میں بیٹھا ہوا تھا جبکہ اقرا، نائلہ کا کمرہ دیکھنے خاص طور پر اوپر والے پورشن میں آئی تھی۔ نائلہ اکلوتی نند تھی جس کی شادی انھوں نے بہت ارمانوں سے کی تھی۔ ضرورت کی ہر چیز اسے دی تھی۔ نائلہ کو خوش دیکھ کر اقرا مطمئن ہوگئی۔

"ہما بھابھی!"

نائلہ خوش دلی سے مخاطب ہوئی۔

ہما نے ہلکی مسکراہٹ کے ساتھ اسے دیکھا مگر اس کی نگاہیں تیزی سے میز پر رکھی چیزوں کا جائزہ لے رہی تھیں۔ ہما آگے بڑھی اور بہت محبت سے نائلہ کی بھابھی اقرا کو گلے سے لگایا۔ اقرا سمجھدار اور پڑھی لکھی تھی وہ ایک کالج میں لیکچرار تھی۔ اس کی شخصیت کا اعتماد واضح نظر آتا تھا۔

"میں چائے بنانے جارہی ہوں۔ آپ بیٹھیں نا۔" نائلہ نے جلدی سے کہا تو ہما نے ہاتھ میں پکڑا پلیٹ سے ڈھکا درمیانے سائز کا پیالہ نائلہ کی طرف بڑھایا۔

"میں تو یہ کھیر دینے آئی تھی۔" ہما نے نزاکت سے کہا اور اقرا کے ساتھ بیٹھ گئی۔

"لگتا ہے کہ آپ کو کھیر بہت پسند ہے۔" اقرا نے بات کرنے کی غرض سے کہا تو ہما نے نفی میں سر ہلایا۔

"میں زیادہ میٹھا نہیں کھاتی ہوں۔ کھیر اماں جی نے بنائی تو سب کے حصے بانٹ دیے۔ یہ نائلہ اور احسن کا حصہ ہے۔ اماں جی نے کہا کہ جلدی سے پکڑا آؤں۔ نائلہ اپنے چھوٹے فریج میں رکھ لے گی۔"

ہما نے ایک طنزیہ نگاہ کونے میں رکھے روم فریج پر ڈالی۔ اقرا حیران نگاہوں سے ہما کو دیکھنے لگی۔

"کیا مطلب؟ اس گھر میں چیزیں اس طرح بانٹ کر دی جاتی ہیں؟" اقرا نے ناگواری سے سوال کیا۔

"جی، یہ ہمارے گھر کا اصول ہے۔ دراصل بات یہ ہے کہ......"

ہما نے اپنی آواز مزید مدھم کی اور سامنے پریشان کھڑی نائلہ کی طرف دیکھا۔

"تم بھی یہاں آجاؤ۔" اقرا نے سنجیدہ لہجے

میں کہا تو نائلہ سر ہلاتی پاس رکھی کرسی پر بیٹھ گئی۔ ہما سرگوشی میں کہنے لگی۔

''یہ بات اس کمرے سے باہر نہ جائے۔ میں آپ پر اعتبار کر رہی ہوں۔'' ہما نے کہا۔

''آپ بے فکر رہیں۔'' اقرا نے اسی انداز میں کہا تو ہما کا چہرہ خوشی سے کھل اٹھا مگر وہ فوراً ہی سنجیدہ ہو گئی۔

''نائلہ کی شادی کو ابھی زیادہ وقت تو ہوا نہیں ہے۔ یہ بے چاری اس گھر کے بارے میں کچھ نہیں جانتی۔ دراصل سارے گھر پر میری ساس یعنی اماں جی کا کنٹرول ہے۔ خاص کر گھر میں کھانے پینے کی چیزوں کی تقسیم وہ اپنی مرضی سے کرتی ہیں۔ کھانا گھر کی بہوئیں پکاتی ہیں یعنی میں اور میری دیورانی مگر کھانا تقسیم اماں جی کرتی ہیں۔ بس آپ نہ ہی پوچھیں کہ ہمیں کس کس طرح سے ترسایا جاتا ہے۔''

ہما نے رنجیدہ لہجے میں کہا تو اقرا نے حیران

نگاہوں سے نائلہ کی طرف دیکھا جو خود بھی ہکا بکا بیٹھی یہ سب سن رہی تھی۔
''مگر ہما بھابھی!'' نائلہ نے کچھ کہنا چاہا۔
''تم تو چپ ہی کرو نائلہ! تمہیں ابھی پتا ہی کیا ہے؟ میں اور حمیرا پچھلے کئی سالوں سے اماں جی کا سلوک دیکھ رہے ہیں۔ اماں جی کے آگے تو ابا جی بھی نہیں بولتے ہیں۔''
ہما نے جلدی سے کہا تو نائلہ فوراً چپ ہو گئی۔
''نائلہ! تم تو کہتی تھیں کہ تمہارے سسرال میں سب ٹھیک ہے؟ سب لوگ بہت اچھے ہیں؟'' اقرا نے سخت لہجے میں نائلہ کی طرف دیکھ کر سوال کیا، وہ گھبرا گئی۔
''بھابھی! مجھے تو ایسا کچھ محسوس نہیں ہوا۔ یہ سچ ہے کہ اماں جی اکثر سالن کے حصے کرتی ہیں۔ کیونکہ احسن کھانے کے وقت گھر پہ نہیں ہوتے، وہ دیر سے آتے ہیں اور......'' نائلہ کہتے ہوئے چپ ہو گئی جیسے اسے کچھ یاد آیا تھا۔
''ہاں، باقی سب کے حصے بھی وہ خود بناتی ہیں۔'' نائلہ نے مدھم لہجے میں کہا تو ہما نے فخریہ انداز میں اقرا کی طرف دیکھا۔
''میں نیچے جا رہی ہوں۔ اماں جی انتظار کر رہی ہوں گی۔ آپ لوگ باتیں کریں۔'' ہما نے جلدی سے کہا اور وہاں سے اٹھ کر چلی گئی۔
اس کے جانے کے بعد گہری خاموشی دونوں کے درمیان آ گئی۔ اقرا نے گہری سانس لی اور اٹھ کر نائلہ کے پاس آ کر بیٹھ گئی اور نرمی سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔
''دیکھو نائلہ! تم بہت سیدھی اور سادہ مزاج کی مالک ہو۔ تمہیں گھریلو سیاست کا بالکل اندازہ نہیں ہے کیونکہ تم نے اپنے گھر میں یہ سب نہیں دیکھا۔ تم جانتی ہو کہ ہمارے گھر کا ماحول کتنا دوستانہ ہے۔ سب لوگ پڑھے لکھے اور سلجھے ہوئے مزاج کے مالک ہیں۔ مجھے تو پہلے بھی احسن کے گھر والے اتنے پسند نہیں آئے تھے مگر ڈیڈی اور مما کو احسن دل و جان سے پسند آ گیا۔ بہر حال......''
اقرا نے گہری سانس لی اور پریشان نائلہ کو پیار سے دیکھا۔
''تم پریشان مت ہو۔ اپنی آنکھیں کھلی رکھو۔ سب سے ایک فاصلہ بنا کر رہو۔ ساس کی اتنی مت مانو کہ تمہارے کھانے پینے کے حصے وہ تمہیں کر کے دیں۔ عزت کرو، خدمت کرو مگر اپنا حق لینا سیکھو۔ تم غلام نہیں ہو۔ احسن سے بات کرو کہ اپنی ماں کو سمجھائے کہ ہمارے گھر میں یہ سب نہیں ہوتا۔ جس کا جو دل چاہتا ہے، جیسے دل چاہتا ہے، وہ لے لیتا ہے۔ یہ کیا بات ہوئی بھلا کہ کھانے پینے کی چیزوں کی بانٹ کی جائے۔''
اقرا نے نرمی سے نائلہ کو سمجھایا۔ نائلہ سر ہلاتی رہی۔ اقرا کافی دیر اس کے پاس بیٹھی اور اسے مختلف طریقے سمجھائے۔ اقرا کے جانے کے بعد نائلہ احسن سے اس بارے میں بات کرنے کا طریقہ سوچنے لگی۔ کہ اس کو برا بھی نہ لگے اور وہ اپنی بات بھی پہنچا دے۔ آج نائٹ شفٹ کی وجہ سے احسن بہت دیر سے گھر آیا تو نائلہ کو اس سے بات کرنے کا موقع نہیں ملا۔

☆☆☆

''ٹیپو! ادھر آؤ۔''
باورچی خانے کے سامنے صحن میں رکھے تخت پر اماں جی بیٹھی ہوئی تھیں۔ ان کے سامنے مختلف پھلوں کے تھیلے کھلے ہوئے رکھے تھے۔ وہ ترتیب سے سارے پھلوں کو گھر کے مکینوں میں بانٹ رہی تھیں۔ کچن میں کھڑی، چائے بناتی نائلہ نے بہت ناگواری سے اماں جی کو پھلوں کے تھیلے بناتے ہوئے دیکھا تھا۔
''جی دادو!'' دس سال ٹیپو نے پاس آ کر کہا۔
''یہ تھیلا اپنی ماں کو دے آؤ۔''
اماں جی نے کہا تو ٹیپو نے جلدی سے تھیلا پکڑا اور دوسری منزل کی طرف جانے والی سیڑھیوں کی طرف دوڑ لگا دی۔

''آرام سے لڑکے! گر جاؤ گے۔''

اماں جی نے کڑک دار آواز میں کہا۔ ٹیپو ہما کا دوسرے نمبر والا بیٹا تھا۔ اس سے بڑی رانیہ اور ٹیپو سے چھوٹا اظہر تھا۔

''حمیرا! یہ تمہارا حصہ ہے۔''

حمیرا اپنے کمرے سے باہر نکلی تو اماں جی نے ایک تھیلا اس کی طرف بڑھایا۔ حمیرا نے جلدی سے تھیلا پکڑا اور تیزی سے کمرے میں لے گئی۔ اس کے دونوں بچے پھل دیکھ کر ان پر ٹوٹ پڑے تھے۔ دونوں بچوں کی عمریں سات اور آٹھ سال کے قریب تھیں۔

''اماں جی! چائے۔''

نائلہ نے چائے کی ٹرے پاس رکھی اور تیزی سے مڑ گئی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ اماں جی کی اس بانٹ میں اسے بھی حصہ ملے۔ پچھلے چھ مہینے سے وہ یہ سب دیکھ اور برداشت کر رہی تھی۔ احسن سے کئی بار کہہ چکی تھی کہ اسے یہ سب پسند نہیں ہے۔ اپنی پسند اور مرضی کے علاوہ، آزادی بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔ احسن ہر بار نرمی سے سمجھاتا۔ دراصل احسن بھی اپنی سسرال یعنی نائلہ کے متمول اور پڑھے لکھے گھرانے سے بہت متاثر تھا۔ اس کی دونوں بھابھیوں کی نسبت نائلہ کا تعلق بہت اچھے گھرانے سے تھا۔ اس لیے احسن اپنی سسرال سے تھوڑا دبتا تھا۔

''اتنی جلدی کیا ہے لڑکی! اپنا حصہ تو لے جاؤ۔''

اماں جی نے مسکراتے ہوئے کڑک دار آواز میں کہا تو نائلہ نے گہری سانس لے کر ان کی طرف دیکھا۔

''اماں جی! یہ آپ رکھ لیں۔ میرے میکے سے کل بہت پھل آیا تھا۔ مجھے اس کی ضرورت نہیں۔''

نائلہ نے نخوت سے کہا تو ایک لمحے کے لیے اماں جی کا چہرہ تاریک ہوا مگر فوراً ہی نارمل ہو گئیں۔

''ادھر آؤ۔'' اماں جی نے سنجیدہ انداز میں کہا تو نائلہ ان کے پاس آئی۔

''یہ اپنا حصہ پکڑو۔ مجھے یا تمہارے ابا جی کو کسی چیز کی کمی نہیں ہے جو ہم بہو، بیٹے کے حصے پر نظر رکھیں۔''

اماں جی نے سخت انداز میں کہا تو نائلہ کے چہرے پر طنزیہ مسکراہٹ پھیل گئی۔

''کمی نہیں ہے مگر اماں جی! معذرت کے ساتھ آپ نے گھر کی بہوؤں کو ان کا حق استعمال کرنے کی بھی اجازت نہیں دی ہے۔''

نائلہ نے طنزیہ انداز میں کہا۔ اسی وقت احسن گھر کے اندر داخل ہوا۔ اس کے ہاتھ میں سموسوں اور جلیبیوں کا شاپر تھا۔

''وضاحت کرو گی؟''

اماں جی نے ایک سخت نگاہ نائلہ پر ڈالی اور پھر پیچھے کھڑے، پریشان چہرے والے اپنے لاڈلے سپوت پر۔ نائلہ نے بھی گردن گھما کر شوہر کو دیکھا اور پھر اماں جی کو۔

''اماں جی! آپ کو شاید میرا سچ بولنا برا لگے مگر آپ جانتی ہیں کہ ہمارے گھر میں ہر طرح کی آزادی ہے۔ میں اور میرے بڑے بھائی کی تعلیم و تربیت پر ہمارے والدین نے بہت محنت کی۔ اللہ کا شکر ہے کہ اقرا بھابی بھی ایسی ہی نکلیں مگر شاید میری قسمت میں کوئی کمی تھی جو......!''

نائلہ نے گہری سانس لی اور پھر گویا ہوئی۔

''اماں جی! آپ یقین کریں کہ میں نے بہت کوشش کی مگر مجھے یہ بانٹ کا طریقہ نہ تو سمجھ میں آیا اور نہ پسند۔''

نائلہ نے دوٹوک انداز میں کہا۔ ہما اور حمیرا بھی صحن سے آتی آوازیں سن کر فوراً وہاں پہنچ گئیں اور اب ایک دوسرے کو معنی خیز انداز میں دیکھ رہی تھیں۔ نائلہ بہت فخریہ انداز میں اماں جی کے سامنے اکڑ کر کھڑی تھی کہ جو جرأت اس گھر کی بڑی دو بہوویں نہیں کر سکیں وہ بالآخر اس نے کر ہی لی تھی۔ اماں جی کچھ دیر سوچتی رہیں۔ احسن کی سانس رکی ہوئی تھی۔ اماں جی نے سر اٹھایا اور ایک نظر سب پر ڈالی۔

ہما اور حمیرا کے چہرے کی خوشی ان سے چھپی نہیں رہی تھی اور نائلہ کے چہرے کی بے وقوفی بھی......! نائلہ کے جذباتی پن اور بولڈ ہونے کا فائدہ ہما اور حمیرا نے بہت آسانی سے اٹھایا تھا۔ نائلہ سمجھ رہی تھی کہ وہ اپنے حق کے لیے کھڑی ہوئی ہے مگر دراصل وہ ہما اور حمیرا کے بھڑکانے پر اماں جی کے سامنے کھڑی ہوئی تھی۔

یعنی کندھا اس کا تھا اور بندوق ان دونوں کی۔

اماں جی نے سمجھ کر سر ہلایا۔

''ٹھیک ہے، جیسا تم چاہو۔''

اماں جی نے آرام سے کہا تو سب ہکا بکا انھیں دیکھتے رہ گئے۔ اماں جی نے آرام سے گاؤ تکیے سے ٹیک لگائی اور تینوں بہوؤں کی طرف دیکھا۔

''میں نے بہت سال ''بانٹ'' کا ترازو سنبھالا ہے۔ اب تم تینوں کی باری ہے۔ یہ گھر بھی تمہارا ہے اور گھر والے بھی۔ آپس میں فیصلہ کر لو کہ کیا کرنا ہے اور کیا نہیں۔ میں بھی اس رمضان میں آرام سے عبادت میں مشغول رہوں گی۔''

اماں جی نے ایسے کہا جیسے آج ان کے سر پر سے بہت بڑا بوجھ اتر گیا۔ نائلہ نے حیرانی جبکہ ہما اور حمیرا نے خوشی سے چمکتے چہرے کے ساتھ ان کی طرف دیکھا تھا۔

☆☆☆

''نائلہ! چائنیز رول کے لیے سبزیاں کاٹ دینا۔ میں بچوں کو دیکھ لوں۔''

ہما نے مصروف انداز میں کہا اور سبزیوں کا ڈھیر میز پر چھوڑ کر اپنے پورشن کی طرف بڑھ گئی۔ نائلہ نے حیرانی سے دیکھا۔ جب سے اماں جی نے ان تینوں پر گھر کی ذمہ داری چھوڑی تھی، ایسا اکثر ہی ہونے لگا تھا۔ ہما اور حمیرا دونوں اپنے اپنے بچوں کا بہانا بنا کر کام کے وقت یہاں وہاں غائب ہو جاتیں اور ساری ذمہ داری نائلہ پر آ جاتی مگر کھانے کے وقت سب سے پہلے وہ اور ان کے بچے میز پر موجود ہوتے۔

رمضان سے پہلے سموسے، رول، چکن بالز وغیرہ بنا کر رکھتے تھے۔ وہ دونوں سارا کام نائلہ پر ڈال کر چلی جاتیں۔ نائلہ کو ان کا رویہ چبھتا تھا مگر وہ احسن کے سامنے شکوہ کر کے ڈانٹ نہیں سننا چاہتی تھی۔ جو پہلے ہی نائلہ کے اماں جی کے سامنے بولنے پر شکوہ کناں رہتا تھا۔

''نائلہ! تمہیں اماں جی سے اس لہجے میں بات نہیں کرنا چاہیے تھی۔''

احسن نے اس دن نائلہ کو سمجھانا چاہا مگر وہ کچھ سننے کے موڈ میں نہیں تھی۔

''سوری احسن! مگر ہمارے گھر میں یہ سب نہیں ہوتا۔''

نائلہ کا انداز اتنا سخت تھا کہ احسن نے خاموشی اختیار کر لی۔ اب نائلہ احسن سے ہما اور حمیرا کی شکایت لگا کر مزید بری نہیں بننا چاہتی تھی۔

نائلہ نے چائنیز رول کے لیے سبزیاں کاٹیں، چکن ابالی، آمیزہ تیار کیا اور پھر رول بنانے بیٹھ گئی تو اسے اکیلے کام کرتا دیکھ کر اماں جی کو ترس آ گیا۔

''میرے پاس لے آؤ۔ مل کر بنا لیتے ہیں۔''

اماں جی نے تخت پر سے آواز لگائی تو نائلہ سر ہلاتی ان کے پاس آ کر بیٹھ گئی۔ نائلہ تیزی سے ہاتھ چلا کر رول بنانے لگی۔ اماں جی معصومیت سے دیکھے جا رہی تھیں۔

''بیٹی! ذرا ایک رول آرام سے بنا کر بتاؤ۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا۔''

اماں جی نے رول کی پٹی میں مکسچر رکھ کر معصومیت سے سوال کیا تو نائلہ ہنس پڑی۔

''اماں جی! آپ پٹیاں الگ کر دیں۔ یہ کام بھی بہت ہوتا ہے۔''

نائلہ نے مسکرا کر کہا۔ رول کی پٹیاں رات کو احسن سے منگوائی تھیں۔ ایک دوسرے کے ساتھ جڑی پٹیوں کو آرام سے الگ کر کے اماں جی نائلہ کے سامنے رکھتی گئیں جو تیزی سے ہاتھ چلاتے ہوئے رول بنا رہی تھی۔

ہما اور حمیرا کے چہرے کی خوشی ان سے چھپی نہیں رہی تھی اور نائلہ کے چہرے کی بے وقوفی بھی......! نائلہ کے جذباتی پن اور بولڈ ہونے کا فائدہ ہما اور حمیرا نے بہت آسانی سے اٹھایا تھا۔ نائلہ سمجھ رہی تھی کہ وہ اپنے حق کے لیے کھڑی ہوئی ہے مگر دراصل وہ ہما اور حمیرا کے بھڑکانے پر اماں جی کے سامنے کھڑی ہوئی تھی۔

یعنی کندھا اس کا تھا اور بندوق ان دونوں کی۔

اماں جی نے سمجھ کر سر ہلایا۔

''ٹھیک ہے، جیسا تم چاہو۔''

اماں جی نے آرام سے کہا تو سب ہکا بکا انہیں دیکھتے رہ گئے۔ اماں جی نے آرام سے گاؤ تکیے سے ٹیک لگائی اور تینوں بہوؤں کی طرف دیکھا۔

''میں نے بہت سال ''بانٹ'' کا ترازو سنبھالا ہے۔ اب تم تینوں کی باری ہے۔ یہ گھر بھی تمہارا ہے اور گھر والے بھی۔ آپس میں فیصلہ کرلو کہ کیا کرنا ہے اور کیا نہیں۔ میں بھی اس رمضان میں آرام سے عبادت میں مشغول رہوں گی۔''

اماں جی نے ایسے کہا جیسے آج ان کے سر پر سے بہت بڑا بوجھ اتر گیا۔ نائلہ نے حیرانی جبکہ ہما اور حمیرا نے خوشی سے چمکتے چہرے کے ساتھ ان کی طرف دیکھا تھا۔

☆☆☆

''نائلہ! چائنیز رول کے لیے سبزیاں کاٹ دینا۔ میں بچوں کو دیکھ لوں۔''

ہما نے مصروف انداز میں کہا اور سبزیوں کا ڈھیر میز پر چھوڑ کر اپنے پورشن کی طرف بڑھ گئی۔ نائلہ نے حیرانی سے دیکھا۔ جب سے اماں جی نے ان تینوں پر گھر کی ذمہ داری چھوڑی تھی، ایسا اکثر ہی ہونے لگا تھا۔ ہما اور حمیرا دونوں اپنے اپنے بچوں کا بہانا بنا کر کام کے وقت یہاں وہاں غائب ہو جاتیں اور ساری ذمہ داری نائلہ پر آ جاتی مگر کھانے کے وقت سب سے پہلے وہ اور ان کے بچے میز پر موجود ہوتے۔

رمضان سے پہلے سموسے، رول، چکن بالز وغیرہ بنا کر رکھنے تھے۔ وہ دونوں سارا کام نائلہ پر ڈال کر چلی جاتیں۔ نائلہ کو ان کا رویہ چبھتا تھا مگر وہ احسن کے سامنے شکوہ کر کے ڈانٹ نہیں سننا چاہتی تھی۔ جو پہلے ہی نائلہ کے اماں جی کے سامنے بولنے پر شکوہ کناں رہتا تھا۔

''نائلہ! تمہیں اماں جی سے اس لہجے میں بات نہیں کرنا چاہیے تھی۔''

احسن نے اس دن نائلہ کو سمجھانا چاہا مگر وہ کچھ سننے کے موڈ میں نہیں تھی۔

''سوری احسن! مگر ہمارے گھر میں یہ سب نہیں ہوتا۔''

نائلہ کا انداز اتنا سخت تھا کہ احسن نے خاموشی اختیار کرلی۔ اب نائلہ احسن سے ہما اور حمیرا کی شکایت لگا کر مزید برا نہیں بننا چاہتی تھی۔

نائلہ نے چائنیز رول کے لیے سبزیاں کاٹیں، چکن ابالی، آمیزہ تیار کیا اور پھر رول بنانے بیٹھ گئی تو اسے اکیلے کام کرتا دیکھ کر اماں جی کو ترس آ گیا۔

''میرے پاس لے آؤ۔ مل کر بنا لیتے ہیں۔''

اماں جی نے تخت پر سے آواز لگائی تو نائلہ سر ہلاتی ان کے پاس آ کر بیٹھ گئی۔ نائلہ تیزی سے ہاتھ چلا کر رول بنانے لگی۔ اماں جی معصومیت سے دیکھے جا رہی تھیں۔

''بیٹی! ذرا ایک رول آرام سے بنا کر بتاؤ۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا۔''

اماں جی نے رول کی پٹی میں مکسچر رکھ کر معصومیت سے سوال کیا تو نائلہ ہنس پڑی۔

''اماں جی! آپ پٹیاں الگ کر دیں۔ یہ کام بھی بہت ہوتا ہے۔''

نائلہ نے مسکرا کر کہا۔ رول کی پٹیاں رات کو احسن سے منگوائی تھیں۔ ایک دوسرے کے ساتھ جڑی پٹیوں کو آرام سے الگ کر کے اماں جی نائلہ کے سامنے رکھتی گئیں جو تیزی سے ہاتھ چلاتے ہوئے رول بنا رہی تھی۔

"میں رول کھاؤں گا۔" ٹیپو نے رول بنتے دیکھے تو شور مچادیا۔ اسے فرمائش کرتا دیکھ کر باقی بچے بھی کہنے لگے۔

"اچھا! ابھی بنادیتی ہوں۔"

پتا نہیں کہاں سے حمیرا نکلی۔ جلدی سے دس رول اٹھائے اور تیزی سے کچن کی طرف چلی گئی۔ نائلہ حیران بیٹھی رہ گئی۔ اماں جی ہنس پڑیں۔

"بیٹی! یہ سب معمولی باتیں ہیں۔ ابھی تو سموسے بھی بنانے ہیں۔"

اماں جی نے ہلکے پھلکے انداز میں کہا۔ اگلے دن نائلہ نے سموسے بنائے۔ اس سے اگلے دن چکن بالز۔ جو بچوں کو اتنی پسند آئیں کہ وہ بار بار اس کی فرمائش کررہے تھے۔

"حد ہے احسن! کام میں کوئی مدد نہیں کرواتا اور چیزیں غائب پہلے کردی جاتی ہیں۔"

نائلہ نے جھنجلا کر کہا۔ احسن نے سنجیدہ نگاہ اس پر ڈالی۔

"نائلہ! یہ جوائنٹ فیملی ہے۔ جہاں زیادہ تر ایسا ہی ہوتا ہے۔ خود کو اس کی عادت ڈالو۔ بار بار کے شکوے رشتوں کو گرد آلود کردیتے ہیں۔"

احسن کے سخت لہجے میں واضح تنبیہہ تھی۔ نائلہ چپ کرگئی۔

"احسن مجھے شرمندگی ہے کہ میری وجہ سے آپ ہرٹ ہوئے۔ مجھے اماں جی سے اس طرح دوٹوک لہجے میں بات نہیں کرنا چاہئے تھی۔ اماں جی دل کی بہت اچھی ہیں۔"

میچورٹی کا درجہ بڑھا تو نائلہ کو رشتوں کی سمجھ آنے لگی تھی۔

"اچھی بات ہے کہ تمہیں اپنی غلطی کا احساس ہے۔ بس آئندہ خیال رکھنا۔" احسن نے سنجیدگی سے کہا تو نائلہ نے سرہلا دیا تھا۔

☆☆☆

رمضان المبارک کا مہینہ شروع ہوا تو ہر گھر کی طرح، یہاں بھی سحری اور افطاری کی وہ ہی رونقیں

تھیں۔ ایک دن نائلہ نے اماں جی کے فیصلے کے بارے میں اقرا کو بتایا تو وہ بہت حیران ہوئی۔

"اتنی جلدی اماں جی کیسے مان گئیں؟" اقرا نے نائلہ سے پوچھا۔

"ہم تین ایک طرف جو ہوگئے تھے، شاید اس لیے۔" نائلہ نے فخریہ انداز میں کہا تو اقرا چپ کر گئی۔

"بہر حال! محتاط رہنا۔ تمہاری دونوں جیٹھانیاں بہت تیز اور چالاک ہیں۔" اقرا نے کہا تو نائلہ ہنس پڑی۔

"ہوں! وہ تو ہیں مگر بھابھی؟ آپ کیوں حیران ہورہی ہیں۔ آپ نے ہی تو سمجھایا تھا کہ اپنا حق اور آزادی کبھی نہیں چھوڑتے۔"

نائلہ نے پرسوچ انداز میں سوال کیا۔

"ہاں کہا تھا مگر صورتحال کا فرق بھی مدنظر رکھنا چاہیے۔ خیر تم پریشان مت ہو۔"

اقرا نے بات بدل دی۔ رمضان المبارک شروع ہوا تو پہلی بار نائلہ کو صحیح معنوں میں سسرال اور اس کی ذمہ داری سمجھ میں آئی تھی۔

☆☆☆

"نائلہ! جلدی ہاتھ چلاؤ۔ میں بچوں کو جگانے جارہی ہوں۔ تم ان کے لیے انڈے بنادو۔ رانیہ ہاف فرائی لے گی، ٹیپو کو آملیٹ بنادو اور اظہر کے لیے میٹھا انڈہ۔"

ہما نے سالن گرم کیا اور کچن سے باہر نکلتے ہوئے پیڑا بیلتی نائلہ کو حکم دیا تھا۔ نائلہ نے سرہلا دیا۔ گھر کے بچے روزہ تو نہیں رکھتے تھے کہ کم عمر تھے مگر سحری اور افطاری بہت شوق سے کرتے۔ سحری کے وقت جلدی جلدی کرنے میں نائلہ ٹھیک سے سحری نہیں کرپاتی تھی۔ جب تک وہ کچن کے کاموں سے فارغ ہوتی اور میز تک جاتی سب کچھ ختم ہوچکا ہوتا یا جو بچا ہوا ہوتا، وہ اسے ملتا۔ چائے ٹھنڈی یا آدھا کپ۔ اکثر آدھا پراٹھا کھا کر روزہ رکھتی۔ وہی تو اسے دس روزوں میں ایک دن بھی نہیں ملی تھی

کیونکہ بچتی ہی نہیں تھی۔ سالن میں سے جو بچ جاتا۔ وہ اس کے حصے میں آتا۔

افطاری کے وقت بھی صورتحال الگ نہیں تھی۔ تلنے والا کام نائلہ کے ذمے تھا۔ اکثر افطار سے کچھ دیر پہلے شروع کیا جاتا تاکہ سب گرم رہے اور اسی چکر میں نائلہ کا روزہ ہمیشہ باورچی خانے میں کھلتا۔ اکثر ایک کھجور اور شربت کے ایک گلاس سے۔ میز پر رکھی گرم اور تازہ اشیاء اس کے آنے تک ختم ہو جاتیں کیونکہ ہما اور نائلہ کے بچوں کو بہت زیادہ کھانے کی عادت تھی۔

کچھ ان کی مائیں بھی ضرورت سے زیادہ چیزیں بچوں کی پلیٹوں میں بھر دیتیں۔ بچے اپنی گنجائش کے حساب سے کھاتے اور باقی چیزیں یا تو پلیٹ میں ضائع ہوتیں یا پھر بعد میں کھانے کے لیے ڈھانپ کر رکھ دی جاتیں۔ نائلہ منہ دیکھتی رہ جاتی۔ اس نے کئی بار احسن سے شکوہ کیا کہ کوئی اور نہیں تو کم از کم وہ ہی اس کا خیال رکھ لیا کرے، جس پر احسن نے ٹکا سا جواب دے کر اس کا منہ بند کر دیا تھا۔

"میں سب گھر والوں کے سامنے تمہارے لیے چیزیں نکالتا بہت عجیب لگوں گا۔ ویسے بھی یہ تمہاری مرضی اور پسند کے مطابق ہی ہے۔ اب پلیز شکوہ مت کرو۔"

احسن کا روکھا انداز نائلہ کو بہت کچھ سمجھا گیا۔ اس کے بعد نائلہ نے احسن سے شکوہ تو نہیں کیا مگر اسے ہما اور حمیرا کی چالاکی پر غصہ آنے لگا تھا۔

☆☆☆

عید کی شاپنگ کے لیے احسن اور نائلہ صبح سے بازار گئے ہوئے تھے۔ بارہ روزے ہو چکے تھے۔ اماں جی کے کہنے پر احسن اسے شاپنگ کروانے لے گیا۔ اماں جی کو احساس تھا کہ نائلہ کی شادی کے بعد پہلی عید ہے۔ اس لیے تیاری بھی زبردست ہونی چاہیے۔ نائلہ اور احسن شاپنگ کر کے تھکے ہارے، جب گھر پہنچے تو روزہ کھلنے میں تھوڑی دیر باقی تھی۔ احسن کے سر میں درد ہو رہا تھا۔ وہ تھوڑی دیر کمر سیدھی کرنے کمرے میں چلا گیا۔ نائلہ نے کچن میں جھانک کر دیکھا۔

"اچھا ہوا نائلہ! تم آ گئی ہو۔ پلیز یہ پکوڑے تل لو۔ میں آج بہت تھک گئی ہوں۔"

ہما نے منہ بنا کر کہا۔ نائلہ نے دیکھا کہ روز کی نسبت آج افطار میں کم چیزیں بنی تھیں کیونکہ آج افطار بنانے والی نائلہ نہیں، ہما اور حمیرا تھیں۔ جنہوں نے بس خانہ پری سے کام لیا تھا۔ نائلہ نے کندھے اچکائے۔

"سوری بھابھی! میں بہت تھک گئی ہوں۔"

نائلہ کہتے ہوئے واپس مڑ گئی۔ ہما نے ایک سخت نگاہ اس پر ڈالی جبکہ حمیرا طنزیہ انداز میں ہنس پڑی۔

"بہت تیز ہے۔" حمیرا نے کہا۔

"تیز ہے تو اماں جی کو آتے ہی ایک طرف کر دیا۔ ہم تو ایسے نہیں تھے۔"

ہما نے منہ بنا کر کہا۔ یہ بات نائلہ کے تیز کانوں نے سن لی۔ اپنے کمرے میں آ کر وہ غصے پر قابو پانے لگی کہ روزہ برداشت کا سبق دیتا ہے۔

"نائلہ! روزہ کھل گیا ہے۔ چلو نیچے۔"

احسن نے نرمی سے کہا۔ نائلہ نے گہری سانس لی اور وہ دونوں جب نیچے پہنچے تو میز پر بیٹھتے ہی حیران رہ گئے۔ پکوڑے بچوں کی پلیٹوں میں منتقل ہو چکے تھے۔ سموسے تلے نہیں گئے کہ وقت نہیں تھا۔ فروٹ چاٹ بنائی نہیں کہ کام بہت تھا۔ دہی بھلے ہی ان کے حصے میں تھوڑے سے آئے اور شربت کا ایک گلاس۔ نائلہ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ بازار میں پھرنے کی وجہ سے اسے بھوک بھی لگ رہی تھی مگر آج افطار میں کچھ تھا ہی نہیں۔ ابا جی اور دونوں بھائیوں کی آج افطار پارٹی تھی۔ وہ وہاں گئے ہوئے تھے۔ اس لیے ہما اور حمیرا نے افطاری بنانے میں سستی سے کام لیا تھا۔

"میں نماز پڑھ کے بازار سے کچھ لے آؤں گا۔"

احسن نے اٹھتے ہوئے مدھم لہجے میں کہا تو نائلہ نے سر ہلا دیا۔ احسن نماز پڑھ کے آیا تو اماں جی نے اسے اور نائلہ کو اپنے کمرے میں بلا لیا۔

"یہاں آؤ۔" اماں جی نے اپنے مخصوص انداز میں کہا اور اپنے کمرے میں رکھی میز پر دسترخوان سے ڈھکی ٹرے کی طرف اشارہ کیا۔

"سامنے والے پڑوسیوں نے آج زردے اور بریانی کی دیگ بانٹی ہے۔ یہ تم دونوں کا حصہ ہے۔ میں جانتی ہوں کہ نائلہ بی بی کو بانٹ پسند نہیں ہے مگر اکثر حالات میں بانٹ یا تقسیم کا عمل حاکمیت برقرار رکھنے کے لیے نہیں ہوتا بلکہ گھر میں توازن رکھنے اور رشتوں میں آنے والی اونچ نیچ سے بچنے کے لیے ہوتا ہے۔ امید ہے کہ آج کے واقعے کے بعد تمہیں یہ بات ضرور سمجھ میں آ جائے گی کہ "بانٹ" کیوں ضروری تھی۔"

اماں جی نے ہلکی مسکراہٹ سے کہا تو نائلہ نے سر جھکا لیا۔

"میں معذرت خواہ ہوں اماں جی! دوسروں کے سمجھائے اور پڑھائے سبق کی وجہ سے مجھے یہ لگا تھا کہ آپ صرف اپنی حاکمیت دکھانے کے لیے ہر چیز قبضے میں رکھنا چاہتی ہیں۔" نائلہ نے اعتراف کیا تو اماں جی ہنس پڑیں۔

"بے وقوف لڑکی! میں تم لوگوں کے اٹھنے، بیٹھنے، ملنے ملانے، گھومنے پھرنے وغیرہ کبھی کسی چیز کی نگران رہی ہوں؟ نہیں ناں۔

بیٹی! میں نے کچن یا پھلوں وغیرہ کی بانٹ یا تقسیم کا اختیار اپنے پاس اس لیے رکھا کہ میں جانتی تھی کہ بھرے پڑے کنبے میں ہر ایک کو انصاف سے چیز نہیں مل سکتی۔ اس لیے میں انصاف سے ہر ایک کو اس کا حصہ دے دیتی تا کہ وہ سب آپس میں ایک دوسرے سے لڑیں نہیں۔

تمہاری تو نئی نئی شادی ہوئی تھی، تم جھجک یا شرم کی وجہ سے کسی چیز کا تقاضا نہ کرتیں تو یہ میرا فرض تھا کہ میں تمہارا خیال رکھوں۔"

اماں جی ایک لمحے کے لیے چپ ہوئیں۔

"احسن کے گھر آنے کا کوئی وقت مقرر نہیں تھا۔ مجھے پہلے اس بات کا اندازہ نہیں ہوا مگر احسن اکثر رات کو دیر سے گھر آتا تو اس کے لیے کھانا نہیں بچا ہوتا یا سب کے کھانے کے بعد جو بچ جاتا، وہ احسن کو ملتا۔ پہلے کچھ دن تو میں برداشت کرتی رہی۔ بار بار ہما اور حمیرا کو سمجھایا کہ جتنا مرضی کھانا ہے کھاؤ مگر احسن کا حصہ بھی رکھ دیا کرو۔ ان کے کانوں پر جوں تک نہیں رینگی اور میری ممتا نے یہ گوارا نہیں کیا کہ دو بیٹے تو اپنے حصے سے زیادہ لے لیں اور تیسرے کو اس کا حق ہی نہ ملے۔ اس لیے میں نے احسن کا حصہ نکالنا شروع کر دیا۔ تا کہ آپس میں لڑائی جھگڑا نہ ہو۔ ایک دوسرے کے خلاف شکوے، شکایت پیدا نہ ہوں۔ احسن کی شادی کے بعد بھی میں یہ سب کرتی رہی کیونکہ میں جانتی تھی کہ تم نئی ہو۔ اس

لیے میں ہر چیز میں سے تم لوگوں کا حصہ نکال دیتی۔ اب ایمان داری سے بتاؤ کہ پچھلے دو مہینے سے کیا تمہیں گھر میں پکائی یا بنی کسی چیز میں سے اپنا صحیح حصہ ملا ہے؟"

اماں جی نے سوال کیا تو نائلہ نے شرمندگی سے نفی میں سر ہلایا۔

"یہ سچ ہے کہ ہمیں بچا ہوا ملتا ہے یا اکثر وہ بھی نہیں۔ تب احسن باہر سے کھانا لے کر آتے ہیں۔"

نائلہ نے سر جھکا کر اعتراف کیا۔ اماں جی مسکرا دیں۔

"بیٹی! بڑوں کے بہت سے عمل، باتیں، سوچیں عجیب و غریب ضرور لگتی ہیں مگر یہ ان کی عمر کا نچوڑ، ان کے تجربات کا حاصل ہوتا ہے۔ اس لیے انہیں سمجھنا سیکھو۔ زندگی میں اکثر دوسروں کے تجربات بھی کام آجاتے ہیں۔"

اماں جی نے کہا تو نائلہ نے فرماں برداری سے سر ہلا دیا۔ احسن نے اطمینان بھری گہری سانس لی۔ وہ یہ سب باتیں نائلہ کو بتانا چاہتا تھا مگر وہ سننے کو تیار نہیں تھی۔ اس لیے اماں جی کے کہنے پر وہ چپ ہو کر تماشا دیکھنے لگا۔ اماں جی جانتی تھیں کہ بہت جلد نائلہ کے سامنے سچ آجائے گا اور ایسا ہی ہوا تھا۔

☆☆☆

"پھر کیا ہوا؟"

اقرا نے حیرانی سے استفسار کیا۔ تو سامنے بیٹھی نائلہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ آج بھائی اور بھابھی اس کی پہلی عیدی لے کر آئے تھے۔ نائلہ خوشی سے بات بے بات ہنس رہی تھی۔

"ہونا کیا تھا اقرا بھابھی! اگلے دن سے اماں جی نے کمانڈ سنبھال لی۔ بس فرق یہ ہے کہ اس بار میں ان کی فوج میں شامل ہوں۔"

نائلہ نے شرارت سے کہا تو اقرا زیر لب مسکرا دی۔

"یعنی کہ دشمنوں پر اچانک حملہ ہوا۔" اقرا نے شرارت سے کہا۔

"کافی دھچکا لگا۔ شاید ابھی بھی شاک میں ہیں۔"

نائلہ نے ہنستے ہوئے کہا۔ اس کی نگاہوں کے سامنے ہما اور حمیرا کے حیران چہرے گھوم رہے تھے، جب اس دن کے بعد سے اماں جی نے پہلے کی طرح اپنی جگہ سنبھال لی۔ اماں جی کو فارم میں دیکھ کر وہ دونوں ہکا بکا رہ گئیں۔ زیادہ حیرانی انہیں نائلہ اور اماں جی کی کیمسٹری پر ہو رہی تھی۔ ایک بات، ایک سوچ، ایک عمل......!

"اچھی بات ہے مگر......" اقرا کچھ کہتے کہتے رک گئی اور پھر نفی میں سر ہلایا۔

"ہر گھر کا ماحول، طور طریقے، نظم و ضبط سب الگ الگ ہوتے ہیں۔ میں غلط تھی کہ میں نے تمہیں صورت حال سمجھے بغیر قدم اٹھانے کی ترغیب دی مگر شکر ہے کہ تم نے وقت پر سب ٹھیک کر لیا۔"

اقرا نے کھلے دل سے اپنی غلطی کا اعتراف کیا۔ دراصل یہ ہماری سب سے بڑی خامی ہوتی ہے کہ ہم دوسروں کے وقت، حالات، پس منظر کو سمجھے بغیر فوراً مشورہ دے دیتے ہیں کہ

"ہمارے یہاں تو ایسا نہیں ہوتا ہے۔"

سوال "ہمارے یہاں" کا نہیں، سوال اس "گھر" کا ہوتا ہے جہاں کے مکینوں کے ساتھ زندگی گزارنی ہوتی ہے۔"

"جی بھابھی! میں سمجھ چکی ہوں کہ زندگی وہ میزبان ہے جو اپنی میز پر بیٹھنے والوں میں، ان کے حساب، ان کے ظرف کے مطابق ہی چیزوں، رویوں، رشتوں کی بانٹ کرتی ہے۔ ہمارا ہنر یہ ہونا چاہیے کہ ہم اس بانٹ کو دل سے قبول کریں۔"

نائلہ نے گہری مسکراہٹ کے ساتھ کہا تو اقرا نے ستائش بھری نگاہوں سے اس کی طرف دیکھ کر سر ہلایا۔ وہ جو نائلہ کو نادان سمجھ کر عقل کے سبق پڑھانے آئی تھی، آج اس سے زندگی کا اہم سبق سیکھ کر جا رہی تھی۔

☆

کیے میں ہر چیز میں سے تم لوگوں کا حصہ نکال دیتی۔ اب ایمان داری سے بتاؤ کہ پچھلے دو مہینے سے کیا تمہیں گھر میں پکائی یا بنی کسی چیز میں سے اپنا صحیح حصہ ملا ہے؟"

اماں جی نے سوال کیا تو نائلہ نے شرمندگی سے نفی میں سر ہلایا۔

"یہ سچ ہے کہ ہمیں بچا ہوا ملتا ہے یا اکثر وہ بھی نہیں۔ تب احسن باہر سے کھانا لے کر آتے ہیں۔"

نائلہ نے سر جھکا کر اعتراف کیا۔ اماں جی مسکرا دیں۔

"بیٹی! بڑوں کے بہت سے عمل، باتیں، سوچیں عجیب و غریب ضرور لگتی ہیں مگر یہ ان کی عمر کا نچوڑ، ان کے تجربات کا حاصل ہوتا ہے۔ اس لیے انہیں سمجھنا سیکھو۔ زندگی میں اکثر دوسروں کے تجربات بھی کام آجاتے ہیں۔"

اماں جی نے کہا تو نائلہ نے فرماں برداری سے سر ہلا دیا۔ احسن نے اطمینان بھری گہری سانس لی۔ وہ یہ سب باتیں نائلہ کو بتانا چاہتا تھا مگر وہ سننے کو تیار نہیں تھی۔ اس لیے اماں جی کے کہنے پر وہ چپ ہو کر تماشا دیکھنے لگا۔ اماں جی جانتی تھیں کہ بہت جلد نائلہ کے سامنے سچ آجائے گا اور ایسا ہی ہوا تھا۔

☆☆☆

"پھر کیا ہوا؟"

اقرا نے حیرانی سے استفسار کیا۔ تو سامنے بیٹھی نائلہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ آج بھائی اور بھابھی اس کی پہلی عیدی لے کر آئے تھے۔ نائلہ خوشی سے بات بے بات ہنس رہی تھی۔

"ہونا کیا تھا اقرا بھابھی! اگلے دن سے اماں جی نے کمانڈ سنبھال لی۔ بس فرق یہ ہے کہ اس بار میں ان کی فوج میں شامل ہوں۔"

نائلہ نے شرارت سے کہا تو اقرا زیر لب مسکرا دی۔

"یعنی کہ دشمنوں پر اچانک حملہ ہوا۔" اقرا نے شرارت سے کہا۔

"کافی دھچکا لگا۔ شاید ابھی بھی شاک میں ہیں۔"

نائلہ نے ہنستے ہوئے کہا۔ اس کی نگاہوں کے سامنے ہما اور حمیرا کے حیران چہرے گھوم رہے تھے، جب اس دن کے بعد سے اماں جی نے پہلے کی طرح اپنی جگہ سنبھال لی۔ اماں جی کو فارم میں دیکھ کر وہ دونوں ہکا بکا رہ گئیں۔ زیادہ حیرانی انہیں نائلہ اور اماں جی کی کیمسٹری پر ہو رہی تھی۔ ایک بات، ایک سوچ، ایک عمل......!

"اچھی بات ہے مگر......" اقرا کچھ کہتے کہتے رک گئی اور پھر نفی میں سر ہلایا۔

"ہر گھر کا ماحول، طور طریقے، نظم و ضبط سب الگ الگ ہوتے ہیں۔ میں غلط تھی کہ میں نے تمہیں صورتحال سمجھے بغیر قدم اٹھانے کی ترغیب دی مگر شکر ہے کہ تم نے وقت پر سب ٹھیک کر لیا۔"

اقرا نے کھلے دل سے اپنی غلطی کا اعتراف کیا۔ دراصل یہ ہماری سب سے بڑی خامی ہوتی ہے کہ ہم دوسروں کے وقت، حالات، پس منظر کو سمجھے بغیر فوراً مشورہ دے دیتے ہیں کہ

"ہمارے یہاں تو ایسا نہیں ہوتا ہے۔"

سوال "ہمارے یہاں" کا نہیں، سوال اس "گھر" کا ہوتا ہے جہاں کے مکینوں کے ساتھ زندگی گزارنی ہوتی ہے۔"

"جی بھابھی! میں سمجھ چکی ہوں کہ زندگی وہ میزبان ہے جو اپنی میز پر بیٹھنے والوں میں، ان کے حساب، ان کے ظرف کے مطابق ہی چیزوں، رویوں، رشتوں کی بانٹ کرتی ہے۔ ہمارا ہنر یہ ہونا چاہیے کہ ہم اس بانٹ کو دل سے قبول کریں۔"

نائلہ نے گہری مسکراہٹ کے ساتھ کہا تو اقرا نے ستائش بھری نگاہوں سے اس کی طرف دیکھ کر سر ہلایا۔ وہ جو نائلہ کو نادان سمجھ کر عقل کے سبق پڑھانے آئی تھی، آج اس سے زندگی کا اہم سبق سیکھ کر جا رہی تھی۔

☆

دردِ دل کے واسطے

شمائلہ دلعباد

دوسرے عشرے کا چوتھا روزہ تھا۔ ماریہ نے قرآن جزدان میں لپیٹ کر وقت دیکھا تو عصر کی اذان میں ابھی وقت تھا۔ تینوں بچے بھی سو رہے تھے۔ سلمان کے دفتر میں افطار ڈنر تھا۔ اس لیے وہ تو بارہ بجے سے پہلے گھر آنے والا نہیں تھا۔ ماریہ نے قرآن سامنے رکھی لکڑی کی خوب صورت منقش رحل پر رکھا اور دعا کے لیے ہاتھ اٹھا دیے۔

"یا اللہ تو ہی بھرم رکھنے والا ہے، کوئی سبب بنا دے، ہر سال کی روایت کہیں ٹوٹ ہی نہ جائے، رب العالمین ہمارا بھرم بنائے رکھنا۔ آمین۔" کہہ کر اس نے جیسے ہی چہرے پر ہاتھ پھیرے تو احساس ہوا آنسو خود ہی گالوں تک چلے آئے ہیں۔

بھاری دل کے ساتھ اس نے قرآن کریم کو الماری میں مخصوص جگہ پر رکھا اور خود صوفے پر بیٹھ کر ٹانگیں پسار کر فون اٹھا لیا۔ سوشل میڈیا پر ہر طرف اسے افطار کے لیے طرح طرح کے سجے دسترخوان کے اسٹیٹس ہی نظر آئے۔ واٹس ایپ پر بھی افطاریوں کا ذکر دیکھ کر اس نے دل برداشتہ ہو کر فون رکھ دیا۔

ایسا نہیں تھا کہ گھر میں غربت تھی، اچھے حالات تھے۔ تین بچے، ان کے اسکول کے اخراجات، گھرداری اور دن بہ دن بڑھتی مہنگائی نے پچھلے دو سال سے کی ہوئی بچت بھی استعمال کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔

اب تو یہ حال تھا کہ گھر اچھے سے چل رہا تھا لیکن ہر سال کی طرح وہ جو قریبی رشتے داروں کی افطاری کروایا کرتے تھے وہ اس مرتبہ ناممکن لگ رہا تھا۔ ماریہ اور سلمان کو یہی ٹینشن کھائے جا رہی تھی اس سال اگر افطار پارٹی اور ڈنر کا اہتمام نہ ہوا تو سب کیا کہیں گے۔

سلمان اسے تسلی تو دے رہا تھا کہ آخری عشرے تک کچھ نہ کچھ انتظام کر لے گا لیکن اسے سلمان کی بھی پریشانی تھی کہ کیسے کرے گا۔ تین نندوں کو عیدی بھی پہنچانی ضروری تھی۔ ماریہ کو یوں لگ رہا تھا ہر آنے والا سال عبادت کی لذت بھی ختم کرتا جا رہا ہے۔

مہنگائی کا بھوت عوام کی جان کو ایسا چمٹا تھا کہ رمضان المبارک میں صدقات و خیرات کی خوشی چھین کر روزی روٹی کی ٹینشن میں زیادہ مبتلا کر رہا تھا۔ آج کچھ کرنے کو نہیں تھا تو یہ سوچیں اسے زیادہ پریشانی میں مبتلا کر رہی تھیں۔ ورنہ پہلے تو اس وقت وہ کچن میں افطاری بنانے اور بچوں کو ہوم ورک کروانے میں ہلکان ہوئی رہتی تھی۔ چھٹی کے سبب صبح نہ بچوں کا اسکول تھا نہ سلمان کا دفتر، جب ہی تو دفتر والوں نے افطار ڈنر کا انتظام کر لیا تھا۔

ماریہ کو اپنے لیے افطاری کا اہتمام مشکل لگا تھا اس نے کل کے بچے پکوڑوں کو اوون میں گرم کر کے سکنجبین اور کھجور کے ساتھ افطاری کا سوچا ہوا تھا۔ بچوں کے لیے ترکاری اور سادہ روٹی وہ مغرب کے

بعد بناتی تھی۔ میز پر پڑے فون کی تیز بیل نے اسے سوچ سے نکالا۔ اس کے سب سے بڑے بھائی کی کال تھی۔

حال احوال کے بعد انہوں نے فوراً پوچھا۔

''ابو جی ابھی نہیں پہنچے؟''

''نہیں تو، مجھے تو پتا ہی نہیں ابو جی آ رہے ہیں۔''

''تمہیں عیدی دینے آ رہے ہیں۔''

''لیکن وہ تو آخری عشرے میں آتے ہیں۔'' باپ کا تصور ہی ماریہ کے چہرے پر مسکراہٹ لے آیا۔

''کب سے نکلے ہوئے ہیں؟''

''کوئی گھنٹہ بھر تو ہو گیا ہوگا۔'' اسی اثناء میں کال بیل ہوئی تو وہ بے ساختہ بولی۔

''لو پہنچ گئے۔''

''پھر بھی پوچھ کر دروازہ کھولنا۔''

''ٹھیک ہے بھائی، اللہ حافظ۔''

باپ کے مسکراتے چہرے اور ڈھلکے کمزور شانوں کے ساتھ لگ کر ماریہ کو لگا۔ جب تک یہ مشفق چہرہ اور کمزور وجود نظر آتا ہے، زندگی خوب صورت ہے۔

☆☆☆

مختلف قسم کے خیالات نے وہ جو ذہن و دل پر مردنی ڈالی ہوئی تھی ماریہ کو لگا ابو کے آنے کے بعد یک لخت ختم ہو گئی ہے۔ بچے نانا ابو کو گھیرے میں لیے بیٹھے تھے وہ بھی بات بے بات مسکرا رہے تھے۔ ان کی سادہ اور بنا تلی ہوئی خوراک کھانے کی عادت کی پیش نظر ماریہ نے چھوٹا باؤل ونیلا کسٹرڈ کا بنا کر فریج کے اوپر والے خانے میں رکھا۔ خود مختلف شیپ میں فروٹ کاٹ رہی تھی تاکہ کسٹرڈ میں ڈال سکے۔ بریانی کی بڑی پلیٹ ہمسائی نے بھیج دی تھی۔ وہ لال شربت کے لیے چینی مکس کر رہی تھی جب حبیب احمد اس کے پاس کچن میں ہی چلے آئے۔

''ابو جی! ادھر بہت گرمی ہے، آپ لاؤنج میں بیٹھیں۔''

''بیٹی! تم بھی تکلف میں نہ پڑو، دو پانی کے گلاس اور آدھی روٹی میری خوراک ہے۔ زیادہ کھالیا تو سحری نہیں کی جاتی۔''

''اچھا آپ چلیں، میں آتی ہوں۔'' ماریہ کو لگا وہ اس سے بات چیت کرنے کو بے چین ہیں۔ ''ابو جی کا بس نہیں چل رہا کچن میں ہی مجھے عیدی پکڑا دیں۔'' وہ ہر سال عید پر پیسے ہی دیا کرتے کہ خود جو بھی لینا ہے خرید لینا۔

افطاری کے بعد بچوں نے ہمیشہ کی طرح اودھم مچائے رکھا جب کہ ماریہ چائے کے کپ لے کر باپ کے پاس بیٹھ گئی۔ انہوں جائے نماز سمیٹی اور بیٹی کے قریبی صوفے پر بیٹھ کر چائے کا کپ پکڑ لیا۔

''اور سناؤ بیٹا، سب اچھا چل رہا ہے، سلمان تو اچھا رہتا ہے تمہارے ساتھ؟''

ماریہ بے ساختہ ہنسی۔

''ابو! آپ بارہ سال سے یہی سوال پوچھ رہے ہیں۔'' بیٹی کے مسکراتے مطمئن چہرے کو دیکھ کر انہوں نے ڈھیر دعائیں دے ڈالیں۔ چائے کی آخری چسکی بھر کے انہوں نے کرتے کی جیب میں ہاتھ ڈالا، ان کے ہاتھ میں ہزار ہزار کے کافی نوٹ تھے۔

''یہ لو اپنی عیدی۔'' ماریہ حیران سی ان کے ساتھ صوفے پر جا بیٹھی۔

''ابو جی، یہ اتنے پیسے؟''

''بیٹا! پنجاب والی زمین کا ٹھیکہ لیٹ ہو گیا تھا، اب ملا ہے تو سوچا عید کے ساتھ جتنا تمہارا حصہ بنتا ہے تمہیں بھی دے دوں۔ تیس ہزار ہیں۔''

ماریہ کو معلوم تھا پنجاب میں اس کے دادا کی تھوڑی سی اراضی تھی۔ جس کا کبھی سال بعد کبھی دو سال بعد ٹھیکہ کاشت کرنے والے مزارعے خود پہنچا جاتے تھے۔

ماریہ کا دل بھر آیا۔ آج سارا دن اس کا روم روم دعا کرتا رہا تھا۔ اسے خبر ہوتی آج کا دن قبولیت

کا تھا تو جانے اور کیا کیا نہ مانگ لیتی۔
"بٹیا، ادھر لاؤنج میں ہی سوئیں گے ناں؟"
"نہیں ابو! آپ بچوں کے کمرے میں سوئیں گے۔ سلمان آپ کے پاس سو جائیں گے۔"
"سلمان کو رہنے دو بیٹا! وہ داماد ہے۔ کیا سوچے گا میں اس عمر میں بھی ڈرتا ہوں۔ پہلے کی طرح ادھر لاؤنج میں دو چار پائیاں لگا لو۔ صوفہ ہم مل کر پیچھے ہٹا لیتے ہیں۔"
"نہیں ابو! آپ ٹینشن نہ لیں۔ سلمان کو پتا ہے آپ اکیلے نہیں سو سکتے۔ انہیں آپ کے پاس لیٹنے میں کوئی ایشو نہیں ہے۔"
"اللہ آباد رکھے تمہیں۔" وہ عجیب یاس بھرے لہجے میں بولے۔
"ویسے ابو جی! آج بتا ہی دیں کیوں ڈرتے ہیں آپ، اکیلے کیوں نہیں سو سکتے۔"
"چھوڑو بیٹا! جب تک تمہاری اماں یاسمین کا ساتھ تھا، کبھی یہ محتاجی نہ ہوئی تھی اب تو محتاجی ہی لگتی ہے۔"
"کیا مطلب ابو جی! آپ کو امی کی وفات سے پہلے سے ڈر لگتا ہے۔ کہیں بچپن سے ہی تو اس نفسیاتی عارضے میں مبتلا تو نہیں ہیں؟"
"ارے نہیں ماریہ! یہ کوئی اور قصہ ہے۔"
"کون سا قصہ؟ کیا کوئی جن پری عاشق ہو گئی تھی آپ پہ؟" ماریہ کا انداز ہلکا پھلکا اور متجسس تھا۔
"جن، پری نے کیا کہنا بیٹا! یہ تو اپنی غلطیوں کی سزا ہوتی ہے۔ کچھ غلطیاں شاید قابل معافی نہیں ہوتیں۔"
ماریہ اب عجیب سی کیفیت میں گھر گئی۔ باپ کے چہرے کا پچھتاوا اسے معاملہ کریدنے پر مجبور کر گیا۔ اس کے بے انتہا اصرار پر بالآخر انہوں نے لب کشائی کر ہی لی۔

☆☆☆

"میں بچپن سے ہی نماز روزے کا پابند تھا، قسمت سے تمہاری ماں بھی میری والی فطرت کی مالک مل گئی۔ زندگی اچھی گزرنے لگی۔ ویسے تو سارا سال ہی ہم دونوں میاں بیوی خوب خیر خیرات کا اہتمام کیا کرتے تھے لیکن رمضان شریف میں محلے دار، رشتے دار اور دفتر کے لوگوں کا روزہ افطار کرانا تو جیسے مجھ پر فرض تھا۔
عموماً انیسویں روزے کو افطاری رکھتا تاکہ وہ لوگ جنہوں نے اعتکاف میں بیٹھنا ہے، وہ بھی میرے گھر افطاری کر لیں۔
افطاری کے اگلے دن دفتر، محلہ حتیٰ کہ رشتے دار بھی جب تعریف کرتے کہ حبیب نے افطاری پر بڑا پیسہ لگایا ہے۔ مجھے لگتا ساری محنت وصول ہو گئی، سینہ فخر سے چوڑا ہو جاتا۔ میں اسی دن اگلے سال کی افطاری کے بارے میں سوچنا شروع کر دیتا، کون کون سے کھانے رکھوں گا۔ کیسے دوسروں سے منفرد افطار پارٹی ہوگی وغیرہ وغیرہ۔
مجھے آج بھی یاد ہے۔ سولہواں روزہ تھا اور انیسویں روزے کو میں نے گھر میں افطار کرانا تھا۔ سارے یار دوست، رشتے داروں کو ٹیلی فون کر چکا تھا۔ جن سے روزانہ کی بنیاد پر ملاقات ہوتی تھی ان کو بہ نفس نفیس بھی مدعو کر چکا تھا۔ یوں سمجھ لو، گھر میں سالانہ ... افطار ڈنر کی زور و شور سے تیاری تھی۔
میں نماز عصر ادا کر کے گھر آ رہا تھا کہ آصف گپی سے سامنا ہو گیا۔ وہ گپیں ہانکنے کا شوقین اور ادھار مانگ کر وقت پر واپس نہ کرنے کی بدنام شہرت رکھتا تھا۔ مجھ سے بھی ایک دو بار ادھار لے کر واپسی میں لمبی ٹال مٹول کر چکا تھا۔
میرے دماغ نے پہلے ہی الارم بجا دیا کہ یہ اب بھی مجھ سے پیسے ہی مانگے گا۔ بہانہ وہی پرانا بچہ بیمار، بیوی بیمار، ماں بیمار یا پھر کوئی چاچا ماما فوت ہو گیا، وہاں جانا ہے۔ خدشے کے عین مطابق اس نے پیسے ہی مانگے، وہ بھی پانچ دس ہزار نہیں پورے چالیس ہزار۔ بہانا بھی پرانا ہی تھا بچہ بیمار ہے سر پر چوٹ لگی ہے، ڈاکٹر نے آپریشن کا کہا ہے ورنہ نظر چلی جائے گی۔

میں نے صاف انکار کرتے ہوئے بتایا کہ میری بچت تو افطار کرانے میں لگ رہی ہے۔ افطاری نہ رکھی ہوتی تو ضرور دے دیتا۔ اس نے ہمیشہ والے لاابالی انداز میں کہا۔

یار! جو اپنے گھر میں روزہ رکھ سکتا ہے، وہ کھول بھی لے گا۔ یہی ہوگا کہ تمہارے گھر کا مرغ مسلم اور الا بلا نہ کھا سکے گا۔ سادہ دال روٹی کھالے گا لیکن کھا کر ہی سوئے گا۔

میں نے کہا۔ ''نہیں بھئی اب میں اپنی بے عزتی نہیں کروا سکتا اور اس کے پاس سے فوراً ہی ہٹنے کی، کی۔ وہ میرے پیچھے انسانی جان بچانے کی کوئی بات شات کر رہا تھا پر میں نے سننے کی کوشش نہیں کی۔

افطاری والے دن حسب سابق سب تعریفیں کر رہے تھے۔ مسجد کھچا کھچ بھری ہوئی تھی۔ نماز مغرب کے بعد کھانے کا دور چلتا تھا کہ امام صاحب نے بچے کی نماز جنازہ کا اعلان کر دیا جو مغرب کے فوراً بعد تھی۔ جب ہم مسجد کے پیچھے والی جنازہ گاہ پہنچے تو مجھے صحیح معنوں میں پتہ چلا۔ یہ جنازہ تو آصف کچی کے سات، آٹھ سالہ بیٹے کا تھا۔ صبح سے افطاری کے انتظامات کرتے مجھے اپنی ہوش نہ تھی تو میں کیسے غور کرتا، کس کا بچہ دنیا سے چلا گیا۔

وہیں پر کسی کو کہتے سنا۔ اللہ کسی غریب کو امیروں والی بیماری نہ دے، بچہ علاج نہ ہونے کی وجہ سے مر گیا۔''

حبیب احمد بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رو رہے تھے۔

''ماریہ میری بیٹی! میں نے خود پر ایک اور ظلم کیا۔ میں نے سفید کفن اٹھا کر اس کا چہرہ دیکھ لیا۔ وہ بچہ اب مجھے سونے نہیں دیتا، یہاں، یہاں آ کر بیٹھ جاتا ہے۔ وہ اپنے سینے پر ہاتھ مار رہے تھے۔ بچے ماں اور نانا کو یوں دھواں دھار روتے دیکھ کر اپنی چوکڑیاں بھول گئے۔

ماریہ نے باپ کی کمر سہلانی شروع کر دی۔

''ابو! ہم نے ہمیشہ آپ کو ایک رحم دل اور دوسروں کی مدد کرنے والا انسان ہی پایا ہے۔ ان شاء اللہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔''

''میرا بچہ! میرا پچھتاوا نہیں جاتا، کیا تھا جو اس سال حبیب احمد کے گھر افطاری نہ ہوتی۔ صرف تعریف و توصیف نہ ملتی، میرے نفس کی تسکین نہ ہوتی۔ دکھاوا نہ ہوتا تو کیا پتا آج وہ بچہ کسی دوسرے کی خدمت کر رہا ہوتا۔''

''ابو! اس کی لکھی ہی اتنی تھی۔''

دل کے بہلانے کو غالب، یہ خیال اچھا ہے۔

وہ بدستور افسردہ تھے۔ یاد ماضی نے انہیں نڈھال کر ڈالا تھا۔ جونہی فضا میں عشاء کی تقدس بھری اذان گونجی، وہ باپ بیٹی وضو کے لیے اٹھ گئے کہ نماز کے ساتھ تراویح بھی اہتمام سے پڑھتے تھے۔

☆☆☆

اگلی صبح سلمان نے سحری میں صرف چند چمچے دہی کھایا البتہ چائے اس نے ماریہ اور حبیب احمد کے ساتھ ہی پی۔ نماز کے بعد وہ سویا تو ماریہ کو خبر تھی بارہ سے پہلے نہیں اٹھنے والا۔ اسی لیے خود ہی اوبر کرلی۔ باپ کو رخصت کر کے چند پل سونے کی غرض سے لیٹی تو دل و دماغ میں باپ والا قصہ ہی گھوم رہا تھا۔ وہ کروٹ پر کروٹ بدلتی رہی جب سلمان نے اس کی طرف کروٹ لے لی۔

''کیا بات ہے ماریہ، نیند نہیں آ رہی تو نہ لیٹو۔ مجھے بھی ڈسٹرب کیے جا رہی ہو۔''

''سونے کا ارادہ تو تھا پر لیٹی ہوں تو ابو کو ہی سوچے جا رہی ہوں۔''

''سوچنے کی کیا بات ہے، آج بھی ادھر ہی رکھ لو۔''

''وہ تو گھر بھی پہنچ چکے ہوں گے۔''

''چلے گئے؟'' سلمان حیران ہوا۔

''جی اوبر منگوا دی تھی۔''

''اداس ہونے کی کیا بات ہے، جس دن کہو گی تمہیں چھوڑ آؤں گا۔''

''نہیں اس بات کی اداسی نہیں۔ بس ان کی صحت دیکھ کر ٹینشن ہوئی ہے کس قدر کمزور ہوتے جا رہے ہیں۔''
''عمر کا بھی تقاضا ہے۔''
''اتنی بھی عمر نہیں ہے میرے ابو کی، بس بیماریاں وقت سے پہلے کمزور کر رہی ہیں۔'' ماریہ فوراً برا منا جاتی تھی۔
سلمان ہنس دیا۔
''میں تو بھول ہی گیا چچا جان کو کم عمر ثابت کرو گی تب ہی تو خود کو چھوٹی بنا کر پیش کر پاؤ گی۔ تین بچوں کی اماں جان ہو کر بھی کم سن ہو۔''
ماریہ نے گھور کر اسے دیکھا تو سلمان کو بچوں کے نام پر جیسے کچھ یاد آ گیا۔
''یار! چاچے شریف کی بیٹی کا بیٹا ہوا ہے ماں بچے دونوں کو بیماری لاحق ہے، دس دس ہزار کی ویکسین ہے۔ کل چاچا بہت پریشان تھا۔''
چاچا شریف، سلمان کے دفتر کا چوکیدار تھا۔ ماریہ اکثر بچوں کے چھوٹے ہو جانے والے کپڑے اس کے بچوں کو بھیجتی رہتی تھی۔
''کہہ رہا تھا باس سے بات کر کے اسے ایڈوانس لے کر دوں۔ میں نے کہا باس تو ایک روپیہ نہیں دینے والا، عید پر ہزار ہزار کا بونس کیسے دے رہا ہے۔ کہہ رہا تھا خود دے دوں یا کسی اور سے اپنی گارنٹی پر ادھار لے دوں۔ میں نے سمجھایا۔ چاچا عید کا موقع ہے ہر بندہ مہنگائی کے ہاتھوں تنگ ہے سرکار تو کچھ سوچنے والی نہیں، سب ہی اپنا اپنا سوچ رہے ہیں۔ آپ بھی خود ہی کوئی راستہ نکال لو۔''
ماریہ جو بغور شوہر کی باتیں سن رہی تھی فوراً پوچھنے لگی۔
''کتنے پیسے مانگ رہا ہے چاچا؟''
''بیس ہزار کہہ رہا تھا۔'' سلمان نے سر کے نیچے سے تکیہ نکال کر دور رکھتے ہوئے جواب دیا۔
ماریہ نے اپنا تکیہ بھی اٹھا کر سائیڈ پر رکھا اور بے آواز بیڈ کراؤن میں بنی دراز کھولی۔ کل والے تیس ہزار اسی میں رکھے ہوئے تھے، اس میں سے بیس ہزار نکال کر سلمان کی طرف بڑھا دیے۔
''یہ آج ہی چاچا شریف کو دے آئیں، کچھ فروٹ بھی ساتھ لے کر جائیں گے زچہ کے لیے۔''
''ماریہ! یہ پیسے کہاں سے آئے؟'' اب وہ بھی اٹھ کر بیٹھ چکا تھا۔
''ابو! عیدی اور زمین کے ٹھیکے میں سے میرا حصہ دے کر گئے ہیں۔''
''لو یار! پھر تو ہمارا بھی افطار پارٹی کا مسئلہ حل ہو گیا۔ گھر میں اتنی ٹینشن ہے تم کہہ رہی ہو چاچے کو دے آؤ۔ باس کے آگے ایڈوانس کے لیے منت کرنے سے بہتر ہے، ہم اپنی رقم سے کل ہی گھر میں افطار ڈنر رکھ لیتے ہیں۔ ایڈوانس کی کٹوتی میں اگلے مہینوں میں خواہ مخواہ تنگی برداشت کرنے کی کیا ضرورت ہے؟''
''ہم افطار ڈنر نہیں ارینج کر رہے سلمان! جب باس نہیں ہے تو دکھاوے یا تنگ ہو کر روایت نبھانے کی کیا ضرورت ہے؟''
''حد ہو گئی یار! گھر میں پیسے آ گئے ہیں اس کے باوجود ہم کسی کو دے دیں۔ اپنی شان نہ بنائیں؟''
سلمان جھنجلا گیا تو ماریہ نے باپ والا سارا قصہ من وعن سنا ڈالا۔
ساری بات سننے کے بعد وہ چند پل اس کا چہرہ اور بھیگی آنکھیں دیکھتا رہا، پھر بولا۔
''میں نہا لوں تب تک تم بچوں کو دیکھ لو۔ ظہر ادا کرنے کے بعد اکٹھے ہی چاچے شریف کی طرف نکلتے ہیں۔''
ماریہ کھل اٹھی، جب وہ چاچے شریف کو بنا ادھار کے بیس ہزار پکڑا رہے تھے تو ان سب کی گیلی آنکھیں اور مسکراتے لب جو دعائیں دے رہے تھے۔ ماریہ کو یقین تھا۔ وہ دعائیں رائیگاں نہیں جائیں گی۔

☆

نازیہ رزاق

دل کو یہ دعا ہے

پنجاب کی سردیاں بلاشبہ اپنا سحر قائم کر سکتی ہیں مگر کچھ لوگوں کا حصار بڑا ڈھیٹ ہوتا ہے۔ جاتے دسمبر کے دنوں کی کڑاکے والی سردی تھی۔ منہ سے نکلی بھاپ اور جلد کا رواں تک جم چکا تھا۔ رات اتنی سیاہ تھی کہ دھند تک کوئلہ رنگ دکھتی۔

گیارہ بجتے ہی حاجی صاحب نے سکون کی کروٹ لی اور اگلی تیسری سانس لیتے ہی خراٹوں کا اسٹریو چل پڑا۔ یہ سکون انہیں مخصوص آواز سے ہی ملتا تھا۔ دروازے کا کھلنا...... موٹر سائیکل کا اندر آنا اور بھرپور مردانہ قدموں کی آہٹیں۔ کچھ دیر کو طوطوں کے پنجرے میں جوش سا لہراتا۔

''بھایا آیا...... بھایا آیا!'' توتے بولتے اور حاجی صاحب کی بتی گل۔

ہاں...... مگر وہ جو گیٹ کھولتا ...... آہٹیں پیدا کرتا وہ ہیلمٹ اتارتا، جیکٹ دستانے لاؤنج میں مخصوص جگہ رکھتا اور خراٹوں کی دھنیں بناتے حاجی صاحب کے کمرے میں جاتا۔ روشنی بجھاتا اور کچن میں چلا آتا۔ کھانا گرم کیا۔ کھایا اور اپنے کمرے کی راہ لی۔ فون کھولا، کوئی پیغام دیکھا، دل کیا تو جواب لکھا ورنہ الارم لگا کے رضائی لپیٹی اور بس...... دن ختم، یہ

ناولٹ

روزانہ کا کام تھا۔ جانے کتنے سالوں سے۔ دسمبر اسے یونہی ''اپنے جیسا'' پاتا...... سرد...... مصروف...... لگاتار سا۔

☆☆☆

صبح وہ مخصوص وقت پہ اٹھا تھا۔ پچھتر فیصد آبادی کی طرح وہ فجر ضرور پڑھتا، صرف فجر۔ دودھ لے کر آیا تو حاجی صاحب چائے کی پیالی سامنے رکھے متفکر سے بیٹھے تھے۔ وہ سامنے بیٹھتے، اخبار دیکھتا بولا۔

''اتنے رنجیدہ کیوں ہیں والد صاحب؟'' وہ اس کے لیے بھی باقی سب کی طرح حاجی صاحب، ہی تھے مگر طنزاً وہ انہیں والد ہی بولتا۔

''او یار...... تجھے پتا تو ہے ہی فضا کی طبیعت کا بس اسپتال لے جانے کا وقت آیا ہی چاہتا ہے۔

تو سوچتا ہوں، گھر کیسے چلے گا؟ آدم اور اذبان کی دفعہ تو بہو کی ماں حیات تھیں اور اب کے تو ڈاکٹر نے بھی سیزیرین بتایا ہے۔ ہم پورا ٹبر (خاندان) اور وہ بے چاری بیار بچی...... گھر کیسے چلے گا؟"

"ہاں تو آپ شیراز سے بات کریں، کیا کہتا ہے وہ؟" اخبار لپیٹتا وہ گفتگو کو تیار ہوا۔ کچن کے دروازے پہ کھڑی فضا نے ابھی سے گھبرانا شروع کر دیا کہ دیور کی زبان اب گولے داغنے کو تیار ہوگئی تھی۔

"بات کی تھی میں نے اس سے، کہہ رہا تھا کہ فضا کو اس کے میکے چھوڑ دیں گے، اس کی بھابھی دیکھ لیں گی اور......"

"یہ تو کمال ہی کہہ دیا اس نے۔ حیرت ہے یہ بات ہم کم عقلوں نے کیوں نہ سوچی؟"

حاجی صاحب بڑبڑائے۔

"اس عقل کل بیٹے سے ذرا یہ بھی پوچھنا تھا کہ بیوی کا سوچ لیا، بوڑھے باپ اور جوان بھائی کا کیا ہوگا۔ وہ دو ماہ کیسے رہیں گے یہ بھی بتا دے اور ذرا دیکھ لیں، آپ اپنی اکلوتی دختر کی احسان فراموشیاں۔ تین ماہ پہلے عفیفہ کی پیدائش پہ بھابھی ڈیڑھ ماہ اس کی سیوا کر کے لوٹی تھیں اور میں ایف بلاک سے کھانے لالا کے ہلکان ہوگیا تھا۔ اب محترمہ کہہ رہی ہیں کہ چھوٹے بچوں کے ساتھ کیسے سنبھالوں گی تم لوگوں کو۔ ابھی بھی تو ایف بلاک سے کھانے پیک کے آ سکتے ہیں ناں؟ مگر نہیں عائشہ ادریس کسی کی چاکری کے لیے پیدا ہی نہیں ہوئی۔"

اور یہ بھابھی کو بھی بڑا جنون ہے سپر لیڈی بننے کا۔ کل سارا گھر تلپٹ کر کے رکھ دیا۔ کہا جی کہ میں ہاسپٹل جانے سے پہلے سارے گھر کی تفصیلی صفائی کروالوں صفیہ سے۔ صفیہ تو چلی گئی گھر مگر یہ لگی رہیں پردے، لحاف دھونے میں۔ حد ہے یعنی کہ...... عقل نام کی بھی کوئی شے اس دنیا میں میسر ہے۔ بھئی اور یہ گھر والے۔"

وہ شروع ہو چکا تھا۔ شروع سے ہی منہ پھٹ تھا۔ وقت نے اس شیرے میں ضد اور اصول پرستی کا مغز ڈال کے وہ لڈو بنا دیا تھا کہ اب وہ یہ لڈو ہر ایک کے حلق میں ٹھونس دیتا یوں کہ سانسیں ہی بند ہو جائیں اگلے کی۔ یہ اثر انداز ہو جانے والی خصلتیں بھی ناں......

"شیراز کہہ تو رہا تھا کہ گاؤں سے کسی عورت کو بلوائے گا۔ اب دیکھو۔ عاشی بھی شام تک آنے کا کہہ رہی تھی۔ ہسپتال میں تو وہی رہے گی۔" حاجی صاحب اس کی للکاروں سے اکتائے بولے۔

"اور یہی بات فقط سات منٹ پہلے کہہ دیتے آپ تو میں یوں جلسہ نہ لگا کے بیٹھا ہوتا۔"

"یعنی الٹا چور...... کھوتا۔" حاجی صاحب نے زیر لب یہی کہا جبکہ گوہر ادریس...... اسکول جاتے آدم کی ٹائی باندھ رہا تھا۔

☆☆☆

گورنمنٹ کالج برائے بوائز کے اسٹاف روم میں وہ اپنے گروپ کے ساتھ بیٹھا کسی اسائنمنٹ پہ کام کر رہا تھا جب نوید تارڑ صاحب ہنستے ہوئے آن بیٹھے۔ اس کی دوستی سب ادھیڑ عمر پروفیسرز کے ساتھ ہی تھی کہ جوان استاد اس کے سامنے دبتے تھے اور دوستی میں صرف برابری ہی تو شرط ہے۔

"یار گوہر! تم بھی ناں۔" نوید صاحب بولے۔

"کینٹین والا رونے والا ہو رہا تھا۔ سر جی یہ میس کا چارج گوہر سر سے لے لیں جی۔ یہ تو پتی کے دانے تک گن کے رکھتے ہیں اور چینی تو جب دل چاہے نکلوا کے دیکھتے ہیں کہ پرسوں تو اتنی تھی، اب اتنی کیسے ہوگئی۔ بیس والا لیز کا پیکٹ تم لوگوں کو سات روپے کا پڑتا ہے اور بچوں سے سیدھا تیس روپے کیوں؟ اتنی سختی نہ کیا کرو بھئی، انہوں نے بھی تو رزق کمانا ہوتا ہے آخر۔"

"نوید صاحب! میں پیسے کی طاقت پہ بڑا ایمان رکھتا ہوں۔ پیسہ ایک ایسی لاٹھی ہے کہ جس

سے آپ گردنوں کو ہانک سکتے ہیں۔ گردن جانتے ہیں؟ غرور، فخر، پیسہ سب کر سکتا ہے۔ اور میں تو اپنی زندگی میں ہر شے کا ہی اتنا حساب رکھتا ہوں۔"

"نوید صاحب! آپ تو اسے یوں کہنے بیٹھے تھے جیسے آج آپ کے ستارے عروج پر ہیں اور گوہر ادریس کو قائل کرنے کا سہرا جیسے آج آپ پہن ہی لیں گے۔" راجا کاظم اردو والے ٹھٹھا لگا کے بولے تو گوہر مسکرایا۔

"مجھے تو لڑکے کی شادی کی فکر ہے۔ عمر نکلی جا رہی ہے اور پھر ہم ہی کیوں اس ٹارچر سیل کو سہیں، اس اونٹ کے لیے بھی تو پہاڑ بنا ہی ہوگا۔" راجا صاحب نے ہاتھ سے سب کو متوجہ بھی کیا کہ اب دیکھنا گوہر کی گوہر افشانیاں۔

"راجا صاحب! میں حلفاً یہ کہنے کو تیار ہوں کہ آپ اگر خاتون ہوتے تو پھپھی ہوتے۔" قہقہہ بڑا گونج دار پڑا تھا۔

"وہ تمہارے والد صاحب کسی کوشش میں لگے تو ہوئے تھے؟" فصیح تغلق صاحب اسلامیات کے پروفیسر تھے...... مدبر باوقار سے۔

"کوشش کا کیا ہے۔ پہلے میرا بھائی اور بہنوئی اپنا خاندان مکمل کریں گے پھر ان کی بیویاں میرا کچھ سوچیں گی اور یہ خود میرا ہی فیصلہ تھا۔ عجلت میں ڈھونڈی گئی لڑکی گھر میں لوڈشیڈنگ جیسی ہی ہوتی ہے۔ برداشت نہیں ہوتی اور کرنی بھی پڑتی ہے۔"

سب پھر سے ہنسے تو اسٹاف روم میں کئی دوسرے گروپس نے مڑ کے دیکھا۔ ایک انتیس سالہ کنوارہ کیمیا دان بھلا کون سے لطیفے سناتا ہوگا ان خود پرست بوڑھے عالم فاضلوں کو؟

☆☆☆

عاشی اپنے تینوں بچوں کے ساتھ موجود تھی۔

"ہائے گوہر......" "برف والی آئس بار ہو رہے ہو قسم سے۔ گاڑی بس جگہ گھیرنے کو خریدی تھی کیا؟"

"برف والی اور آئس بار دونوں ایک ہی قلفی کو کہتے ہیں۔ کچھ سیکھ لو تم بھی۔ نرے ڈیڑھ کروڑ کے گھر میں رہنے سے بندہ شہری نہیں بن جاتا۔ اور یہ ابراہیم کو کچھ عقل بھی سکھا دو۔ یہ ابھی تک چک 232 کا ہی لگتا ہے۔ کیسے توتے کے پنجرے میں تنکا گھسا کے انہیں چھبو رہا ہے۔" جوتے اتارتا وہ بولے گیا۔

"لو جی ہو گیا یہ شروع۔" سب اس فری لانس اخلاقیات کی کلاس کے عادی تھے۔ مریم کھانا میز پہ رکھنے لگی۔ عاشی بولی۔

"اچھا اب سو مت جانا۔ شیراز کو چھٹی نہیں ملی۔ ٹیوشن پہ جاتے ہوئے ہمیں ہاسپٹل چھوڑ دینا۔" وہ سر ہلانے لگا۔

"گاڑی لے جاؤں گا آج گروسری بھی کرنی ہے۔"

"اس ماہ میری باری ہے گروسری کرنے کی دیکھ لینا بھابھی نے ہر شے دگنی لکھ دی ہوگی لسٹ میں۔" وہ جلا ہوا بولا۔

"اور تم تو جیسے سب فرماں برداری سے لا دو گے اسے اڑانے کو۔ گوہر! کسی دن میرا منہ کھل گیا ناں پتر تو ایسی پڑنی ہے ناں کہ غیرت مند کو زندگی میں ایک ہی بار پڑتی ہے ویسی۔" حاجی صاحب بچپن سے یہی دھمکی دے رہے تھے۔ اس لیے وہ مگن سا آلو گوشت نبٹاتا رہا۔

"جانے اتنی کنجوسی تو کس کے لیے کرتا ہے؟ شادی تو نے نہیں کرانی، خرچے تیرے کوئی سیں دیا لو اور سخی بالکل بھی نہیں تو پیسے بچا کے میرے نام کی مسجد بے شک نہ بنوانا۔" حاجی صاحب مخول کرنے لگے۔

"ہاں تو والدہ کے نام کی تو بنوائی ہے ناں۔ آپ نے تو صاف انکار کر دیا ہے۔" وہ بھی انہیں گھیرنے لگا۔

"اچھا حاجی صاحب! پھر کیا پوچھ رہا تھا وہ آدمی؟" عاشی موجود ہوتی تو باتوں کو پنکھ لگا دیتی۔ کوئی ادھر کو اڑا دی۔ کوئی ادھر کو۔

"بس بیٹا جی! ایسے ہی پوچھ گچھ کر رہا تھا یہ سعید

صاحب کی ربیعہ کا رشتہ ڈالا ہے شاید۔" چائے کی طرف ہاتھ بڑھاتا گوہر فوراً رکا۔

"اللہ کرے، اس بار خیر ہی رہے۔ اتنی اچھی لڑکی کو جانے کس کی نظر لگی ہے۔ جب بھی رشتہ آئے بیماری ساتھ ہی آ جاتی ہے۔" فضا بھابھی چادر لپیٹتے آ بیٹھیں۔

"میں نے خوب تسلی کروائی ہے ان کی۔ پورے بی بلاک میں اس کی ہم پلہ کوئی لڑکی نہیں ہے بھئی۔" حاجی صاحب کھڑے ہوتے بولے۔

"ہونہہ! ہم پلہ، آپ بھی خدائی ضامن بنے پھرتے ہیں حاجی صاحب۔ وہ ازلی بیمار لڑکی کہ جس کے لیے تسلیاں کرواتے پھرتے ہیں۔ مایوں کے لہنگے میں ہی ٹمبی ہو جائے گی پھر آپ جیسے خیر خواہ ہی کہتے پھریں گے۔ بیچارہ بھی تھا ماں باپ کو اپنی لڑکی کا پھر بھی اگلوں کا خرچا کروا دیا بس۔ ایویں۔" وہ اتنا کڑوا تھا کہ حاجی صاحب کو رک جانا پڑا۔

"لو پھر سنو۔ بی بلاک میں جس سے بھی تمہاری پوچھ گچھ کی گئی، لوگ دندان شکن مقالہ لکھیں گے۔ جی حاجی صاحب سیدھے بندے ہیں۔ بڑا بیٹا اسلام آباد پولیس میں ہے اور پورا پولسیا (پولیس والا) ہے۔ "مطلوب" کہنے کو تو اٹھارہ جماعتیں پڑھا ہے پر جی سچ پوچھو تو سمجھو، گدھا کتابیں اٹھائے ہینکتا پھرتا ہے۔ منہ پھٹ ایسا کہ کونے والے ایک سو دو سالہ مخدوم بٹ صاحب بھی اسے دیکھتے ہی چارپائی کے بان میں سر گھسا کے پڑ جاتے ہیں۔ شوم (کنجوس) ایسا کہ کرکٹ کھیلتے بچوں کی چھت پہ آئی گیندیں انہیں ہی بیچتا ہے۔ شدید برف باری بھی ہو گی تو گاڑی نہ نکالے گا اور پیروں کو ہمیشہ زحمت میں مبتلا رکھے گا۔ پلانٹ سے کوئی پھول توڑے گا تو یہ عدالت عظمیٰ کا دروازہ کھٹکھٹانے سے بھی نہ چوکے گا۔ انتیس کا "مجھے نہیں کھیلنا تم لوگوں کے ساتھ" والا بچہ ہے۔ معمولی شکل غیر معمولی قد کاٹھ اور غیر معمولی ہی بد اخلاق یہاں تنخواہ ساٹھ ہزار لیتا ہے۔ دو ہوم ٹیوشنز کے تیس ہزار ملا کے ہو گئے نوے ہزار۔ لو جی نوے ہزار کو بیٹی دینی ہے تو بخوشی دیں۔ لڑکے کو دینی ہے تو نہ ہی دیں۔"

وہ ٹانگ پہ ٹانگ جمائے اپنے سگے باپ کو دیکھتا رہا۔ پھر سرد لہجے میں بولا۔

"وہ لڑکی...... مرنے والی ہے اور یہ حقیقت ہے۔ بھابھی چلیں سب تیار ہیں؟ بچے کدھر چھوڑنے ہیں؟ اور عاشی! تم تو اپنے بچے زبیر بھائی کے پاس چھوڑ آتیں۔ اب انہیں لیے گھومتے رہیں کیا؟ کبھی خود بھی عقل سے کام لے لیا کرو۔"

وہ اتنی بڑی بات کہتا اور پرسکون رہتا۔ حاجی صاحب نے تھک کے سامان اٹھا لیا تھا۔ جانے کہاں غلطی ہو گئی تھی ان سے۔

☆☆☆

شیراز چھٹی پہ آ گیا اور گاؤں سے کام والی بھی۔ اگلے دن جب ٹھنڈی ہوا چلتی تھی تب فضا بھابھی کی بیٹی بھی دنیا میں آ گئی۔ وہ خوش ہوا۔ شیراز بولا۔

"یار خرچا کافی ہو گیا ہے۔ بچے ننھیال جا کے رہیں گے تو سوچ رہا تھا، کچھ خریداری کرا دوں ان کو۔"

وہ بازار کو نکل گئے۔ شیراز کچھ کہنا چاہتا۔ پھر گھبراتا۔

"شرماتے کیوں ہو...... بول دو کہ گوہر شاپنگ تم نے ہی کروانی ہے۔ خرچا جو اتنا ہو گیا ہے۔" شیراز اس کے کہنے پہ ہنس دیا۔

"بس تمہاری ایک ٹیوشن فیس جتنی خریداری بس۔"

بہترین برانڈ کے جوتے، کپڑے، لوازمات۔ شیراز نے آنکھیں ماتھے پہ ہی رکھ لیں۔ بیس ہزار کی حد پار کرتے ہی گوہر نے ہاتھ اٹھا دیے۔

"میرے بجٹ سے آؤٹ ہوئے کتنے ہی ہزار ہو گئے ہیں۔ اب بس اور نہیں۔"

شیراز بدمزہ ہوا۔

"پوری کالونی میں لوگ مجھے کہتے ہیں کہ

تمہارے بھائی کی ٹیوشن کا ریٹ بانٹا والا ہے۔اور تم تو اتنی جلدی واپس لے آئے۔"

"میں پندرہ ہزار لیتا ہوں میرے بھائی پندرہ لاکھ نہیں۔اوپر سے عاشی کو بھی لحافوں کے لیے نیا کپڑا چاہیے۔ بندہ پوچھے زبیر بھائی پچاس لاکھ کا نیا پلاٹ خرید سکتے ہیں تو دس ہزار کا کپڑا انہیں خرید سکتے؟ یہ شادی شدہ بہنیں بھی ناں۔ اس کو کہا بھی تھا، ادھر گاؤں میں ہی رہے۔اس دن روٹھی ہوئی بیٹھی تھی گوہر یہاں گاجریں اسی روپے کلو ہیں۔ ارے بھئی اب گاؤں میں تو بیس روپے کلو ہو سکتی ہیں۔شہر کے مالز میں نہیں۔ ابراہیم دس روپے لے جاتا تھا اور بھٹہ لے آتا تھا۔اب تین سو روپے کا کیریمل پاپ کارن کا پیکٹ منگواتی ہے اور دہائیاں الگ۔ کیسا قلعہ نما گھر، کھلی آزاد فضائیں اور نرم گرم رشتے چھڑا کے لے آئی زبیر بھائی کو شہری بنانے کے لیے۔ حد ہے یار ان لڑکیوں کے دماغوں کی بھی۔"

شیراز دبکا بیٹھا رہا۔ تقریر مکرر ہوتی رہی۔

☆☆☆

سردیوں کی اتواریں خاصی خوشگوار ہوتی ہیں۔ مگر ہر کسی کی روح ٹھکانا پسند نہیں ہوتی۔ گوہر ادریس فطرتاً جانے کیسا تھا مگر پیدائشی خانہ بدوش طبیعت کا تھا۔ مستزاد یہ کہ سکون کو رخصت ہوئے بھی زمانہ بیت گیا۔ وہ کسی کا دوست نہ بنتا بس لوگ اس کے گرد رہنا پسند کرتے۔ جو چند دوست تھے وہ شہر کے امراء اور قابل ترین افراد میں سے تھے۔ خانہ بدوشی کے لیے ٹھکانا بننے کو تیار۔ سو اتوار کسی نہ کسی سفر کی نذر ہو جاتیں۔

حاجی صاحب فضا بھابھی کے میکے بچوں سے ملنے گئے تھے۔ وہ گیٹ پہ کھڑا دھوپ کی سمت دیکھنے لگا۔ مدت ہوئی کالونی میں فرصت کی نظر کیے۔ بھلے زمانوں میں ابا نے آبائی زمین بیچ کر کالونی میں تین پلاٹ خریدے تھے۔ لاکھوں میں خریدے پلاٹس اب کروڑوں کی مالیت میں تھے۔ خوب صورت کوٹھی، گیراج میں کھڑی دو گاڑیاں ...... دونوں بھائیوں کی اچھی نوکریاں، ابا کی پنشن، کوٹھیوں کا کرایہ...... متمول ہوئے بھی ایک دہائی ہونے کو آئی تھی۔ ٹراؤزر میں ہاتھ گھسیڑے آنکھیں سکوڑے اس نے کونے والی کوٹھی کے مخدوم بٹ صاحب کو خود پہ کمبل لپیٹتے دیکھا اور مسکرایا۔ حاجی صاحب بھی ناں بڑے دھیان باز ہیں۔

کومل پونی کستی گیراج سے اپنی اسکوٹی نکال رہی تھی۔ اسے دیکھ کے اسکارف درست کیا، مودب سا سلام جھاڑا اور گنگناتی اڑ گئی۔ دو سال پہلے یہ ہونق سی کومل گوہر سے کیمسٹری فزکس کے نیومیریکل پوچھتی اور جھاڑیں کھاتی تھی۔ اب پنجاب کالج کی ٹاپر تھی۔

فہد جلدی جلدی دہی کی تھیلی سنبھالتا گھر کو بھاگا جاتا۔ سہیل چیمہ بیگم بچوں کو ہونڈا موٹر سائیکل پہ لاد کے لے جاتا، مال بردار ڈرائیور سا خشک دکھتا۔ اب اس نے فرصت سے سامنے والے گھر کو دیکھا۔ یوں جیسے کوئی بے روزگار نوکری لگنے والوں کی فہرست میں اپنا نام کھنگالتا ہو۔ اسی لمحے انگڑائی لیتے سعید انکل نے بھی اسے دیکھا اور پرجوش سے آگے بڑھ آئے۔

"اللہ مجھے ڈر نہیں لگتا بس اس لمحے سے موت جھانکتی دکھتی ہے۔" وہ مسکرا نہ سکا۔ سعید انکل حال احوال پوچھنے لگے وہ ان کے گیٹ کی ماربل لگی ڈھلوانی سلیب کو دیکھتا فرہاد کی موٹر سائیکل کو دیکھتا۔ آگے بس اندھیرا سا نظر آتا۔

"اس دفعہ تو کلثوم نے اخیر ہی کر دی۔ لڑکے کی تعریفیں، لڑکی کی نکلتی عمر، بیماری، میں نے کہا مسقط تو یہیں پڑا ہے پھر واپس آجاؤں ذرا لڑکیوں کا کچھ کر آؤں اس بار تم بھی پتا کرنا کسی سے۔ لڑکا کیپٹن ہے۔ ادھر بحریہ میں نیا گھر بنوایا ہے۔ پہلے ادھر ایف بلاک میں ہی ہوتے تھے اپنے۔"

گوہر ادریس کو غصہ آیا۔ میرے پھپھا جی لگتے ہیں آپ؟ کیسے ذمے داری بانٹتے پھرتے ہیں۔ پھر بے بس...... خدارا مجھ سے کوئی کچھ نہ کہے۔ دماغ بکتا جھکتا رہا۔ وہ سن رہا۔

"اچھا انکل! مجھے کہیں جانا ہے تو......" ماتھا سہلاتا بولا۔

"او اچھا اچھا چلتا ہوں۔ ربیعہ رات سے کھانس رہی ہے کسی نے ڈاکٹر کا بتایا ہے تو وہاں......"

وہ جھٹکے سے گیٹ بند کرتا مڑ گیا۔

سعید انکل خجل سے ہو گئے۔

"وقت بدل گیا ہے۔ بچے بڑے ہو گئے۔ اب کہاں اتنا وقت ہے کسی کے پاس۔" بڑبڑاتے مڑ گئے۔

"اس بار کچھ ہونے والا ہے گوہر ادریس!" سگریٹ کے دھوئیں میں سے کوئی ہنسا۔

"ہونہہ...... وہ دمہ زدہ لڑکی۔" نفرت دل پہ بوجھ بن کے بیٹھ گئی۔ فون چنگھاڑنے لگا۔ حاجی صاحب چہک کے بولے۔

"وہ عورت جو تمہاری بھابھی کی محلے دار ہے آج شام آئے گی۔ رفیعہ سے اچھی طرح گھر صاف کروا لینا اور اسے ریڈی میڈ لا دینا نگٹس اور کباب خود تل لے گی۔ میں دوپہر میں عاشی کو لیتا آؤں گا۔"

"نہیں نہیں آخر وہ کیوں کریں گی اتنا تردد میرے لیے۔ پہلے اپنے خاندان تو مکمل کر لیں۔ کبھی بھابھی مصروف ہیں تو کبھی بہن۔ میرے دوست کب کے ابا بن گئے اور یہاں سب لگے ہوئے ہیں بہبود آبادی والوں کو شرمندہ کرنے۔" وہ دھاڑنے لگا۔

حاجی صاحب نے فون کاٹ دیا۔

شام کو سب آ گئے۔ وہ ٹیوشن کے لیے تیار ہوتا رہا۔

"نہ تو اب بہبود آبادی والوں کا احساس جاگ گیا دل میں جو شادی کا خواب پس پشت ڈال کر چل دیے۔"

حاجی صاحب اس کی ہجو گوئی کو ہمیشہ ہر اول دستے میں رکھتے۔ وہ خاموش رہا۔ مصروف بھی۔ عاشی اسے مہمانوں کے سامنے جس منت سماجت کے بدلے لے کر گئی، یہ حاجی صاحب نہ جانتے تھے۔

"گھر میں کوئی عورت تو ہے نہیں۔" پہلا اعتراض۔

"دلہن کا شوہر خود اسلام آباد...... بیوی باپ بھائی ساتھ۔"

تیسری دفعہ بولا تو وہ تیز لہجے میں کہنے لگا۔

"اگلی تنخواہ میں کوئی معقول سی عورت خرید لاتا ہوں۔ رونق بھی ہو جائے گی، ہماری رکھوالی بھی اور ڈنگل بھی مفت میں لگ جایا کرے گا۔" لڑکی کی ماں گھبرا گئی۔

"آنٹی! چھ بار تو بتایا ہے، آپ کو کہ والدہ کا انتقال ہو گیا اور میری شادی...... اللہ کی مرضی ہے ہم کیا کر سکتے ہیں۔" عاشی متوازن لہجے میں بولی۔

خاتون کو اکھڑ سا لڑکا پسند آ گیا۔ گھر آنے کی دعوت دیتی چل دیں۔ عاشی جانتی تھی، گوہر اب بھی نہیں مانے گا۔

☆☆☆

پانچ سال پہلے جب گوہر ادریس کی روح کا ٹھکانا ایک پرائیوٹ ہسپتال میں زندگی سے مایوس ہو گیا تو شیراز سے کہا۔

"بیٹا! حرام مسلمانوں کے لیے حرام ہی رہتا ہے، چاہے وقت اسے فرض ہی کر دے۔"

"امی! اور جو جی چاہے مانگ لیں، یہ نہ کہیں۔ کوئی نہیں جانتا کہ سسٹم کس قدر دلال بن چکا ہے۔" وہ روتے ہوئے بے بسی سے بولا تھا۔

"خود سے جھوٹ نہ بولنا بھی۔ یہ زندگی کا سکون کھا جاتا ہے۔ عاشی سے پیٹھ نہ پھیرنا بھی، وہ تنہا ہے۔"

"امی...... میں؟" سب سے چھوٹا کتنا پیارا ہوتا ہے ناں ماں کو۔ بڑا بے بس آنسو نکلا تھا امی کی آنکھ سے۔

"اللہ تیرا دل ٹھنڈا کرے گوہر!" گوہر کو بس اتنا ہی کہا۔ ماؤں کو سب پتا ہوتا ہے کہ کیسا مایا جال سا بے سکون بچہ ہے ان کا۔

گوہر بھچو گوند ہو گیا۔ ہر مہینے بریانی کی دیگ تقسیم کرتا۔ عاشی کے لحاف نئے بنتے ہیں، صوفوں کی

پالش کروانی ہے۔ آئی پیڈ کا نیا ورژن...... عیدیں، شب برأت، میلاد النبی ﷺ، چودہ اگست پر کیک، نقد، کپڑے، بچوں کے کھلونے...... وہ بد دماغ...... بداخلاق، بدزبان ماں بن گیا عاشی کی۔

شیراز دن بہ دن پھلتا پھولتا۔ لٹھے کے شلوار سوٹ، ہوا جیسی ہلکی پشاوری چپل نئی سوک، آگے ہی آگے مگر گوہر کا دل...... وہ ٹھنڈانہ ہوا کبھی، دہکتا، چٹختا، بھڑکتا...... سنہری سے زرد۔ زرد سے سرخ...... سرخ سے اناری اور اناری سے سیاہ پڑتا دل۔

وہ منہ سے آگ اگلتا۔ دوسروں کے چیتھڑے اڑاتا۔ بہترین کماتا...... سگریٹ کے دھویں کو نسوں میں بھرتا۔ کھانسی سے مرنے کو ہوتا، انگلی جلاتا۔ ہونٹ جھلساتا۔ خانہ بدوش بن جاتا۔ پتھر سا بے حس اور قصابوں سا بے درد۔ آہ...... مگر یہ دل۔

☆☆☆

جاتے دسمبر کی پر انتقام، سرد، غصیلی غراہٹیں تھیں۔ لوگوں کی کپکپاہٹ اور گوہر ادریس کا تغافل۔ رات گیارہ بجے وہ سیاہ شلوار سوٹ پر اخروٹی شال اوڑھے، قمیص کی آستین اوپر کو موڑے فون سنتا کسی گاڑی، رکشے کا انتظار کرتا۔ شیراز ٹیوشن پر چھوڑ گیا تھا۔ واپسی اسے خود کرنی تھی۔

رکشہ سامنے آن رکا۔ وہ پیچھے جا بیٹھا۔ رکشہ جھٹکے سے چلا۔ گوہر نے فون بند کر کے ہاتھ میں تھاما اور بائیں طرف مڑ کے دیکھا اور......

دل کو بددعا ہے کسی عاشق کی
یہ مر بھی جاتا ہے مگر رکتا نہیں

''آگ لگے شیراز کے ہر ٹھاٹ کو۔ جہنم میں جلے یہ رکشے والا جو لکھ کے نہیں رکھتا کہ آج سوار کون ہے۔ بہرہ ہوا ایسا فون کرنے والا جس نے بصارتیں محدود کر دیں میری۔'' وہ سرد تر ہوتا بڑبڑاتا۔

''ہم نے تو سنا تھا گاڑی خرید لی گوہر نے۔'' ثوبیہ آنٹی کے بھرے چہرے پر مسکراہٹ کرلانے لگی۔

وہ کوئی ملعون بے زبان ہو گیا۔ ثابت ہوا کہ ہر زبان دان کی زبان بندی کے لیے لوگ اور مواقع ضرور ہوتے ہیں۔ وہ ثوبیہ آنٹی سے پرے بیٹھی دمہ زدہ کو نہ دیکھتا مگر وہ...... کچھ اور بھی تو نہ دیکھتا۔

''جی ہے گاڑی تو...... گاڑی والا ہوں۔ گاڑی والا جاہل نہیں ہوں۔ گاڑی یوں خریدی کہ پچھلے دو سالوں میں کوئی دو سو افراد یہ پوچھتے رہے کہ اب بھی پبلک ٹرانسپورٹ استعمال کرتے ہو؟ حاجی صاحب نے کہیں کوٹھی قرضہ لے کے تو نہیں بنوائی۔ اب گاڑی لے لو یار! نو دولتیوں جیسا دکھاوا کرنے کا میں قائل نہیں۔ جب تیس روپے سے آ جا سکتا ہوں یا ستر روپے کا پیٹرول بائیک میں ڈلوا کے استعمال میں لا سکتا ہوں تو فضائی آلودگی کے ماہرین سے کوسنے کیوں سنوں؟''

کسی اور کے پوچھنے پر وہ یہ تقریر اس کے منہ پر مارتا آگے بڑھ سکتا تھا مگر......

''آپ...... یہاں؟ خیریت؟'' بوکھلاہٹ میں وہ سوال کیا کہ جواب کے نتیجے میں ثوبیہ سعید کی بیمار بیٹی کو دیکھنا پڑا۔

سارے شہر سے باقی ماندہ روشنیاں اس کی آنکھوں میں سمٹ آئیں اور اس تاریک وجود کا اندھیرا ہم تک نہ سکا۔

سیاہ شال...... زرد چہرہ، سفید لب...... اور آنکھیں گوہر کو ایسی سیاہی کے لیے لفظ نہ مل سکے کہ جیسی اس کی آنکھوں میں تھی۔

کینولا لگے ہاتھ کو سہلاتی، اپنی گود کو دیکھتی، ہاتھوں کو...... سڑک کو...... مگر گوہر ادریس کو نہیں۔

''خیریت؟'' اس کے پوچھنے پر ثوبیہ سعید کی زبان فرانٹے بھرنے لگی۔

''امید تو دلائی ہے ڈاکٹر نے۔ مگر میں نے کہا کہ ذرا جلدی بحالی کریں صحت کی۔ منگنی کرنی ہے ناں اس کی۔ ڈاکٹر نے کہا ڈرپ لگوالیں تو کچھ تاخیر ہو گئی واپسی میں۔ سعید صاحب کے رشتے داروں میں ایک نکاح تھا۔ باقی سب وہیں چلے گئے۔ میں نے تو کریم کروائی تھی۔ ربیعہ سخت بے آرام ہوتی

ہے، جھٹکوں سے مگر میرا انٹرنیٹ ہی نہ چلا اوپر سے یہ وقت۔ بس ہم کیسے بھی بیٹھ گئے۔ تم آنا ضرور منگنی پر۔ بہت ہی اچھی فیملی ہے۔ شان دار لڑکا، جیسا میں نے ہمیشہ سے چاہا۔ شکل سے نسب اور کمائی سے پہنچ تک باکمال۔" ربیعہ نے کہا۔

"روکو رکشہ...... یہیں اتارو مجھے۔" وہ دھاڑا۔ رکشہ والے نے ایک لمحے کی تاخیر نہ کی۔ کرایہ تھا تا وہ کمزور کانپتا شخص سواریوں کو بڑبڑانے پر مجبور کرتا۔

"تو بندہ فیشنی ہیرو نہ بنے۔ اتنی ٹھنڈ بنا سویٹر گھومنے کی تک کیا ہے بھلا۔" کینولا والے ہاتھ والی لڑکی چہرہ ہاتھوں میں چھپائے سفر بتاتی۔

"ہونہہ...... آج بھی ویسی ہی جلن۔" ثوبیہ سعید کے چہرے پر آنے والے وقت کی آزمائش کے لیے بےزاری ہی بےزاری تھی۔

☆☆☆

دل کو بددعا ہے کسی مداری کی
ڈگڈگی ٹوٹ بھی جائے، یہ رکتا نہیں

"بھایا آیا...... بھایا آیا......" طوطے اونگھ سے جاگتے ہی واویلا کرنے لگے اور بھایا نے قریب سے گزرتے اپنی شال پنجرے پر دے ماری۔ پہلے پنجرے والوں نے شور کیا، پھر دبک گئے۔

اندھیرے میں وقت کی گھڑیاں گنتے حاجی صاحب کو آج انتظار لمبا لگا۔ ہاں مگر دھڑ دھڑ قدموں کی آہٹوں کو سنتے وہ بےخبر ہو گئے۔

قمیص کے بٹن کھولتا وہ نل سے نکلتا پانی خود پر انڈیلنے لگا۔ سگریٹ کا پیکٹ یوں ڈھونڈا کہ سارا کمرہ تلپٹ کرنا پڑا۔ کبھی کبھار کا، تنہائی کا شغل آج نشہ سا محسوس ہو رہا تھا۔ وہ شیراز کے کمرے میں گیا۔ وہاں تلاش کی پھر واش روم میں ٹنگی ایک قمیص کی جیب سے پیکٹ ملا۔ کشادہ چھت پر پڑے گملے اس اجنبی کو دیکھتے چونکے کہ وہ کبھی اس طرف آیا ہی نہ تھا۔ مدت ہوئی اس زاویے پر کھڑے ہو کے سامنے والوں کی بند کھڑکیوں کو تکتا۔ یوں کہ کھڑکی پار سوتے وجود کو بےآرام کر دیتا۔

"امی...... ی ی......" کھانسی کا دورہ کھڑکی پار والی کو ہی پڑا تھا۔

"امی کی جان!" ثوبیہ سعید نم آنکھوں سے سیرپ چمچہ میں انڈیلتیں۔

"کھو، قبول ہے...... قبول ہے...... قبول ہے...... ورنہ گلا دبا دوں گا۔"

آوازسی گونجتی۔ ربیعہ لحاف پر دہری ہوتی۔

"امی! میری گردن...... کمر...... آہ امی! یہ درد۔" رونے والی وہی کھڑکی پار کی لڑکی ہی تھی۔

"پھر شروع ہو گیا یہ منحوس درد۔ یا اللہ میرے اس بار نہیں، اس بار نہیں......" ثوبیہ سعید زار زار رونے لگیں۔

کھڑکی پار سامنے کی چھت پر بنا قمیص کھڑا، مرغولے بناتا وہ شخص ماضی بننے لگا تھا۔

☆☆☆

دل کو بددعا ہے کسی تقدیر نویس کی
کہ یہ ایجاد ہی درد و داغ کی ہے رکتا پھر بھی نہیں

وہ پیدائشی لیڈر تھا، زنانہ نام والا...... کٹر مرد۔ سات ماہ میں بھی مرد تھا۔ سال سات میں بھی۔ اکھڑ سے معمولی نقوش...... گھنی بھنویں...... سیدھے نوک دار بال۔ دو سوا تنالیس کی تعداد کے اسکول میں سے کم از کم ڈیڑھ سو اس کے مرید۔ وہ کچھ کہہ دیتا۔ دوسروں کا ماننا فرض، کچھ سن لیتا۔ دوسروں کی ستائش اس کا حق، کچھ دیکھ لیتا...... دوسروں کی طلب بند۔

میلاد النبیﷺ ہوتا، وہ نعرے لگاتی ٹولی کا سردار، چودہ اگست پر جھنڈا جو سب سے بڑا ہوتا، اسی کو تھمایا جاتا۔ ماں باپ کے لیے مشکل بچہ۔

مغرب کے بعد ڈھونڈ ڈھانڈ گھر لایا جاتا۔ کھانے میں، پہننے میں، پڑھنے میں...... آنے جانے غرض ہر کام اس سے کروانا ایک باقاعدہ مسئلہ ہوتا۔ کالونی ابھی نئی تھی۔ کئی پلاٹس خالی پڑے تھے۔ شیشم اور پیپل کی چھاؤں تلے گرمیاں گزرتیں۔ لڑکے کرکٹ کھیلتے، کبھی کنچے۔ لڑکیاں شادی شادی کھیلتیں۔ پٹواری صاحب کی ساڑھے دس سالہ

سامعہ آپی لڑکیوں کو سستے ٹھیلوں سے خریدے میک اپ سے رنگتیں۔ مایوں، مہندی اور بارات کی دلہنیں بنتیں۔ لڑکوں کو اس کھیل میں شامل ہونے کی ہڑک جاگتی۔

"سامعہ آپی! میں پتے اتاروں؟ بارات پر پھول بھی تو پھینکتے ہیں۔" گوہر خود ہی شامل ہوگیا۔ شادی کا کھیل اور متنوع ہوگیا۔

"سعد کو دولہا بناتے ہیں۔" عاشی کی تجویز تھی۔

سعد ثقلین پچھلی لین میں رہتا تھا۔ بلا کا خوب صورت بچہ۔ بلا کا غصیلا بھی اور جل ککڑا بھی۔ سعد روزانہ دولہا بننے لگا۔ سب خوش تھے۔ روزانہ گھر سے کچھ لاتے۔ لڑکیاں پکاتیں۔ لڑکے ڈھول پیٹتے، ناچتے، پتے ٹہنیوں سے جگہ سجاتے۔ ایک دن عاشی آئی تو ساتھ ایک بچی تھی۔ سعد ثقلین سے بھی خوب صورت، نازک اور نخریلی۔ پتے توڑتے گوہر نے دیکھا۔ شہد رنگ کی آنکھوں، بالوں اور دودھیا رنگت والی ربیعہ سعید کو۔

"آج ربیعہ کو دلہن بناتے ہیں، اس کی فراک بھی فریال سے اچھی ہے۔" سامعہ آپی نے فیصلہ سنایا۔

"اس کا دولہا میں ہی بنوں گا۔" گوہر ادریس نے وہ جملہ بولا کہ جس نے مستقبل کو مفلوج ہی کردیا۔ سامعہ کو دولہا پسند نہ آیا مگر دوسرے لڑکوں نے شور مچادیا۔

وہ اپنی دلہن کا ہاتھ مضبوطی سے تھامے بیٹھا تھا۔ وہ کسمسائی۔

"گوہر! ہاتھ چھوڑو۔" عاشی کو غصہ آیا۔

"ماموں نے بھی تو حمدہ مامی کا ہاتھ پکڑا تھا۔" وہ ہاتھ نہ چھوڑتا۔

"یہ جھوٹی موٹی شادی ہے۔" وہ بھڑک کے بولی۔

"دلہن تو اصلی ہے ناں۔" وہ اڑ گیا۔

"ماموں تو مامی کو سیڑھیوں پر لے جارہے تھے اوپر۔ اس لیے پکڑا تھا ہاتھ۔ ان کے کپڑے دیکھے تھے؟"

"رابی! تم بھی کل لہنگا پہن کے آنا۔" اسے یہی فرق لگا۔

"عاشی! میں نے کہا بھی تھا گوہر کو نہیں بناتے دولہا۔" سامعہ اکتائی۔

یوں وہ زبردستی ہر دفعہ ربیعہ کا دولہا بننے لگا۔ ربیعہ بس اس کے ساتھ خوش رہتی۔ اسے گھر لے جاتی۔ ڈول ہاؤس دکھاتی...... اپنی کلرنگ بکس، گلابی رنگ سے سجا اپنا کمرہ۔ ثوبیہ سعید لاپرواسی ماں تھیں۔ زرد رنگے بال، سپید رنگت، فربہ جسم، وہ خریداری کرتیں، میک اپ یا فون کالز۔

ایک دن اسکول میں سعد ثقلین کی ایک بچے سے لڑائی ہوگئی۔ گوہر مخالف بچے کو اکساتا رہا، یوں کہ چھٹی کے وقت گیٹ کے پاس اکھاڑہ لگ گیا۔

"اوئے سب پیچھے رہیں گے۔ کوئی آگے نہ آئے، بس دیکھو۔" گوہر نے سب کو تماشے کے لیے اکٹھا کرلیا۔ وہ ایسا ہی تھا۔

سعد کو خاصی شرم ناک شکست ہوئی۔ گوہر سے اس کی ٹھن گئی۔ تو تکار ہونے لگی۔ ہر روز ہونے لگی۔

"رابی کا دولہا میں ہی بنوں گا اب۔" سعد نے محض جلانے کے لیے کہہ دیا۔ گوہر نے دھکا دے کے اسے بنچ سے نیچے گرادیا۔ پھر بات مار کٹائی پر ہی ختم ہوئی۔ گوہر نے سعد کا جینا دوبھر کردیا۔ اسے دیکھتے ہی تان لگاتا۔

دیکھو دیکھو سعد آیا
ساتھ میں اپنے کوڑا لایا
کوڑے سے نکلا ہاتھی
ہاتھی اس کا ساتھی
ہاتھی کوڑا کھاتا ہے
سعد کو بھی کھلاتا ہے

سعد اسکول میں "ہاتھی میرا ساتھی" کے نام سے مشہور ہوگیا۔

ایک دن گوہر کو سخت بخار ہوا۔ امی نے اسے گھر سے نہ نکلنے دیا۔ وہ تڑپتا رہا۔ موقع پا کر خالی پلاٹ کو

دوڑا اور...... کیا دیکھا وہاں ربیعہ کا دولہا سعد......
وہ بنا کسی سے بات کیے سعد کو پیٹنے لگا۔ سعد کی ناک سے بھل بھل خون بہنے لگا تو وہ ربیعہ کی طرف ہوا۔
''سامعہ آپی! بتاؤ کہ تم کس کی دلہن ہو؟'' حکم دیا۔ وہ سہم گئی۔
''بولو......'' وہ دھاڑا۔ ربیعہ رونے لگی۔ گوہر نے اس کی گردن دبوچ لی۔
''میں ماردوں گا تمہیں......نہیں تو بتاؤ انہیں۔''
رفیق بٹ صاحب چیخیں سن کے دوڑے آئے۔ اس دن یہ کھیل عجیب شرم ساری پر ہمیشہ کے لیے ختم ہوگیا۔ حاجی صاحب نے سارے محلے کے سامنے گوہر کو مارا۔ وہ امی کے سامنے ڈٹ گیا۔
''جو بھی اسے دلہن بنائے گا، میں اسے ماردوں گا۔'' نو سالہ گوہر کی دھمکی نے اس کی ماں کو جامد کردیا۔
پھر یوں ہوا کہ سارے اسکول کو اس کی دیوانگی پتا چلتی گئی۔ دونوں بہترین دوست تھے۔ گوہر کا ہوم ورک ربیعہ کرتی تو ثوبیہ کو بھی بازار نہ جانا پڑا۔ امی ہچکچاتیں۔
''یوں بھاگ بھاگ میرے کہنے پر تو کہیں نہیں جاتے تم۔''
میٹرک کرتے ہی گوہر یک دم مرد بن گیا تھا۔ بھرپور جوان۔ میٹرک میں نمبر بہترین تھے۔ وہ ڈاکٹر بننے کے خواب دیکھنے لگا۔ کالج میں گیا اور کچھ مصروف ہوگیا۔ ربیعہ دسویں میں تھی، اکیڈمی سے دونوں اکٹھے واپس آتے۔
''رابی! اب تم بڑی ہوگئی ہو۔ گوہر سے فاصلہ رکھو بیٹا۔''
پہلی بار ثوبیہ کو گوہرا تنا بڑا برا لگا۔ یہی بات گوہر نے کہی مگر یوں......
''اتنی بڑی ہوگئی ہو رابی! دوپٹہ لینا نہیں آتا کیا؟'' دوپٹہ گھما کے رابی کو لپیٹ دیا۔ دونوں سارے راستے ہنستے رہے۔

ثوبیہ نے اب کے سختی سے کہا۔
''گوہر سے دور رہو۔ اس کی نظر ٹھیک نہیں۔''
وہ سمٹ گئی۔
گوہر کو نظر انداز کرتی، اکیڈمی سے تیز تیز پلٹتی۔
''اوئے دلہن!'' گوہر شرارت سے پکارتا، یوں تو وہ ہنس دیتی تھی مگر اب......
''گوہر! اب ہم بڑے ہوگئے ہیں۔'' ٹوکتی۔
''ہاں تو میں نے کب کہا چھوٹی دلہن!'' بالوں میں انگلیاں چلاتا۔
رابی بے بس سی ہوجاتی۔ رات کے کھانے کے بعد وہ چھت پر آتا۔ ربیعہ اپنے کمرے میں چکر کاٹتی، کیمسٹری کو رٹے لگاتی۔ کیمسٹری چھوڑتی اور کھڑکی میں کھڑی گوہر سے پوچھ رہی ہوتی۔
''ٹیسٹ میں کتنے نمبر آئے؟''
''تمہاری امی نے کیا بنایا ہے۔ کڑھی...... واہ جی! تھوڑی دے ہی جاؤ۔ میں چاول ابالتی ہوں تب تک۔''
''میں فیل ہوگئی تو سارا قصور تمہارے سر ہوگا۔ جان کو چمٹ ہی گئے ہو۔'' وہ مسکراہٹ عام نہ ہوتی، وہ ناراض ہوجاتا۔
''ایک تو پہلے ہی شکل ماشاءاللہ ہے، اوپر سے بگاڑ لیتے ہو گھڑی گھڑی...... کیا کروں میں؟'' سیڑھیوں پر ہی ہوتا کہ فون پر میسج آجاتا۔
''اپنا منہ بند رکھا کرو۔ میں بڑا ہوں تم سے اور کسی کی بدتمیزی برداشت بھی نہیں کرتا۔'' فون آف کردیتا۔
ربیعہ کو جانے کیا کیا ہوتا۔ پیغام لکھے جاتی، بھیجے جاتی...... اگلی شام اکیڈمی میں وہ مسکرا رہا ہوتا۔ ربیعہ رونے کو ہوجاتی۔
میٹرک میں ربیعہ سعید نے ضلع بھر میں ٹاپ کیا تھا۔
''افسوس صد افسوس ہے، پاکستانی نظام تعلیم پر۔ اب ربیعہ سعید جیسے ہونق بھی ٹاپرز ہونے لگے۔'' گوہر کا افسوس نہ جاتا۔ ربیعہ خوش ہوتی۔

"اب کالج بھی اکٹھا، اکیڈمی بھی اور ایم بی بی ایس بھی۔" منصوبے بناتی۔
"اور......؟" گوہر پوچھتا تو تڑخ کے بولتی۔
"اس سے زیادہ کوئی برداشت کرسکتا ہے تمہیں؟"

☆☆☆

پنجاب کالج کے دونوں کیمپس میں بیٹھے وہ دونوں حد سے زیادہ محنت کرتے، باہر نکلتے اور اکٹھے اکیڈمی کو چل دیتے۔ پھر واپس گھر...... دونوں دوستی نام کے دھوکے میں مبتلا تھے۔ محبت محبت تو کبھی کھیلا ہی نہیں تھا۔
اکیڈمی میں ربیعہ نے سعد ثقلین کو دیکھا۔ وہ اتنا نکھر چکا تھا کہ شاید پورے شہر میں اس جیسا نہ ملتا۔ میٹرک اس نے اپنے ماموں کے ہاں کیا تھا۔ اب پری میڈیکل کے دوسرے سال ٹرانسفر ہو کے آیا۔
"تم نے سعد کو دیکھا؟ اف...... کیا پرسنالٹی ہے۔ سارے کیمپس میں دھوم مچ گئی ہے۔"
گوہر بے آرام ہوا۔ بولا کچھ نہیں۔ ربیعہ جیسے اندھی بہری ہوگئی۔ بلا دھڑک سعد کی تعریفیں روزانہ دہرانی۔
پھر ایک دن......
"سچ پوچھو تو صرف شَشکا ہی ہے سعد صاحب کا، مجھے تو بونگا ہی لگتا ہے۔ بوائز کیمپس میں تو بس گوہر ادریس ہی سب سے زیادہ پرکشش لگتا ہے مجھے۔ مرد مرد سا لگتا ہے ناں۔ باقی تو عجیب بال رنگوا کے بھنویں کٹ لگوا کے آجاتے ہیں۔ زنانہ سے۔"
ربیعہ شدید ترین بے آرام ہوگئی۔ جانے کیوں اسے اچھا نہ لگتا۔ کوئی دور سے بھی گوہر کا نام لیتی تو اس کا دل بے ترتیب ہو جاتا۔ مشکوک بھی۔
گوہر کو ربیعہ کی بے بسی مزا دیتی۔
سامعہ آپی کی شادی پر وہ اتنی خوب صورت لگی کہ گوہر کا دل حسد سے بھر گیا۔ چھت پر کھڑا تھا۔ وہ کھڑکی میں کھڑی رائے پوچھتی۔
"میں نہیں جارہا، دل نہیں۔" پیغام بھیجا اور نیچے آ گیا۔
صبح شیراز نے بتادیا کہ سعید انکل کی طرف سے فرہاد ہی آیا تھا۔ گوہر مسکرایا۔
"کیا ضرورت تھی اتنا قاتل لگنے کی۔"
اس کا ٹیسٹ ہوتا۔ گوہر کی فرمائش......
"مجھ سے بات کرو۔ آج میرا کوئی ٹیسٹ نہیں۔" وہ پیغام کا جواب لکھتی کبھی بے بسی سے کتاب کو دیکھتی رہ جاتی۔ کارکردگی متاثر ہونے لگی۔ جانے کیسی کم ہمت تھی وہ کہ یوں ہتھیار ڈال دیتی۔
"سیاہ رنگ کیوں پہنا؟" اعتراض ہو جاتا، وہ دل مار لیتی۔
"امی مجھے سیاہ کپڑے نہیں لینا۔"
"کیوں، تمہیں تو پسند ہے یہ رنگ۔"
وہ چپ۔
دن بہ دن ربیعہ بس پر چھائیں بنتی گئی اور گوہر سارا منظر۔ ثوبیہ سعید نے اب معاملہ سنجیدگی سے پرکھا۔
گوہر سالانہ امتحانات سے فارغ ہوا۔ ربیعہ کے امتحان شروع ہوئے۔ ہاں وہ امتحان کے دنوں میں انسان ہی رہا تھا۔
آخری پیپر والے دن اچھے سے تیار ہوا۔ دوست کی بائیک مانگی اور سینٹر کے باہر کھڑا ہوا۔
"کیسے ہوئے؟" وہ خوش گواری سے اسے دیکھتی تو پوچھتا۔
"ٹاپ تو شاید نہ ہو سکے مگر میڈیکل کا میرٹ بنا ہی لوں گی۔"
"چلیں؟"
وہ جھجکی۔ "گوہر...... رکشے والا انتظار...... امی پریشان۔"
"چلو گی یا نہیں؟" وہی ظالم سا بے لچک لہجہ۔
وہ خاموشی سے پیچھے بیٹھ گئی۔
متفکر سی آئی تھی مگر ہمراہی گوہر کی تھی۔ سب کچھ بھول گیا۔ بس وہ یاد رہا جو ساتھ لیے لیے گھومتا۔ کبھی گول گپے کھلاتا، ناریل کا پانی، کولڈ کافی...... بے

ترتیب چٹخارے اور قہقہے......

اس دن دونوں کو ہی اس بات پر روز حشر سا یقین ہوگیا تھا کہ وہ صرف دوست نہیں۔ واپس لوٹے تو جیسے سب کچھ لوٹانے کا وقت آ گیا۔

☆☆☆

"کتنے دن گوشت پکتا ہے تمہارے گھر؟"

ثوبیہ سعید آج اسے اندر بلا لائی تھیں۔ ربیعہ مجسم التجا بنی کھڑی تھی مگر ماں اسے دیکھتی تک نہ تھی۔

"میری بیٹی نے اس گھر میں شاید ہی کوئی ایسا دن دیکھا ہو، جب کوئی عام شے گھر میں بنی ہو۔ بینک کلرک کی ماہانہ آمدن پینتیس ہزار ہے اور میرے گھر بجلی کا بل اس سے دوگنا آتا ہے۔ کیا دے سکتے ہو ربیعہ کو، جو میں اسے ایسی بے وقوفی کرنے دوں؟ میں دیکھتی رہی کہ شاید میری بیٹی خود ہی دنیا کے رنگ دیکھ کے پلٹ آئے مگر جانے کون کون سے منظر بناتے اور دکھاتے ہوا سے کہ اسے کچھ اور نظر ہی نہیں آتا۔ سن لو لڑکے! میری ربیعہ کے لیے پہلا رشتہ ہی اس کے خالو کے باس نے دیا ہے، اپنے بیٹے کے لیے۔ اب بتاؤ تمہیں کس گنتی میں رکھوں؟"

اپنی طرف سے وہ گوہر ادریس کو پانی پانی کرکے اپنی بیٹی کی زندگی سے دفع دور کر کے بیٹھ گئیں۔

گوہر استہزاء سے مسکرا دیا۔ ربیعہ کو دیکھ کے بولا۔

"مجھے لگا تمہاری امی کچھ نیا کہنے والی ہیں۔ کچھ سنسنی خیز...... مگر یہ تو کچھ یوں ہوگیا کہ انہوں نے میرے سامنے کینو رکھا اور بولیں۔"

"یہ کینو ہے...... اسے کینو ہی کہتے ہیں۔ یہ کھٹا میٹھا ہوتا ہے۔" ہنسنے لگا۔

ثوبیہ سعید کو پہلی بار اشتعال آیا۔ معاملہ سنجیدہ لگا۔

"مجھے معلوم ہے کہ میرے ابا کے ریال نہیں آتے۔ میری اماں ماہانہ ہزاروں نہیں لٹاتیں پارلرز میں۔ کھانا بھی خود ہی بنا لیتی ہیں۔ بڑے دونوں بہن بھائی یونیورسٹیز میں لاکھوں جھونکتے ہیں، شاپنگ کے بجائے...... اس سب کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ آپ کی ایک بیٹی نہ پال سکیں ہم۔ غربت تو سوال ہی نہیں۔ میں اسے جواب بناؤں گا ہی نہیں۔ کچھ اور ہے تو آج ہی پوچھ ڈالیں۔"

ثوبیہ سعید سفاک ہوئیں۔

"کچھ اور کچھ نیا یہ ہے کہ امارت کے بعد شکل ہی دیکھی جاتی ہے۔ خود کو کبھی اوروں کی نظر سے دیکھا ہے؟ دائیں طرف آئینہ آویزاں ہے خود دیکھ لو...... حور کے پہلو میں کیا لگتے ہو۔"

"امی!" ربیعہ نے جیسے احتجاج کیا۔

"مجھے بات کرنے دو ربیعہ! ورنہ میں تمہارے ہر راستے میں آگ بھر دوں گی۔ بات کرنے دو کہ کوئی رشتہ بچ ہی جائے۔"

گوہر تناؤ سے بھر گیا۔ ساڑھے اٹھارہ سال کا انتہائی جذباتی ۔ سالڑ کا تھا وہ۔ وہ باتوں میں حاضر جواب تھا۔ قائل کرنے کے فن میں طاق بھی نہ تھا۔

"ایک انتہائی معمولی شکل وصورت...... روایتی سائڈل کلاس پس منظر اور دھندلا، بے یقین پیش منظر اور اعتماد دیکھو اس کا۔ ایک سترہ سالہ لڑکی کو اندھا کرنا آسان ہے مگر اس کی ماں یہ بدنصیبی مول نہیں لے سکتی۔ آج تم ورغلا کے میری بیٹی کو بائیک پر بٹھا لے گئے۔ کل کلاں کو کن پوائنٹ پر نکاح کروالو تو میں کیا کرلوں گی۔ میں تماشا نہیں چاہتی آخر محلے داری ہے اس لیے تمہیں وہ سب دکھا رہی ہوں جو بچکانہ سوچ تم دونوں کو سوچنے ہی نہیں دیتی۔"

"اور کچھ نیا سننا چاہتے ہو تو سنو۔ تم میری بیٹی سے حسد میں مبتلا ہو۔ شکل وصورت، اخلاق و کردار، نسب و خوش حالی وہ ہر شے میں تم سے پچاس فیصد آگے ہے اور تم......"

"امی! ایسا نہ کہیں خدارا...... گوہر یہ سب......"

"ربیعہ! آج تم بولیں تو میں تمہیں لے کر وہاں غائب ہوں گی کہ ساری عمر اس خطے کی خوشبو کو بھی ترسو گی۔ یہ لڑکا تمہیں تمہاری پسند کا کھانا نہیں کھانے

دیتا۔ تم رنگ بھی اس کی مرضی کے پہنو۔ تم اچھی لگیں تو لوگ کیوں دیکھیں۔ آج یہ فارغ ہے تو تم اس کا دل بہلاؤ۔ اس نے ڈاکٹر بننا ہے مگر تمہیں اس نے باندی ہی بنانا ہے۔ تم اس کے مستقبل کے منصوبوں میں کہیں نہیں۔ تم اس کے صحن اس کے کمرے میں کہیں نہیں۔ بس اس کی چھت پر ہو اور تم چلیں مجھے چپ کروانے۔ گوہر کا دل بولنے کو نہیں کرتا تو ربیعہ سارا دن بولے گی۔ آج وہ بول رہا ہے تو ربیعہ کو رائے دینے کا حق تک نہیں۔ اسے تم سے محبت نہیں میری بیٹی! ایسے لوگ محبت کر ہی نہیں سکتے۔ یہ خود سے محبت میں مبتلا لڑکا تمہیں ساری عمر کی مشقت کے سوا کچھ نہ دے گا۔ یہ تمہارے پیچھے اس لیے ہے کہ تم سے بہتر کوئی ملا نہیں جس دن مل گیا۔"

"اپنی ماں کا منہ بند کرواؤ۔" گوہر نے ربیعہ کو انگارہ آنکھوں سے دیکھا۔

"اور کچھ نا سننا ہے؟ تم ربیعہ کے لیے مہلک ہو کیونکہ مجھے تمہارے کردار پر بھروسا نہیں۔ یہ ہوس ہے محبت نہیں۔"

"امی پلیز، چپ کر جائیں۔ آپ کیا کہہ رہی ہیں۔ گوہر نے کبھی ایسا سوچا تک نہیں۔ گوہر رکو...... پلیز! ایسے نہ جاؤ۔ میں بات کرتی ہوں تمہارے سامنے ابو سے، پلیز۔" ربیعہ باہر نکلتے گوہر کی طرف لپکی۔

"ربیعہ! واپس آؤ۔ یہ لڑکا جس نے بچپن میں تمہارا ہاتھ نہ چھوڑا۔ پورے محلے میں تماشا کروا دیا، اب کیا کیا کر سکتا ہے؟ آج کے دو گھنٹوں نے مجھے سولی پر لٹکائے رکھا ہے۔ میں کوئی خطرہ اب کے مول نہیں لوں گی۔"

ربیعہ روتی مگر گوہر کی آستین نہ چھوڑتی۔

"میں نے ابو سے کبھی کچھ نہیں مانگا۔ صرف تمہیں مانگوں گی، پلیز یوں ایک جھٹکے میں سب ختم مت کرو۔"

گوہر اتنا غصے میں تھا کہ اسے کچھ سجھائی نہ پڑتا۔ خود کو چھڑاتا۔

"رابی! چھوڑ دو مجھے ورنہ میں بہت غلط کر دوں گا۔" ربیعہ ہچکیاں لیتی۔

"تم ہمیشہ کے لیے چلے جاؤ گے، میں نہیں چھوڑوں گی۔" ثوبیہ نے چٹاخ سے تھپڑ اسے مارا۔

"شرم ختم ہو گئی تم میں۔ یہ لڑکا...... جانے کیا تعویذ پلایا ہے تمہیں۔"

"بخش دیں مجھے۔ سنبھال کے رکھیں اپنی بیٹی۔ مجھے بھی نہیں چاہیے ایسی ماں کی بیٹی جو لڑکے کو گھر بلا کے بھاؤ تاؤ کرے کہ اگر امیر ہوتے تو ربیعہ تمہاری ہوتی۔ ہیرو ہوتے تو بھی چانس بن جاتا چونکہ معمولی ہو، اس لیے میں نہیں مانتی۔ سمجھا لیجیے گا اسے، میری طرف سے مطمئن رہیں۔"

ربیعہ روتی رہ گئی اور گوہر نے جیسے قسم کھالی کہ مڑ کے نہ دیکھے گا۔ ثوبیہ سعید مطمئن تھیں۔ جانتی تھیں تھوڑا تماشا تو لگے گا مگر وہ لڑکا غصے میں وہی کرے گا جو وہ چاہتی تھیں مگر اس رات جو ربیعہ کو بخار چڑھا، وہ پھر کبھی نہ اترا۔

☆☆☆

دل کو بد دعا ہے کسی طبیب کی
یہ ناسور تو ہو جاتا ہے مگر رکتا نہیں

"دسمبر میں قمیص اتار کے سگریٹ پھونکنے سے گھوڑا، نسلی گھوڑا نہیں بن جاتا۔"

حاجی صاحب کچھ پریشان تو ہوئے مگر اس کی بخ پیٹھ تھپک کے طنزاً بولے۔ تہجد کے نوافل کے لیے اٹھے تھے۔ شیراز اور گوہر کے کمرے میں روشنی تھی۔ پنجرے پر پڑی گوہر کی شال، وہ گھبرا اٹھے۔ اب گوہر کو ڈھونڈتے ڈھانڈتے آئے تھے۔ دس سال پرانا مشغلہ دہراتے گوہر کو دیکھ کے کھٹک گئے مگر پوچھا کچھ نہیں کہ وہ کبھی نہ بتاتا۔ یہ خیال ہمیشہ انہیں ستاتا کہ کچھ غلط ہے۔

گوہر ایسا تو تھا "اتنا زیادہ" ایسا نہ تھا۔

وہ دونوں خاموشی سے سیڑھیاں اتر رہے تھے۔

☆☆☆

دل کو بد دعا کسی دور دیس کے جاڑے کی
رگیں درد سے جم بھی جائیں مگر یہ رکتا نہیں

"گوہر...... رکو بیٹا۔" کالونی کے پارک میں سفید گھاس نے بھی سرد برف سی آنکھوں سے گوہر کو سعید صاحب کی آواز پر رکتے دیکھا۔

گوہر کی بھنویں اور جبڑے بھنچ گئے۔ تناؤ جیسے ٹھنڈی گھاس پر لوٹنیاں لے کے بھی آتش سا رہا۔

"روزانہ آتے ہو کیا؟" ساتھ چلنے لگے۔ گوہر کو وحشت ہوئی۔

"بس کبھی کبھی۔" قدموں میں تیزی در آئی۔ سعید صاحب ہانپنے لگے۔

"اگر لڑکے کا پتا کروا دیتے تو...... دراصل تم بحریہ ٹیوشن دینے جاتے ہو تو لڑکا بھی اسی لین میں رہتا ہے۔ پوچھنا تھا ان سے۔ آخر محلے داری ہے تو معلوم ہی ہوگا، نہیں۔"

"ہماری بھی تو محلے داری ہے۔ جانتے ہیں آپ مجھے؟" تڑخ کے بولا۔

"حاجی صاحب کو تو جانتے ہیں ہم۔ تم بھی تو ان کے وجود کا حصہ ہو۔"

"یہی تو مسئلہ ہے انکل! رابی بھی تو، یوں نہ روک کے کھڑے ہو جایا کریں یار۔" وہ بڑبڑایا۔

"سومیہ کی سسرال میں شادیوں کا سیزن چل رہا ہے۔ ہم پر بھی جلدی تاریخ دینے کا دباؤ ہے۔ میں کہتا ہوں بڑی کا بھی ہو جائے تو......"

"نہیں ہوگا، یہاں تو ہرگز نہیں ہوگا۔" وہ اصلیت میں لوٹا۔

"آپ کی بیوی نے صرف بحریہ میں شان دار گھر اور فرانسیسی چہرے والا لڑکا ہی دیکھا ہے بس۔ ہیروئن، افیم اور حشیش وہ میٹرک میں لیتا تھا۔ پھر کچھ عرصہ بعد چھوڑ دی۔ اب تو مہنگا ترین گانجا استعمال میں ہے صاحب بہادر کے۔ ابھی اس کا فون کھول لیں تو وہ ویب سائٹس اور ویڈیوز ملیں گی کہ آپ کو چھوٹا موٹا ہارٹ اٹیک تو لازمی ہوگا۔ مگر یہ سب وہ سائٹس اور ویڈیوز ہوں گی جو ذرا کم تھرلنگ ہیں اور وہ انہیں چھپانا بھول گیا۔ ہاں فوج میں کمیشن ملا تھا اسے اور محض نو ماہ میں ہی فارغ کر دیا گیا اور کچھ؟"

وہ سانس لینے لگا۔ سعید انکل کو پتا نہیں سمجھ میں آ رہا تھا یا نہیں۔

"اگر اس نیک مقصد کے لیے آ ہی گئے ہیں تو معاملہ تو بیہ آنٹی پر مت چھوڑیے گا۔ یہ میری آپ سے درخواست ہے۔ بہت سہہ چکی آپ کی بیٹی۔ بس اس بار اپنی جدید بیوی کو ان فیصلوں سے دور ہی رکھیے۔" رکھائی سے کہتے کہتے وہ ملتجی بولا۔

"مگر آج کل اچھے رشتے ملتے کہاں ہیں۔ ہر دفعہ کوئی مسئلہ...... کوئی رخنہ...... جانے اللہ کو کیا منظور ہے۔ بہت شکریہ بیٹا! تم نے ہمیشہ میری مدد کی۔ جانتے ہو ربیعہ! کے ایم بی بی ایس کی دفعہ......"

"ٹھنڈ کافی ہوگئی ہے انکل! مجھے اجازت دیں۔" وہ جواب سنے بغیر پلٹ گیا مگر مُردوں سی یادیں ٹریک کے دائیں بائیں سے نکلنے لگیں۔

ربیعہ سے ناراضی نہیں شاید خود سے فرار، امی کا کہنا۔

"میرے گھر میں آدھے اچار، مربعے، چٹنیاں جس گھر کے لیے بنتی تھیں، آج وہ مجھے غریبی کے طعنے دے گئی ہے گوہر! مڑ کے دیکھا تو پیدا کرنے والی کو بھول جانا۔"

ساتھ ہی ایم سی اے ٹی کی تیاری نے اسے شل کر دیا۔ نتیجتاً وہ پیپر میں ترتیب بھول گیا۔ انٹری ٹیسٹ میں فیل ہو گیا۔ امی نے لاہور ماموں کے پاس بھجوا دیا۔ بی ایس کیمسٹری، پھر ایم ایس وہ آٹھ سال میں صرف تین بار گھر آیا۔ جب پہلی بار آیا تو......

"ربیعہ نے انٹری ٹیسٹ کلیئر کر لیا ہے، نشتر ہاسپٹل ملتان کا میرٹ بنا ہے۔" عاشی نے بتایا۔ وہ جھلس ہی تو گیا پھر......

وہ پارک کے ٹریک پر چلا جاتا اور بولتا۔

"سارے میڈیکل کالجز سے بدنام ترین ہے نشتر ملتان،، بہن کو نشے اور جہنم کے گناہ میں جھونکنا ہے تو بھیج دو۔ میرے دوست نے تو پچھلے سال اپنے

بھائی تک کو نہ جانے دیا تھا۔ پھر میرا اپنا میرٹ یہیں کا بنا مگر ماموں نے کہا، نام بھی مت لینا۔" وہ فون بند کرتا۔ سعید انکل لپک کے آتے۔

"میری بیٹی کا بھی......" مشورہ مانگتے۔

"یوں تو میں کچھ نہیں کہنا چاہتا مگر سچ پوچھیں تو......" زبان کے جواہر نے ربیعہ سے زندگی کا آخری خواب بھی چھین لیا۔

"امی سچ کہتی تھیں گوہر! امی واقعی سچ کہتی تھیں۔"

ربیعہ کی آنکھوں میں محبت کی جگہ کچھ اور دکھا گوہر ادریس کو۔

کچھ اور نے دونوں کے درمیان اتنی اونچی دیوار بنادی کہ دس سال تک وہ دیکھ تک نہ سکے ایک دوجے کو۔

دس سال بعد گوہر نے ربیعہ سعید کو دیکھا تو اسے لگا۔ دل تو نقطے نہیں بدلتا۔ دل کے تو نقطے ہیں ہی نہیں۔ دل نہیں بدلتا۔

☆☆☆

"اللہ اللہ کیسے تپ رہے ہو؟ دوا کیوں نہیں لیتے؟" عاشی نے آتے ہی چہل پہل کو ہر گوشے، ویرانے میں پھیلا سا دیا۔

چائے پیتا گوہر غیر متوجہ سا رہا۔ عاشی اپنے بچوں کو ناشتہ کروانے میں ہلکان ہوتی رہی۔

"زید! میری جان صرف ایک ٹکڑا اور...... موسیٰ بیٹا! اب بتا بھی دو، کیا لو گے تم؟" گوہر متوجہ ہوا۔

"میرا بیٹا! میری جان یہ کھاؤ...... وہ کھاؤ...... تم صبح صبح تو ایسی ہی تر و تازہ محبت جھاڑتی ہو۔ رات تک کہتی پھرتی ہو، میری جان مت کھاؤ...... سو مر بھی جاؤ۔ حد ہے ویسے عاشی! اور یہ دودھ کی دیگچی میں پائپ کیوں نہیں لگوا دیتیں، اس یاجوج ماجوج کی قوم کو۔ کتنی بار کہہ چکا ہوں کہ اب ان کے معدے ٹھوس غذا سہہ ہی لیں گے۔ تم ہمت کر کے رسک تو لو، مگر نہیں اپنی آسانی کو اٹھتی ہو اور یہ فیڈر پر فیڈر دودھ ان کو دیے جاتی ہو۔ پانچ کلو دودھ آتا ہے، ہمارے ہاں۔ شیراز آئے تو چھ مگر تم آؤ تو نو کلو دودھ لیتا ہوں میں۔ اپنے خرچے سے، کوئی احساس ہی نہیں کسی کو یہاں۔"

حاجی صاحب نے کڑواہٹ بھرا منہ بنایا۔ اچھا بھلا چپ تھا دو دن سے...... یہ عاشی بھی ناں۔ ہمدردی دکھائی نہیں اور جھاڑ کھائی نہیں۔

"ابراہیم تو توں کو ہاتھ لگایا تو ماموں ٹیرس سے نیچے پھینک دیں گے۔" وہ ابراہیم کو دھمکاتا۔

"ابو جی! اب گوہر کی شادی جلدی کر دیں۔ کسی اور کے پیچھے پڑے اب۔" عاشی مصروف سی بولی۔ وہ ہنکارا بھر کے رہ گیا۔

"سامعہ آئی تھی کل ملنے۔ کہہ رہی تھی ثوبیہ آنٹی، ربیعہ کو کسی سائیکاٹرسٹ کے پاس لے کر جا رہی ہیں۔ سائیکاٹرسٹ نے کہا ہے کہ ربیعہ سائیکو سومیٹک ہے۔ وہ ٹھیک ہو جائے گی مگر......"

وہ پاؤں گھسیٹتا کالج کے لیے نکل گیا۔ پیچھے عاشی کہہ رہی تھی۔

"ابو جی! مجھے سامعہ کی بات بہت اچھی لگی ہے۔ گوہر کو بھی ربیعہ کتنی پسند تھی بچپن میں۔ پھر ربیعہ کی طبیعت بھی صلح جو ہے، گوہر کو تو اس کی شکل پر ہی ترس آ جایا کرے گا۔ کچھ بھی پہن لے گی اچھی ہی لگے گی۔ پھر میکے جانے کا خرچا بھی نہیں۔ گوہر جیسا مہا کنجوس تو خوش ہی خوش۔" عاشی نے اپنے طور پر ایک سے ایک مدبر دلیل دے کر حاجی صاحب کو چت کر دیا۔

"بی بلاک میں کوئی اس لڑکی کا ہم پلہ نہیں مگر...... میرا اپنا پیدا کردہ کھوتا......"

"فکر نہیں کریں، خود بات کروں گی۔ آپ بس کچھ مت بولنا ورنہ اکڑ جائے گا۔"

حاجی صاحب نے سامنے بیٹھی، اپنی خاتون بیٹی کو ہمدردی سے دیکھا۔

☆☆☆

دل کو بددعا ہے وقت آخر کی یہ ہر بار نئی آس بیل لگاتا ہے کہ اسے رکنا نہیں

''رشتہ دکھا رہی ہو کہ سم کارڈ؟'' وہ اتنا اونچا بولا کہ فضا بھابھی اور حاجی صاحب لپک کے لاؤنج کی طرف بڑھے۔

''ہوں؟ یہ ملاؤ گے تو چاہے نئے کپڑے مت دلانا۔ وہ ملاؤ گے تو ''کرایہ فری'' آفر ملے گی۔ یہ دباؤ گے تو اس کی بولتی بند...... بہن بند کروا اپنا ون لائنز اور اپنی بتیس سالہ زندگی میں آخر ایسا کون سا دانائی بھرا کام کر بیٹھی ہو جو میری زندگی میں جمع تفریق کرنے لگیں۔ سامعہ نے کہہ دیا اس دمہ زدہ سائیکو لڑکی سے شادی کرلوں۔ خوب، تم کو بات اچھی لگی تو اس ڈینگیں مارتی فیشن زدہ عورت کو گھر میں لا کر سجالوں۔ حاجی صاحب کو پیشکش معقول لگی تو متوسط گھرانے میں بنا سوچے، سہرا باندھ کے گھس جاؤں۔ میری زندگی ہے تو مجھے ہی طے کرنا ہے ناں کچھ نہ کچھ؟ مجھے ربیعہ سعید سے تو کیا، اس نام کی کسی بھی لڑکی سے شادی نہیں کرنی۔ مجھے شہد رنگ سے اپنا گھر نہیں بننا۔ مجھے رشتہ نہیں ڈالنا کہ ثوبیہ سعید کی گردن کا سریا مجھے جینے نہیں دے گا۔ مجھے کم از کم اس زندگی میں اس لڑکی کو نہیں دیکھنا جو اپنی ماں کی نظر سے دیکھتی ہے۔ میں تمہاری منت کرتا ہوں کہ کچھ ایسے ہی اونچے بونگے دلائل اور اکٹھے کرو اور حاجی صاحب کے دماغ سے بھی یہ بات نکال دو ورنہ میں وہ کچھ کروں گا کہ تم لوگوں کو میرے بارے میں اپنی رائے پر افسوس ہونے لگے گا۔''

وہ اعتراض کرے گا، سب کو معلوم تھا مگر وہ بے عزت کرے گا کسی کو گمان نہ تھا۔ وہ بھڑاس نکال لے گا کسی کو علم نہ تھا۔ عائشہ ادریس کے آنسو سب سے پہلا ردعمل تھے۔ وہ بچوں کو لیے روتی گھر سے نکلی۔

حاجی صاحب چپ چاپ مسجد کو چلے اور گوہر ادریس ایک شامی بے گھر بچے سا ہو گیا۔ شکوہ کناں...... اذیت میں مبتلا...... چوٹیں سہلاتا...... انتقام کے لیے بلبلاتا۔

☆☆☆

تیسرا دن تھا گھر میں سرد سی جنگ چل رہی تھی۔ خاموش اور تنگ۔

اتوار کا دن تھا اور گوہر رفیعہ کے سر پر کھڑا جاہل انداز میں چلا رہا تھا۔ ''یہ کرو...... وہ کرو......'' حاجی صاحب کو جانے کیسا رنج ہوا کہ آج وہ گوہر ادریس کو دھرتی پر لانے کے لیے جت گئے۔

''او گوہر! ادھر آ ذرا۔'' لاؤنج کے صوفے پر جم کے بیٹھتے ہوئے بولے۔

''آج کرلو میرے سامنے تقریریں...... ساری آج ہی کردے پتر۔'' پچکار کے دھاڑے۔

''یہ جو روز روز تماشیاں کرتا ہے ناں، آج کل کھل کے کھیل۔ کیا چاہتے ہو سرکار؟ عاشی بے وقوف، شیراز عیش پرست۔ فضا پھوہڑ، فضول خرچ اور میں بڈھا کمزور بے دام کا غلام۔ رفیعہ کام چور، سامعہ ناقص العقل۔ راجا صاحب پھاپھا کٹنی۔ ایاز صاحب بے ایمان۔ ربیعہ عقل کی اندھی، اس کی ماں فیشن کی ماری۔ رفیق بٹ ناکارہ۔ سارے کے سارے نقص زدہ۔ نامکمل...... تم کیا ہو......؟ ہو کیا تم؟''

گوہر دنگ رہ گیا۔

''آج بھی میری ماہانہ آمدن تم سے زیادہ ہے۔ آج بھی میرے سر پر بال تم سے زیادہ ہیں۔ آج بھی لوگ تمہیں پیٹھ پیچھے گالیاں اور میرے پیٹھ پیچھے دعائیں دیتے ہیں۔ خود بے تین نسل پرانے آدمی سے تمہارا مقابلہ نہیں تو اس نسل میں کون سا نمبر ہوگا تمہارا، کبھی سوچا؟ مجھے لگا تم میں احساس نہیں۔ چلو کوئی نہیں۔ تم میں رکھ رکھاؤ نہیں، شائستگی نہیں...... مگر تم میں تو سیدھے سیدھے، خدا خوفی ہی نہیں گوہر ادریس! تم تو خود کو منواتے منواتے ابوجہل بن گئے...... خود پرستی میں مبتلا...... عیب جوئی میں مشغول، یا تو آج خود کو ابوجہل تسلیم کرو یا ایسی بے درد راست گوئی کی وجہ بتاؤ مجھے۔''

گوہر کی نظریں زمین میں پیوست ہو گئیں۔ وہ بے دم ہو رہا تھا آج کل، اب نادم بھی ہو گیا۔ سر اٹھ ہی نہ سکا۔ گرم سا سیال گالوں اور کانوں کی لوؤں میں گھومتا رہا۔

''ربیعہ کے لیے پریشان ہے سعید اور مجھ سے

ایک بیٹی والے کی پریشانی دیکھی نہیں جاتی۔ تمہیں اس جہلا جیسے روپے کو سدھارنے کے لیے کسی نبی پیغمبر کا انتظار ہے؟ یا ابھی بھی توبہ پر یقین باقی ہے؟ رشتہ تو اب ادھر ہی ہوگا جہاں میری 'دانا' بیٹی نے کہہ دیا ورنہ مجھے اپنی رائے پہ کوئی افسوس نہ ہوگا۔

''حاجی صاحب مسجد کو نکلے تو خود کو داد دیتے...... گوہر کو کوستے......

''وڈا شوخا نہ ہو تو......''

☆☆☆

دل کو بددعا ہے کسی رقاصہ کی
گھنگرو ٹوٹ بھی جائیں، یہ رکتا نہیں

وہ کالج کے گیٹ سے بائیک نکال رہا تھا جب ہنگامہ دیکھا۔ لڑکے کو پیٹتا ہجوم اور بے تحاشا روتی لڑکی...... سر جھٹک کے آگے بڑھ گیا اور اگلے دن......

اسٹاف روم میں عدالت بجی تھی۔ وہ کلاس لے کر لوٹا تو لڑکے کی ماں روتی، دہائی دے رہی تھی۔

''سر! میں کہاں جاؤں...... کس کو کہوں؟ باپ بھائی ہے نہیں اس کا۔ چچا تایا کہاں تک بھاگیں اس عاشق کے پیچھے۔ میں نے بہت سمجھایا ہے مگر بہرہ ہوا بیٹھا ہے۔''

اب لڑکی کا بھائی بولتا۔

''ہمیں کوئی شوق نہیں ہے بی بی اپنی لڑکی کا نام یوں اداروں میں لیتے پھریں۔ یہ تو راجا صاحب نے معاملہ حل کروانے کا کہا تو چلے آئے ہیں۔ اپنے بیٹے کو کہو یا تو ہماری لڑکی کی جان چھوڑ دے یا پھر تم اس پر بین کرنے کو تیار ہو جاؤ۔''

گوہر کو معاملہ سمجھ میں آ گیا کہ محبت کا سیاپا ہے۔ کرسی گھسیٹ کے آن بیٹھا۔ بغور لڑکے کو دیکھتا۔

''میں نہیں چھوڑوں گا۔'' گوہر کے ہونٹ لڑکے کی ہمت پر گول ہوئے۔ معاملہ شدید تر ہوتا گیا۔ گوہر کی رگیں تن گئیں۔

''محبت نہیں ہوتی یہ۔'' سائیکالوجی کا صہیب مجید بولا۔

''ہو ہی نہیں سکتی۔ محبت ہوتی تو تمہیں ڈر ہوتا، لڑکی کی بدنامی کا پاس ہوتا، اس کی عزت کا۔ اپنی ہوس، کم ظرفی اور فلمی جذباتیت کو محبت مت کہنا۔''

گوہر کو لگا تو بیہ سعید نے آسمان اٹھا کے گوہر کے سر پر لا دیا ہو۔ سارا اسٹاف روم صاف سلیٹ ہو گیا اور شہر کی سب سے بڑی سائنس اکیڈمی سامنے چھپ گئی۔ گیٹ سے بائیک نکالتا گوہر نظر آیا۔

اور وہیں کھڑی تھی مجبور سی ربیعہ...... گوہر ادریس کی گردن تن گئی۔ آبرو بھی گردن کے پیرو کار ہوئے۔

دل کو بددعا ہے کسی عزت مآب کی
کہ یہ ذلت کے زیر پانیوں میں ڈبکیاں لیتا ہے، رکتا پھر بھی نہیں

''مجھے مت چھوڑو۔'' جنت کی نعمتوں کی قسم ربیعہ سعید کی گڑگڑاہٹ گوہر ادریس کے پیروں میں جھکی پڑ رہی تھی۔

آتے جاتے لڑکے بغور دیکھتے، سمجھتے، رشک، حسد، حیرت کرتے، گرلز کیمپس کی خوب صورت ترین ٹاپر لڑکی...... بوائز کیمپس کا گالیاں بکتا، کف اڑاتا گوہر ادریس......

''کہنا بے معنی ہے مگر تم جانتے ہو میں مر جاؤں گی۔ میں مر جاؤں گی۔ میرا دل پھٹ جائے گا گوہر...... مجھے مت چھوڑو۔''

یوں روتی کہ جیسے اپنے مرنے پر رویا جائے۔ بائیک اسٹارٹ کرتے گوہر کو روکتی۔

''میں تھپڑ مار دوں گا ہاتھ ہٹاؤ۔ تماشا لگا رکھا ہے۔ اپنی ماں کو دکھاتیں یہ رونا تو شاید وہ اتنی سفاک نہ ہوتی۔ اب کوئی گنجائش نہیں۔'' ربیعہ کی سمجھ میں نہ آتا سفاک کون ہے۔

''میں ہاتھ جوڑ رہی ہوں ناں۔ میں تمہاری ہر بات مانوں گی۔ کبھی تنگ نہیں کروں گی۔'' سترہ سالہ بچی......

''بیٹھو بائیک پر...... بشارت کے ہوٹل چلو میرے ساتھ۔'' اس نے شرط رکھی تھی۔ بدنام زمانہ ہوٹل...... ربیعہ کا رونا شدید ہوتا اور گوہر مزید کٹھور۔

''ایسے مت کرو۔'' لڑکے آنکھیں پھاڑے اس لڑکے کا نصیب دیکھتے تھے۔

"تم دونوں ذرا میرے ساتھ آؤ۔" انگریزی کے استاد حامد خان جما کے بولے اور وہ دونوں نئی منزل پہ تھے۔

"یہ زہر آلود ہے لڑکی۔ چھوڑ دو اسے۔" واشگاف لفظوں میں ربیعہ سے کہا تھا انہوں نے۔

"محبت نہیں ہے یہ، ہو ہی نہیں سکتی ورنہ اتنی دیر لڑکوں سے بھری سڑک پہ کھڑا تم سے تماشا نہ کروا رہا ہوتا۔ یہ تمہیں کھوکھلا کردے گا۔ شاید تم مجھے سمجھ نہ سکو کہ عمر ہی ایسی ہے مگر بچے تم خود سے پوچھو گی تو جواب واضح ہی ملے گا۔ پوچھو خود سے کہ کیا واقعی یہ تم سے محبت کرتا ہے۔ تمہیں کبھی محبت محسوس ہوئی اس کی؟ ایسے نفسیاتی مریضوں کو خود معلوم نہیں ہوتا کہ وہ کسی کو کس حد تک زک پہنچا رہے ہیں۔ یہ تمہاری بھوک ختم کردے گا (ربیعہ تم نے تین دن سے صرف ایک سیب کھایا ہے بیٹا؟) تمہاری نیند برباد کردے گا۔ (مر نہیں جاؤ گی اگر دو گھنٹے نہ سو سکیں تو)

تمہارا کیریئر تمہارا مستقبل، تمہاری عزت، تمہارا کردار...... سب سیاہ کردے گا اس محبت نامی دھوکے میں مبتلا رکھ کر۔ میں نے کہا ناں Toxic (زہر آلود) ہے یہ۔ اس عمر میں بروقت ایسی شخصیت اسے پہچاننا مشکل ہوتی ہے اور اگر آپ کو محبت ہو اس سے پھر تو ناممکن...... چھوڑ دو ایسے کہ زندگی اتنی بھی ارزاں نہیں کہ صرف ایک بے یقین جذبے کے پیچھے بہا دیں۔"

ربیعہ کے آنسو ساکت ہوئے اور گوہر کا فشار خون گولی کی رفتار سا ہوا۔

ربیعہ نے رونا چھوڑ دیا شاید، پھر میڈیکل کا خواب پورا نہ ہونے پر وہ آخری بار بولی تھی گوہر کے مقابل۔

"کیا کہہ رہا تھا صہیب مجید، ہوس، کم ظرفی، جذباتیت۔" گوہر فالج زدہ سا گنگ بیٹھا رہا۔

"تم نے کہا، وہ ہوس زدہ ہے۔" گوہر ادریس کو اس لفظ سے خوف آتا تھا۔ صہیب ہنسا۔

"ارے...... یونہی غیرت دلانے کو چوٹ کی تھی بچے پر، کام کر گئی۔ بات منوانے کا ایک یہ بھی طریقہ ہے۔" گوہر ڈھے گیا۔

بے یقینی سی بے یقینی......

ثوبیہ سعید چاہے بال جس رنگ کے بھی رنگواتی تھی مگر ربیعہ کے لیے وہ "کیئر" ماں ہی تھی۔ فیشن زدہ تھی مگر بے ضمیر، بدکردار ماں تو نہ تھی۔ عام سا داؤ کھیلا اس نے۔ چوٹ کی اور گوہر نے کھل کے اپنا آپ دکھا دیا۔ اگر اس دن ربیعہ بائیک پر بیٹھ جاتی گوہر کا دل بیٹھ گیا۔

ہوس زدہ بہرحال نہ تھا وہ مگر ٹاکسک ضرور تھا۔

ایک ماں نے نہ صرف لڑکے کے زہر کا توڑ کردیا بلکہ اتنے سالوں سے وہ پرکھتی گئی گوہر کو...... مکمل بنائی گئی اسے...... کامیاب، شریف، باکردار......

کالونی پہ اندھیرا اکیلے سنبل کے درختوں نے بے دم ہوئے گوہر کو دیکھتے ہی سرپہ ہوا اڑا دیے وہ لیپ ٹاپ بیگ بمشکل اٹھائے گھسیٹتا جاتا خود کو، خود کو مکمل سمجھتے اور درحقیقت "مکمل" ہونے میں جانے کتنے نوری سالوں کا فاصلہ ہے۔ جانے کتنے سوراخ ہوتے ہیں ہماری شخصیت میں...... بھرتے ہی نہیں۔

لیمپ پوسٹ جل اٹھے تھے اور اندھیرا کفن اوڑھے کونوں میں لاوارث پڑا تھا۔ سرما کا غرور تھا کہ ٹوٹتا ہی نہ تھا۔ سعید انکل کے گھر کے سامنے مہنگی گاڑی کھڑی تھی۔ وہ گزرنے لگا تو......

"گوہر ادریس...... حیران کن بات!" سعد ثقلین کی چہکار پہ گوہر حیران ہوتا اس سے بغل گیر ہوا۔

"تم لوگ ابھی تک ادھر ہی ہو؟" حسب عادت شروع ہوا۔

"تم؟" اس سے زیادہ گوہر سے بولا ہی نہ گیا۔

"یار...... امی لڑکیاں دیکھتے تھک گئی تھیں میں نے کہا اب میں دکھاتا ہوں آپ کو لڑکی...... جو بھی ہو بس معاملہ فائنل ہونا چاہیے اب۔ اس سے پہلے کہ تم کہہ دو۔ یہ میری دلہن ہے۔" آج اتنا زود رنج نہ ہوتا تو سعد ثقلین کی نکسیر تو پھوڑ ہی دیتا یا پھر اس کے سلیقے سے ملنے جمے بالوں میں انگلیاں پھنساتا اور......

"اچھا پھر ملتے ہیں کہیں...... تمہارا نمبر تو ہوگا ناں ربیعہ کے پاس۔ اسی بہانے ربیعہ سے بات چیت کا آغاز ہو جائے۔" سرگوشی میں بولا اور گوہر نے

اس کی پشت پر کھڑی ثوبیہ سعید کو جیسے پہلی بار دیکھا۔
جدید لباس، میک اپ زدہ خوب صورت چہرہ اور...... سادہ مسکراہٹ۔

ثوبیہ نے کتنے ہی سالوں بعد اصلی گوہر کو دیکھا مگر...... بے بس، شکوہ بھری آنکھوں والا ناکام بچہ...... وہ بے آرامی سے بھر گئیں کہ گوہر کے سست، شکستہ قدم اپنے گھر کو اکھڑ رہے تھے اور ان کی ربیعہ...... اس کی کمر کا درد...... سانس کی تکلیف......

☆☆☆

دل کو بددعا ہے کسی بے گھر کی کہ یہ "پناہوں" کو واسطے دیتا ہے اور رکتا پھر بھی نہیں وہ ابوجہل سا رحمت سے دور مخمص گڑگڑاہٹوں کو خود میں اٹھتے پاتا۔ وہ مسجدوں، خانقاہوں کو لپکتا۔

"اللہ مجھے ربیعہ چاہیے، مجھے آپ کا دلاسا چاہیے۔ کیسے بھی سہی مجھے یہ کہہ دیں۔ گوہر ادریس! تم اتنے خوب ہو کہ ربیعہ سعید سے بہتر لڑکی کے لائق ہو۔" وہ اللہ سے خود کے لیے 'خوب' سننا چاہتا ہو جیسے۔

"مجھے ربیعہ نہیں چاہیے۔" وہ سوسائٹی پارک میں مفلس ہو جانے کے ڈر سے بھاگتا...... اتنا بھاگتا کہ رگیں ببول ہو جاتیں۔

"ربیعہ نہیں بس۔" ٹیوشنز چھوڑتا۔

"اور کوئی بھی......" جم کا انسٹرکٹر اس کی دیوانگی پر بوکھلاتا۔

"دو دن میں مرجاؤ گے اگر یونہی کرنچز (Crunches) کرتے رہے۔"

"اللہ مجھے وہ بیمار لڑکی...... نہیں ہرگز نہیں۔"

"بخار کیوں نہیں اتر رہا تمہارا۔" راجا صاحب گھبرا کے کلائی چھوڑتے۔

"ربیعہ کے علاوہ کوئی بھی ہو......" عاشی بس دیکھے جاتی کہ بھائی کو اتنا کہنے کی آخر ضرورت ہی کیوں ٹھہری۔

"گوہر! یہ مٹھائی سعید انکل کے گھر سے......" اس کے تیزی سے غائب ہو جانے پر فضا بھابھی حق دق رہ جاتیں۔

رات نو بجے جم سے واپسی پر وہ اپنے لیے کھانا نکالتا۔

"بریانی بڑی اچھی بنائی ہے فضا بھابھی نے۔"

"ہیں یں یں......" حاجی صاحب مڑتے۔

"اومیں تمہیں خچرا! یہ تو سعید کے گھر سے آئی ہے منگنی کی ہے ناں بچی کی اس نے۔ وہ تیرے ہی جماعت کے شوخے سے لڑکے سے......"

وہ جھٹکے سے اٹھا یوں کہ گلاس لڑھکتا نیچے گرا اور کانچ نے ہر جانب شور سا مچا دیا۔

ہاں، حاجی صاحب نے خود دیکھا کہ وہ خوف زدہ ہوا تھا جیسے کوئی کالا عقرب نکلنے کے بعد ہوتا ہوگا۔

"کیا ہوا ہے گوہر؟" زندگی میں تیسری بار وہ گوہر کے لیے فکر مند ہوئے اور اس کھوتے، خچر، ابوجہل کو لگا وہ یوں بلک بلک کے رو دے گا کہ حاجی صاحب پرانے نام بھول کے اسے "نامرد" ہی کہا کریں گے۔

"ابھی بھی بخار ہے کیا؟"

"ہاں ابھی بھی محبت ہے یا شاید ہوس...... یہ ختم نہیں ہوتی حاجی صاحب......! ربیعہ کہیں نہیں جاتی میرے اندر سے...... یہ رزیل دل نہیں رکتا۔"

وہ بڑبڑاتا اندر کو بڑھا۔ حاجی صاحب فون ملاتے عاشی کو بلانے لگے۔

"میرے کاکے کا بخار نہیں اتر رہا پتری۔"

☆☆☆

جب رات مزید گہری ہوئی تو دھند نے ہر شے کو عدم کرنا شروع کیا۔ مرکزی شاہراہوں سے ٹریفک کی ہلکی آوازیں کالونی میں گھومتیں، پندرہ منٹ بعد چکر لگا کے چوکیدار سیٹی بجاتا......

یخ بڑے گملوں سے ٹیک لگائے بیٹھا گوہر ادریس، ربیعہ کی کھڑکی کو دیکھنا چاہتا مگر سفید جھاگ سی ہوا۔

ضروری نہیں تھا کہ ثوبیہ سعید، عین ان ہی دنوں سچی اور حق بجانب ثابت ہوتیں ضروری نہیں تھا کہ عین ان ہی دنوں اسے ربیعہ کو پالینے کا راستہ نظر آنے لگتا۔ ضروری نہیں تھا کہ سالوں بعد بھی گوہر ادریس اتنا ہی مستقل مزاج رہتا۔

وہ بوتل سے پانی کا گھونٹ بھرتا۔ آنکھ جھپک کے درد کو پیچھے دھکیلتا۔ محبت کے معاملے میں اتنا غیرت مند، ہونا کس کام کا۔

"میں ربیعہ کو ختم کر دیتا اپنی ذات کے دبدبے سے...... اچھا ہی ہوا...... نہیں...... اچھا نہیں ہوا۔ میں سدھر سکتا تھا۔ اب ربیعہ نہیں مل سکتی۔" مکالمہ شروع ہوا۔ جب حاجی صاحب آ کے بیٹھے۔

"مان جاتے تو اچھا ہی تھا۔ سعید کی بیٹی جیسی پورے بی بلاک میں...... دیکھ گوہر اور تو کسی نے ماننا نہیں جیسی خرانٹ تیری شکل اور عادتیں ہیں، وہ تو عادی تھی بے چاری، تیری نازیبا بکواس......"

"میں ٹاکسک ہوں حاجی صاحب، میری ذات اسے کوئی سکھ نہ دیتی۔"

"او پاغلا! بیوی پر کوئی زہر اثر نہیں کرتا۔ اگلی زہر کا نسوار بنا کے آپ کے نتھنوں میں ٹھونس دیتی ہے۔" حاجی صاحب جو آدھی بات سمجھے تھے اس کا صحیح جواب دے رہے تھے۔

"اب تو سورج کسی اور دیس جا نکلا ہے۔ روشنی کے تصور سے جی بہلانے کا فائدہ؟ منگنی نہ ہوتی تو......"

"لے...... وڈا! مرتا پریتم، او پتا ہے نہیں کہ منگنی کس کی ہوئی ہے۔ ایویں ورزشیں کر کر کے ڈولے (مسلز) بنا رہا ہے سلمان خان نہ ہو تو......" وہ کھلبلی سے اٹھ کھڑا ہوا۔

"حاجی صاحب! دل کو تو جانے کس کس کی بددعا ہے مگر آپ کو بھی کسی، چھچھورے اداکار کی بددعا ہے ایویں اتنے لمبے لمبے مکالمے بولنے لگتے ہیں۔ پتا بھی ہے نا یہ رزاق کو پسند نہیں لمبے مکالمے او بھائی کس کی منگنی......؟"

"او خچر! بڑبڑاتا ہی رہے گا کہ بتاؤں؟" حاجی صاحب کچکچائے۔

"ربیعہ سے چھوٹی سامعہ کی ہوئی ہے۔ سعد کی جونیئر تھی پی ایم سی (پنجاب میڈیکل کالج) میں بتایا نہیں اس سڑے درانی نے؟"

وہ سعد کے لتے لینے لگے۔ گوہر گھٹنوں کے بل ان کے سامنے بیٹھا۔

"حاجی صاحب......" دنیا کی ہر زبان 'بے بس' کو مدد دینے میں ناکام ہی ہے۔ حاجی صاحب بولتے۔

"اگر تو مان جائے تو...... ربیعہ جیسی پورے......" وہ گوہر کی تلملاہٹ پر ہنستے۔ اللہ شریکوں جیسا باپ نہ دے کر کسی کو۔' وہ سوچتا۔

"عاشی آج ڈال آئی تھی رشتہ میرے اور فضا کے ساتھ۔ اب قیص پہن لے کھوتیا۔ نمونیا ہو گیا تو ڈرپ لگوائے گا یا شادی کی دعوتیں کھائے گا۔"

گوہر کوئلے کی کان میں دبے ڈھانچے سا ساکت ہو گیا۔

دل کو بددعا ہے کسی تاریکی کی
کہ سارے سورج، دیے لٹ بھی جائیں، یہ رکتا نہیں

☆☆☆

"میرے پیدا کرنے والے تجھے اس بچی پر رحم نہ آیا۔ تیرے عدل نے کیسے گوارا کیا کہ کسی معصوم کو دنیا میں ہی جہنم کا مکین کر دیا۔ یہ بچی اب کیسے جیے گی۔"

کارڈ پر چھپے نام پر حسرت سے ہاتھ پھیرتے راجا صاحب کی دہائیاں سارا اسٹاف روم سنتا اور اس 'حاضر جواب' کو دیکھتا۔

وہ چائے اٹھاتا، کرسی کی ٹیک سے پشت ٹکاتا۔

"راجا صاحب! آپ کی کوئی رشتہ دار بیوہ ہے کیا؟"

"نہیں۔"

"ہوں تو بتایئے گا مجھے حاجی صاحب کی زندگی بھی جہنم بنوانی ہے۔" ایسا قہقہہ پڑا کہ کئی ایک نے مڑ کے دیکھا۔ مطلب لڑکا لوٹ آیا تھا 'پردیس' سے۔

زیورات حاجی صاحب نے بنوائے۔

"بڑی کو ساڑھے سترہ چڑھایا تھا۔ تم نے پانچ تولہ بیچ کر گاڑی میں رقم ڈال لی تھی تو اب ساڑھے بارہ یہ رہے۔ اپنی طرف سے کچھ بنوانا ہے تو......"

"غضب خدا کا کون سا اس کو 'دیوی' کے سنگھاسن پر بیٹھ کے 'وچن' شاسن کروانے تھے۔" اندر کا کنجوس جیسے بیدار ہوا۔

"چھ سے بھی کام چل جاتا۔" حاجی صاحب کی

تسبیح رکی۔
"چلو...... وش کر لیتے۔" حاجی صاحب نے کچھ ڈھونڈنا چاہا۔ وہ پھرتی سے کھڑا ہوا۔
"دیکھ لیں...... ساڑھے بارہ تولے چڑھا کے دیکھ لیں۔ وہیں فرش ہو جائے گی وزن سے وہ ٹی بی زدہ......" حاجی صاحب کو غش ہی آ گیا۔

☆☆☆

"یہ نائی نے تو عجیب بکری سامنہ بنا دیا ہے اس کا۔" حاجی صاحب کے شگوفے پر گوہر نے یہ پہلو پر پہلو بدلا۔
وہ اکھڑ گیا۔ دن کا آغاز ہی یوں ہوا۔
"نیگ لے لو مگر یہ سرمہ لگا کے مجھے 'شیروانی والا ڈاکو' بنانے کی ضرورت نہیں۔" پہلا حکم۔
"اگر وہاں چھچھوری لڑکیوں نے ایک گلاس دودھ کے لیے اٹھکیلیاں کیں تو میں بیچ میں چھاڑ دوں گا۔" عاشی ان سنی کرتی۔
"یوں کریں ووں کریں والے پوز نہیں بنوانے مجھ سے، آئی سمجھ۔" فوٹو گرافر کی شامت۔
"گوہر بھائی! ٹھیک سے کھانا کھایے گا۔"
فرہاد ذمہ دار شکل بناتا۔
"اویار! کھانے بھی تو دو، چھٹا لڑکا یہی مکالمہ بول رہا ہے۔"
حاجی صاحب بے طرح کھانسنے لگے، شیراز کے پیٹ میں بل پڑ گئے۔ فرہاد جانے کدھر کو نکلا۔ سارا دن وہ تنا رہا۔
"عاشی! بریانی پھر سنبھال لینا پہلے ابراہیم کو سلاؤ، یہیں لڑک رہا ہے صوفے پر۔" لاؤنج میں کمبل میں دھنسا وہ تان لگاتا۔
"ہیں...... تم ابھی تک یہیں بیٹھے ہو؟ یہ شیراز بھی ناں اپنے سونے کی پڑ گئی بس۔ اچھا اٹھو تم، ربیعہ پہلے ہی تھکی ہوئی ہو گی۔"
گوہر کو خوف آیا۔
"اللہ پوچھے حاجی صاحب کی جلد بازیوں کو......"

☆☆☆

"کیا کہا تھا تمہاری امی نے؟ کہ حور کے پہلو میں کیا ہوں میں......؟
"آج اسی لنگور کو بیٹی سونپ کے کالونی میں بریانی اور ٹرائفل بانٹ رہی ہیں واہ......"
آتے ہی سہارا طنز کا لیا تھا۔ جوتے، گھڑی اتارتے جانے کیوں وہ لحہ بہ لحہ غصے میں آ جاتا...... یہ جانتا تھا کہ گھونگھٹ میں گھبراہٹ کو دوڑ پڑی ہے۔
"بڑا خوش ہوں جی میں سارے جہاں سے بے عزت ہونے کے بعد دلہن گھر لانے میں، غریب، بدشکل، حاسد اور ہوس پرست۔" ربیعہ کے وجود میں کپکپی بھرنے لگی۔
"جانے وقت کو کیسی دشمنی رہی ہے مجھ سے، سائیکل پسند تھی۔ جب ملی تو موٹر سائیکل کو دل چاہتا تھا، بریانی کو دل کرے تو مسور کی کھچڑی ملتی ہے اور بریانی ملے تو بھوک نہیں ہوتی اس دن۔ مجھے تو تمہارے ملن کی دعائیں مانگے بھی دس سال ہو گئے تھے۔ اب کیا فائدہ...... کوئی مزا محسوس نہیں ہوتا کچھ مل جانے کا۔"
ربیعہ نے گھونگھٹ الٹ دیا کہ سانس الٹنے لگا تھا۔ اکھڑتی سانسیں۔
"اب تمہاری امی کو لگا کہ یہی بے وقوف ہی تو ہے جوان کی ناتواں بیمار بیٹی کو سر آنکھوں پر بٹھائے گا کہ کسی وقت کا عاشق ہے۔ مگر سن لو ربیعہ! میں انتہائی شقی القلب اور انتقام پرست انسان ہوں۔ نہ خود سکون سے رہوں گا نہ تمہیں رہنے دوں گا۔"
مسلسل ہلچل سے وہ پلٹا...... استھما کا اٹیک...... ربیعہ زرد ہوئی ان ہیلر ڈھونڈنے میں مصروف۔
"کچھ نہیں ہوا ربیعہ! پر سکون رہو۔ صرف سوچ رہی ہو۔"
وہ اس کے نخ ہاتھ تھامنے لگا۔ ربیعہ نے ہاتھ جھٹکے۔ وہ بھاشن بھول گیا۔ انا بھول گیا۔ اذیت بھول گیا۔ ذلت بھی بھول گیا۔ وہ صرف ربیعہ کی تکلیف دیکھتا۔ اتنی مشکل سے سانس لیتی کہ گوہر کی رگیں چھٹتیں۔ اس کے ہاتھ اور ہونٹ نیلے سے ہونے لگے۔
اب گوہر ادریس پاگلوں کی طرح اس کے

سامان سے ان ہیلر ڈھونڈ رہا تھا۔ ان ہیلر لینے کے بعد وہ بے دم سی ہوگئی۔ ان پانچ منٹوں میں ہی گوہر نے جان لیا کہ وہ کیسا شوہر بننے والا ہے۔

رات کے کتنے ہی پہر وہ بے ترتیب سانسوں سے سوتی رہی۔ آنکھ کھلی تو عادتاً اندھیرے میں گھورنے لگی۔

"کیا دیکھتے ہو؟" سرد رات میں آنچ سی کھلی۔

"لگا میری آنکھ بھٹکی تو تمہیں سانس نہیں آئے گی۔"

ربیعہ نے کروٹ بدلی۔ اس کا ہاتھ اپنے گال تلے رکھا۔ کچھ دیر گزری۔

"میں نے خود کو کبھی تمہیں بھولنے نہیں دیا گوہر! مگر امی سچ کہتی ہیں۔ بات عمر بھر کی ہو تو محبت کو پہلے نمبر کی ترجیح پر کبھی مت رکھو۔ تمہیں ہوس نہیں تھی مگر...... وہ محبت بھی نہ تھی وقت نے دونوں کو پرکھا پھر فیصلہ کیا۔"

آج گوہر ادریس کی ماں کی دعا پوری ہوئی تھی۔ آج اس کا دل ٹھنڈا ہوا تھا۔

☆☆☆

"مجھے سخت صدمہ ہوا ہے عاشی، یہ بہو بھی ہماری جیسی 'عوام' ہی نکلی، وہ تو اکڑا پھرتا ہے۔" حاجی صاحب کے قلق۔

"گوہر ویسے ہی وخت ڈالے رکھتا ہے اور بہو کے لرزے خاصے مایوس کن ہیں۔"

"مایوس نہ ہوں ابا...... ابھی وہ ہواؤں میں ہے کہ ربیعہ کو غصہ نہیں آیا۔ ایک بار وہ اکھڑی تو دیکھ لینا۔ مرنے کو ہو جائے گا۔" عاشی کو اطمینان تھا۔

"یہ گروسری لسٹ تم نے بنائی ہے؟" شادی کا دوسرا مہینہ تھا اور گوہر کی گروسری کی باری......

"حد ہے تمہاری...... بارہ ہزار کی گروسری کرتا تھا میں...... اس بار ساڑھے انیس ہزار کی ہوئی ہے۔ اور یہ تمہارے 'سرجری' کے سامان نے ہلاکت ڈال دی ہے بجٹ میں۔ کون سے سیارے سے منگواتے ہیں یہ شیمپو جو پینتیس سو کا آتا ہے۔ اور بیالیس سو کا تو یہ فیس سیرم ہی ہے۔ میرے خدا اتنی مہنگی چیزیں استعمال کرنے کی تک کیا بنتی ہے بھلا۔ تب ہی تمہاری امی میری غربت کو انکاری تھیں اور تم اتنی بیماری کے بعد بھی 'گلابی' ہی ہو۔"

ربیعہ کی آنکھوں میں پہلے شکوہ پھر آنسو...... پھر غصہ بھر گیا۔

"تمہیں الفاظ کا استعمال اب سیکھ ہی لینا چاہیے گوہر! ساڑھے سات ہزار مجھ سے لے لینا۔" وہ زور سے دروازہ بند کرتی کچن میں چلی گئی۔ حاجی صاحب کی خوشی کا ٹھکانا نہ رہا۔

کچھ ہی دیر میں وہ باہر آیا۔ لاؤنج میں بیٹھے حاجی صاحب نے لمبی سی انگڑائی لی، ٹانگیں پھیلائیں، ٹی وی کی آواز کم کی اور گنگنانے لگے۔

گوہر نظریں چراتا کچن میں چلا گیا۔

"دور رہو......" ربیعہ کی دھاڑ نے حاجی صاحب کو سرور دیا۔

"اچھا...... سوری کہہ تو رہا ہوں۔ اب کیا توے پر زبان چپکا دوں سزا کے طور پر۔" جھلائی...... بے بس آواز۔

"ہاں کہہ دے ربیعہ! تیرا احسان ہوگا۔" حاجی صاحب بڑبڑائے۔

ناکامی سمیٹے! چہرہ سرخ و سپاٹ لیے وہ ساتھ والے صوفے پر آن بیٹھا۔

"ہر لوہے کی کاٹ ہے۔ ہر آگ کو پانی...... اکھڑے بیٹوں کے لیے بہوئیں بھی تو ہیں۔" سر دھنتے حاجی صاحب۔

"پھر نہیں مانی؟" جھک کے راز دار بنے پوچھتے۔ یوں ہنستے کہ گوہر کا خون چہرے پر چک پھیریاں کھانے لگتا۔

"کچھ دن ٹھہر جائیں آپ، راجا صاحب کی کوئی رشتہ دار بیوہ ہوئے ذرا۔"

حاجی صاحب ہنسے اور وہ ایک بار پھر کچن کو چل دیا۔

دل کو بددعا ہے کسی اکھڑ محبوب کی کہ اسے فاصلوں کو سینچنا ہے اور رکنا پھر بھی نہیں

کشف بلوچ

دی ہیپی اینڈنگ

"کیا تم خوش ہو؟" میں نے اس سے پوچھا۔ وہ موسم سرما کی ایک سرد شام تھی۔ آسمان پر چھوٹے چھوٹے بادل تیر رہے تھے اور ہلکی ہلکی ہوا چل رہی تھی۔ میں گھر کے آنگن میں کرسی ڈالے بیٹھا تھا جبکہ وہ میرے سامنے برآمدے کی سیڑھیوں پر بیٹھی تھی۔ اس کے ہاتھ میں کافی کا کپ تھا۔ میری مٹھی میں مونگ پھلی کے چند دانے تھے۔

کومل کا شوہر لان میں ٹہل رہا تھا۔ اس کی توجہ مکمل طور پر موبائل کی اسکرین پر تھی۔ جبکہ اس کی بیٹی اپنی گود میں ایک نازک سی گڑیا بٹھائے جھولا جھول رہی تھی۔ اندر باورچی خانے میں گھر کی ساری خواتین جمع تھیں۔ گاہے بگاہے دبی دبی ہنسی اور کچھ

شوخ جملے مجھے سنائی دے رہے تھے۔اس شام سبھی بہت خوش تھے۔مجھے یاد ہے ہمارے خاندان میں کبھی دادی جی کی حکمرانی چلتی تھی مگر اب ان کے گزر جانے کے بعد چھوٹی چچی، منجھلی چچی اور میری امی یہ تینوں خاندان کی بڑی تھیں۔اب تو خیر ان کے بچوں کے بھی بچے ہو چکے تھے۔جب تک دادی زندہ رہیں ایسی دعوتیں اور محفلیں روز ہی جمتی تھیں مگر اب تو سالوں بعد گھر میں ایسی رونق لگتی اور خاص طور پر کومل کی پاکستان آمد پر۔

آج شادی کے کتنے عرصے بعد کومل اپنے شوہر اور بیٹی کے ساتھ میکے آئی ہوئی تھی۔کومل چھوٹی چچی کی بیٹی تھی جس کی شادی ان کے بھانجے سے ہوئی تھی جو بیرون ملک اپنا بزنس کرتا تھا۔وہ تین سے چار سال بعد آتی۔سسرالی رشتہ داروں کی تعداد کم ہونے کی وجہ سے کومل پندرہ بیس دن بعد ہی اپنے میکے آجاتی۔خاندان کی ساری بیاہی لڑکیاں جیسے اس کی آمد کی منتظر ہوتیں تبھی تو کومل جیسے ہی میکے پہنچتی، ساری کی ساری اپنے اپنے میکے آن ٹپکتیں۔باورچی خانے کھانوں کی خوشبو سے مہک اٹھتے۔روز ہی کسی نہ کسی کے گھر دعوت ہوتی اور ہم مرد حضرات بھی ضروری کام نمٹا کر وہیں پہنچ جاتے۔آج کی دعوت ہمارے گھر میں تھی۔میں ابھی ابھی دفتر سے لوٹا تھا اگلے روز چونکہ اتوار تھا اس لیے ہم دونوں اطمینان سے بیٹھے پرانی باتیں یاد کر رہے تھے۔

"یاد ہے سبط! آج اس نے کئی سالوں بعد مجھے سبطین کہنے کے بجائے سبط کہا تو میں اس کے طرزِ تخاطب پر چونک اٹھا۔شادی سے پہلے وہ مجھے سبط ہی کہا کرتی تھی۔"بچپن کے دن بھی تو ایسے فرصت بھرے ہوتے تھے۔ہم بارش کے پانی میں کاغذ کی کشتیاں اتارتے اور جس کی کشتی جلدی ڈوب جاتی وہ ہارنے پر آئس کریم کھلاتا۔ان دنوں سب سے چھپ کے چھت پر بیٹھ کر آئس کریم کھانا بھی عیاشی لگتی تھی۔گرم دوپہروں میں جب گھر کے سب بڑے ٹھنڈے کمروں میں سو جاتے تو ہم سب دبے پاؤں چھت پر آجاتے اور پتنگیں لیا کرتے، لڑکیاں ڈور تھام کر پیچھے کھڑی رہتیں اور اگر کسی کی پتنگ کٹ جاتی تو سارے خوب شور مچاتے......

ہم لڑکے گرمیوں کی بارش میں مینڈکوں کو دھاگے سے باندھ کر انہیں خوب دوڑائے پھرتے اور ساری لڑکیاں ڈر کے مارے گھر کی طرف بھاگ جاتیں۔دن پر لگا کر گزر جاتے اور ہماری مائیں ہمیں شام کو نلکے کے سامنے کھڑا کر دیتیں اور ہم نئے کپڑے پہن کر دادی کے کمرے کی طرف بھاگ جاتے۔دادی جی کا وہ بڑا سا کمرہ جو ہمیں حیرت زدہ کر دیتا۔اس وقت ہمیں ایسا لگتا تھا جیسے ان کی سنائی کہانیوں کے سارے کردار ان کے ساتھ اسی کمرے میں رہتے تھے۔وہ شرارتی چوہے جو جادوگر کا ہیٹ اٹھا کر بھاگ جاتے تھے یقیناً وہ سارے دادی کے پلنگ کے نیچے چھپے ہوئے تھے۔ان کی قدیم الماری کی درازوں میں بونوں کی بستی تھی۔میں بونوں کی کھوج میں اکثر ان کی غیر موجودگی میں الماری کھولنے جاتا مگر دادی الماری پر موٹا سا تالا لگا کر رکھتی تھیں۔دادی کے کمرے کی کھڑکی کھولنے پر آنگن میں موجود برگد کا پیڑ نظر آتا جس پر چلتے چیونٹے پکڑ کر بوتل میں بند کر دیتے تھے مگر صبح ہونے پر بوتل خالی ملتی اور وہی چیونٹے برگد پر چلتے ہوئے ہمارا منہ چڑاتے، ہمیں لگتا تھا کہ برگد کے پیڑ پر وہ ساری پریاں رہتی ہیں جو دادی کی کہانیوں میں اچھے لوگوں کی مدد کرتی ہیں۔

اب اس وقت کومل کے ساتھ باتیں کرتے ہوئے مجھے وہ سب باتیں دھیرے دھیرے یاد آرہی تھیں۔شاید اس کے تصور میں بھی بچپن کے سنہری دن کسی فلم کی طرح چلنے لگے تھے۔میں نے دیکھا اس کا چہرہ انوکھے رنگوں سے سجا ہوا تھا۔ان پھلجڑیوں کی طرح جو جلانے پر کئی رنگ چھوڑنے لگتیں۔میں اس کی طرف دیکھ کر مسکرایا تو وہ کہنے لگی۔

"یاد ہے بچپن میں دادی ہمیں ایک کہانی سناتی

تھیں۔ جس میں شہزادی کو ایک دیو اپنے محل میں قید کر لیتا تھا۔ پھر کہانی کے آخر میں ایک شہزادہ آ کر دیو کو مار دیتا اور پھر وہ شہزادی کو آزاد کروا کے اپنے ساتھ لے جاتا تھا۔" بولتے سے کومل نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔

میں جانتا تھا کہ گزرے وقت سے چرائے ہوئے پل اس کے تصور میں چلنے لگے تھے۔ وہ منظر جو اب ہماری یادوں میں محفوظ ہو کر رہ گئے تھے۔ بچپن کے وہ بے فکر لمحات جہاں ہم سب چچا تایا زاد تاروں سے بھرے آسمان کے نیچے دادی کی چارپائی پر بیٹھ کر کہانی سنتے اور پھر آنکھ لگتے ہی اپنے خوابوں میں شہزادی اور شہزادے کا روپ بھر لیتے۔ ہم سارے کزنز رات کو دادی سے جو کہانی سنتے دن کو اسی کا حصہ بن جاتے۔ کوئی غصے میں ہوتا اس روز وہ دیو بن جاتا اور بڑے بڑے قہقہے لگا کر اندر کا زہریلا مادہ باہر نکال دیتا۔ کوئی اس روز زیادہ سست اور تھکا ہوا ہوتا تو بادشاہ اور ملکہ کا کردار کر لیتا۔ پوری کہانی کے دوران وہ تخت پر اونگھتا رہتا۔ بیچ بیچ میں اس کے ڈائیلاگ آتے تو پاس کھڑا کوئی کزن جو اس وقت دربان کا کردار نبھا رہا ہوتا۔ اسے دادی کی چھڑی سے جھٹکا دے کر بولنے کا اشارہ دیتا اور ہم سارے ہنسنے لگ جاتے میں اور کومل ہمیشہ شہزادی اور شہزادے کا کردار لیتے۔ چاہے ہم کتنے تھکے ہوئے کیوں نہ ہوتے یہ کردار لینے کے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیتے۔ اور سچ تو یہ تھا کہ باقی کزنز کو یہ دونوں کردار کچھ خاص پسند نہیں تھے۔ اگرچہ میں شہزادے کے روپ میں اتنا اچھا نہیں تھا مگر یہ کردار مجھے اس لیے بھی جلد مل جاتا کہ مجھے کہانیوں میں موجود شہزادوں کے سارے ڈائیلاگ ازبر ہوتے مگر کومل بچپن سے ہی بنی بنائی شہزادی تھی۔

"بچاؤ...... بچاؤ...... کوئی مجھے ظالم دیو کے قید سے آزاد کراؤ......" کھڑی چارپائی کے ساتھ بندھی کومل چیختی تو میں جوش میں دو دو سیڑھیاں ایک ساتھ پھلانگ کر اس تک پہنچ جاتا۔ جیسے وہ سچ مچ کی شہزادی ہو اور حقیقت میں کوئی دیو اسے مجھ سے دور لے جانے کی کوشش کر رہا ہو۔ ہائے...... اس وقت شہزادہ بننا کتنا سہل لگتا تھا۔ میں یہ بس اپنے دل میں سوچ کر رہ گیا۔ کومل چائے پیتے ہوئے میری جانب دیکھ رہی تھی۔ جیسے اپنے سوال کا جواب جاننا چاہ رہی ہو۔

"ہاں...... مجھے یاد ہے۔" میں نے تھکے تھکے انداز میں اسے جواب دیا اور پھر اپنی بند مٹھیوں کو دیکھنے لگا۔

"کتنی عجیب بات ہے ناں کہ ہم کہانیاں سنتے سنتے ایک روز اس جیسی ایک کہانی کا حصہ بن جاتے ہیں۔" کومل یہ کہتے ہوئے بے حد پھیکے انداز میں ہنس دی۔

"ہوں۔" میں نے ٹھنڈی سانس بھری۔

"مستنصر حسین تارڑ کہتا ہے زندگی کے اخبار میں سب سے خوبصورت صفحہ بچوں کا صفحہ ہوتا ہے۔ مگر المیہ یہ ہے کہ بچپن دبے پاؤں گزر جاتا ہے اور بڑے ہونے پر ذمہ داریوں اور فکروں کی ان دیکھی بیڑیاں پیروں سے لپٹ جاتی ہیں۔ مجھے یاد ہے ہم سب کزنز ایک ساتھ تعلیم سے فارغ ہوئے اور جلد عملی زندگی کا حصہ بن گئے مگر میں اس معاملے میں تھوڑا سا پیچھے رہ گیا۔ شاید اس کی وجہ یہی تھی کہ تقریباً سبھی لڑکوں نے سائنس پڑھ رکھی تھی اس لیے انہیں جلد جاب مل گئی اور اسی بات کو لے کر میرے گھر میں گھمسان کا رن پڑتا تھا۔

"اگر تم نے بھی ہماری بات مان لی ہوتی تو آج یہ نوبت نہ آتی، تمہیں تو جیسے کوئی آرٹسٹ بننا تھا۔ اب آرٹس لے کر اپنا فیوچر تباہ کر لیا ناں۔" ان دنوں سب کی زبان پر یہی بات ہوتی تھی۔ گھر کے بڑے ہم سب کو ٹھکانے لگانے کا سوچ رہے تھے۔

کومل کے لیے اس کے کزن کا رشتہ آیا ہوا تھا۔ کسی کو کوئی اعتراض نہیں تھا کیونکہ انکار کی کوئی وجہ بھی نہیں بنتی تھی۔ مگر میرے پاس وجہ تھی مگر کس منہ سے کومل سے کہتا کہ میرے لیے رک جاؤ۔ شاید کہہ دیتا

تب بھی کیا ہو جاتا۔ نجانے مجھے جاب کب ملنی تھی۔ میں اسے کس آس پر روک لیتا۔

اور سچ تو یہ ہے کہ وہ میرے بن کہے سال بھر اس رشتے کو ٹالتی رہی۔ وہ میرا حوصلہ بڑھاتی کہ جلد سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ یاسیت کے ہر لمحے میں وہ میرے لیے اینٹی ڈپریشن کا کام دیتی تھی۔ مگر کب تک؟ چچی کا دباؤ بڑھتا جا رہا تھا اور دوسری طرف میں بھی تو خاموش تھا۔ پھر اسی خاموشی میں ایک روز کومل نے ہاں کہہ دی۔ رات بھر میرے سپنوں میں اس کی آوازیں آتی رہیں۔

"بچاؤ...... بچاؤ...... کوئی مجھے ظالم دیو کے قید سے آزاد کراؤ۔" مگر مجھ میں اب دو دو سیڑھیاں پھلانگنے کے بجائے قدم اٹھانے کی بھی سکت نہ تھی۔ شہزادی مدد کے لیے چلاتی رہی اور کہانی کا دیو مجھ پر ہنسنے لگا۔ کہانیاں اب بھی سچی ہوتی ہیں مگر آج کے شہزادے بزدل بن گئے ہیں۔ بچپن میں جب دادی کی کہانی ختم ہوتی تو سب مزے سے نیند کی وادیوں کی سیر کو نکل جاتے اور میں بہت دیر تک جاگتا رہتا۔ ہمیشہ کہانی سننے کے بعد مجھ پر ایک سرشاری کی کیفیت اترتی اور میں سوچتا تھا کہ سبھی کہانیوں کا انجام ایک جیسا ہو جاتا ہے دی ہیپی اینڈنگ مگر جب ہماری محبت کی کہانی کی اینڈنگ ہوئی تو پتا چلا کہ سب ہی کہانیاں ہیپی اینڈنگ پر ختم نہیں ہوتیں۔ کچھ کہانیوں کا انجام ایسا بھی ہوتا ہے کہ شہزادی کی شادی دیو کے ساتھ ہو گئی اور وہ اس کے ساتھ ہنسی خوشی رہنے لگی۔

کومل کی شادی کے ایک سال بعد مجھے جاب ملی اور پھر اس کے اگلے سال میری شادی ایک کزن سے ہو گئی۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے سب کچھ ٹھیک ہوتا گیا۔ مگر ویسا کچھ نہ ہوا جیسا ہم نے سوچا تھا۔ یہ زندگی تھی کوئی فلم یا ڈائجسٹ کی کہانی نہیں تھی کہ جس کے آخر میں سب کچھ اچھا ہو جاتا۔ میری آنکھوں میں بیتے منظر کسی تیز رفتار ٹرین کی طرح آ کر گزر گئے مگر سماعتوں میں اب بھی کومل کا جملہ ٹھہرا ہوا تھا۔

"کتنی عجیب بات ہے ناں کہ ہم کہانیاں سنتے سنتے ایک روز اس جیسی ایک کہانی کا حصہ بن جاتے ہیں۔" میں نے اپنے خیالات سے چونک کر کومل کی طرف دیکھا، اس سے کومل ہنستے ہوئے بہت عجیب لگ رہی تھی۔ اتنے سالوں کی دوری کے باوجود میں اب بھی اس کی ہنسی کے سارے انداز پہچان لیتا تھا۔ ہمارے بیچ کچھ پل خاموشی چھا گئی۔

"تم نے کیا پوچھا تھا؟" کومل نے کافی کا ایک گھونٹ بھرا اور پھر میری طرف دیکھ کر پوچھا۔

"کیا تم خوش ہو......؟" میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکا اور پھر سے اپنا سوال دہرا دیا۔

"ہاں......" یہ کہہ کر اس نے اوپر آسمان کی طرف دیکھا اور پھر چپکے سے اپنی آنکھیں میچ لیں۔

سچ ہے محبت کون کرتا ہے
کسی کی چاہ میں اب کون مرتا ہے
کبھی دریا کنارے شہر بستے تھے
مگر اب شہر سے دریا گزرتا ہے
رتیں بیتیں جو جاں پہ کیا بتائیں
عذاب اک ہجر کا موسم گزرتا ہے
ذرا دیکھو تو چہرے کیا ہوئے ہیں
ہر ایک چہرے پہ موسم نقش کرتا ہے
فلک سے ٹوٹ کے گرتے ہیں تارے
کسی کھڑکی میں تارہ اک سنورتا ہے
لکھے گا کون اب میری کہانی
وہ قصہ خود کو روزانہ جو گھڑتا ہے

میں اسے کچھ دیر یونہی تکتا رہا اور پھر بے ساختہ نظریں چرائیں۔ ہم کتنی بھی کوشش کر لیں مگر اس درد کی گہرائی تک نہیں پہنچ سکتے، جو کسی دوسرے کے دل میں پنہاں ہوتی ہے۔ میں نے کومل کی طرف دیکھا۔ وہ چپکے سے اٹھ کر اپنی بیٹی کی جانب بڑھ گئی۔ میں نے تھکے تھکے انداز میں کرسی کی پشت سے ٹیک لگا لی۔ یکایک آسمان پر تیرتا ایک خالی بادل کا ٹکڑا میری آنکھ کے اندر دھیرے دھیرے برسنے لگا۔

منشا محسن علی

"میں اکیسویں صدی کی ایک حقیقت پسند لڑکی ہوں کہ جس کے ایک ہاتھ پر جلتی ہوئی استری رکھی ہوئی ہو اور دوسری طرف اس کا محبوب اسے چھوڑ کر جا رہا ہو تو وہ جسمانی تکلیف سے چھٹکارا چاہے گی اور محبوب کو جانے دے گی۔"

دو سال بعد، تیسرے سال کے پہلے دن حویلی میں بھونچال آ گیا تھا۔ حویلی والوں نے جس بات کو تھک کر چھوڑ دیا تھا، وہی بات آج سامنے آ کر سب کو ورطۂ حیرت میں مبتلا کر گئی تھی۔ کڑتمبے کوٹتی اماں کو غش آنے لگے تھے۔ یہ کڑتمبے کی کڑواہٹ نہیں تھی جوان کے سر کو چڑھی تھی بلکہ یہ غزل افتخار خان کی بات تھی جس نے ان کی آنکھوں کو ساون بھادوں کے رستے دکھائے تھے۔ دیکھو تو معجزہ نظر آتا تھا۔ سمجھو تو حقیقت تھی۔ اب سوہنی مہینوال، عذرا قیس، شیریں فرہاد کے زمانے کسی گہری کھوہ میں خراٹے لے رہے تھے۔

اماں کو آج اس بات پر من وعن یقین آ گیا تھا کہ ان کی بیٹی واقعی آج کے مشینی اور جدید دور کی پیداوار ہے۔ دو سال اس جوگن نے روگ جھیلا تھا۔ اب اس کی بس ہو گئی تھی۔ بازو استری کی جلن نے چھیل کر رکھ دیا تھا۔ سانسیں چڑھی ہوئیں، آنکھ کے چھپر بھاری، ہونٹ کپکپاتے ہوئے، بغیر دوپٹے کے، ننگے پیر کھڑی وہ اس حویلی کی سب سے ہٹیلی، ضدی اور اڑیل لڑکی تھی۔

غزل افتخار خان...... بوہے باریاں کی ہیروئن......!

☆☆☆

حویلی کیا تھی بھلا، حویلیوں کے نام پر دھبہ تھی۔ شہر کے وسط میں صدیوں پرانی جو کہ انگریزوں کے زمانے سے بھی پہلے کی لگتی تھی۔ در و دیوار ایسے ڈھیٹ تھے کہ ابھی تک صحیح سلامت تھے، کچھ ستون بھربھرے تھے اور چھتوں میں کہیں کہیں ننگا پن برسات کے دنوں میں ظاہر ہوتا تھا تو لڑکیاں بالیاں بالٹی، تسلے، اگالدان، جگ کڑاہیاں رکھ کر پھر پانی باہر پھینکتی تھیں۔ لڑکیوں کی بھی تو فوج تھی۔ حویلی تین حصوں میں تقسیم تھی، اتفاق دیکھیے کہ ہر حصے میں تین تین لڑکیاں تھیں۔ چھوٹی، منجھلی، بڑی اور......

مگر سب کی سب پریاں تھیں۔ ایسی شہتوت کی چھال کی سی لچک، نمکین لہجے، ناگن زلفیں اور چال ایسی کہ بس...... اصل جلال اور وقار تو "غزل افتخار" کے حصے میں آیا تھا۔ دیو داسیاں دیکھی ہیں کبھی؟

نہیں...... تو حویلی جا کر غزل کو دیکھ آئیں۔ سچ کہوں تو وہ حویلی اس کی شایان شان نہیں تھی اور دوسری دل لگتی بات یہ ہے کہ جس کو وہ اپنے لیے شایان شان سمجھتی تھی...... مرید عباس!

وہ اس نمانی کے لائق نہیں تھا مگر کیا کرتی، وہ جوگن تھی، جوگیوں کی فطرت اور مقدر میں جوگ ہوتے ہیں۔ تنفس کا کارن، سانس پہ سانس بھرتے جائیں۔

وہ بھی جو کہ داسی تھی۔ مرید عباس جیسے دیوتا کے جاپ کرتی تھی۔ خیر سے منکوحہ تھی، اس کی بچپن کی اور پوچھو تو وہ کون تھا؟

ناولٹ

پھوپھی کا بیٹا۔ خشک مزاج، کتابی اور حسابی۔ فلاسفر انسان جب بھی بات ہوتی تھی تو وہ اسے سوالوں کے ایسے ریشم میں الجھاتا تھا کہ وہ ہفتوں "دم گھٹن" کا شکار ہو کر بوسیدہ اور باسی حویلی کی فضا میں بولائی بولائی سی پھرتی رہتی تھی۔ پہلے حصے کی سلمٰی ہمیشہ کہتی تھی......

"مجھے تو مرید عباس لچا لگتا ہے۔ پڑھائی پر پڑھائی کیے جا رہا ہے مگر تمیز نام کو نہیں۔ شربت کا گلاس لے کر کھڑی میں پتھر ہو گئی تھی مگر موصوف کو جون کی گرمی میں بھی چائے کا چسکہ ہے۔ ایسے چونچلے اس کے صرف تم ہی پورے کر سکتی ہو۔"

جھولے پر جھولتی، مزے لیتی سلمٰی دھات کی چیں چیں سے بھی خوف زدہ تھی یہاں سارا کچھ ہی پرانا تھا۔ غزل چوڑی کے پارے کو کھرچ رہی تھی۔

"جس کو محبت ہو، وہی محبوب کے سامنے بانس کی طرح اٹل کھڑا ہو گا۔ جو تیرا حق ہی نہیں۔ میں تو چائے کا گھڑا اٹھائے صدیوں کھڑی رہوں۔"

وہ کتنا خوب صورت ہنستی تھی۔ سورج سے پگھلی جاتی تھی۔

"تم ہی ایسا کر سکتی ہو۔ میں تو کبھی نہ کروں۔ سچ کہتی ہو، لچا ہے۔ بھورے بالوں میں بال پوائنٹ پھنسائے کون سسرال آتا ہے بھلا؟"

"تو نہیں سمجھے گی سلمٰی! میں نے محبت کی فصل بوئی ہے۔ مجھے معلوم ہے میرے کھیت کے پودوں کو جب پھل لگا، زعفران ہو گا۔"

سلمٰی نے تو بس آنکھ بھر کے ہی دیکھا تھا۔ زعفران تو وہ خود تھی۔ مرید عباس تو بس ٹاٹ تھا۔ بے وقعت۔

محبت اندھی ہوتی ہو گی مگر غزل کے نصیب میں محبت کو کئی بیماریاں لاحق تھیں۔ گونگی، بہری اور یک طرفہ بھی۔ اصل قیامت تو یہی تھی، داسی بے خبر...... مدہوش۔

☆☆☆

جاتی گرمیوں کے دن تھے، جب وہ بھورے گھونسلے میں بال پوائنٹ سجائے سامنے کھڑا تھا۔

"میں مقابلے کا امتحان دے رہا ہوں۔"

وہ آنکھوں میں جگنو لے کر کھڑی تھی۔

"وہ کیا ہوتا ہے؟"

سامنے والے کے پاس ہمیشہ کیکٹس ہی ہوتے تھے۔

"بہت بڑا امتحان ہوتا ہے۔ پاکستان کا سب سے بڑا امتحان، جسے سول سروسز کہتے ہیں، افسر لگتا ہے بندہ۔ طاقت اور پیسہ ہوتا ہے۔ ہر کوئی ڈرتا ہے۔ خیر تم میٹرک پاس کو کیا پتا۔ کبھی کبھی سوچتا ہوں کہ تم جیسی ان پڑھ سے میرا نکاح ہوا ہی کیوں تھا۔ اگر میں بڑا افسر لگ گیا تو......"

کیکٹس کی رگڑ نے لہولہان کر دیا تھا۔ اگلے دن فجر کے وقت اسے جلے پیر کی بلی کی مانند دیکھا تھا۔ وہ جو پڑھائی سے جان چھڑانے والی، میٹرک کا امتحان رو رو کر پاس کیا تھا۔ علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی کی مشقیں لکھتی ہوئی پائی جاتی تھی۔ حویلی کے دوسرے حصے کی عنبر کے پاس وہ سوال لے کر آئی تھی۔

عنبر بڑی سیانی بیانی اور سمجھ بوجھ والی تھی۔ اگلے کی پوری بات سنتی تھی اور اپنی آدھی سناتی تھی۔

آدھی گواہی تو کیکر کے پھول سے بھی ہولی ہوتی ہے۔ اڑ جاتی ہے، بکھر جاتی ہے۔ کہوں تو فنا بھی ہو جاتی ہے۔

"پیاری عنبر! ہم دونوں صرف قد میں ہی برابر آتے ہیں۔ تعلیم میں تو میں بہت پیچھے ہوں۔ اگر وہ افسر لگ گیا تو کیا وہ میری قدر جانے گا۔ رات کو تکیے پر سر رکھتی ہوں مگر مجھے نیند نہیں آتی۔ رات کی ماں آ کر ڈراتی ہے۔ مجھے اس کی چنگاری آنکھوں سے خوف آتا ہے۔ میں پرائیوٹ پڑھ لوں گی، مگر اس کی طرح مقابلے کا امتحان تو نہیں دے سکتی۔"

چکن کے اجلے دوپٹے میں لپٹی، موٹی آنکھوں والی اداس ہرنی نے "آدھی بات" والی کو پورا کر کے رکھ دیا تھا۔

"تمہارا ترازو تو کبھی برابر نہیں آئے گا غزل!"

وہ الٹے پاؤں بھاگی تھی۔ روتی پیٹتی، کمرہ بند ہوگئی۔

کھانا پینا چھوڑ چکی تھی مگر پھر وہ آ گیا۔ چراغوں میں روشنی نہ رہی۔

"تم پرائیوٹ پڑھ رہی ہو، اچھی بات ہے۔"

وہ کسی اڑن کھٹولے پر تھی۔ چائے کا تھرماس خالی ہوتا جا رہا تھا۔ سامنے والا سیر ہی نہ ہوتا تھا، غزل نے نظر بھر کے دیکھا۔

وہ گھونسلہ بال سلیقے سے تراشے ہوئے، سفید کھدر کا لباس وہ اس کے سر سے مرچیں وار کر آج لازمی دھونی سلگانے والی تھی۔

"میں نے سوچا، چلو تم بھی افسر ہو جاؤ گے تو کچھ پڑھ لوں۔ سب اچھے سے پڑھ لیتی ہوں، مگر انگریزی نہیں آتی۔"

حویلی کی وہ لڑکی شرمندہ ہوتی ہوئی بہت خوب صورت لگا کرتی تھی۔

داسی کا ہر روپ شان دار ہوتا ہے، جسے فقط دنیا ہی سراہتی ہے۔ دیوتا کو یہ بات زیب نہیں دیتی، وہ اپنے سنگھاسن سے نیچے آتا ہی نہیں۔ وہ بھی نہیں آیا۔

"مجھے نہیں لگتا کہ تم کر پاؤ گی۔ اونہوں...... خیر، میری اکیڈمی کی تیاری بس ختم ہونے والی ہے اور اگلے ماہ پیپر ہیں، تو تم میرے لیے دعا کرنا۔"

تھرماس خالی ہو گیا مگر غزل افتخار خان بھر گئی تھی۔ لمبی نمازیں...... عشا اور ظہر قضا کر دینے والی کی اب کوئی بھی نماز چھوٹتی نہیں تھی۔ تسبیح کے منکے جلدی ختم ہوتے تو انگلیوں کی پوریں کم پڑ جاتیں مگر وظیفے ختم ہی نہ ہوتے تھے۔

زیادہ منکوں والی تسبیح آ گئی۔ صبح شام وظیفے پڑھتی، آنکھیں حلقوں کے گھیرے میں آ گئیں۔ اماں فکر مند ہو گئیں۔ بادام اور گری پیس کر کھلانے لگیں۔ سلمٰی، نجمہ اور عنبر نے ایک شام اسے جا لیا تھا۔

"مرید عباس کے لیے کر رہی ہو ناں یہ سب؟"

"ہاں، وہ میرا شوہر ہے۔"

"کبھی کبھی ہمیں لگتا ہے، جیسے تم بہت اونچے آسمان سے گرو گی۔"

"تمہاری زبان تو ہر گزرتے دن کے ساتھ کالی ہوتی جا رہی ہے۔"

اسے سخت برا لگا تھا۔

"تم دوستوں کو بھولتی جا رہی ہو، اس لچے کی محبت نے تمہیں راہبہ بنا دیا ہے۔"

"اسے لچا مت کہو۔" دل پر ہاتھ پڑا۔

وہ پیلی پڑتی جا رہی تھی۔ دوستی کی مستطیل میں مرید عباس نے سیندھ لگائی تھی۔

"کاشی بھیا بتا رہے تھے کہ اکیڈمی کی لڑکیوں کے ساتھ اکثر بینڈ کوٹھے پر چرغے کھا رہا ہوتا ہے۔"

مہینے بھر کی چپ کے سامنے شور نے جنگ کی اور اسے باؤلا کر کے رکھ دیا تھا۔ وہ بے چاری سسکیاں بھرتی رہی مگر تسبیح کے منکوں کی رفتار پھر بھی نہ رکی تھی۔

"سات آسمانوں کے اکیلے رب! میرے مرید عباس کو بڑا افسر بنا دے۔"

☆☆☆

حویلی کے لوگوں کی زندگیاں کبھی بھی زیادہ شان دار نہیں رہیں کیونکہ انہوں نے اپنے اپنے حصے کی زمینیں بیچ کھائی تھیں اور اب گزارے دکانوں کے کرایوں سے ہی ہوتے تھے۔ مرد تاش کھیلنے اور چکن کوزی حکیم کھانے کے علاوہ کچھ نہیں کرتے تھے۔ بس حویلی کی عورتیں ہی ہلکان ہوتی تھیں، جان مارتی تھیں۔ اور آدھے ادھورے کرائے بھی وصول کر کے گھر کا نظام سنبھالتی تھیں۔ گھروں کے بارے میں دوسری فکر یہاں کی لڑکیوں بالیوں کو تھی جو رسالے پڑھ پڑھ کر راتوں کو سپنے سجاتی تھیں۔ مستقبل کے

خواب کاڑھتی تھیں، اب ان کا سب کچھ اگلے گھروں سے وابستہ تھا جسے ہم سسرال کہتے ہیں۔

دیورانیوں کی پہلے پہل بڑی کھٹ پٹ رہی کہ غزل پھوپھی کا لائق فائق بیٹا لے اڑی ہے مگر پھر سب کو سمجھوتے کی پڑتے پڑتے عادت پڑ ہی گئی تھی اور غزل کو جوان ہوتے ہوتے پیار عشق میں ڈھلتا محسوس ہوا تھا ورنہ ایسے کون دیو داسیوں کے لقب لے کر سر تان کر چلتا ہے، اس نے سر لے لیا تھا۔

اور اگلا کو نین گھلا تھا۔ کوئی کڑوے کریلے کے جیسا۔ سرد مزاج ایسا کہ وہ پوہ کی سرد راتوں کی طرح ٹھٹھرا کے رکھ دیتا تھا اور وہ ہو کے بھرتی لور لور پھرتی تھی۔

ایسے ہی تو دوستی کی مستطیل میں دراڑیں نہیں پڑی تھیں۔ سلمٰی، نجمہ اور عنبر بچی تھیں۔ اب تک بڑا ایکا تھا، ان چاروں میں۔

سل بٹے پر مرچیں پیس رہی تھی۔

چھولے اور لسوڑے کے اچار کی تیاریاں کر رہی تھیں۔

بیسن کے لڈو بنا رہی ہیں۔ سندھی کڑھائی کر رہی ہیں۔ ہر سہ پہر گھاس پر بیٹھ کر بیت بازی کی محفل سجا لیتی تھیں۔

پروین شاکر کی خوشبو غزل کے پاس ہوتی تھی۔

جون ایلیا کی گویا سلمٰی کی گود میں دھرتی ہوتی تھی، عنبر اور نجمہ فقط سامع تھیں جو سن کر سر دھنتی تھیں۔

یہ تب کی بات ہے جب غزل افتخار کو بریم بخار ابھی نہیں چڑھا تھا پھر جب چڑھا تو ساری مستطیل ہی ٹوٹ گئی تھی۔ سنجے لیلا بھنسالی کی فلمیں ٹکٹکی باندھ کر دیکھتی تھی۔ پھوپھی نے عیدی بھیجنی شروع کی تو دل ایک اور ڈگر پر چل پڑا۔ وہ بیچ بچاؤ بھی نہ کر سکی تھی۔ خیر نکاح کے بولوں میں بہت طاقت ہوتی ہے مگر اس کا اثر صرف اس نمانی پر ہوا تھا۔

وہ جو ہر بات پر اکڑ فوں دکھاتی تھی۔ اب مٹی کا ڈھیر ہو کر رہ گئی تھی۔ وہ لڑائی جھگڑے ختم ہو گئے تھے۔

مزاج میں عجیب نرمی اور گداز آ گیا تھا۔ ہر کوئی حیران تھا۔

''تو ٹھیک تو ہے ناں؟''

''کیوں، کیا ہوا۔ میں بالکل ٹھیک ہوں۔''

''تیرا دماغ ٹھکانے پر ہے ناں؟''

''سب ٹھکانے پر ہے۔ بس دل پھسل گیا ہے۔''

وہ چیخ اٹھی تھی۔

''ہائے، گھنی میسنی۔ سب کچھ صحیح سے بتا۔''

اور وہیں پروین شاکر کی خوشبو گود میں دھرے وہ اس شام کے منظر میں پہنچ گئی تھی۔ جب بارش جل تھل برسے جا رہی تھی اور ہر کوئی ننگی چھتوں کے ٹپکنے کے اثرات سے بچاؤ کی تدابیر میں لگا ہوا تھا۔ وہ صدر دروازے سے اسے اندر آتا دیکھ رہی تھی۔ مکمل بارش میں بھیگا، بالوں سے ٹپکتا پانی، پلکوں کے چھپر بھاری، ہاتھوں سے بھورے بال ٹھیک کرتا ہوا وہ موسم...... مرید عباس اور نکاح کا تعلق سب اکٹھے ہو گئے تھے اور داسیوں کے پاس کوئی ڈھال نہیں ہوتی۔ وہ بھی بے بس کھڑی رہ گئی تھی، کیوپڈ کا تیر چل گیا تھا۔

☆☆☆

یہ سارا قصیہ تھا۔ پھوپھی جب بھی آتی تھیں، اسے خوب لپٹاتی تھیں۔ اس میں کی تب آئی تھی جب حویلی میں گھمسان کا رن پڑا تھا۔ پھوپھی نے حویلی میں سے حصہ مانگا تھا۔ حویلی والے مردوں کو غش پر غش آنے لگے تھے۔

''ندرت! تمہارا دماغ تو نہیں چل گیا؟'' غزل کے ابا دھاڑے تھے۔

''ارے تو کیا سب بخش دوں تم نکھٹو بھائیوں کو۔ جہیز میں اماں نے دیا ہی کیا تھا۔ دیار کا ایک پلنگ اور مسہری...... اس کے علاوہ جو میز تھی، تین ٹانگیں ہی سلامت تھیں۔ چوتھی کو تمہارے بھیا نے کیل ٹھونکے تھے اور اگر زیور کی بات کروں تو پچھلے دنوں زرگر نے

ایسی کاٹ لگائی کہ نرا نقصان ہی ہوا۔ مقصود نے تو طعنے دے دے کر جان کھالی ہے میری۔''
سب ہکابکا رہ گئے۔ پھوپھی کے چہرے پر مکمل سکون تھا۔ بھائی صاحبان تاش کے پتے پھینٹنے بھول گئے تھے۔
''ندرت! تو تو بالکل ہی پرائی ہوگئی ہے چندا!''
''مکھن نہ لگاؤ مجھے، بس حصے بخرے کی بات کرو۔''
ندرت موقع شناس اور حساب میں طاق تھیں۔
''بھائی نکمے ہیں۔ کاروبار یا نوکری نہیں ہے کہ تم بھائیوں کو لوٹ کھاؤ۔''
زبیدہ بھابھی نے انہیں شرمندہ کرنا چاہا تھا۔
بڑے کمرے میں جاری خفیہ میٹنگ کی آواز بہت سکون سے باہر گیلری میں چکر کاٹتی، لڑکیوں میں بھی پہنچ رہی تھی۔ غزل روہانسی ہو رہی تھی۔ پھوپھی دھاڑ رہی تھیں۔ بڑی بہن تھیں جی دار اور بھائی ٹڈی دل ایسے ڈرپوک...... ہر لحاظ سے پلہ بھاری تھا۔
''میرے سامنے میاں ایسے طوطا، مینا راگ نہ گاؤ تو بہتر ہے۔ تاش کے نشے اور چکن کوزی حلیم ہضم کرنے کے سوا کام کیا ہے تم لوگوں کو۔ دکانوں کے ہزاروں کے کرائے بھی تم لوگ اینٹھ رہے ہو۔ پندرہ دن کے اندر اندر میرا حصہ میرے حوالے کرو ورنہ عدالت کا راستہ جانتی ہوں میں۔''
فالسے کا شربت پی کر اپنا پرس بغل میں دباتی وہ بس غزل کے پاس لمحے بھر کو رکی تھیں۔
''ارے یہ سب تمہارے اور مرید عباس کے واسطے ہی تو کر رہی ہوں۔''
پھوپھی کے جانے کے بعد بھائی صاحبان باسی کڑھی میں ابال کی طرح ابلتے کھولتے رہے اور بھابھیاں پھوپھی صاحبہ کو نئے نئے القابات سے نواز رہی تھیں۔
''چنڈال...... پھاپھے کٹنی...... حریص...... مجھے پہلے ہی پتا تھا اس کی فطرت میں ہی چھین جھپٹ ہے۔ شکر ہے میری عنبر اس عورت کے عذاب سے بچ گئی۔''
کیلنڈر پر دائرے لگتے تھے۔ تین دن...... ہفتہ اور پندرہ مکمل۔
ٹوپی والا برقع پہنے آگئیں اور پھر اپنا حصہ وصول کرلیا۔ حویلی کے حصے بخرے ہوگئے۔

☆☆☆

لڑکیوں نے غزل کا جینا محال کردیا تھا۔
''اللہ بچائے، پھوپھی کتنی لالچی ہیں۔''
وہ ہر ممکن مقدمہ لڑ رہی تھی مگر ساری دلیلیں فضول اور بودی تھیں۔
''ان کا حق تھا۔''
نجمہ کو تو یہ بات سر پر ٹھا کر کے جا لگی تھی۔
''تم بھی ان کے نقش قدم پر چلنا، انہیں ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔''
آہستہ آہستہ وہ دوستانہ بکھر گیا۔ حویلی کے ہر فرد کے دل میں کوئی خوف پنجے گاڑ کر بیٹھ گیا۔
نہ توسل سے پر مرچیں پینے کا موسم آیا۔
اچار کے چھولے اور لسوڑے بھی کام نہ آئے۔
بیت بازی کی جگہ ایک گہری چپ نے لے لی تھی۔
وہ جو پہلے کباڑ کی دکان سے تھیلے بھر بھر کے رسالے آتے تھے، گردو غبار سے بے حال وہ رسالوں کی چھانٹی کرتی تھیں۔ اب سب خواب ہوگیا تھا۔ اس بار چھوٹا رسالوں اور میگزین سے لدا پھندا حویلی آیا تو اسے واپس بھیج دیا گیا۔
باتیں، واقعات بہت معمولی اور چھوٹے سے بے شک نظر آتے ہوں مگر ان کا وزن بہت زیادہ ہوتا ہے۔ یہی چھوٹی چھوٹی باتیں حویلی والوں کے لیے بار بن گئی تھیں۔ پھوپھی کسی فاتح کی طرح افتخار کے گھر آئی تھیں، فقط اس وجہ سے کہ وہ اس گھر کی بیٹی کی ساس تھیں۔ اماں خاطر مدارات میں ہلکان ہوتی رہتی تھیں، باقی بھابھیوں نے توبہ کرلی تھی۔ بس بات

چیت کے علاوہ چائے، شربت کا رواج بھی ختم ہو گیا تھا۔ آخر کار ندرت نے کون سا اچھا کیا تھا۔

☆☆☆

مرید عباس جب بھی آتا تھا تو وہ بھی اس پروانے کے گرد گھومتی رہتی تھی اور وہ اس بات پر نازاں اور مغرور ہوا پھرتا تھا۔ اس کا شمار ان لوگوں میں ہوتا تھا جو شاید جذبات سے عاری اور محبتوں سے متنفر ہوتے ہیں، انہیں محبتیں بھی بار لگتی ہیں۔ وہ اچھے اسکولوں میں پڑھا تھا، لائق فائق بھی تھا۔ اب جوانی کی سرحد پر کبھی کبھی غزل کا اپنے آگے پیچھے پھرنا اسے مزا دیتا تھا۔ وہ چائے کا شوقین تھا اور غزل کی جان جاتی تھی۔ اس کے واسطے چائے بنانے کے ساتھ ساتھ وہ چائے پینا بھی سیکھ گئی تھی۔

وہ بہت حیران ہوتی تھی کہ وہ جو محلے کے سب چھوکروں کو جوتے کی نوک پر رکھتی تھی اور محبت ناپے پیروں تلے روند کر ان کے ارمان ان کے سامنے قتل کر کے گزرتی تھی، ایسی آکاس بیل میں جکڑی گئی تھی کہ پہروں سوچتی تھی۔ کبھی کبھار جو مرید عباس آجاتا تو کھڑکی کے سوراخوں سے ٹکٹکی باندھے دیکھ کر سوچتی تھی۔

"اتنا پیارا تو نہیں، چہرہ گول سا ہے۔ ناک ستواں نہیں۔ نقوش بھی واجبی سے ہیں مگر پھر بھی مجھے یہ بندہ پتھر کیوں کر دیتا ہے۔ میں کیوں اسے دیکھ کر بجھ بجھ جاتی ہوں۔ شاید وہ میرا محرم ہے، تب ہی دل ہمکتا ہے۔"

مرید عباس کو اس کی باتیں کوفت میں مبتلا کر دیتی تھیں۔ کیسے پھسپھسے قصے تھے یہ محبتوں کے۔ محبتیں تو سنجیدگی اور وقار کے چولے میں ہی اچھی لگتی ہیں۔ انسان جس ماحول میں رہتا ہے، اسی کے مطابق سوچ بڑی یا چھوٹی رکھتا ہے۔ حویلی کی لڑکیاں اس کے علاوہ کیا سوچ سکتی تھیں۔

"تم مجھ سے محبت کرتے ہو؟"

"یہ کیسا سوال ہوا...... تم کب اس فضول چیز سے باہر آؤ گی، باہر دیکھو دنیا کہاں پہنچ چکی ہے اور تم ابھی تک ان غیر ضروری چیزوں میں الجھی بیٹھی ہو۔"

وہ اون کے گولے کی طرح بکھرتی چلی گئی تھی۔

وہ تو پروین شاکر کی خوشبو کی طرح ادب کے جہان میں اپنے جذبات لے کر واہ واہ سمیٹتی تھی۔ سامنے کھڑا شخص محبت کو غیر ضروری کہہ رہا تھا۔

"کیا واقعی یہ سب غیر ضروری ہوتا ہے۔ کسی کی پروا کرنا، سوچنا، دن رات اس کا ذکر کرنا۔"

وہ اکتا گیا تھا۔ کتابی انسان کتابی باتیں نہیں سمجھ پا رہا تھا۔ مگر وہ لاعلم تھی۔ وہ نفع دینے والی کتابیں پڑھتا تھا۔ ادب، شاعری، سے دور دور تک اس کا کوئی بھی واسطہ نہیں تھا۔

"ہاں...... میں یہی سمجھتا ہوں اور تم ایسی باتیں کر کے مجھے کیوں میرے مقاصد سے ہٹانا چاہتی ہو؟"

باہر کہیں آندھیوں نے سر اٹھایا تھا۔ دیوانی کو نظر کچھ نہیں آیا تھا۔ تو یہ سب بے وقعت ہے۔ محبت بھی غیر ضروری ہو سکتی ہے بھلا؟

مرید عباس اپنے نام کے الٹ تھا مگر وہ اپنے نام پر صادق آئی تھی۔ ہرن کی اداسی۔ ایک تھی داسی......!! یہ غزل افتخار خان کی محبت تھی۔ جو اس نے کی مگر مول لگانے والے نے بے مول کر دیا تھا۔

وہ سمجھتی تھی کہ وہ بڑا آدمی بن رہا ہے تو دن رات مصروف ہوتا ہوگا۔ چائے پراٹھا بھی کھاتا ہوگا یا نہیں۔ شاید کبھی تو نوالے میں اچار کی پھانک تک رکھنا بھی بھول جاتا ہوگا۔ بھلا اتنی مشکل پڑھائی کہاں اتنی فرصت دیتی ہے۔ وہ انٹر میں پاس ہو گئی تھی۔ نتیجے والے دن مسلسل صبح شام فون کرتی رہی مگر وہ کاٹ دیتا تھا اور وہ دل کے آگے تسلیوں کے ڈھیر لگاتی رہی۔

"اتنی مشکل پڑھائی پڑھتا ہے تو مصروف ہوگا۔"

دل کو بہلا لیا خود کو کاموں میں لگایا مگر شوکی بھیا

کی بات نے اسے پتھر کر دیا تھا۔
"پنڈ کوٹھے پر اکثر شام کو لڑکیوں کے ساتھ بیٹھ کر چرغے کھاتا ہے۔"
وجود میں سوئیاں گڑ گئی تھیں۔ مستطیل سلامت نہیں رہی تھی۔ ورنہ چار سرا کٹھے ہو کر روتے۔ سارے روگ اکیلی کو بھگتنے تھے۔ پھر فون اٹھایا گیا اور وہ بپھری ہوئی غرائی تھی۔ حویلی نے پہلی بار اس کا پرانا روپ دیکھا تھا۔
"وہ لڑکیاں کون ہیں؟"
فون کے دوسری طرف ہنسا تھا۔ جیسے اسے یہی امید تھی۔
"میری دوست ہیں۔"
"شام ان کے ساتھ ہوتے ہو۔"
"ہاں ہر شام۔"
حویلی کی چھتیں سلامت تھیں۔ آسمان صاف تھا مگر پھر بھی کہیں بارش ہو رہی تھی۔ وہ ہولے ہولے بھیگ رہی تھی۔
"کیوں ہوتے ہو کبھی میرے لیے تو وقت نہیں نکالا۔"
"کہا تھا ناں تم جیسی لڑکیوں کو دنیا کا کچھ پتا نہیں۔ ارے یار، تم کیوں مینڈک بن گئی ہو۔ نکل آؤ کنویں سے۔ باہر دنیا بدل گئی ہے۔"
واقعی باہر تو مطلع بالکل صاف شفاف ہے۔ یہ کن من بارش تو اندر کہیں ہو رہی ہے۔ لہجہ بھیگ گیا اور موٹی آنکھوں میں سیلاب ٹھہر گیا۔
"مرید عباس میں نے دنیا نہیں دیکھی۔ صرف تمہیں دیکھا ہے۔"
وہ اس لفاظی پر واہ واہ اور مکرر مکرر کی تان بلند کرنے والوں میں سے نہیں تھا۔ ظرف کا پیمانہ چھوٹا نہیں ہونا چاہیے۔
"کون تمہارے دماغ میں خناس بھرتا ہے؟"
"کوئی نہیں وہ شوکت بھیا کہہ رہے تھے کہ......"

بات ادھوری رہ گئی تھی۔ وہ دوسری طرف گندی سی گالی دے کر دھاڑا تھا۔
"تیرا شوکی بھیا تو خود آدھی عورت ہے۔"
رابطہ منقطع ہو گیا تھا۔ حال میں خاموشی تھی، بھیانک سی۔ جیسے کچھ ہونے کو حویلی کی ڈھیٹ دیواریں سلامت کھڑی رہیں۔

☆☆☆

غزل افتخار خان نے دعاؤں کا ڈھیر لگا لیا تھا۔ مرید عباس کے امتحان ہو رہے تھے پھوپھی آئی تھیں تو اس نے اپنے حصے کے گری اور بادام پھوپھی کے ساتھ کر دیے تھے۔ پھوپھی ہنس دی تھی۔
"صدقے جاؤں، تمہیں ابھی سے مرید کا اتنا خیال ہے میری بچی۔"
وہ صرف مسکرادی تھی۔ جائے نماز پر بیٹھے سجدے طویل سے طویل تر ہوتے گئے۔
کاش اسے پتا ہوتا کہ اس کی دعائیں قبول ہو جائیں گی مگر وہ کبھی بھی اس بڑے افسر کی کامیابی میں حصہ دار نہیں بن سکے گی۔ امتحان ہو گئے تو وہ ایک دن کسی کام سے حویلی آ گیا۔ دیوداسی شوق آنکھوں میں بھر کر کسی دیوار کی طرح تن کر کھڑی ہو گئی تھی۔
"میں نے تمہارے لیے بہت دعائیں کی ہیں۔"
کوئی دیکھتا خوشی کا کوئی رنگ ہے تو اس کا چہرہ ہے۔ محبت کی کوئی صورت ہے تو اس کی صورت ہے۔
"کیوں؟"
عام سا لہجہ جیسے عام سی بات ہو۔
"تم نے...... تم نے ہی تو کہا تھا۔"
زبان لڑکھڑا گئی تھی۔ آدھے لفظ ذہن کی سلیٹ سے صاف ہو گئے۔
"ارے...... کس دنیا میں رہتی ہو۔ تم کبھی نہیں سدھرو گی۔ کبھی نہیں۔ ہٹو، رستہ چھوڑو۔ دیوار بن کے کھڑی ہو گئی ہو۔" بازو سے اسے پرے کرتا وہ آگے بڑھ گیا تھا۔ قافلہ لٹا پٹا وہیں کا وہیں کھڑا رہ گیا۔

مال غنیمت میں صرف اور صرف "محبت" تھی۔
کندھے پر ہاتھ آٹھہرا۔ آدھی بات بتانے والی کھڑی تھی۔
"میں نے کہا تھا ناں غزل کہ یہ ترازو کبھی برابر نہیں آئے گا۔"
زمین پر بیٹھ گئی۔ عنبر نے بھی پھسکڑا مار لیا۔
"کیا روگ لگ گیا تجھے غزل! کیوں اپنی حیثیت کم کرتی رہتی ہے تو......"
"عنبر! پھر کیا کروں۔ یہ جو دل ہے ناں، مجبور کر دیتا ہے۔ میں مجبور ہوں۔ بہت زیادہ۔"
وہ بلک بلک کر رو رہی تھی۔ سلمی دوڑی آئی۔ نجمہ کو بھی سندیسہ پہنچا۔ چار سر اکٹھے ہو گئے۔ مستطیل کا خانہ پھر سے مدت بعد فٹ بیٹھ گیا تھا۔
"مرد بغیر کوشش کے ملنے والی چیز کو وقعت نہیں دیتا۔ حق سمجھ کر وصول کرتا ہے پھر چاہے سر آنکھوں پر رکھے یا پاؤں کی ٹھوکر پر۔"
ایک دوسرے کے آنسو صاف کرتے کرتے وہ پھر پہلے جیسی ہو گئیں۔ انہوں نے اتنا کیا کہ غزل کو چپ سکھائی تھی۔ جیسے اسے صبر آ گیا ہو......
اپنے آپ پر رحم کھا لیا ہو مگر قسمت رحم نہیں کھاتی۔ وہاں روتی ہے جہاں سو رونے ہوتے ہیں۔
حویلی میں خزاں اتری تو اداسی کے سائے پیر پسارے ہر کھڑکی، کونے کھدرے میں دبک کر بیٹھ گئے۔ بہاروں کو آنے میں صدیاں درکار تھیں۔

☆☆☆

جس دن مرید عباس کا نتیجہ آیا اور وہ بڑا افسر بن گیا۔ اس سے ہفتے بعد طلاق کا پرچہ بھی حویلی آ گیا۔
تسبیح کے منکوں نے بھرم رکھ لیا تھا۔ نمازیں اور وظیفے کام آ گئے تھے۔ تب سمجھ میں آیا تھا اس سے ترتیب الٹ ہو گئی تھی۔ اس شخص کی کامیابی کی دعا کے بجائے اسے اس شخص کے دل تک پہنچنا تھا۔
حویلی کا ایک ڈھیٹ ستون اس دوپہر چپکے سے عمارت کا ساتھ چھوڑ گیا۔ غزل افتخار خان کی تو سارے وجود کی عمارت زلزلوں کی زد میں آ گئی تھی۔
وہ ایسے تڑپ تڑپ کر روئی کہ حویلی کے محلے کی عورتوں نے شرارتوں اور کھیل کود تک سے منع کر دیا تھا۔
وہ دل ٹوٹنے کا سوگ تھا۔ بخار کی حرارت نے ادھ موا کر کے رکھ دیا تھا۔ وہ باقاعدہ کانپ رہی تھی۔
طلاق، طلاق، طلاق......
ہائے......ہائے......
وہ تینوں اس کے گرد بیٹھی وظیفے پڑھ پڑھ پھونکتی رہ گئیں۔
داسی اندھی ہو گئی تھی۔ نظر آنا بند ہو گیا تھا۔ صرف ایک شخص نظر آیا تھا اور بس......
پھوپھی چلی آئی تھیں روتی پیٹتی، غزل کو لپٹائے روتی رہیں۔
"ہائے میری بچی......مرید عباس بڑا بے وفا نکلا اڑیے......کسی افسر کی بیٹی سے محبت کر بیٹھا ہے۔ بڑے گھر کی لڑکی ہے۔ میں نے بہت سمجھایا کہ بھائی کو کیا منہ دکھاؤں گی مگر......میں شرمندہ ہوں۔"
کسی بچھو نے ڈنک مارا، سارا جسم نیلا ہو گیا۔
"محبت......کیا اسے پتا ہے کیا ہوتی ہے۔ کیسی ہوتی ہے۔ کیوں ہو جاتی ہے؟"
وہ اتنا منہ پھاڑ پھاڑ کر ہنسی کہ حویلی کے در و دیوار لرز کر رہ گئے......محبت......محبت......محبت
یہ ایک لفظ ہونٹوں پر تھا پیٹ پر ہاتھ رکھ کر دوہری ہوتی گئی......ندرت پھوپھی کو افتخار نے باہر کا رستہ دکھایا تھا۔ طبیب بلوایا گیا......بے ہوشی میں بھی داسی کو مرید عباس کا "ہوش" تھا۔
وہ تاریخ کا واحد دن تھا جب حویلی کے در و دیوار نے دیکھا۔ تاش کے پتے پڑے رہ گئے۔ یکے رکتے رہے اور چکن کوزی حلیم کی کٹوریاں بلیاں چاٹتی رہ گئیں۔
یہ سوگ کا لمحہ تھا اور سوگ کے لمحوں کے احترام کیے جاتے ہیں۔ خاموشی اختیار کر لی جاتی ہے۔

یہاں خاموشیاں آباد کرلی گئی تھیں...... گھر والوں کی طرف سے کئی ماہ تک اور غزل افتخار خان کی طرف دو سال اور تیسرے سال کے پہلے دن تک......!!!

☆☆☆

جی تو اب ملاحظہ ہو وہ قصہ جو کہانی کے شروع میں ہے۔

دو سال کے روگ جوگ کے بعد تیسرے سال کے پہلے دن یونہی بس بیٹھے بیٹھے کپڑوں کا ڈھیر استری کرتے ہوئے غزل کا دھیان بھٹک گیا اور جلتی ہوئی استری ہاتھ پر آ گئی...... وہ درد کی انتہا تھی۔ ماس جل گیا۔ درد اتنا تھا کہ وہ پوری جان سے لرز گئی تھی۔ یونہی تو ہوتا ہے کہ کسی سمے کے بندھن میں انسان بندھ جاتا ہے اور پھر سب بدل جاتا ہے۔ پریم بخار اتر کر رہ گیا تھا۔ وہ زور سے شدت سے کراہی تھی۔

''ہائے ہائے...... میں جل گئی۔ میرا ہاتھ...... میرا ہاتھ۔''

اور تب پتا لگا تھا کہ چوٹ چوٹ میں بھی فرق ہوتا ہے۔ دور دور میں بھی تغیر ہے۔

تیل کی ساری بوتل ہاتھ پر الٹتی ہوئی جھلسے ہاتھ سے نیل قطرہ قطرہ گر رہا تھا۔ وہ اماں کے سامنے آئی تھی۔

''اماں! جو گاؤں سے رشتہ آیا ہے اس کے لیے ہاں کر دیں۔ میں شادی کے لیے راضی ہوں۔''

اماں تو قیمہ پیتے پیتے غش کھا گئیں۔ وہ ویسے ہی ہاتھ پکڑے عنبر کے پاس آ گئی تھی۔

''عنبر! مجھ سے سوال پوچھو۔''

وہ بے چین بے قرار تھی۔ کترنوں کے ڈھیر پھر ولتی عنبر کو بھی شدید جھٹکا لگا تھا جب کسی مریض کی صحت یابی سے اعتبار اٹھ چکا ہو...... کہ اب نہیں بچے گا اور وہ سلامت ہو کر پہنچ جائے تو......

''کیا پوچھوں غزل؟''

وہ مسکرا کر اس کے مقابل آئی تھی۔

''یہی کہ اگر ایک طرف محبوب چھوڑ کر جا رہا ہوں اور دوسری طرف ہاتھ استری سے جھلس رہا ہوں تو کون سا درد زیادہ ہوگا؟ محبوب کو روک لوں یا جسم کو درد سے آزاد کروں؟''

وہ صبر کی سب سے بہترین انتہا تھی۔ عنبر کو ٹوٹ کر پیار آیا تھا۔

''بتاؤ غزل! تم کیا کرو گی؟''

غزل ہنس دی تھی۔ اس نے جھلسا ہوا ہاتھ آگے کر کے دکھایا تھا۔ پھپھولا...... نیل۔

''میں...... میں نے اس کو جانے دیا عنبر! میں نے اپنا ہاتھ جھلسنے سے بچا لیا۔ میں اکیسویں صدی کی لڑکی ہوں۔ اس دور میں سوہنی مہینوال، شیریں فرہاد نہیں ہوتے۔''

عنبر نے اس کا ماتھا چوم لیا تھا۔

''وہ تمہارے قابل نہیں تھا۔''

وہ موٹی آنکھوں والی اپسرا بھیگی آنکھوں کے ساتھ ہنس دی تھی۔

''ہاں عنبر! تم سچ کہتی ہو، وہ واقعی میرے قابل نہیں تھا۔ کتنا عجیب سا تھا۔ بھورے بالوں کے گھونسلوں میں پکا سو کا بال پوائنٹ پھنسائے پھرتا تھا۔''

سلمٰی پر لگا کر آئی تھی...... اسے گھما ڈالا۔

''ارے میں تو کب سے کہتی تھی زمانے بھر کا لچا انسان ہے۔''

''تم سچ کہتی تھیں۔''

''بھاڑ میں جائے اب...... دفع کرو اسے۔ آج شام کو میری طرف سے دعوت ہے۔''

شام چلی آئی۔ بہار کے پہلو بہ پہلو آئی۔

حویلی کے در و دیوار چنبیلی اور موتیے کی خوشبو سے معطر ہو گئے۔

گول دائرے میں بیٹھی وہ پہلے جیسے ماحول میں ڈھل گئیں۔

چائے کے کپ پرانے رسالوں کا ڈھیر، نان

خطائیاں اور سلمیٰ نجمہ کی لمبی لمبی ٹپے، ماہیوں کی تانیں......

باجرے داسٹہ دے میں تلی تے مروڑیا
چٹا ککڑ بنیرے تے کاسنی دوپٹے والیے
منڈا عاشق تیرے تے

زندگی تغیر کا نام ہے۔ جواب ہے کل نہیں ہوگا۔ قدرت نے ہر جگہ بدلاؤ کا اصول رکھا ہے چاہے موسم ہوں یا پھر انسانوں کی حالتیں......!!

مکرم علی کا رشتہ تھا جو دور پرے کے ایک گاؤں سے تھا۔ وہی قبول کرلیا گیا۔ پھر بڑے کمرے میں اجلاس ہوا اور مکرم علی کی جانچ پڑتال شروع ہوگئی۔ نپے تلے جواب دیتا۔ سر جھکائے بیٹھا۔ سنجیدہ اور قبول صورت نقوش والا مکرم دل سے بھا گیا تھا۔ ادھر بڑے کمرے کے باہر گیلری میں جلے پیر کی بلی کی طرح ٹوہ لیتی لڑکیوں کی جان پر بنی ہوئی تھی۔ خدا خدا کر کے جب مرد صاحبان نے مکرم علی کو پاس کر دیا تو لڑکیوں نے اسے جالیا تھا۔

''کیسے ہیں آپ؟''

''اچھا ہوں۔''

''کھانے میں کیا پسند ہے؟''

''ساگ روٹی، سب کھالیتا ہوں جی۔''

مؤدب سر جھکائے تھوڑا سا گھبرایا ہوا وہ کمرہ امتحان میں اتنے سارے ممتحن حضرات میں بے چارہ خجل سا ہو رہا تھا۔

''اونہو پھر تو بہت مشکل ہے۔'' سلمیٰ نے تجسس کا انداز اپنایا تھا۔ مکرم نے چونک کر سر کو اٹھایا تھا۔

''کیا مطلب جی؟''

''وہ تو کیکڑے بھون کر کھاتی ہے۔''

وہ ٹھٹکا پھر ان کے چہروں پر ہنسی دیکھ کر ان کی شرارت سمجھ گیا تھا۔ عنبر نے اب کی بار مخاطب کیا تھا۔

''غزل سے ملنا چاہیں گے؟''

''پتا نہیں جی۔'' ہاتھ میں رکھا ٹشو پسینے میں بھیگ گیا تھا۔

کچھ ہی دیر بعد غزل اور وہ آمنے سامنے تھے۔ چپ کئی لمحے حائل رہی تھی۔ وہ دونوں عجیب قسم کے مخمصے میں پھنس گئے تھے۔

''آپ کیسی ہیں؟''

وہ روشن پیشانی اور مہذب انداز غزل کو اطمینان دے گیا۔

''اچھی ہوں۔''

اداس غزل، بالوں کی لٹ چہرے پر کھیلتی ہوئی، مکرم علی کو دل جیسے ہاتھ سے جاتا نظر آیا تھا۔

''آپ کیکڑے بھون کر کھاتی ہیں؟'' جھجک کر پوچھا گیا تھا۔ غزل ہکا بکا کسی ایسے سوال کی توقع نہیں کر سکتی تھی۔

''آپ کو کس نے کہا۔''

''وہ جو ملنے آئی تھیں۔'' وہ ان کی شرارت سمجھ گئی تھی۔ ہنس دی تھی۔ ہنسی میں بھی اداسی کا رنگ نمایاں تھا۔

''ایک بات پوچھوں؟''

''جی پوچھیں۔''

''آپ کی آنکھوں میں اتنی اداسی کیوں ہے؟''

اور یہیں پہ آکر غزل کی ہستی کی دیواریں گرنے لگی تھیں۔

کوئی پہلی ہی ملاقات میں کیسے اسے جان سکتا تھا۔ تو کیا اب وہ کھلی کتاب ہوگئی ہے؟ جب بھی جو بھی چاہے پڑھ لے؟ وہ دوپٹہ بمشکل سنبھالتی وہاں سے بھاگی تھی۔

رشتہ پکا ہوگیا۔ تیاریاں شروع ہوگئیں۔ وہ تینوں اس کو ساتھ لے کر لور لور بازار پھرتی تھیں۔ وہ چپ چاپ ساتھ گھسٹتی رہتی تھی۔

''آپ کی آنکھوں میں اداسی کیوں ہے؟''

داسیوں سے اداسی کا سوال نہیں کرتے۔ احترام میں کھنڈت سی پڑ جاتی ہے۔

عنبر اور وہ بیٹھ کر باتیں کر کے ماضی کو کسی اندھیرے غار میں گم کرنے کی کوشش میں لگی رہتی تھیں۔

''تم گاؤں میں رہ لوگی؟''

”کہیں بھی رہ لوں گی عنبر! اب تو کہیں بھی۔ بس اپنا شہر نہ ہو۔ یہاں مجھے خوف آتا ہے۔“

”اوپلے تھاپ لوگی؟“ نجمہ کو تو بس اس بات کی سب سے زیادہ فکر تھی۔ وہ ہر بار کی طرح بس ہنس دیتی تھی۔

”میں سب کرلوں گی نجی!“

”ہاں...... ہمیں یقین ہے تم سب کرلو گی۔ فکر مت کرو۔“

☆☆☆

گاؤں کے گاؤں نئی نویلی دلہن دیکھنے کو امڈ آئے تھے۔ پانچ گھنٹے کے مسلسل سفر نے اسے تھکا دیا تھا۔ حویلی میں اس کے دلہناپے سے جوبن اتر آیا تھا۔ داسی پہ گونگا کردینے والا روپ چڑھا تھا۔ اداس دلہنیں یونہی ہوتی ہیں۔ دلکش، حسین، ترین...... کبھی نہ بھولنے والی، آخری بار پلٹ کر حویلی کو دیکھا تھا اس نے اور گاڑی میں بیٹھ گئی تھی۔

منزل مقصود پر گھونگٹ اترا تو وہ ایک طویل چوکھٹ پر کھڑی تھی اور سامنے گاؤں کا گاؤں بچے بوڑھے، جوان، سب ایک بھوری بھینس کا رستہ اسے تھمادیا گیا تھا۔ اور اس کی ساس نے پیشانی چوم کر کہا تھا۔

”یہ بھوری اب تمہاری ہے۔“

وہ رسم کے بعد آگے بڑھی تھی۔ ان کی چار حویلیوں کے برابر کا ایک گھر تھا۔ آدھا کچا پکا۔ اور چوبارہ......

یوں لگا سارا آسمان پیراشوٹ کی طرح کھل گیا ہو۔ وہ حیران ہوئی تھی ایسے کیسے کسی نئی جگہ پر وہ سکون کا سانس لے رہی تھی۔ جیسے صدیوں سے وہاں رہتی آئی ہو۔

بکائن کے درخت، انار کے پودے اور کیاریوں میں بے تحاشہ کھلے کھلے گلاب...... باڑے کی طرف کچھ دنوں کے میمنے شرارتیں کرتے ادھر اُدھر بھاگ دوڑ رہے تھے۔

اسے کرسی پر بٹھادیا گیا تھا۔ وہ سر جھکائے بیٹھی

اپنی ساس کی آواز سن رہی تھی۔
"ارے بچی تھک گئی ہے، کولڈ ڈرنک لے آؤ۔"
وہ ہنسی تھی۔ بیٹھے بیٹھے خواہ مخواہ، بس یوں ہی۔
کولڈ ڈرنک آ گئی۔ کچھ سکون ملا اور ملنے ملانے کے بعد، وہ اپنے کمرے میں تھی۔ سادہ سا کمرہ، ہوادار، ہلکی پھلکی سجاوٹ پھر وہ آیا۔ جواب اس کا مجازی خدا تھا۔
"کیسی ہو؟"
"اچھی ہوں۔"
غزل نے گھونگٹ کی جالی کے پار دیکھا تھا۔ انگلیاں چٹخاتا، سفید لباس واسکٹ میں ملبوس، سیاہ تیل لگے بال...... کتنا اطمینان ہوا تھا، اسے مکرم علی کو دیکھ کر۔
"دودھ پیوگی؟"
"نہیں۔"
"تب ہی تو اتنی کمزور ہو۔"
افسوس کرنے والا انداز تھا۔
"یہاں گھر میں دودھ، مکھن، لسی بہت ہوتا ہے۔ پیا کرو، اب تو سب تمہارا اپنا ہے۔ پہلے تو میں اور اماں دو جانیں ہوتی تھیں بس۔ اب تم بھی ہو تو......اور اماں نے اب تو بھوری بھی تمہیں دے دی ہے، جس پر میری کب سے نظر تھی۔ اماں کہتی تھی مکرم کی ووہٹی کو دوں گی۔"
وہ کیسا خوش نظر آ رہا تھا۔ مکمل، پورے کا پورا۔ اگر جو اسے خبر ہو کہ سامنے والی آدھی ہو کر آئی ہے۔ کتنے سال دل کی سلطنت پر کوئی اور حکمران رہا ہے تو؟
"یہاں دلہنوں کو بھینسیں ملتی ہیں؟"
"ہاں...... یہاں رزق دیا جاتا ہے۔ حلال مال سے شروعات کی جاتی ہے کہ کبھی رشتوں میں آگے کھوٹ نہ پیدا ہو جائے۔"
اور یہیں آ کر غزل کو دھکا لگا تھا۔ کھوٹ...... لفظ نہیں چابک تھا۔ اس کا سانس سوکھ گیا تھا۔
"پانی...... پانی ہے؟"
مکرم علی نے دودھ کا گلاس آگے کیا تھا، جسے وہ غٹا غٹ چڑھا گئی تھی، جسے دودھ پسند نہیں تھا۔ وہ خالی گلاس لے کر ساکت بیٹھی تھی۔
"اماں شروع سے ہی کہتی تھی کوئی شہری پڑھی لکھی، بھولے کے آئے گی۔ میں بہت ڈرتا تھا کہ جانے کیسی ہو۔ ناز نخرے والی ہو۔ کہیں ہم ماں بیٹے کو ہی گھر سے چلتا نہ کر دے مگر جب میں نے تمہیں دیکھا تو مجھے بہت اچھا لگا۔ پتا ہے مجھے کیا لگا؟"
داستان سناتے سناتے وہ رکا اور پوچھنے لگا۔ خالی گلاس تھامے وہ حواسوں میں نہیں لگتی تھی۔
"ہوں......ں ں......"
"مجھے لگا اللہ نے میرے نصیب میں تمہیں ہی لکھا ہے۔ جیسے ہی تمہیں دیکھا مجھے سب بھول گیا۔ بس تمہارا چہرہ ہی یاد رہا اور بس......"
وہ ساری رات داستان امیر حمزہ تھی۔ وہ سناتا رہا اور وہ سنتی رہی۔ جب فجر کی پو پھوٹی تو غزل افتخار خان مکرم علی کے بازو پر سکون سے سو رہی تھی۔
☆☆☆
آنے والوں دنوں میں وہ سسرال نامی جس عفریت سے خوف زدہ تھی، سب وہم ثابت ہوا تھا۔ وہ خوش قسمت تھی۔ گھر میں وہ تین ہی تو لوگ تھے۔ وہ، ساس اور شوہر......
اسے ساس اور اماں میں ذرہ برابر بھی فرق نہ لگا تھا۔ وہ کھلا کھلا طویل صحن والا گھر اسے بہت پسند آیا تھا۔
حویلی کے کاموں اور یہاں کے کاموں میں بڑا فرق تھا۔ کھانوں میں بھی بہت...... کوئی دو ہفتوں تک اسے کام کو ہاتھ بھی نہ لگانے دیا گیا تھا۔
"پہلے کون سا کام کروگی؟"
مکرم نے کھاد کے حساب والے رجسٹر سے سر اٹھا کر پوچھا۔ وہ سوچ میں پڑ گئی۔
"اوپلے تھاپنا سیکھوں گی۔" وہ اتنے اطمینان سے کہہ رہی تھی کہ وہ ہنس ہنس کر پاگل ہو گیا تھا۔
"ایسے کیوں ہنس رہے ہو؟" وہ خفا ہوئی۔

''میں نے سوچا تم مجھے کوئی شہری کھانا پکا کر کھلاؤ گی۔ ویسے کیا تمہیں کچھ پکانا آتا ہے؟''
وہ واقعی نہیں جانتا تھا مگر وہ چپ بیٹھی رہی۔ شہری کھانے سے کیا کچھ یاد نہ آیا تھا۔
ہر طرف راکھ ہی راکھ اڑنے لگی تھی۔ ساری عمر خواب ہی دیکھے تھے۔ مرید عباس کے ساتھ پیزا کھاتے، لانگ ڈرائیو، موسم پر گفتگو اور بہت کچھ...... اور سامنے بیٹھے شخص کے ساتھ اس کا مستقبل کیا ہوگا بھلا۔ اوپلے، مکھن، لسی اور دودھ...... کہیں اس نے خود پیروں پر کلہاڑی تو نہیں مارلی تھی۔ اب تو وہ پرائیوٹ سولہ جماعتیں پوری کر چکی تھی۔
مکرم علی دس جماعتیں پاس تھا جو ہمیشہ کھاد، دھان اور برسات کی باتیں کرتا تھا۔ وہ دنیا کے بارے میں کیا جانتا ہوگا بھلا۔ کبھی سوچیں بہت بڑا زہر ہوکر سامنے آتی ہیں۔ کہیں کا نہیں رہنے دیتیں۔ وہ بھی جال میں آ گئی تھی۔
سب کچھ برا لگنے لگا تھا۔ طویل آنگن، انار اور بکائن کے درخت۔ یوں لگا کمرے کی چھت گرنے کو ہو۔
دل لمحے میں گرد و پیش سے اکتا گیا تھا۔ وہ کھیس لپیٹ کر لمبی تان کر دھاگے توڑ توڑ کر روتی رہی، اپنے اوپر ترس آرہا تھا۔ آنے والے دنوں میں وہ بجھی بجھی رہی۔ وہ گنے لے کر آتا رہا۔ شہر گیا تو پاستے، میکرونی، کسٹرڈ کے ڈھیر لے آیا۔ وہ تپ گئی تھی۔
''کیوں لے کر آئے ہو اتنا کچھ؟''
''تمہارے لیے۔ تمہیں یہ سب اچھا لگے گا تو تب ہی لے آیا۔''
وہ جیسے بھڑک اٹھی تھی۔ بھڑ کے چھتے میں بھونچال آ گیا تھا۔
''مت لایا کرو یہ سب۔ مجھے نہیں چاہیے۔ تمہیں بھلا کیا پتا ان سب چیزوں کا۔ آخر تمہیں دنیا کے بارے میں پتا ہی کیا ہے۔''
وہ سادہ اور نرم دل شخص سیاہ پڑ گیا تھا۔
''ہاں۔ تم درست کہتی ہو، بھلا مجھے کیا پتا۔ دسویں جماعتیں پاس میں کیا جانتا ہوں۔''
وہ شام مکرم علی کے حصے میں آئی تھی۔ کھیس تانے دھاگے توڑتا رہا۔ یہ اداسی، یہ خفگی اور غصہ۔ کوئی اور وجہ تو نہیں......
رات بیتتی رہی، ہمیشہ کی طرح۔ راتوں کو بھلا کہاں فرق پڑتے ہیں۔ وہ کھڑکی میں کھڑی ایک جملے کی بازگشت میں آ گئی تھی جو سیدھا پیشانی پر آ لگا تھا۔
''تم جانتے ہی کیا ہو، دنیا کے بارے میں۔''
اسے لگا وہ مرید عباس کے وجود میں تحلیل ہوگئی ہو اور مکرم علی غزل افتخار خان کے روپ میں ڈھل گیا ہو۔
درد حد سے سوا ہو گیا تھا۔
☆☆☆
سردیاں آ گئیں۔ گرم کوٹھڑی میں آدھی رات انگارے سلگتے رہتے، وہ اور اماں باتیں کرتی رہتی تھیں۔
''بس محلے کے لڑکے آ کر مٹکوں میں رکھی ہوئی ہماری سویاں چرا کر بھاگ جاتے تھے اور راتوں کو آگ کے مچ جلا کر بیٹھکوں پر کھاتے تھے۔ تب کے زمانے میں تو اس بات کو بھی برا نہیں مانا جاتا تھا۔ اب دنیا بدل گئی ہے۔ دل بدل گئے ہیں۔''
وہ ٹھٹکی تھی۔
''اماں! کیا واقعی دل بھی بدل جاتے ہیں؟''
وہ دودھ کاڑھ رہی تھیں۔ ابل کر گرنے والا تھا مگر وہ سنبھال گئی تھیں۔
''ہاں نا۔ ہر شے کی حالت بدلتی رہتی ہے۔ کھڑے پانیوں میں تو گند ہو جاتے ہیں پھر کائنات تبدیلی کے زور پر مکمل ہے۔ چیزیں، موسم کے ساتھ ساتھ دل بھی بدل جاتے ہیں۔''
راکھ کو کپاس کی چھڑک سے کریدتی وہ سوچ رہی تھی۔
''پھر میرا دل ابھی تک کیوں نہیں بدل پا رہا؟''
دونوں میں سرد مہری کی دیواریں کھڑی ہوگئی

تھیں۔ بات چیت بھی کم ہونے لگی تھی۔ وہ بھی کچھ شرمندہ سی تھی۔ وہ چپ چپ تھا۔

''میں کچھ دنوں کے لیے حویلی جانا چاہتی ہوں۔''

''تیار رہنا، کل چھوڑ آؤں گا۔''

وہ حیران رہ گئی تھی۔ وہ واقعی چھوڑ گیا تھا۔

حویلی میں اس کا خیر مقدم ہوا تھا۔ کیونکہ شادی کے کافی عرصے بعد وہ آئی تھی۔ سب کے جھرمٹ میں وہ بیٹھی تھی۔

''کیسی لگی وہ زندگی؟''

''تم تو پہلے سے زیادہ خوب صورت ہو گئی ہو۔''

''اوپلے تھاپتی ہو اور درانتی لے کر برسیم کاٹتی ہو یا نہیں؟''

وہ سب کے سوالوں کے جواب دھیرے دھیرے دیتی گئی۔ سب کو یوں لگا تھا جیسے کچھ کچھ بدلاؤ آ گیا ہو مگر ابھی یہ علم نہیں تھا کہ یہ بدلاؤ کیسا تھا۔ اچھا، برا یا پھر بہت اچھا......

اماں کے سوال پر اس نے انہیں خوب مطمئن کر دیا تھا۔ ماؤں کو الگ سے سب بتایا جاتا ہے، اس اسٹیج پر زیادہ دقت اور فنکاری سے کام لینا پڑتا ہے، جیسے وہ لے رہی تھی۔

''میں بہت خوش ہوں اماں! بہت اچھا اور بڑا سا گھر ہے میرا۔ میری ساس بالکل آپ کے جیسی ہیں۔ سارے کام تقریباً خود ہی کرتی ہیں۔ اوپلے تھاپنے مجھے نہیں سکھائے اور کھانا بھی خود بناتی ہیں۔ میں کبھی کبھی شوربے کا سالن پکا لیتی ہوں بس۔ مکرم بھی بہت اچھا ہے۔''

اماں مطمئن ہو کر کھانے پینے کی تیاریوں میں لگ گئی تھیں اور وہ ان تینوں کے ساتھ پھسکڑا مارے گھاس پر بیٹھ گئی تھی۔ ان کے دلوں میں کئی تجسس تھے، ان گنت سوال۔ وہ اس سب کی تیاری کر کے ہی آئی تھی۔

''مکرم کو کیسا پایا؟''

''بہت اچھا۔ ملنسار اور محبت کرنے والا۔''

''گھر اور رہن سہن کیسا لگا؟''

''مجھے خوب پسند آیا۔ بہت سکون ہے وہاں۔ جب چاہوں سر اٹھا کر آسمان کو دیکھ لیتی ہوں۔''

عنبر نے ذرا جھجک کر پوچھا تھا۔

''غزل! تم ماضی ساتھ لے کر تو نہیں گھومتی ہو؟''

وہ پیلی پڑ گئی تھی۔ حویلی کی ڈھیٹ دیواروں نے راز پا لیا تھا کہ وہ اس سوال کی ہرگز تیاری کر کے نہیں آئی تھی۔

''ناں...... نہیں...... میں نے اسے بھلا دیا ہے عنبرو! مکرم نے مجھے سب بھلا دیا ہے۔ اب مجھے کچھ بھی تو یاد نہیں آتا۔''

نجمہ کی نظریں اس پر ابھی تک گڑی ہوئی تھیں۔

''تمہاری آنکھوں کی اداسی کیوں نہیں جاتی؟''

وہ مسکراہٹ چہرے پر لے ہی آئی تھی، کھوکھلی سی۔ بناوٹی۔

''غزل ہوں ناں اس لیے۔''

اداسی...... ہرنی کی اداسی...... داسی کے درد۔

کھانے کی میز پر سلمیٰ نے ہنس کر اسے متوجہ کیا تھا، جب وہ قہوے کی پیالی اٹھانے والی تھی۔

''تمہیں پتا چلا؟'' وہ رک گئی تھی۔ جانے کس بات کی طرف اشارہ تھا۔

''کس بات کا؟''

''پھوپھی نے مرید کی شادی کر دی ہے، کسی اس کے ساتھ کی افسر لڑکی کے ساتھ۔ حویلی آئے تھیں معافی مانگنے۔''

وہ پتھر کی ہو کر رہ گئی تھی۔ بھلا ایسے کیسے۔ آنکھوں میں بوجھ بڑھنے لگا تھا۔ وہ بمشکل بند باندھے بیٹھی تھی۔

''پھر؟'' جان نکلنے کا عالم تھا، مگر سانسوں کی گنتی پوری نہیں ہوئی تھی۔

''پھر کیا...... سب نے معاف کر دیا۔ آخر بہن ہیں حویلی والوں کی۔ مرید اور عالیہ تو سب کے ساتھ تاش بھی کھیلتے رہے۔ بہت مزا آیا۔ کھانا بھی سب

نے مل کر کھایا۔"

قہوے کی پیالی ہاتھ سے چھوٹ کر گر پڑی۔ کانچ ادھر اُدھر بکھر گیا۔ اس نے نظریں اٹھا کر سب کو دیکھا تھا۔ سارے نظریں چرائے مرغ مسلم کھانے میں مگن تھے۔

حویلی والوں نے بے وفائی کردی تھی۔ آنکھیں ڈبڈبائی تھیں۔ وہ وہاں آکر ہاری تھی جہاں کا کبھی سوچا بھی نہ تھا۔ اسے چولہے کے گرد بیٹھے وہ سرد شام یاد آئی تھی۔

"سب بدل جاتا ہے، تغیر کی دنیا ہے۔ موسم، چیزیں، انسان اور دل۔"

وہ آدھی رات کو حویلی کے ستونوں سے ٹیک لگائے سوچتی کھڑی رہ گئی۔ چیزیں بدل گئیں۔ انسان بھی بدلتے دیکھ لیے۔ میرا دل کب بدلے گا؟

یہاں آسمان صاف نظر نہیں آتا تھا۔ دل چاہا ابھی اسی وقت دوڑ کر اس آنگن پہنچ جائے جو صرف اور صرف اس کا تھا۔ بغیر کسی چھال کے، فریب کے۔

پھر وہ دیوتا آ گیا جس کا سنگھاسن اونچا تھا۔ سہ پہر سے شام ہوگئی تھی۔ جم جم بادل آئے تھے۔ گیلری میں آمنا سامنا ہوگیا۔ وہ آج بھی ویسا ہی تھا، خشک مزاج۔ سر سے بال کم ہوگئے تھے، نخوت بھرا انداز تھا۔

غزل نے اپنے دل میں جھانکا تھا۔ دل میں چپ تھی۔ کوئی ہلچل نہیں، تماشا نہیں۔ فقط خاموشی۔

"تمہارا اپینڈو شوہر کیسا ہے؟"

وہ ہنسی تھی۔ حویلی کی دیواریں اور مکین دنگ رہ گئے۔ وہ ہنسی بہت خوب صورت تھی۔ آخر وہ حویلی کی سب سے پروقار اپسرا کی ہنسی تھی۔ کھنک دار، اونچی۔

وقت تھم گیا۔ بارش کی بوچھاڑ نے عالیہ مرید عباس کو گیلا کردیا تھا۔ وہ گنگ ہوگئی تھی۔ سامنے کھڑی لڑکی کا قد آور مرتبہ اسے بہت بلند اور اونچا لگا۔

مرید عباس بونا ہوتا گیا...... چھوٹا۔

وہ ہنسی روک کر منہ پر ہاتھ رکھ کر بولی تھی، جتاتا لہجہ۔

"تم نے دنیا کہاں دیکھی ہے مرید عباس خان! افسوس تمہاری تعلیم اور ڈگریاں تمہیں انسان کی پہچان بھی نہ سکھا سکیں۔"

دیوتا کا بت دھڑام سے گر کر ٹوٹا تھا۔ وہ عالیہ کے سامنے آئی تھی۔

"سنبھل کے عالیہ جی! آپ کا شوہر بہت لچا ہے۔"

اور یہیں کہانی ختم ہوئی تھی۔ دل "بدل" گیا تھا۔

☆☆☆

شوکی بھیا نے حویلی کی اس نار کو کچے گھر کے آنگن میں کھڑے دیکھا تھا، جو عین وسط میں کھڑی آسمان کو دیکھ رہی تھی۔

"شوکی بھیا! حویلی والوں کو واپس جا کر بتائیے گا کہ غزل کے گھر سے آسمان صاف نظر آتا ہے۔ انار پھل سے لدا ہوا ہے اور بکائن پھولوں سے۔ جس شام وہ مٹی کی ہانڈی میں ساگ بناتی ہے، محلے کے بچے کٹوریاں لے کر جمع ہوجاتے ہیں۔ اس گھر کی گاگروں سے دودھ اور لوگوں کے دلوں سے محبت کبھی ختم نہیں ہوتی۔"

مدت بعد وہ ہوگیا تھا۔ دل "بدل" گیا تھا۔

کہا تھا ناں تغیر کائنات کا نام ہے، سب بدل جاتا ہے۔

بھوری نے جگالی کرتے ہوئے مالکن کو دیکھا تھا۔ اماں ساس مٹی کے چولہے کے بوسے بناتی ہوئی مسکائے جارہی تھیں اور مکرم علی میکرونی کھاتا ہوا اپنی بیوی کی مسلسل ٹکٹکی باندھ کر دیکھتی نظروں سے نروس ہورہا تھا۔

غزل افتخار خان نے دل کے سارے بوہے باریاں وا کردی تھیں۔

یہی ہوتا ہے...... سب بدل جاتا ہے...... بدلنا ہوتا ہے، فقط قدم اٹھانا شرط ہے۔

☆

عنیزہ سید

وہ سرما کی چھٹیوں سے پہلے اسکول کا آخری دن تھا۔ طویل سہ ماہی چھٹیوں کا تصور اسکول کے طلبا کے لیے یقیناً مسرت کے پھول کھلاتا ہوگا۔ طلباء کے ساتھ ساتھ ان کے اساتذہ بھی پیشہ وارانہ ذمہ داریوں کی طویل اور بوجھل روٹین سے وقتی چھٹکارے پر خوش ہو رہے تھے۔ بورڈنگ میں رہنے والے بچے کئی دن پہلے سے اپنا سامان باندھنے میں مصروف تھے۔ سب ہی ہاؤس ماسٹرز اور مسٹریسز بچوں کو سامان باندھنے اور چھٹیوں میں کرنے کے کام کے متعلق مختلف ہدایات دینے میں مصروف رہے تھے۔

اس ساری بھاگ دوڑ اور گہما گہمی میں شاید وہ اکیلی ہی تھی جس کا دل ان طویل چھٹیوں کے خیال سے بیٹھا جا رہا تھا۔ آخری پیریڈ کا گھنٹہ بجنے کی آواز کے ساتھ ہی وہ اپنی کلاس سے باہر نکلی تھی۔ مختلف جماعتوں کے بچے اس روز اپنی جماعت کے کمرے سے باہر نکل کر گیٹ یا ہاسٹل تک پہنچنے کے لیے قطار سے نکل بھاگنے کو بے چین نظر آ رہے تھے۔

اس نے ہاتھ میں پکڑا حاضری رجسٹر اور ہفتہ وار درسی پلان کی فائل سینے سے لگاتے ہوئے بچوں کے خوشی اور جوش سے تمتماتے چہروں پر ایک نظر ڈالی اور آہستہ قدموں سے چلتی طویل راہداری سے نکل کر باہر اسکول کے سب سے بڑے گراؤنڈ میں ایک سے فاصلے پر رکھے لکڑی کے سبز بنچوں میں سے ایک پر آ کر بیٹھ گئی۔

بورڈنگ میں رہنے والے بچوں کے ٹرالی بیگز اور مرکزی گیٹ کی طرف جاتے قدموں کی دھمک سارے میں سنائی دے رہی تھی۔ وادی پر سرما کے بادل چھائے ہوئے تھے اور دن کے ڈیڑھ بجے ہی شام کا سا گمان ہو رہا تھا۔

مکمل ناول

اسکول بند ہونے کے ساتھ ہی اس کی بھاگتی دوڑتی زندگی ایک مختصر عرصے کے لیے ٹھہر جائے گی۔ یہ گہما گہمی، یہ چہل پہل اسکول کی عمارت کے اندر یہ رونق مفقود ہو جائے گی۔ اس نے اداسی سے سوچا۔

اس عمارت پر بھی وادی میں پڑنے والی برف کی طرح برفیلی خاموشی چھا جائے گی اور زندگی ایک تھکی ہوئی، سست اور حماقت زدہ روٹین پر چلنے لگے گی۔

اور جب اس نے اپنے ان خیالات کا اظہار اپنی کولیگ اور دوست تابندہ سے کیا تو وہ کھلکھلا کر ہنس دی۔

''اور جو اگر تمہاری یہ باتیں بورڈنگ میں رہنے والے بچے سن لیں تو کبھی تمہیں اپنی پسندیدہ ترین ٹیچر کا ٹائیٹل نہ دیں۔ جانتی ہو کہ وہ سب اس وقت یہ طویل چھٹیاں اپنے گھروں میں گزارنے کے تصور ہی سے کتنے خوش ہیں۔''

''جانتی ہوں۔'' ماہین ہلکا سا مسکرائی۔ ''لیکن اسی کو تو زندگی کی ترجیحات گردانا جاتا ہے۔ اسکول کی اس چار دیواری کے اندر موجود لوگوں میں ہر ایک کی اپنی اپنی ترجیحات ہوں گی۔''

''ہاں، جیسے بچوں کی ترجیح چھٹیاں اور چھٹیوں کے لیے مزے مزے کے پلان اور یہاں پڑھانے والے ہر استاد کی اپنی اپنی ترجیحات۔'' تابندہ نے کہا۔

''ہاں۔'' ماہین نے بینچ کی پشت سے سر ٹکاتے ہوئے کہا۔ ''جیسے میرا بس چلے تو پورا سال کبھی چھٹیاں نہ ہوں۔''

''اور جیسے میرا بس چلے تو ہفتے میں صرف دو دن پڑھائی اور باقی دن اسکول بند رہے۔''

تابندہ مسکرائی اور قریب سے گزرتے ہیڈ کلرک خاور صاحب کی طرف دیکھتے ہوئے بلند آواز میں بولی۔

''آپ بتائیے سر! ان چھٹیوں میں آپ کا کیا پلان ہے؟''

''سیزن آن ہے مس! میدانی علاقوں سے آنے والے مہمانوں کی مہمان نوازی میں مصروف رہیں گے اور کیا۔'' خاور صاحب پل بھر کو رکے اور تابندہ کے سوال کا جواب دینے کے بعد آگے چل دیے۔

''میری مانو، تم بھی چھٹیوں میں کسی کی مہمان بن جاؤ یا پھر اپنے ہاں کسی کو مہمان بلا لو۔'' تابندہ نے ماہین کی طرف دیکھا۔ ''خاور صاحب چھٹیوں میں اپنے گھر پر پے انگ گیسٹ ٹھہرا کر سیزن میں خوب کماتے ہیں۔''

''تم جانتی ہو، میرے لیے یہ ممکن نہیں۔'' ماہین اٹھتے ہوئے بولی اور اپنے لانگ کوٹ کے بٹن بند کرتے ہوئے گیٹ کی طرف چل دی۔ جہاں کچھ بچے اپنے اپنے سامان کے ساتھ کھڑے اپنے گھر والوں کا انتظار کر رہے تھے۔ ان بچوں کے قریب پہنچ کر اس نے انہیں سردی سے بچاؤ کے لیے ٹوپیاں اور دستانے پہن لینے کی ہدایات دینا شروع کی ہی تھیں کہ تابندہ اس کا بیگ اور فائل اٹھائے اس کے سر پر آ پہنچی۔

''اپنا بیگ تم وہیں چھوڑ آئیں، تمہارا فون بج رہا ہے۔'' تابندہ نے پھولا سانس بحال کرتے ہوئے بیگ اس کی طرف بڑھایا اور خود بچوں کی طرف متوجہ ہو گئی۔ ماہین نے بیگ سے فون نکال کر دیکھا، وہ مناہل کی کال تھی۔

''میں فری ہو چکی ہوں، آپ کا کیا پلان ہے اب؟'' مناہل کی عادت تھی، کال ریسیو ہو جانے کے بعد دعا، سلام کے چکر میں پڑے بغیر اپنی بات شروع کر دیتی تھی۔

''میں نے تمہیں بتایا تھا۔'' ماہین نے فون کان اور کندھے کے درمیان دبا کر ایک چھوٹے بچے کے سویٹر کے بٹن بند کرنے کے لیے جھکتے ہوئے کہا۔

''میں اسکول سے فارغ ہو کر واپسی پر بابا سے ملتی ہوئی جاؤں گی۔''

''افوہ۔'' مناہل یقیناً بھنا گئی تھی۔ ''جیسے وہ

آپ کے منتظر ہی تو ہوں گے۔"
"اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔" ماہین نے اسکول آڈیٹوریم کی قدیم اور بلند عمارت کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "میرا دل چاہ رہا ہے کہ میں ان سے ملوں، بہت دن ہو گئے ان کو دیکھے۔"
"آپ اور آپ کا دل۔" مناہل کے لہجے میں تلخی اُتری۔ "خیر، مجھے آپ کو آپ کا وعدہ یاد دلانا تھا۔ چھٹیوں کی پہلی رات مشروم ساس والا بیف اسٹیک بنا کر کھلانے والا، بھول گئیں شاید آپ۔"
"نہیں بھولی۔" ماہین نے پھولے پھولے لال گالوں والے ایک بچے کی طرف مسکرا کر ہاتھ ہلایا، جو اپنی گاڑی آ جانے پر اس سے ہاتھ ملانے اس کی طرف آ رہا تھا۔ "میں صبح گھر سے نکلنے سے پہلے اسٹیک میری نیٹ کر آئی تھی، آج رات ہم وہی شاندار ڈنر کریں گے، جس کا اعلان ہوا تھا۔"
"ٹھیک ہے۔" مناہل نے بے تاثر لہجے میں جواب دیا۔ "سو اگر آپ کا اپنے والد کا دیدار کرنے کا پکا ارادہ ہے تو پھر میں سبیکا کے ساتھ اس کی طرف جا رہی ہوں۔ گھر کے لیے نکلنے سے پہلے مجھے کال یا میسج کر دیجیے گا، میں بھی پہنچ جاؤں گی۔"
"ٹھیک ہے۔" ماہین نے مختصر جواب دے کر فون بند کر دیا۔ لمحہ بھر کے لیے اس کا دل اداسی کا شکار ہوا لیکن پھر اگلے ہی لمحے وہ اپنے والدین کی آمد پر ان کی طرف خوشی سے بڑھتے بچوں کو دیکھ کر خوش ہو گئی۔
"میں آپ کو بہت مس کروں گا ٹیچر!"
پھولے پھولے لال گالوں والے بچے نے اس کی ٹانگوں سے لپٹتے ہوئے کہا۔
"میں بھی آپ کو بہت یاد کروں گی۔" ماہین نے اس کے بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا اور اسے اپنے ساتھ لپٹا لیا۔
"گھر جانے پر خوش نہیں ہو کیا آپ؟" پھر اس نے نرم لہجے میں اس بچے سے پوچھا۔
"خوش ہوں۔" وہ آہستہ آواز میں بولا۔
"کتنے خوش ہو؟" وہ مسکرائی۔
"اتنا......" بچے نے دو قدم پیچھے ہٹتے ہوئے بازو دائیں بائیں پھیلائے۔ "اتنا زیادہ۔" اور پھر پلٹ کر گیٹ کی طرف بھاگ گیا۔
"ٹھیک ہی تو کہتی ہے تابندہ!" بچے کو گیٹ کے قریب جا کر چوکیدار سے کچھ پوچھتے ہوئے دیکھ کر اس نے سوچا۔ "ان بچوں کو تو یہ سہ ماہی تعطیلات بھی کم ہی محسوس ہوتی ہوں گی۔"

☆☆☆

سبز عمودی چھتوں سے ڈھکے اس کاٹیج کی طرف جاتے ڈھلوانی راستے سے وہ اتنی ہی مانوس تھی جتنی خود اپنے آپ سے۔
اس کا بچپن اور اوائل عمری کا دور اسی راستے سے اتر کر وادی میں جاتے اور اسی راستے پر چڑھ کر اپنے گھر جاتے گزرا تھا۔ اس کے قدم اس راستے سے یوں مانوس تھے کہ بغیر گنتی کے اوپر نیچے چلے آنے کے عادی ہو چکے تھے لیکن گزرے برسوں اور اس دن کے درمیان نجانے کتنی عمروں یا پھر صدیوں کا وقت آ کر ٹھہر گیا تھا جب ہی تو اب اس ڈھلوانی راستے پر چڑھتے اس کے قدم بے یقین بھی رہتے تھے اور لڑکھڑا بھی جاتے تھے۔
اس روز بھی اس کے قدم رک رک کر اٹھ رہے تھے اور ہر تین چار قدم کے بعد وہ رک کر جیسے خود کو سانس لینے کا موقع فراہم کرتی۔ اپنے آس پاس اور نیچے وادی میں نظر ڈالتی۔
"جانا چاہیے...... نہیں جانا چاہیے......" کی پس و پیش میں گھری ساکت ہو جاتی تھی۔
"بظاہر کچھ بھی تو نہیں بدلا۔" اپنے سامنے کاٹیج تک جاتے ہلکی برف سے ڈھکے راستے اور اس کے ارد گرد موجود کسی لینڈ اسکیپ جیسے منظر پر نظر ڈالی۔
"لیکن سب کچھ بدل گیا ہے۔ انسان، دل، جذبات، محسوسات سب ہی۔" ذرا سے توقف کے بعد اس کے اوپر جاتے قدم بھاری ہونے لگے۔
"اور جو انہوں نے میری آمد کو نظر انداز کر دیا

اور اگر وہ گھر پر موجود ہی نہ ہوئے اور جو وہ بات کرنے کے موڈ میں نہ ہوئے؟"

خود سے سوال، جواب کرتی وہ ٹانگیں گھسیٹتی، راستہ ناپتی اس ہموار لان میں جا کھڑی ہوئی جس کے وسط میں سبز چھتوں سے ڈھکا اور چوبی ستونوں پر کھڑا وہ کاٹیج موجود تھا۔ بابا کی بیٹلے کانٹی نینٹل، اپنی مخصوص شان کے ساتھ پورچ میں کھڑی نظر آ رہی تھی۔ گویا وہ گھر ہی پر موجود تھے۔ عقبی برآمدے کے قریب بہادر بخش بیٹھا آتش دان میں جلانے کے لیے خشک لکڑی کے گٹھے باندھتا نظر آ رہا تھا۔

سرما کی وہ سہ پہر تیزی سے شام میں ڈھل رہی تھی۔ وادی پر بادل چھائے تھے اور سامنے کا منظر بھی دھندلا رہا تھا۔

"جب کسی بات کا ارادہ کر لیں تو نتیجہ کیا ہوگا کی فکر سے آزاد ہو جانا چاہیے۔"

ماضی کی کہی ایک بات اس کے کان سے ٹکرائی اور پس و پیش میں پڑا اس کا دل ہر فکر سے آزاد ہو گیا۔ اب اس کے قدم تیزی سے کاٹیج کے داخلی دروازے کی طرف بڑھ رہے تھے جس کے اندر کا ماحول ہمیشہ کی طرح نرم اور گرم تھا۔ گرد و پیش کے موسم سے ہمیشہ کی طرح بے نیاز۔

☆☆☆

فاطمہ مریم کے اندر ماہین کی آمد کے بارے میں جیسے کوئی انوکھا سا سینسر لگا ہوا تھا۔ وہ گھر کا داخلی دروازہ کھول کر بے آواز قدموں سے گیلری کے فرش پر بچھے شتری رنگ قالین پر چلتی کھانے کے کمرے کے دروازے پر آ کر رک جاتی۔

اس دروازے کی طرف پشت کیے کچن میں چولہے پر رکھی ہنڈیا یا چائے کی کیتلی پر جھکی فاطمہ مریم کو بنا کسی آواز اور آہٹ کے پتا چل جاتا کہ اس گھر کی بیٹی کئی دنوں پیچھے اپنے مائکے آئی ہے۔

کچن میں ہمیشہ سے رکھی براؤن پالش والی برتنوں کی بڑی سی الماری کے ہینڈل پر لٹکے کچن ٹاول سے ہاتھ صاف کرتے وہ بے اختیار پلٹ کر دیکھتیں اور ان کا اندازہ کبھی غلط نہیں ہوتا تھا۔

اس روز بھی نہیں ہوا تھا۔ بھورے گرم لانگ کوٹ کی بیلٹ کمر پر باندھے، کندھے تک آتے بھورے بالوں کو سمیٹ کر جوڑے کی شکل میں باندھے، سر پر اونی ٹوپی اور بھورے گرم لانگ جوتے پہنے وہ دونوں ہاتھ کوٹ کی جیبوں میں ڈالے۔ ہمیشہ کی طرح گردن کو ذرا سا ترچھا کیے کھڑی ان ہی کی جانب دیکھ رہی تھی۔

انہوں نے گرم اونی شال کو سر پر سیدھا کرنے کے بعد ناک پر رکھا سنہری چشمہ درست کیا اور جھکی کمر کے ساتھ بدقت قدم اٹھاتی اس کی طرف آ گئیں۔

"بہت دن پیچھے آنا ہوا۔" اس کے قریب پہنچ کر انہوں نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا۔

"جی۔" اس نے ہولے سے سر ہلایا۔ "وقت ہی آج ملا۔"

"وقت۔" انہوں نے نظریں اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔ "ہاں، وقت کہاں ملتا ہوگا تمہیں بھی۔ کام ہی بہت ہیں تمہارے سر پر۔"

"آپ بتائیں۔" اس نے اپنے شانے پر رکھا ان کا جھریوں بھرا نرم ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر ہولے سے دباتے ہوئے کہا۔ "آپ کیسی ہیں؟"

"دیکھ لو۔" وہ آہستہ آواز میں بولیں۔ "جی رہی ہوں، چل پھر رہی ہوں۔ اب تو اتنا بھی بہت ہے۔"

"بہت سے ینگ لوگوں سے بہتر ہے آپ کی صحت۔" ماہین ان کا ہاتھ ایک بار پھر سے دباتے ہوئے زبردستی مسکرائی۔

"مجھ سے زیادہ کام کر لیتی ہیں اب بھی۔ آپ چلتی پھرتی نہ ہوں تو یہ کچن کون سنبھالے۔ یہ اب بھی ویسے ہی چل رہا ہے جیسے آپ ہمیشہ سے اسے چلاتی آئی ہیں۔"

فاطمہ مریم اس کی طرف نہیں دیکھ رہی تھیں، ان کی نظریں خلا میں کہیں جمی تھی جیسے وہاں کوئی منظر دیکھ رہی ہوں۔

"کیا ہوا؟" ماہین نے اپنے ہاتھ میں دبے ان کے ہاتھ کو ہلایا۔ "بیٹھنے کو نہیں کہیں گی کیا؟"

"ہاں۔" وہ چونکتے ہوئے بولیں۔ "کیوں نہیں، آؤ۔" وہ کھانے کے کمرے سے نکل کر گیلری میں آتے ہوئے بولیں۔ "کہاں بیٹھو گی، لاؤنج میں یا......"

"بابا اپنے کمرے میں ہیں یا لائبریری میں؟" ماہین نے ان کی بات کاٹتے ہوئے پوچھا۔

"وہ تو......" لاؤنج کی طرف بڑھتے فاطمہ مریم کے قدم رکے۔ "لائبریری...... ہاں لائبریری میں ہی بیٹھے ہیں۔"

"مجھے پتا تھا۔" وہ بے اختیار مسکرائی۔ جیسے اپنے اندازے کے درست ہونے پر خوش ہو رہی ہو۔ "اور مجھے یہ بھی پتا ہے کہ ابھی کچھ دیر پہلے آپ نے بابا کو میپل وائٹ ہاٹ چاکلیٹ بھی بنا کر دیا ہو گا اور وہ اس وقت ٹیل آف ٹو سٹیز پڑھتے ہوئے ساتھ میں انتونیو ویوالڈی کا "دی فور سیزنز" سن رہے ہوں گے۔"

وہ جیسے ٹرانس میں بول رہی تھی، یوں جیسے وہ لائبریری کے اس منظر کی جزئیات تک کو اپنی نظروں سے دیکھ رہی ہو۔ فاطمہ مریم نے اسے اپنے سامنے نظریں خلا پر جمائے بولتے دیکھا اور افسردگی کے ساتھ اس کا ہاتھ تھپتھپایا۔

"تم چلو، میں تمہارے لیے بھی میپل وائٹ ہاٹ چاکلیٹ بلکہ نہیں......" وہ کہتے کہتے رکیں۔ "تمہیں تو میپل وائٹ کا ذائقہ بالکل بھی اچھا نہیں لگتا۔ میں ایسا کرتی ہوں تمہارے لیے ونیلا بین ہاٹ چاکلیٹ تیار کرتی ہوں۔"

"ہاں، یہ ٹھیک ہے۔" اس نے جواب دیا اور اپنے لانگ شوز کی ایڑیوں پر مڑی اور اب کے لمبے قدم اٹھاتی گیلری کے آخر میں بالائی منزل کو جاتے چوبی زینے کی طرف بڑھ گئی۔

فاطمہ مریم کھانے کے کمرے کے دروازے میں کھڑی کچھ دیر اسے زینے تک جاتے دیکھتی رہیں اور پھر واپس مڑ کر آہستہ قدموں سے چلتی کچن میں آ گئیں۔ جہاں بہادر بخش پہلے سے کھڑا گیس اسٹوو پر سرد ہاتھ جھکائے انہیں حدت پہنچانے کی کوشش کر رہا تھا۔

"بہت دن بعد آئیں مینو بٹیا!" فاطمہ مریم کو آتے دیکھ کر وہ بولا۔

"ہاں۔" وہ مختصر جواب دیتے ہوئے کچن سے ملحق پینٹری کی طرف بڑھیں۔

"بڑے لوگوں کی ضد بھی بڑی ہی ہوتی ہے۔" بہادر بخش نے ہاتھ سینکتے ہوئے سر ہلایا۔ "اتنے دنوں پیچھے بٹی اس اتنے بڑے گھر میں تنہا رہے، باپ سے ملنے آئی ہے وہ بھی گھڑی دو گھڑی کے لیے۔ جی میں آئی تو گھنٹہ ایک بیٹھ رہے گی، نہیں تو ہوا کی مانند آئی، ہوا کی مانند چلی گئی۔"

"تنہا کیسے؟" فاطمہ مریم پینٹری سے ونیلا بینز کا بند ڈبا پکڑے واپس کچن میں آئیں۔ "ہم تم نہیں رہتے کیا اس بڑے سے گھر میں اور خورشید بھی۔" انہوں نے مالی کا نام لیا۔ "اور سبیکا اور جارج کو بھول گئے، دونوں بس رات گزارنے ہی تو اپنے گھر جاتے ہیں۔ باقی کا سارا دن ان کا بھی یہیں گزرتا ہے۔"

"بے چاری فاطمہ بی بی!" بہادر بخش نے چولہے کا بٹن بند کرتے ہوئے سوچا۔ "میں گھر والوں کی بات کر رہا ہوں اور یہ اس گھر کے ملازموں کی فہرست گنوائے جا رہی ہیں۔ گھر کے اصل مکین تو اس کے مالک اور اس کا خاندان ہوتے ہیں۔ ملازموں کی چاہے فوج ہی کیوں نہ رہتی ہو گھر میں، وہ گھر کے مکین تو نہیں بن جاتے نا۔"

سچ کہہ رہا تھا میں بڑے لوگوں کی ضد میں چاہے تو اپنی ہی فوجیں پٹ جائیں اور چاہے تو گھر مکینوں کے ہوتے ہوئے بھی خالی رہیں۔

دوسری طرف دودھ کاڑھنے کی غرض سے چولہے پر اسٹیل کا برتن رکھتے ہوئے فاطمہ مریم سوچ رہی تھیں۔

"صاحب نے کبھی مینو کے انتظار میں رہنے کا

اظہار نہیں کیا اور بظاہر ایسا لگتا بھی نہیں کہ انہیں اس کا انتظار ہے پھر بھی ہر مہینے کچن کے سامان میں ونیلا بینز کا ڈبا ضرور آتا ہے اور خود صاحب کو ونیلا بینز بھی پسند نہیں رہیں اور کیرمل آلمنڈ کوکیز بھی۔"

☆☆☆

"اسکول بند ہو گیا ہے تو تمہارے لیے بہتر تو یہ ہی ہے کہ تم فارغ بیٹھنے کے بجائے بچوں کو ٹیوشن پڑھالو۔ اضافی آمدنی کا ذریعہ بھی بن جائے گا اور تمہیں بوریت کا احساس بھی نہیں ہوگا۔"

اپنی اسٹڈی ٹیبل کے اس پار ریوالونگ چیئر پر بیٹھے بابا نے بے تاثر لہجے میں اسے مشورہ دیا تھا اور وہ دل میں پچھتانے لگی تھی کہ ان سے کوئی بات کرنے کی خاطر وہ ان سے تعطیلات اور اپنی بوریت کا ذکر کیوں کر بیٹھی تھی۔

"اس میں کوئی حرج نہیں، ہاتھ بھی کھلا ہو جائے گا تمہارا۔" وہ موسم سے بھی زیادہ سرد اور خشک لہجے میں کہہ رہے تھے اور وہ چاہ کر بھی کوئی تلخ جواب نہ دے پائی تھی۔

"کوئی نئی کتاب منگوائی آپ نے۔" اس نے خود پر قابو رکھنے کی خاطر پہلو بدلتے ہوئے بات بدلنے کی کوشش کی۔ "اس ماہ کا ریڈرز ڈائجسٹ یا پھر ٹائم میگزین وہ تو ضرور آچکا ہوگا آپ کے پاس۔"

"آئے رکھے ہیں لیکن میں ابھی تک پڑھ نہیں پایا۔ تمہیں چاہیے تو نیچے بک اسٹال پر مل جائیں گے۔ انسان اپنے شوق اپنی جیب سے پورے کرے تو بہتر ہوتا ہے۔"

ماہین نے گہری سانس لی۔

"اس گھر میں موجود کسی بھی چیز پر میرا حق نہیں، یہ بات جتانے کے لیے آپ کون کون سے مختلف طریقے اور الفاظ استعمال کریں گے آخر۔" اس نے سوچا۔

"مناہل کو بھی چاہیے کہ چھٹیوں میں کوئی ایسا کام شروع کرے جس سے اضافی آمدنی کا سبب بن سکے۔ ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بے کاری میں وقت گزار دینا کہاں کی عقل مندی ہے۔"

وہ کہہ رہے تھے اور ماہین ان کی کرسی کے پیچھے دیوار پر لگی رافیل کی "دی اسکول آف ایتھنز" کی فرسٹ کاپی دیکھ رہی تھی۔ یہ پینٹنگ وہ اپنے بچپن سے یوں ہی اسی دیوار پر لگی دیکھتی چلی آرہی تھی۔ یہیں اسی کرسی پر بٹھا کر بابا نے اسے "حیات نو" دور کے مصوروں، مجسمہ سازوں اور لکھاریوں کے بارے میں بتایا تھا۔

یہیں اسی لائبریری میں بیٹھے بیٹھے اس نے بابا کے ساتھ ان گنت زمانوں کی سیر کرتے ہوئے، ان کے باشندوں اور خصوصیات سے تعارف حاصل کیا تھا۔ اس کی نظریں مسلسل اس تصویر پر جمی تھیں۔ "حیات نو" کے تمام حساب دان، فلسفی اور سائنس دان اس تصویر میں اپنی محفل جمائے بیٹھے تھے۔ کتنے زمانے، کتنی صدیاں بیت چکی تھیں اس پینٹنگ کو تخلیق ہوئے اور کتنا وقت گزر چکا تھا ماہین کو اس سے تعارف حاصل کیے ہوئے۔ اس تعارف کے بعد کتنا وقت گزر چکا تھا اس کے اور بابا کے درمیان ایک خلا کو حائل ہوئے۔

"وقت...... اے وقت......" اس نے مضطرب ہوتے ہوئے پہلو بدلا۔ "تجھ سے بڑی حقیقت کوئی دوسری نہیں اور تیری حقیقت کو بدلنا کسی کے لیے بھی ممکن نہیں۔"

"وہ اب بچی نہیں رہی، اب اسے زندگی کے معاملات میں تمہارا ہاتھ بٹانا چاہیے۔" بابا اسی سرد اور خشک آواز میں اپنی بات جاری رکھے ہوئے تھے۔ "کب تک تم اکیلی سب ذمہ داریاں سنبھالتی رہو گی۔"

"جی!" اس نے پینٹنگ سے نظریں ہٹا کر سر جھکا لیا اور اپنی گود میں رکھے بیگ کے تسموں کو انگلیوں میں دباتے ہوئے مروڑنے لگی۔

"سیزن آن ہونے کے ساتھ ہی کرائے بھی بڑھ جائیں گے گھروں کے۔" وہ کسی مخلص ہمدرد کی طرح خبر دے رہے تھے۔ "مالک مکان سے بات

ہوگئی تھی تمہاری؟"

"جی۔" اس نے بدقت اپنے لہجے کی تلخی پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ "اس کے ساتھ حالیہ معاہدہ کی مدت دو سال کی ہے۔"

"چلو، یہ تو اچھا ہے۔" انہوں نے میز پر دھرا سنہرے فریم کا چشمہ اٹھاتے ہوئے کہا۔ فاطمہ مریم اس کے لیے ونیلا بینز ہاٹ چاکلیٹ کا گلاس ٹرے میں دھرے کمرے میں داخل ہوئی تھیں۔

"یہ آپ نے اچھا کیا فاطمہ مریم!" بابا نے سر ہلاتے ہوئے فاطمہ مریم کی طرف دیکھا۔ "آج موسم کا ابھی تک کا سب سے سرد دن ہے۔"

"ہاٹ چاکلیٹ پیو۔" فاطمہ مریم کے جانے کے بعد انہوں نے ماہین کی طرف دیکھا۔

"تمہاری بٹیا جب تک ہاٹ چاکلیٹ کا گلاس ختم نہ کرے، آپ یہاں سے نہیں جائیں گی فاطمہ مریم!"

ماضی کا ایک دھندلا منظر ماہین کی نظروں کے سامنے آٹھہرا۔ بابا سات سالہ ماہین کے قریب سامنے رکھے کاؤچ پر بیٹھے اپنے ہاتھ میں گلاس تھامے اسے گرم چاکلیٹ پلا رہے تھے۔

"نیچے بیگم صاحب میرا انتظار کر رہی ہوں گی صاحب!" ادھیڑ عمر فاطمہ مریم مسکرا کر کہہ رہی تھیں۔

"تمہاری بیگم صاحبہ کے کام تو سدا چلتے رہیں گے لیکن یہاں قصہ یہ ہے کہ مینو بٹیا جب تک یہ گلاس ختم نہیں کرلیں گی تب تک عمر خیام کی کہانی کا سلسلہ رکا رہے گا اور ان کا کہنا یہ ہے کہ وہ آج پوری کہانی سن کر ہی رہیں گی۔ کیوں مینو بٹیا!"

"جی بالکل۔ میں آج پورا قصہ سن کر ہی رہوں گی۔" بچی کی آواز کمرے میں گونجی تھی۔

"تو سلسلہ یہ ہے کہ جب تک آپ یہ گلاس ختم نہیں کریں گی، عمر خیام کی کہانی آگے نہیں چلے گی۔ لیں دیکھیں، فاطمہ مریم منتظر کھڑی ہیں، انہیں یہ گلاس واپس بھی تو لے کر جانا ہے۔ چلیں شاباش! ایک دم ختم کریں اسے، جلدی جلدی...... جلدی۔"

آوازیں وقت کی گرد میں کہیں گم ہو چکی تھیں۔ نظروں کے سامنے کے منظر بدل چکے تھے۔ وقت سرپٹ بھاگتے گھوڑے کی طرح قرنوں کے فاصلے لمحوں میں طے کرتا آج کے منظر پر آکر لمحہ بھر کو رک گیا تھا۔ وہی کمرا تھا، وہی ماحول، وہی فرنیچر اور اس کمرے میں موجود وہی دو نفوس تھے۔ لیکن وقت بدل چکا تھا۔

ہاٹ چاکلیٹ اپنے ہاتھوں سے پلانے والا اب اسے دعوت دے رہا تھا کہ وہ اپنے سامنے رکھا گلاس اٹھائے اور پی لے اور پینے والی کا وقت تو بالکل ہی بدل چکا تھا۔

وہ اس گھر کی مکین، اب اس گھر کی مہمان بن چکی تھی۔ اس کا اپنا سگا باپ ایک رسمی میزبان میں ڈھل چکا تھا اور شاید اسے اس کی اس گھر میں آمد کا کبھی انتظار رہا تھا نہ ہی خوشی۔

"اچھا، اب میں چلتی ہوں۔" اپنے پسندیدہ مشروب کو گھونٹ گھونٹ حلق سے اتارنے کے بعد وہ اٹھ کر کھڑی ہوئی۔ "میں نے سوچا، چھٹیوں میں شاید اس طرف آنا ہو یا نہ ہو۔ آج گھر واپس جاتے جاتے آپ سے ملتی جاؤں۔"

"ہمم......" انہوں نے ہاتھ میں پکڑی کتاب پر ہنوز نظریں جمائے زیرلب کہا۔ چند لمحے مزید ان کے چہرے کی طرف دیکھتے رہنے کے بعد اس نے سر ہلایا۔

"اللہ حافظ۔"

"ہاں، ٹھیک ہے۔" انہوں نے کتاب کا صفحہ پلٹا۔ "جاتے ہوئے دروازہ اچھی طرح بند کر جانا۔"

"جی۔" اس نے سر جھکایا اور دروازے کی طرف چل دی۔

فاطمہ مریم اور بہادر بخش کو اللہ حافظ کہنے کے بعد وہ آہستہ قدموں سے چلتی گھر سے باہر نکل آئی۔ باہر دھند تھی اور شدید سرد ہوا۔ وادی نیم تاریکی میں ڈوب چکی تھی۔

"بہادر بخش!" بالائی منزل کے کمرے سے نکلی گھنٹی کی آواز کے ساتھ ساتھ بابا کی آواز بھی اس

کے کانوں سے ٹکرائی۔ ماحول پر اتنی خاموشی چھائی ہوئی تھی کہ سوئی گرنے کی آواز بھی صاف سنائی دیتی، وہ تو پھر بابا آواز بلند پکار تھی۔

"یہ دونوں رسالے اٹھاؤ اور بھاگ کر مینو کو پکڑا آؤ۔ اسے تاکید کرنا کہ پڑھنے کے بعد واپس دے جائے۔"

بالائی منزل کے اس کمرے کی کھڑکی کا پردہ سرکا کر پشت پر ہاتھ باندھے وہ کھڑکی کے شیشے سے اسے آہستہ قدموں سے گراؤنڈ کے آخری کنارے تک جاتے دیکھ رہے تھے۔ بہادر بخش نے ان کے اسٹڈی ٹیبل سے دونوں پرچے اٹھائے اور دروازہ بند کر کے تیزی سے سیڑھیاں اتر کر داخلی دروازے کی طرف لپکا۔

☆☆☆

"فاطمہ بی بی بہت دکھی ہو رہی ہیں جی۔" پھولے سانس کے ساتھ اس کے پیچھے بھاگنے کے بعد اس تک پہنچ کر اس کے ساتھ چلتا بہادر بخش کہہ رہا تھا۔ اس نے دونوں رسالے اپنے دونوں ہاتھ میں پکڑ رکھے تھے۔

"وہ کیوں؟" ماہین کے قدم پہلے کی نسبت تیز ہوئے۔

"آپ کھانا کھائے بغیر جو جا رہی ہیں۔" بہادر بخش نے رسالے سینے سے لگاتے ہوئے کہا۔

"مجھے بھوک نہیں ہے۔" اس نے مختصر جواب دیا۔

"اور آپ آج اپنے کمرے میں بھی نہیں گئیں، بی بی! فاطمہ مریم چاہ رہی تھیں کہ آپ سے پوچھیں، کمرے کی سیٹنگ ویسی کر دیں جیسی آپ سردی کے موسم میں کر دیا کرتی تھیں۔ کھڑکی کے رخ...... بیڈ۔"

"وہ اب میرا کمرہ نہیں رہا بہادر بخش!" ماہین نے اس کی بات کاٹی۔ "فاطمہ مریم سے کہنا جیسے وہ باقی گھر کی دیکھ بھال، صفائی ستھرائی کراتی ہیں ویسے ہی اس کی بھی کر لیا کریں۔"

"وہ جی......" بہادر بخش کچھ کہتے کہتے رکا۔

"ہاں کہو۔" وہ ڈھلوانی راستے سے نیچے اتر کر سڑک کے کنارے پہنچ کر رک گئی۔

"آپ جی......" بہادر بخش ایک بار پھر جھجک گیا۔ ماہین نے منتظر نظروں سے اسے دیکھا۔

"آپ بڑے صاحب کی وجہ سے اپنے گھر آنے سے نہ جھجکا کریں جی!" وہ رک رک کر بول رہا تھا۔ "وہ ایسے ہیں نہیں جی، وہ بس ایسے ہی ہیں۔" دائیں بائیں دیکھتے ہوئے اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اپنی بات کو کن الفاظ میں بیان کرے۔

"بس اوپر اوپر جیسے یہ برف کی ہلکی تہ نظر آ رہی ہے نا جی۔" سڑک کے کنارے جاتے راستے پر نظر پڑتے ہی جیسے اسے الفاظ مل گئے۔ "یہ ابھی برف باری نہیں ہے، کہرا ہے ہلکا سا۔ جب دن چڑھے بھی ہلکا سا سورج بھی نکلا تو اس کی تپش سے پگھل جانے والا کہرا اور جب یہ پگھل گیا تو نیچے زمین سمجھو پانی پانی ہو جاتی ہے۔"

"لاؤ، یہ مجھے دے دو۔" ماہین نے بہادر بخش کی طرف ہاتھ بڑھایا اور میگزین اس سے لے لیے۔ "یہاں سے آگے میں خود چلی جاؤں گی، تم اب واپس جاؤ۔ بابا کے آتش دان میں آگ مدھم ہو رہی تھی۔"

"ہاں جی۔" بہادر بخش نے سر ہلایا اور واپسی کے لیے اوپر جاتے راستے کی طرف مڑا۔

"اور ہاں۔" ماہین کی آواز پر اس کے قدم رکے۔ "بہادر بخش! میں تمہاری اور فاطمہ مریم کی آج بھی ویسے ہی دل سے قدر کرتی ہوں جیسے ہمیشہ سے کرتی رہی ہوں لیکن اب ایسا ہے کہ میری حیثیت بدل گئی ہے۔ میں تم لوگوں کے جذبات کا ویسے جواب نہیں دے پاؤں گی، جیسے پہلے دیا کرتی تھی۔ پھر بھی بہت بہت شکریہ۔ اور یہ بات فاطمہ مریم سے بھی کہہ دینا پلیز۔"

"جی۔ بالکل ٹھیک جی۔" بہادر بخش بغیر مڑے بولا۔

ماہین نے ذرا توقف کے بعد گردن اٹھا کر

دیکھا۔ وہ اوپر جاتے راستے کے نصف تک پہنچ چکا تھا۔ اس نے اپنا دھیان واپس اس راستے کی طرف موڑ لیا جس پر چل کر اسے اپنے گھر پہنچنا تھا۔

☆☆☆

''آج رات سے موسم کی پہلی باقاعدہ برف باری شروع ہو جائے گی۔ ابھی ٹی وی پر بتا رہے تھے۔'' مناہل نے چائے کا خالی کپ سنک میں رکھتے ہوئے کہا۔

''ہوں۔'' ماہین نے چکن کے ٹکڑے گرل پین میں الٹتے پلٹتے ہوئے مختصر جواب دیا۔

''واہ کیا بات ہے بھئی۔'' مناہل چولہے کے قریب آتے ہوئے بولی۔ ''کیا خوشبو ہے۔'' اس نے چکن اسٹیک کی طرف اشارہ کیا۔ ''ماننا پڑے گا کہ آپ ایک بہترین کک ہیں۔''

''تم ذرا اس ساس پین میں چمچہ چلا دو تو میں تمہیں خود سے بہتر کک مان لوں گی۔'' ماہین نے سر سے اشارہ کیا۔

''چلا دیتی ہوں۔'' وہ دوسرے چولہے کے قریب چلی گئی۔ ''لیکن پھر آپ مانیں گی کہ یہ ہم دونوں کی کاوش ہے۔''

''تم کام تو کرو۔ میں مان لوں گی۔'' ماہین نے گرلڈ چکن پین سے نکال کر پلیٹ میں رکھی اور لہسن کے تڑکے والے چاول بنانے کے لیے پین چولہے پر رکھا۔

''لیکن ایک مسئلہ ہے۔'' مناہل نے ساس پین میں چمچہ چلانا بند کر کے اس کی طرف دیکھا۔ ''آپ کے پاس ایسے کھانوں کی ترکیبیں تو بہت ہیں لیکن انہیں ان کے مقام اور حیثیت کے مطابق ڈش آؤٹ کرنے کے برتن نہیں ہیں۔''

''اب دیکھیں نا، اس اسٹیک اور اس ساس کا اصل لطف تو سیزلنگ پلیٹ میں رکھ کر کھانے سے ہی آتا ہے نا۔ یہ رنگ برنگی سبزیاں جو آپ اس کا ساتھ نبھانے کے لیے بنا رہی ہیں، وہ بھی اسی پلیٹ میں نکالنے کا مزا ہے۔ کیسی تڑ تڑ کرتی آوازیں نکالتی ہیں جب ان پر مشروم ساس ڈالی جاتی ہے۔''

''تمہاری فرمائش پر آج رات کا کھانا بنانے میں جانتی ہو کتنے دنوں کے کھانے کا بجٹ اڑ گیا۔'' ماہین نے رک کر اسے دیکھا۔ ''ابھی تم مناسب برتنوں کی بات کر رہی ہو۔''

''بجٹ......؟'' مناہل کی لمحہ بھر کی ہنسی میں تلخی تھی۔ ''جمع تفریق، ضرب تقسیم، دو ادھر، دو اُدھر...... چار زیادہ، چار کم......'' وہ چھوٹی سی کچن ٹیبل کے پاس رکھی کرسی پر جا بیٹھی۔ ''آپ کی زندگی کا سب سے بڑا مسئلہ، سب سے بڑا ہیڈک یہ بجٹ ہی ہے نا۔''

اس نے ماہین کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر تمسخر اڑاتی مسکراہٹ آ رکی تھی۔

''بس اسی چکر میں بھٹکتے دماغ کے ساتھ زندگی گزارتے چلی جا رہی ہیں۔''

''تو کیا کروں۔'' ماہین نے ہاتھ میں پکڑے فرائنگ پین سے چمچہ ٹکراتے ہوئے پہلے کی نسبت اونچی آواز نکالی۔ ''اگر جو میں اس جمع تفریق کے چکر سے خود کو آزاد کر لوں تو پھر گزر گئی زندگی۔''

اس نے ناراض نظروں سے مناہل کی طرف دیکھا جو ٹانگ پر ٹانگ چڑھائے کرسی پر بیٹھی ہنوز تمسخر اڑانے والے انداز میں دیکھ رہی تھی۔

''آپ ایسا کر لیں گی تو بھی کچھ نہیں ہوگا۔'' وہ بے نیازی سے بولی۔ ''جانتی ہیں، آپ پودینے اور انار دانے والی چٹنی بھی بہت اچھی پیس لیتی ہیں۔ مہینہ پندرہ دن وہ بھی کھانی پڑے تو چلے گا۔ مگر یار! اگر کبھی کوئی عیاشی کرنے والی ڈش بنائیں تو اس کا پروٹوکول تو پورا ہونا چاہیے نا۔''

ماہین اس کی بات کا جواب دیے بغیر کھانا پلیٹوں میں نکالنے میں مصروف ہو گئی۔

''اسی لیے کہتی ہوں، مت جایا کریں اپنے ابا حضور کی طرف۔'' کھانے کے دوران چھائی خاموشی ایک مرتبہ پھر مناہل نے توڑی تھی۔ ''واپسی پر آپ کئی دن تک چڑی رہتی ہیں۔ مذاق کی بات کو بھی انجوائے نہیں کر پاتیں۔''

''مجھ پر اب کسی بھی بات کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔''
ماہین نے بے تاثر لہجے میں جواب دیا۔
''جی ہاں، بالکل بالکل۔'' مناہل نے گرلڈ سبزیوں میں سے گاجر کے ٹکڑے علیحدہ کر کے پلیٹ کے کنارے پر دھرے۔ ''آپ تو روبوٹ ہیں، مشینی عورت۔ آپ کا کام مشینی انداز میں زندگی گزارتے چلے جانا ہے بس۔ کوئی کیا کہہ رہا ہے، کوئی آپ کے بارے میں کیسے سوچ رہا ہے۔ آپ کو پروا ہی نہیں ہے۔ آپ کو کوئی فرق جو نہیں پڑتا۔''
''ہاں، ایسا ہی ہے۔'' ماہین نے کھانا ختم کر کے اٹھتے ہوئے میز پر رکھے برتن اٹھانا شروع کیے۔
''کبھی کبھی نا، مجھے سچ میں آپ پر ترس آنے لگتا ہے۔'' مناہل اسے برتن سمیٹ کر سنک میں رکھنے، میز صاف کرنے اور پھر برتن دھونے میں مشغول ہوتے دیکھتی رہی۔ ''قسمت نے آپ کے ساتھ واقعی اچھا نہیں کیا۔ آپ اپنے ہائی کلاس قبلہ والد صاحب کی بیٹی تھیں۔ کتنے عیش و آرام کی زندگی گزار رہی ہوں گی۔ زندگی کے بارے میں اور اس کے معمولات کے بارے میں آپ کے اسٹینڈرڈ کتنے ہائی ہوں گے، وہ تو آپ کے ابا جان کا شان دار گھر دیکھ کر سمجھ میں آتا ہے لیکن ایک ہائی فائی زندگی گزارتے گزارتے اچانک آپ کا دل آیا بھی تو کس پر۔''
وہ کہتے کہتے رکی۔ سنک کے قریب کھڑی برتن دھوتی ماہین نے کن اکھیوں سے اس کی طرف دیکھا۔
''میرے فقطے باپ پر جو کام کا تھا نہ کاج کا۔ اناج کا دشمن بھی ضرور ہوتا اگر اس کے گھر میں ضرورت سے زیادہ تو کیا ضرورت بھر ہی اناج ہوتا۔ تو اناج تو نہیں تھا لہٰذا وہ اس کا دشمن نہیں بن سکا لیکن آپ...... چچ چچ......''
ماہین نے اس کی مسلسل بک بک سے تنگ آتے ہوئے خود پر قابو پانے کے لیے گہرا سانس لیا اور دھلے برتن ریک میں لگانے لگی۔

''آئی فیل، رئیلی سوری فار یو مینو ماما!''
مناہل اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کے قریب آئی اور پیچھے سے اس کے شانوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولی۔
''آپ کو اس نے یعنی میرے باپ نے اناج کمانے کے چکروں میں خوب ڈالا اور ایسا ڈالا کہ آج تک آپ اپنے حصے کے رزق کے حساب کتاب کے دائرے میں ہی پھنسی رہ گئی ہیں۔ دنیا کہاں جا رہی ہے، کیا کر رہی ہے۔ یہ آپ کے مطلب کی بات ہی نہیں۔ آپ کو اگر کسی چیز سے سروکار ہے تو بس اس سے کہ دو جمع دو چار ہوتے ہیں اور اگر ان چار میں سے دو منفی کر دیے جائیں تو باقی پھر سے دو ہی رہ جاتے ہیں اور ان دو میں سے اگر دو مزید منفی ہو جائیں تو باقی بچتا ہے صفر...... یعنی زیرو۔ زیرو یعنی انڈا......''
اس نے دائیں ہاتھ کی شہادت کی انگلی کو انگوٹھے سے جوڑتے ہوئے اس کی نظروں کے سامنے لہرایا اور زور سے ہنس دی۔

☆☆☆

''زیرو یعنی انڈا......''
اس رات سب کاموں سے فارغ ہونے کے دوران اور اس کے بعد اپنے تھکے ہوئے جسم کے ساتھ بستر میں گھستے ہوئے بھی یہ لفظ اور مناہل کی ہنسی اس کے کانوں میں گونج رہی تھی۔
''سو سے صفر کا سفر......'' اس نے ان گزرتے سالوں میں جب کبھی اپنی زندگی کے بارے میں سوچا، ہمیشہ اس کا دل چاہا تھا کہ کبھی وہ اپنی خود نوشت ضرور لکھے گی اور اس کا عنوان ''سو سے صفر کا سفر'' رکھے گی۔
اس روز مناہل نے بھی اس کی زندگی کی کہانی چند جملوں میں مکمل کرنے کے بعد اس کو تقریباً یہ ہی عنوان دیا تھا ''سو سے صفر کا سفر'' زندگی کے اثاثے میں سے اپنے حصے کے سکے خرچ کرتے کرتے شاید وہ واقعی صفر کے ہندسے تک پہنچ رہی تھی۔ جب ہی تو

آخری دو سکوں میں دو مزید جمع کر کے چار بنانے کی تگ و دو میں لگی رہتی تھی کیونکہ وہ جانتی تھی کہ اس کے حصے کا یہ اکاؤنٹ کسی طرح بھی ری چارج نہیں ہو پائے گا۔ اس کو پھر سے بھرنے کے لیے کوئی ان داتا، کوئی چیریٹی کہیں سے آنے والی نہیں۔ اس نے زندگی میں خوشیوں، آسائش، آسانی اور محبت سے بھرا اکاؤنٹ اپنے ہاتھوں سے اجاڑا تھا اور اب اس میں کھنکتے، رہے سہے سکے اسے اپنے ہی ہاتھوں سے سنبھال کر رکھنے تھے۔

"اور اگر جو میں کبھی تمہیں بتا سکی کہ میرے وجود میں کیسی تھکن اتر چکی ہے، میرے جسم کا عضو عضو، ریشہ ریشہ اور اس کی شریانوں میں دوڑتا خون کس شدت سے تھکن کے اس حصار سے نکل بھاگنے کی تمنا کرتا ہے۔"

اس نے تصور میں مناہل کو مخاطب کرتے ہوئے سوچا۔

"تو شاید میں تمہیں یہ بھی بتا پاتی کہ اس تھکے ہارے وجود کو اٹھائے، زندگی کے باکسنگ رنگ میں ادھر سے اُدھر گھومتی اپنے چہرے پر مکے کھاتی، سروائیول کی یہ جنگ میں صرف تمہاری خاطر لڑ رہی ہوں تو شاید تم یقین کرو، نہ ہی تمہیں میری بات سمجھ میں آئے۔"

اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے جنہیں وہ اپنے ہاتھوں سے صاف کر رہی تھی۔ اس لمحے شاید اس نے اپنا سانس بھی روک رکھا تھا کہ سانس لینے کی کوشش میں اس کے آنسو ہچکیوں میں بدل جاتے اور اس کے ساتھ سوئی مناہل تک ان ہچکیوں کی آواز پہنچ جاتی۔

"ہائے میرے دل، تو کس قدر تنہا ہے۔" وہ خود ترسی کا شکار ہوتے سوچ رہی تھی۔ "تیرے زخم صرف تو خود ہی دیکھ پاتا ہے، اپنا واقف حال صرف تو خود ہی ہے۔ اپنا محرم راز بھی اکیلا تو ہی ہے۔"

اس رات وہ مسلسل جاگتی رہی تھی اور اس کے آنسو بے آواز بہتے رہے تھے۔

☆☆☆

"مگر یہ اس کا وہم تھا کہ اس کا محرم راز فقط اس کا اپنا دل تھا۔ رات کے جس پہر وہ اپنے بستر میں جاگتی آنسو بہا رہی تھی عین اسی وقت اسی وادی میں موجود اس گھر جس پر اپنے حق سے وہ برسوں پہلے دست بردار ہو چکی تھی اس گھر کے ایک کمرے میں ایک دوسرا دل بھی تھا جو اس کو یاد کر رہا تھا۔ اس کے راز کا محرم اور اس کے حال سے واقف تھا۔

وہ "فاطمہ مریم" کا دل تھا جو اس کی پیدائش کے دن سے لے کر اس وقت تک اس کے ساتھ سایا بن کر زندگی گزارتی رہی تھیں جب وہ اپنے ماں باپ سے بغاوت کا اعلان کرنے کے بعد ٹم یعنی تیمور امتیاز کا ہاتھ تھام کر اس گھر کو الوداع کہہ گئی تھی۔

رات کے اس پہر نیند نہ آنے کے باعث بے چینی سے کروٹ بدلتے اچانک وہ اس کا خیال آنے پر اٹھ کر بیٹھ گئی تھیں۔ "سسک، سسک، سسک" ان کے کمرے کی کھڑکی کے آگے اگرچہ دبیز پردہ برابر تھا لیکن باہر موسم کی پہلی برف باری کی آواز ان کے کانوں تک پہنچ رہی تھی۔

برس ہا برس سے ان کے کان اس آواز سے مانوس تھے لیکن اس رات یہ آواز سن کر وہ بے اختیار بستر سے نکل کر کھڑکی تک پہنچی تھیں۔

پردہ ہٹا کر انہوں نے کھڑکی کے شیشے سے باہر جھانکا تھا۔ کھلے میدان میں نصف لیمپ پوسٹ میں نصب بلب کی روشنی میں آسمان سے گرتے روئی کے وہ گالے صاف نظر آ رہے تھے۔ جو ایک تواتر سے زمین پر اتر کر آہستہ آہستہ اپنی سفید زنگ دبیز تہ بچھاتے چلے جا رہے تھے۔

"اور بہادر بخش بتاتا ہے کہ مینو بٹیا کے گھر میں موسم سے حفاظت کا کوئی خاص سامان نظر نہیں آتا۔"

ان کا گھر ہے بھی تو ایسی جگہ پر جہاں برف ہٹانے کا کوئی خاص انتظام بھی نہیں۔ بجلی سے چلنے والا ایک ہیٹر دیکھا تھا ان کے گھر میں، لکڑی وکڑی اکٹھی کرنے کا خیال شاید انہیں نہیں آیا۔

بہادر بخش کی سنائی باتیں تھیں جو فاطمہ مریم کو ہولائے دیتی تھیں، خود سے مینو بٹیا سے کچھ پوچھنے کا تو کبھی حوصلہ ہی نہیں پڑا تھا۔

''یا اللہ!'' انہوں نے ایک مرتبہ پھر پردہ ہٹا کر باہر جھانکا۔ ''کیا کرتی ہو گی مینو بٹیا ایسے موسم میں۔''

مضطرب ہوتی وہ واپس پلٹیں اور اپنے کمرے سے متصل غسل خانے میں گھس گئیں، جہاں اس سرد ترین رات میں بھی گرم پانی میسر تھا۔ وضو کرنے کے بعد صاف تولیے سے گیلا چہرہ خشک کرتی وہ واپس کمرے میں آئیں۔

آتش دان میں آگ بجھ چکی تھی۔ انہوں نے بجلی کا ہیٹر آن کیا اور اس کے قریب دھرے صوفے پر بیٹھ گئیں۔ قریب تپائی پر رکھی تسبیح اٹھا کر اس کے دانے دانے پر اسم اللہ کا ورد کرتے ہوئے بھی ان کی نظروں کے سامنے مینو بٹیا کا چہرہ تھا۔

''بجلی کا فقط ایک ہیٹر اور برف باری کا یہ موسم۔'' ان کے ذہن کی رو پھر بھٹکی۔

یہ وہی مینو تھی جس کے ماں باپ اسے کسی بات کی تکلیف پہنچنے کے خیال ہی سے پریشان رہتے تھے۔ فاطمہ مریم اس گھر میں لائی ہی اس لیے گئی تھیں کہ ملک مصدق کے گھر میں آنے والے پہلے بچے کی، پہلے دن سے ہی آیا بن جائیں اور وہ اس گھر میں آنے والی پہلی بیٹی جو آگے جا کر آخری بھی ثابت ہوئی کہ وہ اس کی پہلے دن سے ہی آیا بن گئیں۔

ملک مصدق خود بھی اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھے۔ کیمبرج یونیورسٹی سے تاریخ اور سیاسیات پڑھ کر آئے تھے۔ ہفتے میں دو مرتبہ اسلام آباد کی کسی یونیورسٹی میں لیکچر دینے جایا کرتے تھے اور باقی وقت اپنے اس عالی شان گھر میں جو انہیں اپنے والد سے ترکے میں ملا تھا۔ ریسرچ اور مختلف اخباروں کے لیے کالم نگاری میں مصروف رہتے تھے۔

ترکے میں ان کے لیے ان کے ماں باپ اتنا کچھ چھوڑ گئے تھے کہ ان کی زندگی آسودگی سے گزر رہی تھی۔ گھر میں آسائشوں کی کمی نہیں تھی۔

ملک صاحب کی بیوی ''نگار زہرا'' خود بھی ارب پتی باپ کی بیٹی تھیں۔ زمینی علاقے سے بیاہ کر پہاڑوں کی دلہن بن کر اس گھر میں اتری تھیں۔ حد سے زیادہ بارعب، رکھ رکھاؤ والی اور وضع دار خاتون تھیں۔

فاطمہ مریم اس گھر میں آنے سے پہلے راولپنڈی کے ایک متمول خاندان کے بچوں کی گورنس رہ چکی تھیں۔ اپنے کام کی ماہر تھیں اور اس طبقے کے گھرانوں کے رہن سہن اور طور طریقے سے بخوبی واقف تھیں۔

یہ اور بات کہ وہ اپنی پہلے والی بیگم صاحب کی نسبت نگار زہرا سے زیادہ مرعوب رہتی تھیں۔ ان کی شخصیت میں بات ہی کچھ ایسی تھی کہ فاطمہ مریم تو کیا جو بھی ملتا متاثر اور مرعوب ہوئے بغیر نہ رہ سکتا تھا۔ بیگم صاحبہ بھی ولایت سے پڑھ کر لوٹی تھیں لیکن ولایتی طرز زندگی کی ذرا سی بھی جھلک ان میں نظر نہیں آتی تھی۔ شادی کے بعد سات سال تک اولاد سے محروم رہی تھیں۔ آٹھویں سال میں اللہ کا کرم ہوا تھا اور ان کے گھر میں رحمت کی آمد کی نوید ملی تھی۔ مصدق ملک نگار زہرا پر دل و جان سے عاشق تھے۔

ایسے وقت میں جب وہ انہیں زندگی کی سب سے بڑی نعمت سے نوازے جانے کا ذریعہ بننے والی تھیں، کسی طور بھی ان کی صحت اور دیکھ بھال پر کوئی سمجھوتا نہیں کر سکتے تھے۔ جب ہی آنے والے بچے اور نگار زہرا کی دیکھ بھال کے لیے تربیت یافتہ آیا کی تلاش کے نتیجے میں فاطمہ مریم کی اس گھر میں آمد ممکن ہوئی تھی۔

''اور وہ پہلا دن جب مینو بٹیا کو لے کر بیگم صاحب ہسپتال سے گھر آئی تھیں۔ پورا کا پورا محل دلہن کا روپ دھارے ہوئے تھا۔ صاحب کا بس نہیں چلتا تھا بیگم صاحبہ اور ان کی گود میں موجود بٹیا کے راستے میں پھولوں کے بجائے کہکشاں سجا دیں۔''

وہ سوچتے سوچتے مسکرا دیں۔

''کیسے خوب صورت دن تھے۔ گھر میں

چاروں طرف، اوپر نیچے، اندر باہر مینو بٹیا...... مینو بٹیا کی گردان ہوتی رہتی تھی اور مینو بٹیا کا نام ماہین ملک بھی تو بیگم صاحبہ نے خود رکھا تھا۔ یہ نام انہوں نے کسی ایسے ناول میں پڑھا تھا جو انہیں بہت پسند تھا۔ ماہین ملک سے وہ سب کی مینو بٹیا کب بنیں، پتا ہی نہیں چلا۔ شاید سب سے پہلے بیگم صاحب نے ہی انہیں مینو کہہ کر پکارنا شروع کیا تھا۔ خود صاحب اور بیگم صاحبہ کا کمرہ بالائی منزل پر تھا لیکن مینو بٹیا کے لیے یہاں نیچے ہی سیڑھیوں کے ساتھ والا کمرہ منتخب کر کے ہسپتال جانے سے پہلے بیگم صاحب خود اپنی نگرانی میں تیار کروا کر گئی تھیں۔

اس زمانے کے لحاظ سے کیا ایسا تھا جو بازار میں نومولود بچیوں کے لیے دستیاب ہو اور مینو بٹیا کے لیے نہ آیا ہو۔

اسلام آباد سے بچوں کے کمرے تیار کرنے والی ٹیم خاص طور سے یہاں آئی تھی۔ انہیں یاد تھا، اس ٹیم کی ایک ممبر نے کتنی ہی بار حیران ہوتے ہوئے بیگم صاحبہ سے پوچھا تھا کہ وہ اتنی متمول ہونے کے باوجود اسلام آباد یا کسی بڑے شہر میں ایک بڑا سا بنگلہ لے کر رہنے کے بجائے ایک دور افتادہ وادی کے اس چھوٹے سے کاٹیج میں آبسنے پر کیسے رضا مند ہو گئی تھیں۔

"وجہ صرف اور صرف میرے شوہر کا پہاڑوں اور کنٹری سائیڈ سے حد درجہ لگاؤ ہے۔ وہ اس علاقے اور یہاں کی زندگی سے مانوس ہیں۔ وہاں انگلینڈ میں بھی انہوں نے اپنے لیے ایسا ہی گھر لے رکھا تھا۔ میں جانتی ہوں، اس ماحول سے دور وہ کبھی خوش نہیں رہ سکتے سو میں نے بھی اپنا دل یہیں لگا لیا ہے۔"

بیگم صاحبہ نے اس سوال کے جواب میں مسکراتے ہوئے کہا تھا۔

اور زندگی کی آخری سانس تک وہ اسی کاٹیج میں رہتی رہی تھیں

بقول ان کے یہاں سے دور جا کر وہ خود بھی خوش نہیں رہتی تھیں۔ یہ کاٹیج ان کی راجدھانی بن چکا تھا۔ وہ اس گھر کی مالکہ ہی نہیں ملکہ بھی تھیں۔ سو وہ تھیں اور ان کا یہ محل اور اب تو ان کی بٹیا بھی ان کے ساتھ تھی جس کی ساری ذمہ داری فاطمہ مریم کے سپرد تھی۔ بیگم صاحبہ کو تو صاحب بلا ضرورت بیڈ سے پیر بھی نیچے نہ اتارنے دیتے تھے۔ یوں ہی دن گزرتے رہے۔

نازوں پلی بیگم سے لاڈوں پلی بٹیا کے گرد صاحب کی زندگی گزرنی رہی تھی۔

مینو بٹیا جس کا قدم قدم پر صدقہ دیا جاتا اور جس کے دن اور رات پر ماں باپ پرشوق تماشائی کی طرح نظریں جمائے رکھتے۔ اب آواز نکالنے لگی ہے، اب اس نے کروٹ لینا شروع کر دی ہے۔ اب تھوڑا بہت بیٹھ جاتی ہے۔ بھلے سہارے کے ساتھ ہی سہی، اب دانت نکالے، اب کھڑی ہونے لگی ہے۔ اب چلنے لگی ہے، جیسے مینو کی زندگی فلم کا فیتہ تھی۔ جو لمحہ لمحہ پردۂ اسکرین پر چل رہی تھی۔

اس کی زندگی کے ہر نئے موڑ کی خوشی جی بھر کر منائی جاتی تھی۔ اسی کاٹیج کے گرد پھیلے وسیع قطع پر شان دار پارٹیاں چلتیں اور غریب غرباء میں کھانا اور پیسے تقسیم کیے جاتے۔

"اوہو!" یاد کرتے کرتے فاطمہ مریم کی گرفت تسبیح کے دانوں سے پھسلی اور وہ چونکتے ہوئے پل بھر کے لیے حال میں واپس آ گئیں۔

"کیسے سہانے دن اور دل فریب وقت تھا جو نہ جانے کہاں غائب ہو گیا۔"

بیگم صاحبہ اور صاحب کا بس نہیں چلتا تھا جہاں بھر کی نعمتیں مینو بٹیا کے قدموں میں ڈھیر کر دیں۔ سات سال کی عمر تک آدھی دنیا دکھا لائے تھے صاحب اور دیس دیس کی سوغاتیں برتنے کو مینو بٹیا کے پاس حاضر رہتی تھیں۔ اسکول جانے کی عمر کو آئیں تو کوئی مسئلہ ہی نہیں تھا۔ وہ جس علاقے میں رہتے تھے، وہاں ملک کے بہترین تعلیمی ادارے پڑھائی کے لیے دستیاب تھے۔ لوگ دور دور سے یہاں اپنے بچوں کو پڑھانے کے لیے چھوڑنے آتے

تھے۔ ان کے گھر سے تو یوں منٹوں کا فاصلہ تھا، بہترین اسکول کا۔ وہ بھی مینو بٹیا اپنے بابا کی قیمتی ترین گاڑی میں طے کرتی تھیں۔ کبھی ڈرائیور تو کبھی صاحب خود چھوڑنے اور لینے جاتے لیکن گاڑی کوئی بھی چلا رہا ہوتا بیگم صاحبہ خود اور فاطمہ مریم کا ساتھ جانا لازمی تھا۔ ایسا سنبھال سنبھال کر رکھتی تھیں بیگم صاحبہ مینو بٹیا کو کہ ذرا نظر سے اوجھل ہوئی نہیں اور بیگم صاحب کے ہول اٹھے نہیں۔

اسی طرح پلتی، عمر میں آگے بڑھتی وہ بچی پتا ہی نہیں چلا، کب اتنی بڑی اور لمبی ہوگئی کہ اپنی ہی کھلائی فاطمہ مریم کے قد کے برابر آ پہنچی۔

"دیکھیے، ذرا غور سے دیکھیے اماں، بابا!" ایک چمکیلی روشن صبح ناشتے کی میز سے اٹھ کر کھڑے ہوتے ہوئے وہ قریب کھڑی فاطمہ مریم کے ساتھ کندھا جوڑتے ہوئے بولی۔

"میرا اور فاطمہ مریم کا قد ایک برابر ہوگیا ہے۔" اور یہ بات سن کر سب ہی ہنس دیے تھے۔

"ارے میری بٹیا! وہ دن دور نہیں جب تم مجھ سے بھی اوپر قد نکال جاؤ گی۔"

فاطمہ مریم نے ہنستے ہوئے کہا تھا اور دو چٹیاں کیے، اسکول کے یونیفارم میں ملبوس اس کے سادہ اور صاف ستھرے وجود کو نہال ہوتی نظروں سے دیکھنے لگیں۔

"رکو، میں ذرا تمہارا صدقہ نکال لوں۔ بہادر بخش کو دوں گی راستے میں سلیمہ مائی کے بیٹے کو پکڑا تا جائے۔" بیگم صاحبہ نے اٹھتے ہوئے کہا تھا۔

"فاطمہ مریم! یاد ہے نا، آج شام چائے پر میرے دوست اور سہیلیاں مدعو ہیں۔" ذہانت سے چمکتی آنکھوں والی مینو بٹیا نے انہیں یاد دلایا تھا۔

"چینی کا وہ آب رنگ ٹی سیٹ نکال لیے گا، جو اماں بیلجیم سے لائی تھیں اور ہاں چکن پیٹز اور چاکلیٹ کپ کیکس خود بیک کیجیے گا۔ بیکری والے ذرا مزے کے نہیں ہوتے۔" اس نے ہدایات دی تھیں۔

اور یہ تو اس گھر میں معمول کی بات بن چکی تھی۔

مینو بٹیا اکثر ہی اپنی دوستوں اور کلاس فیلوز کو چائے یا رات کے کھانے پر گھر پر بلایا کرتی تھیں کیونکہ خود اسے کم ہی کسی ساتھی کے گھر جانے کی اجازت ملتی تھی۔ گنتی کی دو یا تین ہی سہیلیاں ہوں گی جن کے والدین بھی صاحب اور بیگم صاحبہ کے دوست یا واقف کار تھے جن کے گھر جانے کی اجازت ملتی تھی۔ ہاں خود وہ جب چاہیں، جسے چاہیں گھر پر بلا سکتی تھیں۔

شروع شروع میں اس بات پر اگرچہ مینو بٹیا نے دبا دبا احتجاج بھی کیا تھا کہ اس کے دوست اور سہیلیاں بھی اس وجہ سے ان کے گھر آنے پر راضی نہیں ہوتی تھیں کہ خود انہیں ان کے گھر جانے کی اجازت نہیں ملتی تھی لیکن بیگم صاحبہ کی زندگی کے کچھ اصول اس لاڈ پیار سے زیادہ اہم تھے اور ان میں سے ایک اصول یہ بھی تھا کہ وہ اپنی بچی کو ہر کسی کے گھر جانے کی اجازت نہیں دے سکتی تھیں۔

"اب اسکول کی فیس بھاری ہو، استطاعت سے باہر ہو یا کیا ہو۔ میں نے دیکھا ہے ہر طبقے میں ایسے والدین بھی پائے جاتے ہیں جو ہر حال میں اس اسکول میں اپنے بچوں کو داخلہ دلوانے پر تل جاتے ہیں اور دلوا بھی لیتے ہیں۔ بھئی اب متمول خاندانوں کی ہم سری کی کوشش میں بچے بھلے ایسے اسکولوں میں پڑھا لیں لیکن ان کو گھروں میں وہ ماحول اور تربیت تو نہیں دے سکتے نا جو ہمارے بچوں کو ملتی ہے۔"

وہ کہا کرتی تھیں۔

"اسی لیے میں تمہیں ہر کسی کے گھر منہ اٹھا کر جانے کی اجازت نہیں دے سکتی، خاص طور پر ان لوگوں کے گھروں میں جن کو میں خود نہیں جانتی۔"

اور یہ بات کہتے ہوئے ان کا لہجہ اتنا سخت اور دو ٹوک ہوتا تھا کہ مینو بٹیا کا احتجاج ایک دو بار کے بعد خود ہی دم توڑ گیا تھا۔ لیکن اس کے بدلے کسی کو بھی گھر پر بطور مہمان بلانے کی فرمائش مان لی گئی تھی۔

اور ان چائے پارٹیوں اور کھانوں پر جو دوست اور سہیلیاں بلائے جاتے وہ اتنی مرتبہ اس گھر میں

آ چکے تھے کہ فاطمہ مریم سب کے ناموں اور چہروں سے بہت اچھی طرح واقف ہو چکی تھیں۔

وہ بھی ایسی ہی چائے پارٹیوں میں سے ایک پارٹی تھی جس کے لیے گھر سے باہر گھاس سے سجے وسیع قطعے پر کرسیاں اور میزیں لگوا کر ان پر ترتیب سے برتن رکھواتے انہوں نے مینو بٹیا کے دوستوں میں ایک نیا چہرا دیکھا تھا۔

وہ اس چہرے سے واقف تھیں نہ ہی اس لڑکے کے نام سے جو مینو بٹیا کے بالکل ساتھ والی کرسی پر بیٹھا تھا اور غالباً سب مہمانوں کو لطیفے سنا رہا تھا۔ جب ہی تو وقفے وقفے سے سب کی ہنسی کی آوازیں فاطمہ مریم کے کانوں تک پہنچ رہی تھیں۔

''اللہ جانے یہ نیا لڑکا کون ہے۔'' کچن میں واپس آ کر اوون سے چاکلیٹ کپ کیکس کی ٹرے نکالتے ہوئے انہوں نے سوچا تھا۔ اسی دم ان کے کانوں سے ماؤتھ آرگن کی آواز ٹکرائی تھی۔

''ارے یہ کون بجا رہا ہے؟'' انہوں نے تجسس کے مارے ٹرے کچن کاؤنٹر پر رکھ کر جالی دار دروازے سے باہر جھانکا، وہ وہی نیا لڑکا تھا جو ماؤتھ آرگن منہ سے لگائے آنکھیں بند کیے کوئی دھن بجا رہا تھا اور اس کے اردگرد بیٹھے باقی بچے سننے میں محو تھے۔

جیسے ہی اس کی دھن ختم ہوئی۔ تالیوں اور چیخوں کا شور بلند ہوا اور فاطمہ مریم نے دیکھا۔ تالیاں پیٹتے اور سیٹیاں بجاتے ہوئے جو چہرہ مسرت اور تحسین کے جذبات سے سب سے زیادہ تمتمار رہا تھا وہ مینو بٹیا کا چہرہ تھا۔

☆☆☆

صبح کی روشنی پھیلنے سے ذرا ادھر ماہین کے ساتھ بیڈ پر سوئی مناہل نے آنکھیں کھول کر پہلو کے بل ذرا سا اٹھتے ہوئے قریب سوئی ماہین کو دیکھا۔ نجانے کب اس کی آنکھ لگ گئی تھی اس کے چہرے پر آنسوؤں کے نشان تھے اور چند بال اس کے ساتھ تر ہو کر چپک گئے تھے۔ مناہل نے ماہین کا چہرہ دیکھتے ہوئے گہرا سانس لیا اور پھر کروٹ بدل کر لحاف سر تک اوڑھ لیا۔

وہ چھٹی کا پہلا دن تھا اور اسے دیر تک سونا تھا۔

☆☆☆

''ارے آج صبح کی روشنی اتنی دیر سے پھیلی۔'' جائے نماز پر بیٹھ کر نماز کے بعد دیر تک تسبیح پڑھنے اور دعا مانگنے کے بعد فاطمہ مریم کا دھیان کھڑکی سے ذرا سا کھسکے پردے پر پڑا۔ ''لگتا ہے رات بھر پڑنے والی برف کا سلسلہ کچھ دیر کو رکا ہے۔''

وہ اٹھ کر جائے نماز تہہ کرنے لگیں اور پھر کمرے کا دروازہ کھول کر باہر کوریڈور میں آ گئیں۔

''صاحب کو بیڈ ٹی میں نے بنا کر دے دی ہے۔'' بہادر بخش کھانے کے کمرے کے دروازے میں کھڑا تھا۔ ''آپ ابھی آرام کریں، صاحب کہہ رہے تھے، ناشتہ ذرا ٹھہر کے کریں گے۔''

''ہوں!'' فاطمہ مریم نے سر ہلایا۔

''آپ کے لیے بھی چائے لاؤں؟'' بہادر بخش پوچھ رہا تھا۔ وہ کوئی جواب دیے بغیر واپس کمرے میں چلی گئیں۔ بہادر بخش ان کے لیے چائے لے آیا تھا اور اب ان کے کمرے کے آتشدان میں لکڑیاں جوڑ کر آگ بھی جلا رہا تھا۔

''مینو بٹیا کے گھر بھی کچھ خشک لکڑیاں پہنچا دیتے بہادر بخش۔'' انہیں نجانے کیوں خیال آیا۔ بہادر بخش نے ہاتھ روک کر ان کی طرف حیرت سے دیکھا۔

''چپکے سے کسی کو بتائے بغیر۔'' فاطمہ مریم نے وضاحت کی۔

''جیسے وہ لے ہی لیتیں۔'' بہادر بخش نے سر جھٹکا اور دوبارہ کام میں مصروف ہوا۔

''ہاں یہ بھی ہے۔'' فاطمہ مریم نے زیر لب کہا۔

''اس لڑکے کا نام تم تھا۔'' بہادر بخش کے جانے کے بعد فاطمہ مریم کی سوچوں کا کافی دیر سے منقطع سلسلہ پھر سے جڑ گیا۔

''تم جو مینو بٹیا کی کلاس میں نئے داخلے کے

ساتھ آیا تھا اور مینو بٹیا کے بقول ہر فن مولا تھا۔"

"ٹم۔" اس شام چائے کی دعوت کے بعد دھلے برتن صاف کپڑے سے خشک کرتے ہوئے فاطمہ مریم نے مینو سے پوچھا تھا۔ "یہ بھلا کیا نام ہوا۔ ٹم بھی کسی کا نام ہوا کرتا ہے کیا۔"

اور وہ جو کچن سلیب پر چڑھ کر بیٹھی بادام کی ٹافی کھا رہی تھی کھلکھلا کر ہنس دی۔

"ٹم اس کا نام ہے فاطمہ مریم! کتنا کیوٹ نام ہے نا۔"

"ارے اللہ رحم کرے، وہ کہیں کسی دوسرے مذہب سے تعلق تو نہیں رکھتا۔" فاطمہ مریم نے ہول کر اس کی طرف دیکھا تھا۔ ان کی شکل دیکھ کر وہ ایک مرتبہ پھر زور سے ہنس دی تھی۔

"ٹم اس کا نک ہے، مطلب نک نیم ہے فاطمہ مریم۔" وہ چھلانگ لگا کر سلیب سے اتری اور فاطمہ مریم کے قریب آگئی۔ "اس کا اصل نام تیمور امتیاز ہے اور وہ مسلمان ہے۔ ٹم تو اس کا پیار کا نام ہے اور کتنا کیوٹ نام ہے نا۔"

اس روز وہ معمول سے زیادہ خوش اور پرجوش نظر آرہی تھی۔

"پہلے تو کبھی نہیں دیکھا اسے۔" فاطمہ مریم نے کچھ دیر اس کے چہرے کی طرف دیکھتے رہنے کے بعد اپنا دھیان دوبارہ برتنوں کی طرف منتقل کر لیا۔

"ہاں تو وہ ابھی دو مہینے پہلے ہی تو یہاں آیا ہے اسکول میں۔" وہ لاپروائی سے بولی۔

"بورڈنگ میں رہتا ہے، کہیں دور سے آیا ہے پڑھنے اور پتا ہے بہت لائق فائق ہے۔ میرٹ پر انٹری ٹیسٹ کلیئر کر کے آیا ہے اور بہترین اسپورٹس مین بھی ہے۔ بہت اچھا تیراک، سپر ایکٹو ایتھلیٹ اور ڈیبیٹس وغیرہ میں بھی حصہ لیتا ہے۔ کلاس میں سب کہہ رہے تھے کہ ایک آدھ سال میں ہاؤس پریفکیٹ بن جانا ہے اس نے...... اور اتنے مزے کیا بات ہے، اتنی کلاس کا بجاتا ہے کہ کوئی اس سے مقابلہ نہیں کرسکتا۔ ماؤتھ آرگن بجاتے تو سنا ہی ہوگا نا آپ نے۔ اسے پتا ہے ڈوبی برادرز کا "لانگ ٹرین رننگ" بجا رہا تھا آج، اُفف...... اتنا اچھا اتنا اچھا کہ دل کرے بس سنتے ہی چلے جاؤ اور......"

وہ یاد کرتے ہوئے بول رہی تھی اور اس کا چہرہ جوش کے مارے سرخ ہو رہا تھا۔

"آپ نے وہ گانا تو سنا ہوگا۔ بابا اکثر گراموفون ریکارڈ پر بجاتے ہیں وہ کیا ہے۔ "رمیا وستاویا رمیا وستاویا" وہ بھی بجا رہا تھا آج...... اللہ ...... لوگ پتا نہیں اتنے ملٹی ٹیلنٹڈ کیسے ہوتے ہیں۔ مجھے تو رشک آتا ہے ٹم پر۔ اس لیے تو آج میں نے اسے اسپیشل گیسٹ کے طور پر انوائٹ کیا تھا پارٹی پر۔ بڑا اریوگینٹ ہے جناب۔ ہر کسی کے گھر نہیں چلا جاتا۔ میرے گھر پتا نہیں کیسے آگیا۔ اوپر سے اسپیشل اجازت لینی پڑتی ہے۔ بورڈنگ میں جو رکتا ہے۔ جھوٹ بول کر آیا تھا سینئر ہاؤس ماسٹر سے کہ شاپنگ کے لیے جا رہا ہے۔ جوتوں کی جوڑی خریدنی ہے اسے۔"

وہ قہقہہ لگا کر ہنس رہی تھی اور فاطمہ مریم اس کے چہرے پر پھیلی خوشی اور ہنستے ہوئے چمکتے سفید دانتوں کو دیکھ رہی تھیں۔

اور پھر گھر میں ٹم کا ذکر روزانہ کا معمول بن گیا۔

"ٹم کوئلے سے اسکیچز بھی بنا لیتا ہے۔"

"ٹم میتھس کے ٹیسٹ میں فرسٹ آیا۔"

"ٹم نے ڈیبیٹ کمپیٹیشن جیت لیا۔"

مینو ٹم کی ہر کامیابی کا ذکر خصوصی طور پر سب ہی سے کرتی۔ فاطمہ مریم اس لڑکے کے ساتھ مینو بٹیا کی غیر معمولی انسیت پر کھٹکتی تھیں اور اس کا ذکر انہوں نے بیگم صاحب اور پھر صاحب سے بھی ایک دو بار کیا تھا۔

"اچھی بات ہے، قابل، ذہین اور محنتی بچوں کی

ساتھ آیا تھا اور مینو بٹیا کے بقول ہرفن مولا تھا۔"

"ٹم۔" اس شام چائے کی دعوت کے بعد دھلے برتن صاف کپڑے سے خشک کرتے ہوئے فاطمہ مریم نے مینو سے پوچھا تھا۔ "یہ بھلا کیا نام ہوا۔ ٹم بھی کسی کا نام ہوا کرتا ہے کیا۔"

اور وہ جو کچن سلیب پر چڑھ کر بیٹھی بادام کی ٹافی کھا رہی تھی کھلکھلا کر ہنس دی۔

"ٹم اس کا نام ہے فاطمہ مریم! کتنا کیوٹ نام ہے نا۔"

"ارے اللہ رحم کرے، وہ کہیں کسی دوسرے مذہب سے تعلق تو نہیں رکھتا۔" فاطمہ مریم نے ہول کر اس کی طرف دیکھا تھا۔ ان کی شکل دیکھ کر وہ ایک مرتبہ پھر زور سے ہنس دی تھی۔

"ٹم اس کا نک ہے، مطلب نک نیم ہے فاطمہ مریم۔" وہ چھلانگ لگا کر سلیب سے اتری اور فاطمہ مریم کے قریب آ گئی۔ "اس کا اصل نام تیمور امتیاز ہے اور وہ مسلمان ہے۔ ٹم تو اس کا پیار کا نام ہے اور کتنا کیوٹ نام ہے نا۔"

اس روز وہ معمول سے زیادہ خوش اور پرجوش نظر آ رہی تھی۔

"پہلے تو کبھی نہیں دیکھا اسے۔" فاطمہ مریم نے کچھ دیر اس کے چہرے کی طرف دیکھتے رہنے کے بعد اپنا دھیان دوبارہ برتنوں کی طرف منتقل کر لیا۔

"ہاں تو وہ ابھی دو مہینے پہلے ہی تو یہاں آیا ہے اسکول میں۔" وہ لاپروائی سے بولی۔

"بورڈنگ میں رہتا ہے، کہیں دور سے آیا ہے پڑھنے اور پتا ہے؟ بہت لائق فائق ہے۔ میرٹ پر انٹری ٹیسٹ کلیئر کر کے آیا ہے اور بہترین اسپورٹس مین بھی ہے۔ بہت اچھا تیراک، سپرا یکٹو ایتھلیٹ اور ڈیبیٹس وغیرہ میں بھی حصہ لیتا ہے۔ کلاس میں سب کہہ رہے تھے کہ ایک آدھ سال میں ہاؤس پریفکیٹ بن جانا ہے اس نے...... اور اتنے مزے کے جوکس سناتا ہے کہ کیا بتاؤں۔ آپ کو ہنس ہنس کر دہری ہو جاتی ہوں میں، اور ماؤتھ آرگن...... اوہو ہو کیا بات ہے، اتنی کلاس کا بجاتا ہے کہ کوئی اس سے مقابلہ نہیں کر سکتا۔ ماؤتھ آرگن بجاتے تو سنا ہی ہو گا نا آپ نے۔ اسے پتا ہے ڈوبی برادرز کا "لانگ ٹرین رننگ" بجا رہا تھا آج، اُف...... اتنا اچھا اتنا اچھا کہ دل کرے بس سنتے ہی چلے جاؤ اور......"

وہ یاد کرتے ہوئے بول رہی تھی اور اس کا چہرہ جوش کے مارے سرخ ہو رہا تھا۔

"آپ نے وہ گانا تو سنا ہو گا۔ بابا اکثر گراموفون ریکارڈ پر بجاتے ہیں وہ کیا ہے۔" "رمیا وستاویا رمیا وستاویا" وہ بھی بجا رہا تھا آج...... اللہ...... لوگ پتا نہیں اتنے ملٹی ٹیلنٹڈ کیسے ہوتے ہیں۔ مجھے تو رشک آتا ہے ٹم پر۔ اس لیے تو آج میں نے اسے اسپیشل گیسٹ کے طور پر انوائٹ کیا تھا پارٹی پر۔ بڑا ایروگینٹ ہے جناب۔ ہر کسی کے گھر نہیں چلا جاتا۔ میرے گھر پتا نہیں کیسے آ گیا۔ اوپر سے اسپیشل اجازت لینی پڑتی ہے۔ بورڈنگ میں جو رکتا ہے۔ جھوٹ بول کر آیا تھا سینئر ہاؤس ماسٹر سے کہ شاپنگ کے لیے جا رہا ہے۔ جوتوں کی جوڑی خریدنی ہے اسے۔"

وہ قہقہہ لگا کر ہنس رہی تھی اور فاطمہ مریم اس کے چہرے پر پھیلی خوشی اور ہنستے ہوئے چمکتے سفید دانتوں کو دیکھ رہی تھیں۔

اور پھر گھر میں ٹم کا ذکر روزانہ کا معمول بن گیا۔

"ٹم کوئلے سے اسکیچز بھی بنا لیتا ہے۔"

"ٹم میتھس کے ٹیسٹ میں فرسٹ آیا۔"

"ٹم نے ڈیبیٹ کمپیٹیشن جیت لیا۔"

مینو ٹم کی ہر کامیابی کا ذکر خصوصی طور پر سب ہی سے کرتی۔ فاطمہ مریم اس لڑکے کے ساتھ مینو بٹیا کی غیر معمولی انسیت پر کھٹکتی تھیں اور اس کا ذکر انہوں نے بیگم صاحب اور پھر صاحب سے بھی ایک دو بار کیا تھا۔

"اچھی بات ہے، قابل، ذہین اور محنتی بچوں کی کمپنی مینو کے لیے ضروری ہے۔ آپ نے دیکھا، جب سے یہ لڑکا اس کی کلاس میں آیا ہے۔ مینو بھی اس

سے مقابلے کی کوشش میں پڑھائی میں پہلے سے زیادہ محنت کرنے لگی ہے اور پڑھائی کے علاوہ غیر نصابی سرگرمیوں میں دلچسپی بھی لینے لگی ہے۔"

صاحب نے فاطمہ مریم کی تشویش کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے کہا تھا۔

"ماشاء اللہ پندرہویں سال میں لگ چکی ہے مینو۔ بڑھتی عمر کے بچوں میں اعتماد پیدا کرنے کے لیے ان سے متعلق کچھ فیصلے خود ان پر چھوڑ دینے چاہئیں۔"

بیگم صاحبہ اب تک مینو کے معاملے میں حد سے زیادہ محتاط رہی تھیں۔ اب آہستہ آہستہ اس کے معاملات پر اپنی گرفت کو تھوڑا ڈھیلا کرنے لگی تھیں۔ ویسے بھی وہ کن بچوں کی کمپنی میں رہتی ہے اس کی دوستیاں کس کس سے ہیں، اپنے سامنے کی ہی تو بات ہے۔ یہی اپنے ڈاکٹر صاحب کا بیٹا، وکیل صاحب کی بیٹی، جدون صاحب کا پوتا اور پوتی اور ہاں وہ ریٹائرڈ کرنل صاحب کی نواسی، سب دیکھے بھالے لوگ ہی تو ہیں۔ اور پھر نکل کلاں کو ان بچوں نے کالج چلے جانا ہے، کچھ تو آزادی ملنی چاہیے انہیں۔"

"لیکن یہ لڑکا ٹم یہ تو بورڈنگ میں رہتا ہے اور اس کا آگا پیچھا ہمیں قطعی طور پر معلوم نہیں۔" فاطمہ مریم نے کمزور سی آواز کہا تھا۔

"ارے فاطمہ مریم! آپ تو حد سے زیادہ فکر کرتی ہیں۔" نگار زہرا ہنس کر بولی تھیں۔ "کون ہوسکتا ہے یہ بچہ، آخر اس اسکول میں پڑھ رہا ہے تو کسی معمولی خاندان کا تو نہیں ہوگا نا۔"

"آپ خود ہی تو کہتی ہیں کہ ہر طبقے کے والدین اب کسی بھی طور اس اسکول میں اپنے بچے کو تعلیم دلوانے کی کوشش کرنے لگے ہیں۔" انہوں نے بیگم صاحبہ کو یاد دلانے کی کوشش کی۔

"ہاں، لیکن یہ اتنا بھی آسان نہیں ہے اور پھر یہ بچہ تو اتنے گنوں والا ہے کہ ضرور اس کا بیک گراؤنڈ بہت ہی مضبوط ہوگا۔"

بیگم صاحبہ نے پہلی بار مینو سے متعلق بے نیازی اور لاپروائی برتی تھی اور یہ بے نیازی اور لاپروائی مینو کے معاملے میں ان کی پہلی اور سب سے بڑی غفلت بن گئی تھی۔

مینو اور ٹم کی دوستی اب صرف دوستی کے طور پر مشہور نہیں رہی تھی۔ اب ان کے دوست اور ساتھی دونوں کا نام لے کر مسکراتے ہوئے ایک دوسرے کے کانوں میں سرگوشیاں کرنے لگے تھے۔

مینو کی زندگی کا سولہواں سال اپنے ساتھ اس کے لیے نیا انقلاب لے کر آیا تھا۔ اسکول سے نکل کر وہ اسی اسکول سے ملحقہ کالج میں پہنچ گئی تھی۔ یہاں آکر لڑکیوں اور لڑکوں کی کلاسیں الگ الگ عمارت میں منتقل کردی گئی تھیں۔ لڑکیوں کے اپنے انفرادی گروپ بن گئے تھے اور لڑکوں کے الگ گروپ تھے۔ کچھ پرانی دوستیاں ختم ہوگئیں اور کچھ نئی بن گئیں۔

مینو اب بھی اپنے دوستوں کے لیے گھر پر پارٹیز کا اہتمام کرتی تھی جن میں اکثر نئی سہیلیاں مدعو ہوتیں۔

فاطمہ مریم کے سامنے کئی نئی دوستیاں بنیں، پرانی ٹوٹیں لیکن اگر نہیں چھوٹا تھا تو ایک "ٹم" کا ساتھ نہیں چھوٹا تھا۔ وہ اب بھی ان دعوتوں کا مہمان خصوصی بن کر آتا اور اپنے پرانے انداز میں لطائف، شعر اور قصے سنا کر محفل لوٹ لیتا۔

الیکٹرانک پیانو پر سب کی پسندیدہ دھنیں بجاتا اور سب کی داد وصول کرتا۔

یہ الیکٹرانک پیانو بھی مینو نے خاص طور پر اپنے بابا سے فرمائش کر کے منگوایا تھا اور ٹم کو اس کی سالگرہ پر تحفے میں دیا تھا۔

فاطمہ مریم اب ذرا غور سے اس لڑکے کے اور چھور کا جائزہ لینے لگی تھیں۔ محض ایک سال کے اندر اندر وہ اسکول کے ایک نسبتاً کم عمر نظر آنے والے معصوم سے بچے کے بجائے اپنی اصل عمر سے بڑا لڑکا لگنے لگا تھا جس کی داڑھی مونچھیں آرہی تھیں اور آواز بھی بھاری ہو رہی تھی۔ بدل تو مینو بھی بہت حد تک گئی تھی۔

بلاؤز، اسکرٹ، ٹونکس اور جینز، ہائی نیک پہننے والی لڑکی، اب تک بالوں کو دو چوٹیوں میں گوندھ کر رکھنے والی، میک اپ کے نام پر ڈے اور نائٹ کریم لگا کر کبھی کبھار اماں سے ضد کر کے ہلکا سا پرفیوم لگا لینے والی لڑکی کو نت نئے کپڑے بنوانے، جیولری، میک اپ اور پرفیومز، ہیل والے جوتوں اور اچھے بیگز لینے کا شوق چرانے لگا تھا۔

"مجھے بھی بھنویں بنوانی ہیں اور اچھا سا ہیئر کٹ بھی کروانا ہے۔" بیگم صاحبہ کے ساتھ ہفتہ واری تعطیل پر اسلام آباد یا لاہور جانے سے پہلے وہ ضد کرتی۔ "ابھی تمہاری عمر کم ہے۔ جب یونیورسٹی جاؤ گی تو......"

بیگم صاحبہ سمجھانے کی کوشش کرتیں تو صاحب کی محبت آڑے آجاتی۔

"بہت سال دبا دبا کر رکھ لیا تم نے اسے۔ اب اپنی عمر کے مطابق تھوڑی سی آزادی اس کا حق ہے۔ تم مجھے بتاؤ، میری بٹیا! کیا چاہیے تمہیں، سب دلوادوں گا۔"

صاحب کو ماہین کی اب تک کی عمر کی سعادت مندی پر ناز تھا۔ اور پھر یہ اعتماد بھی اپنی جگہ تھا کہ ان کی دی ذرا سی آزادی سے وہ کوئی ناجائز فائدہ نہیں اٹھائے گی۔

یہ وہ زمانہ تھا جب صاحب کو ملک کی نئی حکومت کے تحت بننے والی اسمبلی میں خصوصی مشیر کے طور پر منتخب کرلیا گیا تھا۔ صاحب نئی ذمہ داریوں میں مصروف رہتے تھے اور عہدے کے تقاضے پورے کرنے میں بیگم صاحبہ کا دھیان بھی گھر اور مینو کے معاملات سے ذرا ہٹنے لگا تھا۔

اکثر ہی دونوں کا اسلام آباد آنا جانا اور وہاں رہنا لگا رہتا۔ اور مینو بٹیا پڑھائی کی وجہ سے گھر پر رہتیں۔ ایسے میں اس وقتی جدائی کے بدلے دونوں میاں بیوی مینو کو خوش کرنے کے لیے اس کے لیے قیمتی تحائف سے لدے پھندے واپس آتے۔

"بہت بڑی ذمہ داری آجاتی ہے مجھ پر بیگم صاحبہ! آپ کی عدم موجودگی کے دوران، رات بھر نیند نہیں آتی یقین جانیے۔"

دبے لفظوں میں کبھی فاطمہ مریم کہنا بھی چاہتیں تو بیگم صاحبہ ٹال جاتیں۔

"آپ پر خود سے بڑھ کر اعتماد ہے مجھے فاطمہ مریم! اور خود مینو بھی اب بچی تو نہیں رہی نا، جو کسی چیز کے لیے تنگ کرے گی آپ کو۔ دیکھیے تو، ماشاء اللہ اپنی عمر کی بچیوں سے زیادہ سمجھ دار، صابر اور ذہین ہے ہماری بٹی۔"

بیگم صاحبہ ماں تھیں شاید اسی لیے مینو انہیں وہی پرانی معصوم اور انجان لڑکی دکھتی تھی۔ جبکہ فاطمہ مریم کی تجربہ کار نظریں کچھ اور دیکھ رہی تھیں۔ ماں باپ کی اکثر اور کبھی کبھار طویل عدم موجودگی میں وہ کھل کر دوستوں کے ساتھ باہر جانے، سیر سپاٹے کرنے اور ہوٹلنگ میں مشغول رہنے لگی تھی۔ اکثر فاطمہ مریم اسے رات گئے تک اپنے کورس کی کتابیں پڑھنے کے بجائے انگریزی رومانوی ناول پڑھنے میں مگن دیکھتی تھیں۔ ایسے ناول جو وہ ہمیشہ کی طرح اپنے بابا کی لائبریری سے لاکر نہیں پڑھتی تھی بلکہ اپنے دوستوں سے مستعار لاتی تھی۔

فاطمہ مریم انگریزی زبان سے تقریباً نابلد تھیں مگر ان ناولوں کے سرورق دیکھ کر ہی بھانپ جاتیں کہ وہ رومانوی ناول تھے۔ مینو کا پہننا اوڑھنا، اٹھنا بیٹھنا سب بدل رہا تھا۔ فاطمہ مریم یہ سب دیکھ رہی تھیں لیکن نجانے کیوں دل میں انہیں بھی بھروسا تھا کہ مینو کی تربیت اتنی اچھی اور مضبوط ہوچکی تھی کہ وہ اس تھوڑی بہت آزادی کا ناجائز فائدہ نہیں اٹھاسکتی تھی۔

لیکن جب وقت آیا تو نہ بیگم صاحبہ اور صاحب کا اعتماد کسی کام آیا نہ ہی فاطمہ مریم کا بھروسا۔

مینو سیکنڈ ائیر میں تھی۔ جب اس نے صاحب اور بیگم صاحبہ کے سامنے انکشاف کیا تھا کہ وہ 'تم' سے محبت کرتی تھی اور اسے اس کے ساتھ شادی کرنا تھی۔

یہ اتنی غیر متوقع اور ان سوچی بات تھی کہ ایسا لگتا تھا اس گھر میں موجود ہر ذی روح حتیٰ کہ وہاں لگے درخت

اور پودے بھی اپنے پتوں اور پھلوں سمیت ساکت رہ گئے تھے۔
"تمہاری عمر ایسی باتیں کرنے کی نہیں ہے۔"
بیگم صاحبہ ان سب سے زیادہ مضبوط دل کی مالک تھیں شاید اسی لیے انہوں نے ہی سب سے پہلے اپنے حواس پر قابو پاتے ہوئے کہا تھا۔
"ایسی باتیں کرنے کی بھی کوئی عمر ہوتی ہے کیا؟" وہ ہنس کر بولی تھی۔ ایسی باتیں تو کبھی بھی کی جاسکتی ہیں۔"
اس کے اس جملے نے فاطمہ مریم کو کسی انہونی کا احساس دلایا تھا مگر صاحب اور بیگم صاحبہ اس جھٹکے سے سنبھلنے کے بعد بھی کسی مغالطے میں مبتلا رہے تھے۔
"بے وقوف اور نادان ہے، نجانے اس لڑکے نے کیا سبز باغ دکھائے ہیں کہ پیچھے لگ گئی ہے۔"
انہوں نے پیار لاڈ، ناراضی، سختی، ڈراوا، دھمکی، غصہ ہر حربہ آزما کر دیکھ لیا جو کسی طرح بچی سنبھل جائے لیکن وہ تھی اور اس کی ایک ہی رٹ کہ اسے "ٹم" یعنی تیمور امتیاز نامی لڑکے سے ہر حال میں شادی کرنی تھی۔
"اچھا!" ہار کر بیگم صاحبہ نے وقتی ہتھیار ڈالنے کی کوشش کی تھی۔ "ابھی تو تم دونوں پڑھ رہے ہو۔ پڑھائی مکمل کرلو، اسے کیریئر بنانے دو۔ پھر ہم وعدہ کرتے ہیں کہ ضرور اس معاملے پر سوچیں گے۔"
"کہاں کی بات کررہی ہیں۔" اس نے ہاتھ لہراتے ہوئے جیسے ماں کا تمسخر اڑایا تھا۔ "اتنا تو ٹائم ہی نہیں ہے ہمارے پاس۔"
"کیا مطلب؟" بیگم صاحبہ بری طرح چونکی تھیں۔
"ٹم واپس جارہا ہے۔ اس کے ماں باپ اس کی کزن سے اس کی شادی کرنا چاہتے ہیں۔ خدا جانے کیا آفت آگئی ہے ان پر۔ اسے بلاوے پر بلاوا دیے جارہے ہیں۔ اس کے ابا نے کہا ہے کہ وہ فوراً پڑھائی چھوڑ کر واپس آجائے۔ خود نہیں آیا تو وہ یہاں آجائیں گے اسے لینے۔"
"لیکن کیوں؟" بیگم صاحبہ نے حیرت سے پوچھا تھا۔
"یہ نہیں پتا۔" وہ ہونٹ بھینچتے ہوئے بولی تھی۔
"تو اس کے ماں باپ تو اس کی شادی کررہے ہیں وہ بھی اس کی کزن سے۔ وہ تم سے کیسے شادی کرسکتا ہے؟"
"کرسکتا ہے نا، کیوں نہیں کرسکتا۔ وہ کہتا ہے کہ میں آپ کو اور بابا کو راضی کرلوں وہ آج ہی مجھ سے شادی کرنے کو تیار ہے۔"
"دماغ خراب ہے تمہارا۔ آج ہی شادی۔"
بیگم صاحبہ جلال میں آگئی تھیں۔ ان سے ٹھیک سے بولا بھی نہیں جارہا تھا۔
"خدا جانے یہ لڑکا کون ہے، کون نہیں۔ اس کا آگا پیچھا، خاندان، طبقہ کچھ بھی تو نہیں جانتے ہم۔"
چند دنوں کے اندر بیگم صاحبہ منہ پر آئی بیٹی کے سلسلے میں اپنی لاپروائی سے آگاہ تو ہوچکی تھیں لیکن اس کے اس جن کو قابو کیسے کرنا ہے۔ یہ سمجھ میں نہیں آرہا تھا
اس کے لیے ہزار ہا ترکیب سوچ چکی تھیں۔ یہ اور بات کہ ان کی کوئی بھی ترکیب کام نہیں آئی تھی۔ ڈانٹ ڈپٹ، غصہ یہاں تک کہ دو چار ہاتھ جڑ دینے پر بھی مینو نہیں ٹلی تھی۔ گھر کے اندر اس کے کمرے میں قید کردینا بھی اسے اپنی بات سے ہٹا نہیں سکا تھا۔
"مرجاؤں گی اپنی بات سے نہیں ٹلوں گی۔"
اس نے صاف الفاظ میں کہا تھا۔
"مرجاؤ، تمہاری بات نہیں مانی جائے گی۔"
بیگم صاحبہ بھی ضد میں آچکی تھیں۔
"اچھا رکو، ذرا صبر کرو۔" یہاں صاحب آگے بڑھے تھے۔ "میں خود بات کرتا ہوں، اس سے سمجھاتا ہوں۔ سمجھ جائے گی۔" سدا کے نرم دل صاحب جو بیٹی کے باپ کم، دوست زیادہ تھے۔ انہوں نے صدمے کی کیفیت سے نکلتے ہوئے کہا تھا۔
"اسے گھر پر بلاؤ، میں اس سے ملنا چاہتا

ہوں۔"

انہوں نے نجانے کیا حل سوچا تھا جو اس لڑکے کو گھر پر بلا لیا تھا۔ فاطمہ مریم اس کی آمد پر دونوں کے لیے چائے لے کر گئیں تو دیکھا وہ پہلے سے بھی زیادہ بڑا دکھنے لگا تھا۔ کالج کے ڈسپلن کے برعکس اس کے بال بڑھے ہوئے تھے اور ڈاڑھی مونچھیں بھی۔

"کچھ اپنے بارے میں بتاؤ گے۔ اپنے والدین اور خاندان کے بارے میں۔" صاحب پوچھ رہے تھے۔

"گوجرانوالہ سے تعلق ہے میرا۔" وہ صاحب کے سامنے ٹانگ پر ٹانگ چڑھا کر بیٹھا تھا۔

"والد صاحب کیا کرتے ہیں تمہارے۔"

صاحب پر یقیناً اس کا انداز نشست گراں گزر رہا تھا مگر وہ تحمل سے بات کر رہے تھے۔

"باربر ہیں، مردوں کے ہیئر کٹنگ اسپیشلسٹ۔"

"کیا!" صاحب کے ہاتھ میں پکڑے کپ سے چائے چھلک گئی تھی۔ "کیا بتایا تم نے؟"

"جو آپ نے سنا وہی۔" وہ پر اعتماد لہجے میں کہہ رہا تھا۔

"حجام ہیں تمہارے والد، یہی کہا نا تم نے۔" صاحب کے لہجے میں ابھی بس بے یقینی تھی۔

"جی۔ خاندانی پیشہ ہے یہ ان کا۔"

"حجام کا بیٹا اتنے بڑے اسکول میں کیسے پہنچ گیا؟" بے اختیار ان کے منہ سے سوال نکلا تھا۔

"کیوں، حجام کے سینے میں دل نہیں ہوتا کیا۔" وہ تیز لہجے میں بولا تھا۔ "کیا اس کا دل نہیں چاہ سکتا کہ وہ اپنے بیٹے کو اچھے اسکول، اچھے کالج میں پڑھائے۔"

صاحب اس سوال کا جواب نہیں دے پائے تھے۔

"ذہین تھا میں۔ بورڈ میں ٹاپ کیا تھا میں نے۔ سفارش نہیں، میری محنت کام آئی تھی۔ اسکالر شپ پر پڑھ رہا تھا میں یہاں۔" فاطمہ مریم چائے سرو کرنے کے بعد کمرے کے دروازے کے پیچھے کھڑی سن رہی تھیں۔

"تھا سے کیا مطلب ہے۔ کیا ابھی نہیں پڑھ رہے؟" صاحب نے حیرت سے پوچھا۔

"نہیں۔" اس نے بلند آواز میں کہا تھا۔ "چھوڑ دیا ہے میں نے کالج۔"

"کیا وجہ بنی چھوڑ دینے کی؟"

"یہ بتانا ضروری نہیں سمجھتا میں۔" اس کا لہجہ گستاخ ہوا۔ "آپ البتہ مجھے یہ بتائیں کہ آپ کا کیا ارادہ ہے۔ میرے ساتھ مینو کی شادی کر رہے ہیں یا نہیں؟"

"نہیں۔" صاحب نے قطعیت سے انکار کیا تھا۔ "ہرگز نہیں۔ تم فوراً اور ابھی یہاں سے اٹھو اور اپنا راستہ ناپو۔ دوبارہ میں تمہیں یہاں آتے یا مینو سے ملتے نہ دیکھوں۔"

"یہ آپ کی خواہش ہی ہو سکتی ہے۔ میری مرضی نہیں۔" وہ اٹھتے ہوئے بولا تھا۔ "بہتر ہوتا آپ مجھے اچھا پروٹوکول دیتے، خیر آپ کی مرضی۔" وہ تیز قدموں سے چلتا باہر نکل گیا اور صاحب ساکت بیٹھے رہ گئے۔

"پھر اس کے بعد کی کہانی گزرنے میں طویل مگر دہرانے میں مختصر ہی رہی تھی۔"

فاطمہ مریم نے یاد کرتے ہوئے سوچا تھا۔ صاحب کا سمجھانا۔ غصہ، ناراضی وہاں سے دور بھیج دینے کی دھمکی کچھ بھی کام نہ آیا تھا اور اس "ٹم" سے صاحب کی اس ملاقات کے ٹھیک پندرہ دن بعد مینو بٹیا نے ٹم سے کورٹ میرج کر لی تھی۔ بس ذرا سی ہی تو نظر چوکی تھی ان کی اپنی اور بیگم صاحبہ کی نجانے کس پل وہ خاموشی سے گھر سے نکل کر اس لڑکے کے پاس پہنچ گئی تھی اور جب واپس آئی تو میرج سرٹیفکیٹ اس کے ہاتھ میں تھا۔

کیسا دل برداشتہ ہو گئی تھیں بیگم صاحبہ! انہوں نے ۔ ہمیشہ کے لیے اکلوتی بیٹی سے قطع تعلق کر لیا تھا۔

"مر گئیں تم ہمارے لیے اور ہم تمہارے لیے۔ میں زندگی میں دوبارہ تمہاری شکل نہیں دیکھنا چاہوں گی۔" انہوں نے اسے اپنا فیصلہ سنا دیا تھا۔

"اور آپ؟" بیٹی نے باپ کی طرف دیکھا تھا۔ "آپ کیا سلوک کریں گے میرے ساتھ؟"

اور صاحب تو ٹھہرے سدا کے بیگم صاحبہ کے دیوانے، ان کے ہر لفظ کو حرف آخر سمجھنے والے۔ ان کے اس فیصلے سے بغاوت کیسے کر سکتے تھے۔ یوں مینو بٹیا، ماں باپ کی محبت اور ماں باپ کا بنایا راج پاٹ سب چھوڑ کر اس لڑکے کے ساتھ نجانے کہاں چلی گئیں۔

"حجام کا بیٹا، فاطمہ مریم! اس نے محبت بھی کی تو کس سے۔ حجام کے بیٹے سے، بیگم صاحبہ کو یہ صدمہ ہی دل کا روگ لگا گیا تھا۔ ہمیں ہمیشہ کے لیے چھوڑ کر گئی بھی تو کس کی خاطر، ہیئر کٹنگ سیلون والے کے بیٹے کے لیے۔"

وہ روتی جاتی تھیں اور زانو پر ہاتھ مارتے ہوئے اپنا دکھ کہے جاتی تھیں۔

اٹھارہ ساڑھے اٹھارہ سال گزرے تھے فاطمہ مریم کو بیگم صاحبہ کے ساتھ رہتے اور اتنے سالوں میں وہ پہلے کی طرح جوان ہی دکھتی تھیں۔ گزرتے وقت نے ذرا سا بھی اثر ان پر نہیں چھوڑا تھا اور مینو بٹیا کی طرف سے ملنے والے صدمے نے انہیں جیسے دنوں میں بوڑھا کر دیا تھا۔

پہلے پہل کبھی خاموش کبھی با آواز بلند آنسو بہاتے رہنے کے بعد ان پر ایک مستقل خاموشی چھا گئی تھی۔ بعد کے سالوں میں فاطمہ مریم نے انہیں بہت کم بولتے سنا۔

خاندانی، سماجی زندگی سب کچھ چھوڑ چھاڑ بس وہ گھر کی ہو کر رہ گئی تھیں۔ قیمتی اور دیدہ زیب ملبوسات سے بھری الماری خالی کر کے سب کپڑے غریبوں میں بانٹ دیے اور خود سادہ لباس میں ملبوس رہنے لگی تھیں۔ زندگی کا ہر شوق ختم ہو گیا تھا۔

ہاں گھر میں سب کے لیے ایک ہی حکم تھا۔ "مینو کا نام کوئی نہیں لے گا۔ اس کا ذکر کبھی نہیں چھڑے گا۔ سب یوں سمجھیں جیسے وہ مر گئی۔"

اور ایسا ہی ہوا تھا۔ ایک وقت ایسا بھی آیا تھا جب کون مینو، کہاں مینو جیسے سوال بے معنی ہو گئے تھے۔ ایسا لگتا تھا اس گھر میں اس کا وجود بھی تھا ہی نہیں تھا۔ اور صاحب کیسے ویران اور خالی سے ہو گئے تھے بیگم صاحبہ سے محبت نبھاتے نبھاتے۔ انہوں نے کئی بار انہیں مینو بٹیا کے کمرے میں بیٹھ کر وہاں موجود اس کی چیزوں اور تصویروں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے روتے دیکھا تھا۔ بیگم صاحبہ سے چھپ کر پہروں باہر ٹہلتے ہوئے اسے یاد کرتے دیکھا تھا لیکن بیگم صاحبہ کو دیے قول کا اتنا پاس تھا کہ وہ کہاں گئی۔ کہاں رہ رہی تھی۔ کس حال میں تھی۔ سب اختیار ہوتے ہوئے بھی کبھی مڑ کر اس کی طرف جانے کا نام نہیں لیا تھا۔

کتنی ہی بہاریں، خزائیں، برساتیں اور سردیاں گزر گئیں اس مینو کے بغیر جس کے نام کی مالا دن، رات، صبح و شام اس گھر میں جپی جاتی رہی تھی۔ خود "فاطمہ مریم" جو اپنی بے اولادی اور بیوگی کے بعد بے آسرا ہو کر "آیا گیری" کرنے نکلی تھیں جن کی اس گھر میں آمد بھی مینو بٹیا کی۔ وجہ سے ممکن ہوئی لیکن ان ساڑھے اٹھارہ سالوں میں جو مینو کی وجہ سے اس گھر میں گزرے تھے یہ گھر، اس کے مکین اور خود وہ بھی ایک دوسرے سے اتنے مانوس ہو چکے تھے کہ مینو کے چلے جانے کے بعد جب بیگم صاحبہ نے گھریلو ملازمین کی چھانٹی شروع کی تو فاطمہ مریم سے صاف کہہ دیا تھا کہ وہ اس گھر سے کہیں اور نہیں جائیں گی۔

اپنی بیماری اور پیہم غم کی کیفیت کے باعث وہ جانتی تھیں کہ گھریلو امور اور ان کا انتظام اور انصرام وہ خود نہیں دیکھ سکتی تھیں۔ یوں فاطمہ مریم مینو بٹیا کی گورنس سے اٹھ کر گھر کی منتظم کے عہدے پر ترقی پا گئیں۔

گزرتے وقت کے ساتھ گھر کے کئی اور ملازموں کی چھٹی کرا دی گئی تھی۔ مستقل ملازموں میں سے فاطمہ مریم اور بہادر بخش ہی بچے تھے۔ بہادر بخش جو مینو بٹیا کے ڈرائیور کے طور پر ملازم ہوا تھا اس کے جانے کے بعد صاحب اور بیگم کا ڈرائیور بن گیا تھا۔

باقی دونوں ڈرائیوروں کو فارغ کر دیا گیا تھا۔

مالی خورشید، مہتر جارج اور مہترانی سیریکا کو یہاں نوکری کرتے ہوئے چند سال ہی گزرے تھے اور ان تینوں میں سے کسی کو بھی مینو بٹیا کی کہانی کے بارے میں کچھ معلوم نہیں تھا۔ ہاں وہ تینوں اس روز چونکے تو ضرور ہوں گے جب "ٹم" کے ساتھ کورٹ میرج کرنے اور گھر چھوڑ دینے کے دس سال بعد "مینو بٹیا" اچانک کہیں سے واپس اپنے گھر آ گئی تھیں۔ اس کے ساتھ اس کی آٹھ سالہ بیٹی مناہل بھی تھی۔ ہو بہو اپنی ماں کی کاپی۔

اس روز انہیں یہاں دیکھ کر کوئی اور تو کیا میں خود بھی پہلے سکتے میں آ گئی تھی اور جو سکتے کی کیفیت سے نکلی تو کیسے میرے ہاتھ پاؤں کانپنے لگے تھے۔ دل چاہا تھا کہ جو گزری، سب بھلا کر اسے سینے سے لگا لوں۔ ان کا منہ سر چوموں اور اس سے پوچھوں کہ کہاں ۔۔ گئی تھیں مینو بٹیا، بالکل ویسے ہی جیسے بھی اسکول سے واپسی پر دیر سویر ہو جانے پر پوچھا کرتی تھی۔ لیکن میں کون تھی اور میری حیثیت کیا تھی مینو کی اپنی سگی ماں نے انہیں دیکھ کر نہ تو حیرت کا اظہار کیا نہ ہی خوشی کا۔ نہ وہ سکتے میں آئیں نہ ہی ان کے ہاتھ پیر کانپے جو بولیں تو صرف اتنا بولی۔

"تم سے کہا تھا نا کہ جب اپنی جذباتی محبت کے انجام سے دوچار ہو جاؤ تو کبھی ادھر کا رخ کرنے کا نہ سوچنا۔ اس گھر میں میرے اور اپنے باپ کے دل میں کبھی اپنے لیے جگہ نہ پاؤ گی۔"

ایسا سپاٹ لہجہ، ایسا صاف جواب۔ ایسا پتھر دل، فاطمہ مریم سب دیکھ کر اور سن کر کچھ بھی نہ کر پائی تھیں۔ بہادر بخش کی طرف بے بسی سے دیکھنے کے سوا۔

"کہا تھا نا، ہمارے لیے تم اور تمہارے لیے ہم اسی روز مر گئے تھے۔" بیگم صاحبہ مینو بٹیا پر اور ان کی بیٹی پر نظر ڈالے بغیر خلا میں دیکھتے ہوئے بے تاثر لہجے میں کہہ رہی تھیں۔

"اب تو نجانے کتنی برسیاں گزر چکی ہوں گی ہماری اموات کی۔"

"یاد تھا، یاد ہے۔" جواب میں مینو بٹیا نے کہا تھا۔ "بس یہ ہی سننے کو دل چاہتا تھا جو آپ کہہ رہی ہیں۔" وہ اپنی بیٹی کا ہاتھ پکڑ کر اٹھتے ہوئے بولی تھیں۔ اور جس خاموشی سے آئی تھیں، اسی خاموشی سے واپس چلی گئیں۔

"اور صاحب کمرے کے دروازے پر ساکت کھڑے اسے جاتے ہوئے بس دیکھتے ہی رہ گئے تھے۔"

"کیسے صبر نہ کر لوں فاطمہ مریم! کیسے دل پر پتھر نہ رکھ لوں۔"

اس کے جانے کے بعد فاطمہ مریم کے رونے کی آواز سن کر بیگم صاحبہ نے اسی سپاٹ لہجے میں اسی طرح خلا میں دیکھتے ہوئے کہا تھا۔

"جب یاد کرتی ہوں کہ اپنے ہر اٹھتے قدم پر بسم اللہ بسم اللہ کہنے والے۔ اپنی خاطر جان تک لٹا دینے والے، اپنی خوشیوں کے انتظام کے لیے پاگلوں کی طرح دنیا کھنگال دینے والے ماں باپ کے جذبات کو اس نے ایک گستاخ، نا ہنجار، کم مایہ اور آوارہ لڑکے کی خاطر ٹھوکر مار دی تو آپ کیا جانیں۔ دل ایک بار نہیں بار بار اس کی فاتحہ پڑھ لیتا ہے۔ ایسی اولاد کے لیے پھر سے نہال ہونے اور اس کی خوشیوں کے اہتمام کی خاطر لٹ جانے کا پھر سے حوصلہ نہیں کر پاتی ہیں۔ اس نے جو کیا اس کا انجام کل بھی مجھے معلوم تھا۔ آج سامنے آ گیا نا، یہ زندگی، یہ راستہ اس کا انتخاب تھا سو اس کو اسی پر چلنا ہے۔ اسی کو بھگتنا ہے۔"

"لیکن وہ...... آپ نے ان کا حال نہیں دیکھا۔ کیسی، کمزور، بیمار اور بے سرو سامان تھیں وہ۔ ایسا لگ رہا تھا ان کے اوپر دس سال نہیں دس صدیاں گزر گئی ہوں۔"

فاطمہ مریم کہنا چاہتی تھیں لیکن کہہ نہیں پائی تھیں کیونکہ وہ جانتی تھیں کہ اس گھر میں بیگم صاحبہ کا کہا ہی حرف آخر ہوتا۔ انہوں نے ایک بار پھر بے بسی سے صاحب کی طرف دیکھا تو وہ اس روز پہلے سے بھی زیادہ بے چین، اداس اور لٹے ہوئے نظر آ رہے تھے۔

اس کے بعد بہادر بخش ہی تھا جو چپکے چپکے انہیں بتایا کرتا تھا کہ "مینو بٹیا" واپس اسی وادی میں آبسی ہیں۔ "نوکری مل گئی ہے انہیں اپنے ہی اسکول میں۔"
"وہ کیسے؟" فاطمہ مریم چونکی تھیں۔ "ان کی تو تعلیم بھی نامکمل رہ گئی تھی۔"
"اللہ جانے۔" بہادر بخش خود بھی حیران تھا۔ "لیکن میں انہیں اسکول وین میں بیٹھے ادھر آتے جاتے دیکھتا رہتا ہوں۔"
پھر پتا چلا کہ وہ اسکول کے بورڈنگ ہاؤس میں شفٹ ہوگئی تھیں۔ ان کی بیٹی بھی اسی اسکول میں پڑھ رہی تھی۔
تین سال بعد فاطمہ مریم نے انہیں بیگم صاحبہ کے انتقال پر دیکھا تھا۔ سفید بڑی سی چادر میں چہرہ چھپائے وہ دس سے پندرہ منٹ یہاں رکی تھیں اور جنازہ اٹھائے جانے سے پہلے ہی رخصت ہوگئی تھیں۔ بیگم صاحبہ کے انتقال کے دو سال بعد وہ کبھی کبھار یونہی گھر میں آنے لگی تھیں، یہ اجازت یقیناً انہیں صاحب نے ہی دی ہوگی کہاں، کب اور کیسے یہ کسی کو معلوم نہیں تھا۔
وہ مختصر وقت کے لیے آتیں، باپ کے ساتھ رسمی گفتگو کرتیں اور واپس چلی جاتیں۔
"صاحب جو بیگم صاحبہ کے بعد اتنے اکیلے اتنے اداس رہنے لگے تھے شاید ابھی تک بیگم صاحبہ کو دیا قول نبھا رہے تھے۔"
"مینو بٹیا اس گھر میں واپس نہیں آسکتیں، یہ کم ہے کہ انہوں نے اسے کبھی کبھار گھر میں آنے کی اجازت دے دی ہے۔"
یہ بہادر تھا جو بڑا دانش مند بن کر انہیں سمجھاتا تھا۔
"اللہ جانے کس مشکل میں زندگی گزار رہی ہیں۔" فاطمہ مریم تاسف سے کہتیں۔ "اور اللہ جانے جس کے لیے سب کی محبت کو لات مار کر چل دی تھیں وہ کہاں گیا۔"
"سنا ہے کہ وہ مر گیا۔" بہادر بخش نے ایک بار چوروں کی طرح ادھر ادھر دیکھتے ہوئے سرگوشی کے انداز میں انہیں بتایا تھا اور فاطمہ مریم کے ردعمل کو دیکھ کر ہونٹوں پر انگلی رکھ کر انہیں خاموش رہنے کا اشارہ کیا تھا۔

"جو بات وہ آپس میں نہیں کرتے، وہ ہم کیسے کر سکتے ہیں۔" اس نے کہا تھا۔
"یہ تو ہے۔" فاطمہ مریم نے سوچا تھا۔ "ہم تو نوکر ہیں ہماری بلا جانے کیا ہوا، کیسے ہوا۔ میرے لیے تو بس اتنا ہی کافی ہے کہ وہ کبھی کبھار سہی شکل تو دکھا ہی جاتی ہیں۔ کبھی اپنی بیٹی کو بھی ساتھ لے آتی ہیں۔ مجھے تو جانو جینے کا بہانا سا مل گیا ہے۔" وہ اپنی نم آنکھیں چادر کے کونے سے خشک کرتے ہوئے سوچتیں۔
اور اب پچھلے سال آٹھ مہینے سے وہ بورڈنگ ہاؤس چھوڑ کر ایک ایسی جگہ چھوٹا سا گھر لے کر رہ رہی تھیں جہاں سے جارج اور سبیکا کا گھر زیادہ دور نہیں تھا۔ وہ جگہ جہاں سے اپنی پہلی والی زندگی میں شاید گزری بھی نہ ہوں۔
انہیں اس غم نے آلیا تھا اور اس روز یہی غم تھا جو موسم کی پہلی برف باری دیکھ کر مزید گہرا ہوتے ہوئے انہیں ایک بار پھر سے سب یاد دلا گیا تھا۔

☆☆☆

اپنے بالوں کو جوڑے کی شکل میں باندھتے ہوئے بیڈروم اور کچن کے درمیان موجود لاؤنج نما کمرے میں سے گزرتے ہوئے اس نے دیوار گیر شیشے کے قریب کھڑی مناہل کو دیکھا، اس کے ہاتھ میں کافی کا کپ تھا اور وہ غالباً اردگرد موجود مکانوں کی، برف سے ڈھکی چھتوں کا نظارہ کر رہی تھی، جو دور تک نظر آرہی تھیں۔
"یہ کمرا بہت سرد ہے، تم یہاں کیا کر رہی ہو۔" اس نے رک کر پوچھا۔
"اس گھر میں کون سا کمرہ ایسا ہے جو سرد نہیں ہے۔" مناہل نے گردن موڑ کر اس کی طرف دیکھا۔ "بلکہ کہنا تو یہ چاہیے کہ اس گھر میں کل کمرے ہی کتنے ہیں، گنتی کے بس تین اور وہ بھی ایسے اجڑے اور بے سروسامان کہ کیا کہوں۔"
"کچھ کہنے کی ضرورت ہی نہیں، جو ہے اسی پر گزارا کرنا سیکھو۔" وہ مناہل کے طنزیہ انداز سے ذرا سا بھی متاثر نہ ہوتے ہوئے کہہ رہی تھی۔
"ضرور سیکھ جاتی اگر آپ کی طرح روبوٹ کا

روپ دھار سکتی تو۔" وہ خالی کپ چھوٹی تپائی پر رکھتے ہوئے بولی۔ "ویسے اس شیشے کے آگے آپ نے پردے کی جگہ جو ٹاٹ نما کپڑا ٹانگ رکھا تھا۔ وہ کہاں گیا، اس کے ہونے سے سردی کا احساس ذرا سا کم ہی ہو جاتا تھا۔"

"میلا ہو رہا تھا، دھونے کے لیے اتارا ہے۔" وہ کچن کی طرف بڑھ گئی۔

"حیرت ہے، ان حالات میں بھی آپ کو میلے، اجلے کی فکر رہتی ہے۔" مناہل اس کے پیچھے آ گئی۔

"ہاں۔" وہ مختصر جواب دے کر اپنے لیے چائے بنانے لگی۔

"میری تو خیر یونہی گزر گئی، آپ تو اتنی آسائشوں کی عادی تھیں۔ آپ کو برا تو فیل ہوتا ہوگا یوں رہتے ہوئے۔" مناہل اس کے قریب آ کر کھڑی ہوئی۔

"جواب نہیں دیں گی میری بات کا۔" ماہین کی خاموشی پر اس نے پوچھا۔

"کتنی بار یہ سوال کرو گی تم؟" ماہین نے پتی ساس پین میں ڈالتے ہوئے کہا۔ "جتنی بار بھی کرو گی میرا جواب وہی ہوگا جو میں ہمیشہ دیتی ہوں۔"

"آپ کو برا فیل نہیں ہوتا، آپ عادی ہو چکی ہیں وغیرہ وغیرہ۔" وہ ہنس دی۔

"آپ کو پتا ہے، حالات سے ہارا ہوا ہر شخص ایسی ہی باتیں کرتا ہے۔"

"مگر میں تو حالات سے ہاری ہوئی نہیں ہوں، میں انہیں فیس کر رہی ہوں اور فائٹ بھی کر رہی ہوں۔" ماہین نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

"اچھا!" مناہل مسکرائی۔ "اور میں کیا کر رہی ہوں بھلا؟ آپ کا صبر آزمانے کے سوا۔"

"ایک بات بتاؤں مناہل!" ماہین کچھ دیر تک سلیب پر ہتھیلیاں رکھے خود کو کمپوز کرنے کی کوشش کے بعد اس کی طرف مڑی۔ "تمہاری عمر کم ہے اور باتیں بہت بڑی اور اتنی بڑی باتیں وقت سے پہلے کر لینے کا کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ انسان اپنے حصے کی باتیں وقت سے پہلے کر لیتا ہے اور ان باتوں سے کچھ نکلتا بھی نہیں۔"

"اور میں بھی آپ کو ایک بات بتاؤں۔" مناہل نے فوری جواب دیا۔ "میرے جیسے لوگوں کے لیے عمر اور زندگی کے سالوں کی گنتی بے معنی سی بات ہے۔" اس نے ماہین کی طرف دیکھا۔

"میرے جیسے مطلب ایسے لوگ جن کی زندگیاں میری طرح گزری ہوتی ہیں۔ ایک سال میں سمجھیں دو سالوں جتنی زندگی گزرتی ہے ان کی۔"

ماہین نے سر جھکا اور واپس چائے کی طرف مڑ گئی۔ وہ مناہل کی بات پر لاجواب نہیں ہوئی تھی بلکہ ہمیشہ کی طرح اس سوچ میں پڑ گئی تھی کہ وہ کہاں اتنی مصروف رہی تھی جو اسے پتا ہی نہیں چلا تھا کہ اس کی بیٹی اتنی تیزی سے زندگی کے بھید اور فلسفے سمجھنے لگی تھی، حالات کی سختی میں کیا اتنی طاقت ہوتی ہے کہ ہر حقیقت کے مفہوم سے روشناس کروانے لگتی ہے۔

"ہاں ہوتی تو ہے۔" اس سہ پہر کے سب کاموں سے فارغ ہو کر نہانے کے بعد خود کو گرم کپڑوں کے انبار تلے چھپا کر ایک راڈ والے ہیٹر کے پاس بیٹھ کر اس نے تسلیم کیا تھا "خود اپنے آپ کو دیکھ لو، تینتیس سال کی عمر میں پچپن سال جتنی عورت کا تجربہ اور رویے لیے زندگی گزارے چلی جا رہی ہو، حالات کی سختی نے زندگی کے سارے بھید اور فلسفے کتنے کم وقت میں سمجھا دیے ہیں، نہیں، حالانکہ زندگی جب پہلی بار تم سے دو دو ہاتھ کرنے سامنے آئی تھی اس وقت تم ایک انجان، بے پرواہ اور بے نیاز لڑکی تھیں جو کالج کے دوسرے سال میں پڑھ رہی تھی اور یہ مناہل اس نے تو ہوش سنبھالتے ہی زندگی کے حقائق کو اپنے روبرو دیکھا، اس سے بڑھ کر وقت اور حالات کے فلسفے کو کون سمجھ سکتا ہے۔

"جب ہی تو یہ ایسے سوال کرتی ہے جب ہی تو یہ مجھ سے یوں مخاطب ہوتی ہے جیسے وقت سے پہلے عمر گزار لینے پر مجبور ہونے میں سارا قصور میرا ہو۔ غلط تو ویسے وہ اس میں بھی نہیں، قصور تو میرا ہی ہے، بھگتنا

اس کو بھی پڑ رہا ہے۔"
اس نے ہونٹ بھینچے اور ہمیشہ کی طرح خود کو مناہل کی مجرم قرار دیتے ہوئے اسے اس کی خودسری اور گستاخی سے بھرپور گفتگو سے بری الذمہ کر دیا۔
"جو انسان اپنے لیے صحیح فیصلہ نہ کر سکے، اسے کسی دوسرے کو جج کرنے کا کوئی حق نہیں ہوتا۔

☆☆☆

یہ ہی بات اس نے تابندہ سے بھی کہی تھی جو ایک سہ پہر اس سے ملنے کے لیے اس کے گھر آئی تھی۔"
"یوں خود کو ہر چیز کے لیے مجرم قرار دے کر تم اپنے ساتھ زیادتی کر رہی ہو ماہین۔"
تابندہ جو اس کی زندگی کی کہانی سے اچھی طرح واقف تھی، اس کی بات سے متفق نہ ہوتے ہوئے بولی تھی۔
"میرے خیال میں ہر انسان غلطی کا پتلا ہوتا ہے اور اسے اس کی غلطیوں پر معافی کا حق ملنا چاہیے۔ تم ناسمجھی اور انجان پن میں ایک غلطی کر بیٹھیں اور تم نے اس کی سزا بھی بھگت لی، تمہارے والدین کو تمہیں معاف کر دینا چاہیے تھا، تم سے اتنے برس ناراض رہنے کا حق وہ استعمال کر چکے تھے، اس کے بعد تمہیں معاف کر دینے کا تمہارا حق انہیں دینا چاہیے تھا۔"
"تم نہیں جانتیں، میں نے کس بری طرح انہیں ہرٹ کیا تھا، خود سے وابستہ ان کی خوشیوں کا خون کر کے میں ان کے گھر سے نکل گئی تھی۔ میں نے ان کے ساتھ بہت برا کیا، بہت ہی برا۔" ماہین کی آواز بھیگنے لگی۔
"دیکھو ماہین!" تابندہ نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ "اگر قانون فطرت یہ ہے کہ ہر غلط کو زوال سے ضرور دوچار ہونا ہے تو قانون فطرت یہ بھی تو ہے کہ غلطیاں چھوڑ گناہوں کی معافی بھی مل سکتی ہے۔"
"اس کے لیے توبہ ضروری ہے۔"
"کیا تم نے توبہ نہیں کی، کیا تم اعتراف نہیں کرتی ہو کہ تم نے جو کیا وہ غلط کیا۔"
"مجھے اعتراف کرنے کا موقع دیا ہی نہیں گیا۔ جب میں یہ اعتراف کرنے ان کے سامنے گئی تو انہوں نے مجھے یاد دلایا کہ وہ میرے لیے مر چکے ہیں۔"
"اللہ تو ایسا نہیں کرتا، اس کے سامنے جا کر جب بھی اعتراف گناہ کے بعد معافی کے طلب گار ہو وہ معاف کر دیتا ہے، یہ میرا ذاتی تجربہ ہے۔" ماہین نے نظر اٹھا کر تابندہ کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں اپنی بات کا یقین جھلک رہا تھا۔
"تم اللہ کی بات کر رہی ہو اور میں انسانوں کی۔" اس نے نیچی آواز میں کہا۔
"اللہ موقع دیتا ہے، انسان نہیں...... ہے نا۔" تابندہ مسکرائی۔ "تو پھر اس کے سامنے اعتراف کرو اور اسی سے معافی کی طلب گار ہو جو موقع دیتا ہے۔ انسانوں کو جانے دو، انسان تو ہر دم دوسروں کی زندگی کٹھن کرنے کی ترکیب سوچنے میں لگے رہتے ہیں۔ اور جب تمہارے دل کو اطمینان ہو جائے کہ اللہ نے تمہاری معافی کی درخواست قبول کر لی ہے تو خدارا خود کو الزام دینا چھوڑ دینا، تم نے اپنے کیے کی جو سزا بھگتنی تھی وہ بھگت چکی ہو بلکہ شاید ابھی بھی بھگت رہی ہو کب تک اپنے ساتھ سیلف بلیمنگ گیم کھیلتی رہو گی۔"
"میں مناہل کی بات کر رہی ہوں، جو وہ بھگت رہی ہے۔ اس کی ذمہ دار بھی تو میں ہوں۔"
"اس کی ذمہ دار اس کی قسمت کے ساتھ ساتھ اس کا باپ بھی ہے۔" تابندہ کے لہجے میں تیزی آئی۔ "اسے کس نے کہا تھا وہ جس ایڈونچر کے قابل نہیں تھا، وہ کر گزرے۔ کیوں بھگا لے گیا وہ تمہیں اپنے ہیئر کٹنگ سیلون اور پکوان سینٹر چلانے والے باپ کے گھر۔"
"وہ مجھے وہاں نہیں لے جانا چاہتا تھا بلکہ خود رخصت ہو کر میرے بابا کے گھر بس جانا چاہتا تھا۔" ماہین نے درستی کی۔
"اچھا تو پھر جب تمہارے بابا نے انکار کر دیا تھا تو مان جاتا کہ اس کی نیت کیا تھی۔ تم سے کورٹ میرج کرنے کیوں چلا گیا۔ ایسی دھوکا بازی سے تو بے وفا کہلانا زیادہ بہتر ہوتا۔"
"اس کا خیال تھا کہ کورٹ میرج کا سن کر

اس کو بھی پڑ رہا ہے۔"
اس نے ہونٹ بھینچے اور ہمیشہ کی طرح خود کو مناہل کی مجرم قرار دیتے ہوئے اسے اس کی خود سری اور گستاخی سے بھرپور گفتگو سے بری الذمہ کر دیا۔
"جو انسان اپنے لیے صحیح فیصلہ نہ کر سکے، اسے کسی دوسرے کو جج کرنے کا کوئی حق نہیں ہوتا۔

☆☆☆

یہ ہی بات اس نے تابندہ سے بھی کہی تھی جو ایک سہ پہر اس سے ملنے کے لیے اس کے گھر آئی تھی۔"
"یوں خود کو ہر چیز کے لیے مجرم قرار دے کر تم اپنے ساتھ زیادتی کر رہی ہو ماہین۔"
تابندہ جو اس کی زندگی کی کہانی سے اچھی طرح واقف تھی، اس کی بات سے متفق نہ ہوتے ہوئے بولی تھی۔
"میرے خیال میں ہر انسان غلطی کا پتلا ہوتا ہے اور اسے اس کی غلطیوں پر معافی کا حق ملنا چاہیے۔ تم نا سمجھی اور انجان پن میں ایک غلطی کر بیٹھیں اور تم نے اس کی سزا بھی بھگت لی، تمہارے والدین کو تمہیں معاف کر دینا چاہیے تھا، تم سے اتنے برس ناراض رہنے کا حق وہ استعمال کر چکے تھے، اس کے بعد تمہیں معاف کر دینے کا تمہارا حق انہیں دینا چاہیے تھا۔"
"تم نہیں جانتیں، میں نے کس بری طرح انہیں ہرٹ کیا تھا، خود سے وابستہ ان کی خوشیوں کا خون کر کے میں ان کے گھر سے نکل گئی تھی۔ میں نے ان کے ساتھ بہت برا کیا، بہت ہی برا۔" ماہین کی آواز بھیگنے لگی۔
"دیکھو ماہین!" تابندہ نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ "اگر قانون فطرت یہ ہے کہ ہر غلط کو زوال سے ضرور دوچار ہونا ہے تو قانون فطرت یہ بھی تو ہے کہ غلطیاں چھوڑ گناہوں کی معافی بھی مل سکتی ہے۔"
"اس کے لیے توبہ ضروری ہے۔"
"کیا تم نے توبہ نہیں کی، کیا تم اعتراف نہیں کرتی ہو کہ تم نے جو کیا وہ غلط کیا۔"
"مجھے اعتراف کرنے کا موقع دیا ہی نہیں گیا۔ جب میں یہ اعتراف کرنے ان کے سامنے گئی تو انہوں نے مجھے یاد دلایا کہ وہ میرے لیے مر چکے ہیں۔"
"اللہ تو ایسا نہیں کرتا، اس کے سامنے جا کر جب بھی اعتراف گناہ کے بعد معافی کے طلب گار ہو وہ معاف کر دیتا ہے، یہ میرا ذاتی تجربہ ہے۔" ماہین نے نظر اٹھا کر تابندہ کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں اپنی بات کا یقین جھلک رہا تھا۔
"تم اللہ کی بات کر رہی ہو اور میں انسانوں کی۔" اس نے نیچی آواز میں کہا۔
"اللہ موقع دیتا ہے، انسان نہیں...... ہے نا۔" تابندہ مسکرائی۔ "تو پھر اس کے سامنے اعتراف کرو اور اسی سے معافی کی طلب گار ہو جو موقع دیتا ہے۔ انسانوں کو جانے دو، انسان تو ہر دم دوسروں کی زندگی کٹھن کرنے کی ترکیب سوچنے میں لگے رہتے ہیں۔ اور جب تمہارے دل کو اطمینان ہو جائے کہ اللہ نے تمہاری معافی کی درخواست قبول کر لی ہے تو خدارا خود کو الزام دینا چھوڑ دینا، تم نے اپنے کیے کی جو سزا بھگتنی تھی وہ بھگت چکی ہو بلکہ شاید ابھی بھی بھگت رہی ہو کب تک اپنے ساتھ سیلف بلیمنگ گیم کھیلتی رہو گی۔"
"میں مناہل کی بات کر رہی ہوں، جو وہ بھگت رہی ہے۔ اس کی ذمہ دار بھی تو میں ہوں۔"
"اس کی ذمہ دار اس کی قسمت کے ساتھ ساتھ اس کا باپ بھی ہے۔" تابندہ کے لہجے میں تیزی آئی۔ "اسے کس نے کہا تھا وہ جس ایڈونچر کے قابل نہیں تھا، وہ کر گزرے۔ کیوں بھگا لے گیا وہ تمہیں اپنے ہیئر کٹنگ سیلون اور پکوان سینٹر چلانے والے باپ کے گھر۔"
"وہ مجھے وہاں نہیں لے جانا چاہتا تھا بلکہ خود رخصت ہو کر میرے بابا کے گھر بس جانا چاہتا تھا۔" ماہین نے درستی کی۔
"اچھا تو پھر جب تمہارے بابا نے انکار کر دیا تھا تو مان جاتا کہ اس کی نیت کیا تھی۔ تم سے کورٹ میرج کرنے کیوں چلا گیا۔ ایسی دھوکا بازی سے تو بے وفا کہلانا زیادہ بہتر ہوتا۔"
"اس کا خیال تھا کہ کورٹ میرج کا سن کر

میرے ماں باپ کو اپنی عزت کی فکر پڑ جائے گی اور وہ اسے قبول کرلیں گے۔"

"واہ کیا پلان تھا اس چکر باز کا۔ اصل میں نا، اس نے تمہیں بتایا بھی ان کے گھر میں رہنے کے لیے تھا۔ تم مانو گی نہیں لیکن وہ تھا ہی بدنیت، محبت وحبت اسے تم سے کوئی نہیں تھی۔" تابندہ نے اسے اس تلخ حقیقت سے واقف کراتے ہوئے کہا جسے خود اپنے سامنے تسلیم کرتے ہوئے اسے ہمیشہ بہت تکلیف ہوتی تھی۔

"میری سمجھ میں ویسے آج تک یہ نہیں آیا کہ تمہیں اس میں اچھا کیا لگا تھا؟" تابندہ نے کئی بار کا کیا سوال ایک بار پھر دہرایا۔

"وہ۔" ماہین نے بتانا چاہا۔

"ہاں یاد ہے۔" تابندہ نے ہاتھ اٹھا کر اسے خاموش کراتے ہوئے کہا۔ "وہ بہت چارمنگ تھا، ہر فن مولا تھا محفل لوٹ لینے کا فن جانتا تھا، تم پر چیپ رومینٹک ناولز کا اثر تھا اس نے تمہیں چارم کرلیا اور تم مسحور ہوگئیں۔ یہ ہی خلاصہ ہے نا اس سارے قصے کا۔"

"ہاں۔" ماہین نے گہرا سانس لیتے ہوئے اپنا سر کرسی کی پشت سے ٹکالیا۔

"اور تم نے ماں باپ سے بغاوت کی تو میری جان اس ساری کہانی میں تم دونوں برابر کے قصوروار تھے، سزا صرف تمہیں کیوں ملی۔"

"شاید سزا وہ بھی کاٹتا لیکن وہ مر ہی گیا، اب موت سے کوئی لڑائی تو نہیں نا۔"

"قسمت سے بھی کوئی لڑائی نہیں پھر یہ بھی جان لو۔ تمہاری قسمت میں جو لکھا تھا تم نے پالیا اور مناہل کی قسمت میں بھی یہ ہی لکھا تھا۔ جو وہ گزار رہی ہے۔ اس سارے میں اسے تو شکر گزار ہونا چاہیے کہ شروع سے اب تک اسے سپورٹ کرنے کے لیے تم اس کے لیے موجود ہو۔ جو تم سہہ رہی ہو اور کر رہی ہو، وہ اسی کے لیے تو ہے، تمہارے لیے تو کوئی اتنا بھی نہیں ہے۔"

ماہین کے پاس تابندہ کی کسی بات کا کوئی جواب نہیں تھا۔

"بس تو پھر شاباش اب اس گلٹ سے باہر نکل آؤ کہ زندگی کی ہر بری چیز کی ذمہ دار تم ہو۔ یہ ذمہ داری تمہارے اس تیمور عرف ٹم پر بھی عائد ہوتی ہے اور مجھ سے پوچھو تو تمہارے پیرنٹس پر بھی...... کسی نے بھی تمہارے ساتھ اچھا نہیں کیا۔ سب نے تمہیں اکیلے بھگتنے کے لیے چھوڑ دیا اور اب یہ مناہل یہ بھی تمہارے ساتھ ٹھیک نہیں کر رہی۔ اس کے کان بھی کھینچے جانے چاہئیں اور تم اللہ کا واسطہ ہے اب موو آن کرو۔ انسانوں سے غلطیاں ہو جاتی ہیں۔ انسان غلطیاں نہ کرے تو سیکھے کیسے، زندگی کے سبق پڑھنے کے لیے غلطیاں کرنی ہی پڑتی ہیں۔"

"تم نمکو کھاؤ گی، میں نے خود بنائی ہے۔" ماہین نے اٹھتے ہوئے کہا۔

"ہاں۔ ضرور کھاؤں گی اور مجھے تمہیں یہ بھی بتانا تھا کہ میں نے چند بچے اکٹھے کیے ہیں جو تم سے ٹیوشن لینے کے لیے گھر آنے پر تیار ہیں۔ گورنمنٹ اسکول کے بچے ہیں اور دو بچے پرائیویٹ اسکولز کے بھی ہیں، تم اپنا ٹائم ٹیبل سیٹ کرلینا ان کے ساتھ۔"

"ارے یہ تو بہت اچھی خبر سنائی تم نے۔" وہ خوش ہوتے ہوئے بولی۔

"دنیا صرف ٹم، اس کے گھر والوں اور پتھر دل ماں باپ سے ہی نہیں بھری پڑی۔ دنیا میں تابندہ جیسے لوگ بھی ہوتے ہیں جو بنا کسی رشتے اور مطلب کے آپ کو سپورٹ بھی کرتے ہیں اور جینے کا حوصلہ بھی دیتے ہیں۔"

اس رات سونے کے لیے لیٹتے ہوئے اس نے سوچا تھا اور اس رات اسے بہت دنوں بعد اچھی نیند بھی آئی تھی۔

☆☆☆

موسم کی باقاعدہ برف باری کے آغاز کے ساتھ ہی وادی میں سیاحوں کا رش بڑھنے لگا تھا اور یہ رش اپنے ساتھ مہنگائی کا طوفان بھی لے کر آتا تھا۔ سیاحوں کی جیبیں خالی کرنے کے ساتھ مقامی لوگوں کے لیے بھی روزمرہ کی خریداری مشکل بنادی جاتی تھی۔ اس روز اسے گھر کی ضرورت کی عام اور معمولی

چیزیں بھی اب کم از کم ان دو تین مہینوں میں اصل قیمت سے دوگنی پر ہی دستیاب ہوں گی۔

وہ اپنے ساتھ اندازے سے رقم لائی تھی، جو کم پڑ گئی تھی اور آخر میں اسے نہ چاہتے ہوئے بھی اپنے سیلری اکاؤنٹ سے کچھ رقم نکلوانے کی ضرورت پڑ گئی تھی۔ اپنے بینک کے اے ٹی ایم سے رقم نکالنے کے لیے وہ پندرہ منٹ سے اس کے باہر کھڑی انتظار کر رہی تھی اور اس کی باری آنے کا نام نہیں لے رہی تھی۔

''اس سے پہلے کہ برف باری دوبارہ شروع ہو جائے۔ مجھے واپس گھر بھی پہنچنا ہے۔''

وہ قطار میں کھڑی سوچ رہی تھی۔

اور سامان کے یہ تھیلے اٹھا کر پیدل واپس گھر جانا بھی ایک کٹھن کام ہے۔ مناہل کو ساتھ آنے کے لیے کہا تھا تو وہ کروٹ بدل کر دوبارہ سے سو گئی تھی۔

''چلو کسی طرح راستے میں ٹھہر کر دم لیتے لیتے پہنچ ہی جاؤں گی۔'' اس کو کچھ عرصے سے خود سے باتیں کرنے کی عادت ہو چکی تھی، سو اسی میں مگن تھی۔

''میم! آپ کی باری ہے۔'' عقب سے آتی بھاری آواز نے اسے اس خود کلامی سے چونکایا تھا اس نے سامنے دیکھا۔ اس سے آگے کھڑے لوگ پیسے نکلوا کر جا چکے تھے اور اسے خبر بھی نہیں ہوئی تھی۔

''اوہ!'' اس نے شرمندہ ہوتے ہوئے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ میرون اونی ہائی نیک اور سرمئی جینز میں ملبوس وہ نوجوان اس کی طرف دیکھ کر ہلکا سا مسکرایا۔

''آپ کی باری میم!'' اس نے اے ٹی ایم کے دروازے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''ہاں!'' اس نے سر ہلایا اور جھک کر اپنے قدموں میں رکھے سامان کے تھیلے اٹھانے لگی۔ ''یہ یہیں رہنے دیجیے، میں یہاں ہی کھڑا ہوں آپ کیش ووڈرا کر کے لے آیئے، تب تک میں انہیں دیکھتا ہوں۔''

وہ کہہ رہا تھا۔ وہ اس لڑکے کو نہیں جانتی تھی، غالباً وہ مقامی نہیں تھا، اس چھوٹی سی وادی میں رہنے والے تقریباً سب ہی مقامی لوگ ایک دوسرے کو جانتے نہ بھی تھے تو چہروں سے ضرور واقف تھے۔

''ڈونٹ وری میم! میں آپ کا سامان لے کر بھاگوں گا نہیں۔'' وہ اس کی نظروں میں تذبذب دیکھ کر ہنسا تھا۔ ''پرامس۔ نہیں بھاگوں گا۔''

اس نے دونوں ہاتھ اٹھاتے ہوئے کہا تھا۔ ماہین نے ہولے سے سر ہلایا اور دروازہ کھول کر اندر چلی گئی۔ کارڈ مشین میں پھنسانے کے بعد اس نے پن کوڈ مانگے جانے پر کوڈ دبایا، اگلے لمحے مشین اسے بتا رہی تھی کہ اس کا لگایا کوڈ درست نہیں تھا۔ دوسری اور تیسری بار بھی کوڈ دبانے پر اسے یہ ہی پیغام وصول ہوا۔

الجھن اور اس احساس کے زیر اثر کہ باہر اس کے بعد اور لوگ بھی کھڑے اپنی باری کا انتظار کر رہے تھے۔ اس نے چوتھی بار کوڈ دبا دیا۔ اور اس کا کارڈ بلاک ہو چکا تھا۔

''اوہ نو۔'' اس نے با آواز بلند کہا۔ اور کارڈ نکالنے کی کوشش میں مصروف ہوئی۔ ساتھ ساتھ وہ کن اکھیوں سے شیشے سے پار بھی دیکھ رہی تھی جہاں لوگ کھڑے اس کے باہر نکلنے کا انتظار کر رہے تھے۔

''اب کیا کروں؟'' اس کے ہاتھ پیر پھولنے لگے، ایسا اتفاق اس کے ساتھ پہلی بار ہوا تھا اور وہ اس صورت حال کی توقع بھی نہیں کر رہی تھی۔ گھبرا کر اس نے دروازہ ذرا سا کھول کر باہر دیکھا۔ میرون ہائی نیک والا لڑکا ادھر ہی دیکھ رہا تھا۔

''کیا ہوا میم! سب ٹھیک ہے نا؟'' ماہین کے چہرے پر نظر پڑتے ہی شاید اسے کسی گڑبڑ کا احساس ہوا تھا۔

''وہ میرا کارڈ۔'' ماہین نے گردن گھما کر مشین کی طرف یوں دیکھا جیسے وہاں کارڈ کسی معجزے کے تحت نکل آیا ہو۔ ''میرا کارڈ پھنس گیا ہے۔ پتا نہیں ایسا کیسے ہو گیا۔ یہ مشین بتا رہی ہے کہ میرا پن کوڈ ٹھیک نہیں۔''

''نو وریز میم۔'' وہ آگے بڑھا اور مشین کے قریب جا کر صورت حال کا اندازہ کرنے لگا۔ ''آپ کا کارڈ بلاک ہو چکا ہے میم......!''

''اب کیا کروں؟'' وہ حقیقت میں گھبرا گئی تھی

حالانکہ اسے خود بھی علم تھا کہ ایسی صورت حال میں کیا کیا جانا چاہیے تھا۔

"کوئی مسئلہ نہیں، آپ ایسا کریں، آپ باہر آ جائیں۔" وہ نرمی سے بولا اور اس کے ساتھ خود بھی باہر آ گیا۔ اس نے ماہین کا سامان اٹھایا اور اپنے پیچھے کھڑے ہوئے شخص کو اندر جانے کا اشارہ کرتے ہوئے ماہین کو ساتھ لیے ایک سائیڈ پر جا کر کھڑا ہو گیا۔

"کوئی مسئلہ نہیں۔ آپ بس فوراً بینک کی ہیلپ لائن پر کال کیجیے اور اپنے اکاؤنٹ کی تفصیل بتا کر اپنا مسئلہ بتا دیجیے۔ کل تک آپ کا کارڈ ری کور ہو جائے گا۔"

"اوہ ہاں!" اس کے نرمی سے سمجھانے پر ماہین کو خود بھی یاد آ گیا کہ اس صورت حال میں اسے کیا کرنا تھا۔ اس نے بیگ سے فون نکال کر ہیلپ لائن پر کال کی اور وہاں سے موصول ہونے والی معلومات کے بعد اطمینان کا سانس لیتے ہوئے فون بند کیا۔

"سمجھ میں نہیں آ رہا میں اتنی کنفیوز کیوں ہو گئی۔" اس نے خفت بھرے انداز میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "اینی ویز، بہت شکریہ۔"

"میرا سامان۔" اس نے ہاتھ بڑھایا۔

"آپ کا سامان کافی وزنی ہے۔" وہ کہہ رہا تھا "میں آپ کی گاڑی میں رکھ دیتا ہوں۔"

"میرے پاس گاڑی نہیں ہے، مجھے پیدل چل کر واپس جانا ہے۔" ماہین نے کہا اور اپنا بڑھا ہوا ہاتھ تھوڑا اور آگے کیا۔

"اوہ!" وہ رکا۔ "یہ تو کافی وزنی بیگز ہیں۔ کیا میں آپ کی اتنی مدد کر سکتا ہوں کہ یہ سامان اٹھا کر آپ کے گھر تک پہنچا دوں۔"

ماہین نے تعجب اور بے یقینی سے اس کی طرف دیکھا۔ وہ اس کے لیے بالکل اجنبی لڑکا تھا۔ بھلا وہ کیوں راہ چلتے اس طرح اس کی مدد کرنا چاہ رہا تھا۔

"ارے نہیں۔ تمہیں خواہ مخواہ زحمت ہوگی۔ میں چلی جاؤں گی انہیں اٹھا کر۔ مجھے عادت ہے۔" اس نے سر ہلا کر انکار کرتے ہوئے کہا۔

"کوئی زحمت نہیں ہوگی۔ اتنا تو ہر انسان کا اخلاقی فرض ہونا چاہیے۔" وہ سامان کے تھیلے اٹھاتے ہوئے بولا۔ "چلیں۔"

ماہین نے اس کی طرف یوں دیکھا جیسے اس کی بات سمجھ میں نہ آئی ہو۔

"آپ صرف اتنا بتائیے کہ اوپر جانا ہے یا نیچے۔" اس نے اوپر جاتی ہوئی بل کھاتی سڑک کی طرف سر اٹھا کر دیکھنے کے بعد نظروں سے نیچے جاتی سڑک کی طرف اشارہ کیا۔

"نیچے۔" ماہین کو اس سر پھری حرکت کی سمجھ میں نہیں آئی۔ لیکن پھر بھی وہ اس کے پیچھے چل دی۔

"یہ بہت عجیب سی بات ہے۔" واپسی کے راستے پر چلتے ہوئے ماہین نے اس لڑکے سے کہا۔ "بنا کسی واقفیت کے تم میری مدد کرنے پر تل گئے...... اسٹرینج۔"

"بنا کسی واقفیت کے؟" اس نے ماہین کی طرف دیکھا۔ "میم! میں آپ کو بہت اچھی طرح جانتا ہوں جب ہی تو اجنبیت محسوس نہیں ہوئی اور میں نے بلاجھجک آپ کو مدد کی آفر کر دی۔"

"تم مجھے اچھی طرح جانتے ہو۔" ماہین نے حیرت سے کہا۔ "لیکن میں تو تمہیں بالکل بھی نہیں جانتی۔"

"جانیں گی بھی کیسے۔" وہ مسکرایا۔ "اگر کبھی پہلے آپ نے مجھے دیکھا بھی ہوگا تو اس وقت میں غالباً پندرہ یا سولہ سال کا بچہ ہوں گا اور اب میری عمر چوبیس سال ہے۔ میں بڑا ہو چکا ہوں جب کہ یہ درمیان کے سال آپ پر تو جیسے گزرے ہی نہیں۔ آپ آج بھی ویسی کی ویسی ہی ہیں۔ اسی لیے تو میں نے آپ کو فوراً پہچان لیا۔"

ماہین مزید حیران ہوتے ہوئے غور سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ پہلے کبھی اس نے یہ چہرہ دیکھ رکھا تھا اگر ہاں تو کب اور کہاں؟ وہ سوچ رہی تھی۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

نمرہ احمد

تالیہ نے نڈھال سے انداز میں پیچھے ٹیک لگائی۔ اس کی کمر کچرے کے ڈمپسٹر سے جا لگی۔

وہ دوزانو نڈھال سی بیٹھی نیم کھلی آنکھوں سے اس ہیولے کو دیکھے گئی جو اس کی طرف بڑھ رہا تھا۔

ہیشا اندھیرے میں تھی۔ چند قدم اور قریب آئی تو چہرہ مدھم سی روشنی میں آیا۔ اسٹریٹ پول کے باعث یہاں تھوڑی بہت روشنی تھی۔

تالیہ نے پلکیں جھپکائیں۔ دھند ہی دھند تھی جو ہر جگہ چھا رہی تھی۔ وہ گہرے گہرے سانس لینے لگی۔

یوں لگ رہا تھا جیسے کوئی اس کا گلا گھونٹ رہا ہو۔ نہ آواز نکلتی تھی نہ سانس۔

"تالیہ مراد... تم کبھی ہار نہیں مانتیں، ہے نا؟" ہیشا نے افسوس سے سر نفی میں ہلا کے کہا۔

تالیہ نے ہاتھ اٹھانے چاہے لیکن اس کی بند مٹھیاں پہلوؤں میں گری رہیں۔ اس کا جسم مفلوج ہو رہا تھا۔

ہیشا پنجوں کے بل اس کے سامنے بیٹھی۔ اس نے مانگ نکال کے ویٹرسز کی طرح بال جوڑے میں

انتالیسویں اور آخری قسط

باندھ رکھے تھے۔ وہ افسوس سے تالیہ کو دیکھ رہی تھی۔

"تو یہ سب تم نے اسٹیج کیا تھا۔ مجھے پکڑنے کے لیے۔ چچ۔" وہ دھیرے سے بولی۔ "مجھے آج تک کوئی نہیں پکڑ سکا۔ اور تم اس وقت مجھے پکڑنے کی حالت میں نہیں لگ رہیں۔ کیا ہوا ہے تمہیں؟" وہ غور سے پتلیاں سکوڑے اس کے چہرے کے رنگ دیکھ رہی تھی۔

تالیہ کی نظریں ییشا کے کندھے سے پھسلتی اس کے عقب میں جا رکیں۔ گلی کے دوسرے سرے پہ کوئی تھا۔ اندھیرے میں روشنی کا ایک ہیولہ۔

"یہ ذوالکفلی نے کیا ہے' ہے نا؟" وہ مدھم آواز میں افسوس سے کہنے لگی۔ "وہ اپنا مخصوص زہر بنا رہا تھا کچھ دن پہلے اور اسے سیاہی کے ساتھ ملا رہا تھا۔ میرا خیال تھا اپنے کسی ٹارگٹ کے لیے بنا رہا ہے۔ لیکن اپنی ہی اسٹوڈنٹ کے لیے؟ چچ چچ... تم موت کے قریب ہو تالیہ... مجھے افسوس ہے.. مجھے واقعی افسوس ہے..."

اس نے دھیرے سے تالیہ کی سرد پڑتی مٹھی پہ ہاتھ رکھا۔

"ایک کون وومن کو دوسری کون وومن کے ساتھ ہونا چاہیے... اس کے آخری وقت میں..." پھر ییشا نے گردن اٹھا کے افسوس سے اطراف میں دیکھا۔

"ایک تاریک گلی میں کسی کچرے کے ڈبے کے ساتھ موت... آج تم اس طرح مرو گی۔ کل میں اس طرح مروں گی۔ میرے اور تمہارے جیسے لوگوں کا یہی انجام ہوتا ہے' تالیہ۔ ہمیں اندھیرے نگل جاتے ہیں۔"

تالیہ کی نظریں گلی کے سرے پہ جمی تھیں۔ آنکھوں کے آگے دھند تھی۔ اس نے پلکیں جھپکائیں، دھند ہلکی ہوئی۔

بالآخر وہ اسے نظر آنے لگا۔ وہ سفید ہرن... وہ وہیں کھڑا تھا۔ اپنی بڑی بڑی سبز آنکھوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

"تمہیں اپنے اندھیرے قبول کر لینے چاہیے تھے۔ مگر نہیں تالیہ.. تمہیں روشنی چاہیے تھی۔ تمہیں رنگ چاہیے تھے۔ جبکہ ہمارا صرف ایک رنگ ہوتا ہے۔ اندھیرے کا رنگ۔ دیکھو روشنی نے تمہیں کیا دیا۔ ایک اندھیری گلی میں گمنام موت..."

وہ پنجوں کے بل بیٹھی افسوس سے کہہ رہی تھی۔ مگر تالیہ اسے نہیں دیکھ رہی تھی۔ وہ غزال کی آنکھوں میں دیکھ رہی تھی۔ اس کے دیکھتے ہی دیکھتے ننھے ہرن کی سبز آنکھیں پانی سے بھرتی گئیں۔

ہرن نے پلکیں جھپکائیں۔ آنسو اس کے چہرے پہ لڑھکے۔

تالیہ کو اپنے گال پہ گرتا گرم قطرہ محسوس ہوا تھا۔

"میں نہیں جانتی یہ کس چیز کے آنسو ہیں۔" ییشا نے انگلی کی پور پہ اس کے گال کا قطرہ اٹھایا۔

"یہ ذوالکفلی کا زہر ہے۔ تکلیف دیتا ہے.. مگر آئی ایم سوری... اس کا تریاق کسی کے پاس نہیں ہے۔"

سفید ہرن ابھی تک اسے دیکھ رہا تھا۔ تالیہ نے دیکھا' ہرن کے ہونٹوں سے دھیرے دھیرے سرخ قطرے ٹپکنے لگے تھے۔

"تمہارے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔" ییشا دھیمی آواز میں ملال سے کہہ رہی تھی۔ "تمہارے منہ سے خون نکلنا شروع ہو چکا ہے۔ میں تمہارے لیے ایک کام کر سکتی ہوں۔" کہتے ہوئے ییشا نے اس کی جیکٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالا اور اس کا موبائل نکالا۔ اس کو آن کیا۔ پھر تالیہ کے چہرے کے سامنے لا کے اسے ان لاک کیا۔ اب وہ اس پہ کوئی نمبر ملا رہی تھی۔

تالیہ ابھی تک اس گھائل غزال کو دیکھ رہی تھی۔ وہ اسے بھیگی آنکھوں سے دیکھتے ہوئے مڑ رہا تھا۔

اس کا دل بری طرح ڈوبا۔ وہ اسے روکنا چاہتی تھی۔ مگر نہ آواز نکلتی تھی نہ ہاتھ حرکت کرتے تھے۔

ییشا فون پہ کچھ کہہ رہی تھی۔ لیکن تالیہ سن نہیں پا

رہی تھی۔ وہ خوف سے اس غزال کو دیکھ رہی تھی۔ وہ کہاں جا رہا تھا؟ وہ تو اس کا گارڈین اینجل تھا؟ یا کیا وہ موت کا فرشتہ تھا؟ وہ اسے چھوڑ کے کیوں جا رہا تھا؟

بھیگی آنکھوں والا سفید غزال مڑ گیا۔ اس کے منہ سے نکلنے والے خون کے قطرے زمین پہ ننھے سے تالاب کی صورت جمع تھے۔

وہ مڑا تو تالیہ نے اسے پکارنے کے لیے لب کھولے لیکن اس کا جسم حرکت کرنے سے انکاری تھا۔

ہرن اب دور جا رہا تھا۔ اندھیری دھند میں تحلیل ہو رہا تھا۔ تالیہ نے پلکیں جھپکانی چاہیں لیکن اس کی پلکیں بھاری ہو رہی تھیں۔

سب ختم گیا تھا۔

اس کی ہیپی اینڈنگ اس دھند میں کھو گئی تھی....

☆☆☆

تاشہ...

وہ شہزادیوں جیسی تھی...

اور اس نے ایک غلام سے شادی کی تھی

اور اسے آزاد کر دیا تھا......

''چے تالیہ......آپ کتابیں نہیں پڑھتیں؟''

''کیا تمہیں وعدے نبھانے آتے ہیں؟''

''ہونہہ۔ اصلی فوجی ہونا نقلی شہزادی ہونے سے بہتر ہوتا ہے۔''

''تم میرے ساتھ رہو۔ مجھے تمہاری اور تمہیں میری ضرورت ہے۔''

''میں انسان نہیں ہوں کیا؟ میرے اندر سیل ڈلتے ہیں؟''

میں نے تم سے وعدہ کیا تھا کہ تمہیں وقت کی قید سے نکال لاؤں گا اور وعدے کبھی پرانے نہیں ہوتے۔''

''بڑے ہی کوئی ولن ہیں آپ کے بابا۔ وہی تو میں سوچ رہا تھا کہ آپ کس پہ گئی ہیں۔''

''میری خواہش ہے کہ تم میرے ساتھ ہوتیں اور ہم اس کتاب کو ایک ساتھ پڑھ سکتے۔''

''میں نے آپ کو اتنا عرصہ ماضی میں کیسے برداشت کیا تھا؟''

''جو تمہیں کرنا آتا ہے' وہ ہمیشہ تمہاری جان بچاتا رہے گا۔''

''یہ پہلی دفعہ نہیں ہے جو ایک شہزادی نے ایک گستاخ پہ تشدد کروایا ہو۔''

''جنگل ہمیشہ زندہ ہوتا ہے۔ جنگل سے جنگ نہیں کرتے۔''

''اتنے عیش سے رہنے والوں کا قیامت کے دن الگ سے حساب ہوگا۔''

''کبھی مجھ سے ملنے آؤ' حالم۔''

''چے تالیہ آپ بہت ذہین ہیں اور آپ جیسے ذہین لوگوں کو جانتی ہیں کہاں ہونا چاہیے؟ جیل میں۔''

''دل چاہتا ہے جو وہ چاہتا ہے۔''

''جو تمہیں کرنا آتا ہے' وہ ہمیشہ تمہاری جان بچاتا رہے گا۔''

''جو تمہیں کرنا آتا ہے وہ ہمیشہ...''

''جو تمہیں کرنا....''

تالیہ نے دھیرے سے آنکھیں کھولیں۔ پلکیں ابھی بھی بھاری تھیں لیکن وہ ان کو کھول سکتی تھی۔

نگاہوں کے سامنے سب کچھ سفید تھا۔

سفید چھت۔ سفید پردے۔ سفید لحاف جسے اوڑھے وہ لیٹی تھی۔

اس کی نظریں اپنے وجود پہ پھسلیں۔ اس کے ہاتھ کی پشت سے نالیاں جڑی تھیں۔ اور ان پہ سفید بینڈ ایج لگا تھا۔

اس نے دھیرے سے نظریں اٹھائیں۔ دھند غائب ہونے لگی۔ اس کا دماغ ابھی تک غنودگی میں تھا لیکن وہ اپنے ساتھ بیٹھے شخص کو پہچانتی تھی۔

''تالیہ'' وہ مسکرایا۔ وہ اس کے بیڈ کے ساتھ کرسی پہ بیٹھا تھا۔ اس کی طرف جھکے مسکرا کے اسے جاگتے دیکھ رہا تھا۔

''کیا یہ ایک خواب ہے؟'' وہ بے یقینی سے بولی۔ آواز ایسی تھی جیسے گلا خراب ہو۔

فاتح نے نفی میں سر ہلایا۔

''اونہوں۔ تم ہسپتال میں ہو اور تم ٹھیک ہو۔''

''نہیں۔'' کچھ غلط تھا۔ اس سارے منظر نامے کی سینس نہیں بنتی تھی۔

اس نے پریشانی سے اٹھ کے بیٹھنا چاہا لیکن فاتح نے اس کے کندھے پہ ہاتھ رکھ کے اسے روک دیا۔ اس میں اٹھنے کی سکت بھی نہیں تھی۔ یہ سب غیر حقیقی تھا۔

''تالیہ.. تم ٹھیک ہو۔''

''مگر... ییشا نے کہا تھا اس زہر کا کوئی تریاق نہیں ہے۔'' وہ پلکیں بار بار جھپکتی فاتح کو دیکھ رہی تھی۔

''کون سا زہر؟ تمہیں کسی زہر نے نہیں چھوا تھا۔ یہ فوڈ پوائزننگ تھی۔ تم نے کچھ غلط کھا لیا تھا۔''

تالیہ نے بے یقینی سے پلکیں جھپکائیں۔ یہ غلط تھا۔ سب غلط تھا۔ غیر حقیقی۔ خواب۔

''ییشا... وہ پکڑی گئی؟''

فاتح نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''سب ٹھیک ہو چکا ہے۔ سارے مسئلے حل ہو چکے ہیں۔''

تالیہ نے تکان سے سر تکیے پہ ڈال دیا۔ اس کا ذہن ایک دفعہ پھر غنودگی میں جانے لگا۔

''ییشا نے... ییشا نے اعتراف کر لیا؟ آپ کی کرسی اب خطرے میں نہیں ہے؟ آپ ابھی تک وزیراعظم ہیں؟'' وہ بے یقینی سے پوچھ رہی تھی۔

فاتح نے پھر سے اثبات میں سر ہلایا۔

''میں پردھان منتری ہوں۔ اور سب کچھ ٹھیک ہو چکا ہے۔ ہمارے حق میں۔''

''میں کتنی دیر سوتی رہی؟'' اس نے آنکھیں کھول کے گھڑی دیکھنی چاہی لیکن سفید کمرے میں گھڑی نہیں تھی۔ اس کمرے میں وقت کا کوئی حساب نہ تھا۔

''آج کون سا دن ہے؟'' اس کی پلکیں بھاری ہو رہی تھیں۔ وہ بڑبڑائی۔ ''صبح سوموار ہے نا... سوموار کو کچھ ہونا تھا..''

اس کا ذہن کام نہیں کر رہا تھا۔ کمرہ خوب روشن تھا۔ اتنا سفید روشن کہ آنکھیں چندھیا جاتی تھیں۔ اس سارے منظر نامے میں کچھ غلط تھا۔ ہر چیز کا ٹھیک ہو جانا غلط تھا۔

کیا یہ خواب تھا؟ یا وہ وہی دیکھ رہی تھی جو وہ دیکھنا چاہتی تھی؟

''تم...... سو جاؤ......'' فاتح اسے کہہ رہا تھا۔

اس نے آنکھیں بند کر دیں۔

کوئی اسے کہہ رہا تھا...... اس کے اندر کہ وہ جاگ جائے... اسے جاگنا ہے... کچھ غلط ہے.. لیکن اس کی آنکھیں بوجھل ہونے لگیں۔ ذہن ایک دفعہ پھر تاریکی میں ڈوب گیا۔

☆☆☆

اب کی بار اس کی آنکھ ایک جھٹکے سے کھلی۔ چند لمحے وہ چت لیٹی سانس لیتی رہی۔ پھر پلکیں جھپکائیں۔ چھت واضح ہوئی۔ یہ وہی چھت تھی جو اس نے پچھلی دفعہ جاگنے پہ دیکھی تھی۔ لیکن تب وہ سفید تھی۔

اب وہ مسٹرڈ رنگ کی تھی۔

اس کی نظریں نیچے پھسلیں۔ وہی کمرہ تھا لیکن دیواروں کا رنگ سرمئی تھا۔ پردے سبز پھولوں والے تھے۔ میزوں پہ پھول رکھے تھے، فائلیں رکھی تھیں۔ اس کے ہاتھ سے جڑی نالیوں میں سفید نہیں بلکہ رنگ دار مائع قطرہ قطرہ ٹپک رہا تھا۔

وہ چونک کے اٹھی۔ اس کی توانائی واپس آچکی تھی۔ ادھر ادھر ہاتھ مارا۔ ایک گھنٹی بج اٹھی۔ تالیہ نے بٹن سے اپنے بیڈ کو پیچھے سے اونچا کیا۔ پھر اپنے چہرے کو چھوا۔ وہ ٹھیک تھی۔ وہ حرکت کر سکتی تھی۔ اس کا جسم اب مفلوج نہیں تھا۔ پھر بھی دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔

دروازہ کھلا اور ایک میل نرس اندر داخل ہوا۔ ہاتھ میں فائل پکڑے وہ تالیہ کے سامنے آ کھڑا ہوا

اور مسکرا کے اسے دو پہر بخیر کہا۔ ''آپ جاگ گئیں۔ بالآخر۔''

''بالآخر؟'' وہ سکتے میں آ گئی۔ ''میں کتنی دیر سے بے ہوش تھی؟''

''اب تو ہم نے دنوں کا حساب رکھنا بھی چھوڑ دیا تھا' بچے تالیہ۔''

''یہ... یہ کون سا سال ہے؟'' اس کا سانس رک گیا تھا۔

''یہ 2030 ہے۔ آپ پچھلے نو سال سے کوما میں تھیں اور آج آپ جاگی ہیں۔''

وقت ایک لمحے کو تھم گیا۔

تالیہ مراد کا سانس رک گیا۔

اس کی ساری حسیات سن ہو گئیں۔

اسے لگا وہ اگلا سانس نہیں لے سکے گی۔ لیکن پھر اس نے بہ دقت سانس کھینچی۔

''کتنے پیسے دیے ہیں تمہیں داتن نے یہ مذاق کرنے کے لیے؟''

عقب میں قہقہہ بلند ہوا تو تالیہ کے ابرو بھنچ گئے۔ اس نے برہمی سے نرس کے پیچھے سے نکلتی داتن کو دیکھا۔

''لڑکی۔ تمہارے چہرے کے تاثرات ریکارڈ کرنے والے تھے۔''

وہ گردن پیچھے پھینک کے ہنستی ہوئی آگے آئی۔ نرس بھی چہرہ نیچے کر کے ہنسی روکتے ہوئے مڑ گیا۔

تالیہ اسے کھا جانے والی نظروں سے گھورے گئی۔

''ناٹ فنی۔ داتن۔ ناٹ فنی۔'' اس نے اپنے دل پہ ہاتھ رکھا جو ایک لمحے کے لیے اتنی بری طرح ڈوبا تھا کہ ابھی تک اس کی دھڑکن نارمل نہیں ہوئی تھی۔

''ریلیکس گرل۔ تم کل رات یہاں لائی گئی تھیں۔ اور ابھی اس بات کو پورا دن بھی نہیں گزرا۔''

''میری سمجھ میں آ گیا تھا۔'' تالیہ نے پیچھے ٹیک لگائی اور الجھے ہوئے انداز میں پردوں کو دیکھا۔ وہ سفید کیوں نہیں تھے؟

''کیا فاتح میرے ساتھ تھے؟ کس وقت؟''

''ہاں۔ وہ صبح تک یہیں تھے۔''

''تو وہ خواب نہیں تھا۔ لیکن یہ کمرہ سفید تھا۔'' وہ بڑبڑائی۔ ''یا میں وہی دیکھ رہی تھی جو میں دیکھنا چاہتی تھی۔''

''تم کیا دیکھنا چاہتی تھیں؟''

''میری ہیپی اینڈنگ جس کا رنگ سفید ہو۔ لیکن نہیں۔ سب کچھ اتنا سفید نہیں ہو سکتا جتنا مجھے دکھا تھا۔'' پھر اس نے سر جھٹکا اور داتن کو دیکھا۔

''خیر... ایشا کا بتاؤ... اس نے اعتراف کر لیا؟ اب تو اپوزیشن فاتح کو امپیچ نہیں کرے گی نا۔''

''ایشا؟'' داتن نے استفہامیہ انداز میں ابرو اٹھایا۔

''یہ مت کہنا اب کی بار تمہاری یادداشت کھو گئی ہے۔'' وہ چڑ گئی۔

''تالیہ.... ایشا کہاں ہے تمہیں پتا ہے؟''

اب کی دفعہ وہ واقعی سانس لینا بھول گئی۔

''داتن... داتن... ایشا میرے ساتھ تھی اس تاریک گلی میں... اس نے کسی کو فون کیا تھا... فاتح نے مجھے بتایا کہ وہ پکڑی گئی ہے اور سب ٹھیک ہو گیا ہے..''

''کیا فاتح نے تمہیں یہ بتایا یا تم نے وہ سنا جو تم سننا چاہتی تھی؟'' داتن نے گہری سانس لی اور اس کے ساتھ بیڈ پہ بیٹھی۔ پھر اس کا نالیوں میں جکڑا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیا۔

''تالیہ.... جب ایڈم وہاں گیا تو تم اس گلی میں تنہا تھیں۔ وہاں ایشا نہیں تھی۔ وہاں کوئی بھی نہیں تھا۔''

''نہیں۔'' وہ الجھتے ہوئے سیدھی ہوئی۔ کنپٹی پہ ہاتھ رکھا۔ اس کا سر پھر سے درد کرنے لگا تھا۔ ''وہ وہیں تھی۔ اس نے مسز شیلا کا نیکلیس چرایا تھا۔''

''وہ نیکلیس پولیس کو اس ڈمپسٹر سے مل گیا

ہے، جس کے ساتھ تم ملی تھیں۔"
"مگر..... میشا نے میرے فون سے کس کو کال کی تھی؟" اس نے سائیڈ ٹیبل پہ دھرا اپنا فون اٹھایا اور اسکرین کھولی۔
وہاں تمام کالز کا ریکارڈ موجود تھا۔ جس وقت کی وہ بات کر رہی تھی، اس وقت کسی کو کال نہیں کی گئی تھی۔ البتہ ایڈم کی بہت سی مسڈ کالز آئی ہوئی تھیں۔
"تالیہ... میشا وہاں نہیں تھی۔ ایڈم تمہارے لیے پریشان تھا کیونکہ تم فون نہیں اٹھا رہی تھیں۔ وہ تمہیں لینے آیا تو تم اس گلی میں بے ہوش ملیں۔ وہ تمہیں ہسپتال لے آیا۔ تمہیں سادہ سی فوڈ پوائزننگ ہوئی تھی۔"
"نہیں۔ یہ فوڈ پوائزننگ نہیں تھی۔ کچھ غلط ہے۔ میری حالت... ایسے... ایسے فوڈ پوائزننگ میں نہیں ہوتا۔" وہ بے چینی سے اپنے ہاتھ سے لگی نالیاں الٹ پلٹ کے دیکھنے لگی۔ پھر اس نے سائیڈ ٹیبل پہ دھری دواؤں کی ٹرے قریب کرنی چاہی تو داتن نے اسے روک دیا۔
"تالیہ... میری بات سنو... میشا کا خیال دل سے نکال دو۔ وہ غائب ہو چکی ہے۔"
"لیکن اگر میشا نہیں پکڑی گئی... اور اس نے اعتراف نہیں کیا تو فاتح کا عہدہ کیسے بچ گیا؟"
وہ الجھ کر کہتے ہوئے دوائیوں کو ٹٹول کے دیکھ رہی تھی۔
دوسری جانب خاموشی چھائی رہی تو تالیہ نے چونک کے گردن موڑی۔ داتن کی شکل دیکھ کے اس کا دل ڈوبا۔
"آج سوموار ہے۔ آج اپوزیشن نے ان کو امپیچ کرنا تھا۔ اگر میشا نہیں ملی تو...... تو......" اس کی نظریں دیوار پہ لگی ٹی وی اسکرین کی جانب اٹھیں۔ وہ تاریک تھی۔
"میں فاتح کو نہیں بچا سکی۔" اس کے لب بے یقینی سے پھڑپھڑائے۔ "داتن ٹی وی آن کرو۔"
"مگر تالیہ تم ابھی ریسٹ کرو... میں..."
"پلیز ٹی وی آن کرو۔" اس نے بے چینی سے داتن کا ہاتھ تھاما۔ آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگے۔ "انہوں نے کئی برس اپنے اس خواب کے لیے محنت کی ہے۔ مگر یہ سارے لوگ ان کے خلاف جمع ہو کے ان کو ہرانے جا رہے ہیں۔ اور میں کچھ نہیں کر سکی۔"
داتن چپ چاپ اٹھی اور ٹی وی آن کیا۔ اسکرین روشن ہوئی تو سامنے ہی نیوز دکھائی دے گئیں۔
پارلیمان کا منظر دکھایا جا رہا تھا۔ پردھان منتری اپنے ڈیسک کے پیچھے کھڑا کچھ کہہ رہا تھا اور سب خاموشی سے سن رہے تھے۔ نیچے چلتی پٹیاں یہ بتا رہی تھیں کہ پردھان منتری کا پیش کیا گیا تعلیمی بل منظور ہو گیا تھا۔ اور اب وہ بل قانون بن چکا تھا۔
اس کی تقریر جانے کب سے جاری تھی۔ تالیہ بنا پلکیں جھپکائے اسے دیکھے گئی۔
وہ گرے سوٹ میں ملبوس تھا۔ اس نے بال دائیں جانب کر کے جیل سے جما رکھے تھے۔ وہ ہاتھ میں کاغذ کا ایک ٹکڑا پکڑے سنجیدگی سے کہہ رہا تھا اور اس کی آواز ایوان کی اونچی دیواروں سے ٹکرا ٹکرا کے پلٹ رہی تھی۔
"جہاں مجھے اس بات کی خوشی ہے کہ میرے ممبران اسمبلی نے اس بل کو منظور کیا اور اسے قانون کا حصہ بنایا... وہاں مجھے اس بات کا افسوس بھی ہے کہ بہت سے ممبرز نے اس کے خلاف ووٹ دیا۔" وہ مائیک میں کہہ رہا تھا۔ تالیہ سانس روکے سنے گئی۔
"کیا یہ ممبرز اپنے بچوں کا سامنا نہیں کرتے؟ کیا یہ اپنے بچوں کو جواب دہ نہیں ہیں؟ ہم انسان سب سے زیادہ محنت اپنے بچوں کے لیے کرتے ہیں۔ کیا ہم ان کی تعلیم کے لیے یہ آپس کے اختلافات بھلا نہیں سکتے تھے؟ کیا اپنے چھوٹوں کے لیے ہم ذرا بڑے نہیں بن سکتے تھے؟"
وہ بول رہا تھا اور سب خاموشی سے سن رہے تھے۔ کچھ لوگ لاپرواہی سے آپس میں سرگوشیاں بھی

کر رہے تھے۔ صوفیہ رحمن کاغذات کا ایک پلندہ لیے ساتھ بیٹھے شخص کے ساتھ سر جوڑے کچھ کہہ رہی تھی۔

"یہ فاتح کی تقریر کے بعد امپیچ منٹ کی قرارداد پیش کرے گی۔" وہ اسکرین کو دیکھتے ہوئے بڑبڑائی۔ "یہ تیار ہو کے آئی ہے۔ اس کے پاس اتنے لوگ ہوں گے جو یہ قرارداد کامیاب کر سکیں۔"

"لیکن جن لوگوں نے فاتح کے بل کے حق میں ووٹ دیا ہے، وہی لوگ امپیچ منٹ کے حق میں ووٹ کریں گے کیا؟ ایک ہی وقت میں ایسے لوگ فاتح کے حق اور فاتح کے خلاف کیوں ووٹ کریں گے؟"

"کیونکہ تعلیمی بل اوپن بیلٹ کے طور پہ پیش ہوا تھا۔ اخلاقی مجبوری آڑے آ گئی۔" وہ اسکرین کو دیکھتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ "اور ان لوگوں کو دنیا دکھانے کو بل کے حق میں ووٹ دینا پڑا۔ امپیچ منٹ کا ووٹ سیکریٹ بیلٹ سے ہوگا۔ جس کی جہاں وفاداری ہوگی وہ وہیں ووٹ دے گا۔"

"مگر..."

"شش۔ چپ کرو۔ مجھے سننے دو۔"

اسکرین پہ نظر آتا فاتح کہہ رہا تھا۔

"اور میں یہ بھی جانتا ہوں کہ کچھ لوگوں نے تعلیمی بل کے حق میں ووٹ صرف اس لیے دیا ہے کیونکہ انہیں یقین ہے کہ وان فاتح کی وزارت عظمیٰ محفوظ ہے۔" وہ رکا۔ اب کے ہر شخص چونک کے اسے دھیان سے سننے لگا۔ فاتح نے گہری سانس اندر کھینچی۔

"چند دن پہلے میری ای میل لیکس والا معاملہ سامنے آیا تھا۔"

بہت سی سرگوشیاں بلند ہوئیں۔ یہ پہلی دفعہ تھی جب وان فاتح بنا سوال کے اس بات کا ذکر کر رہا تھا۔

"میں نے اس وقت یہ کہا تھا کہ جو بھی ذمہ دار ہوا اس کو سزا دی جائے گی۔ اس معاملے کی تحقیق کروائی جائے گی اور ہم نے ایسا ہی کیا۔ ہم نے اس کی پوری تحقیق کروائی اور اس میں ثابت یہ ہوا کہ..."

وہ رکا۔

یہ تقریر آسان نہیں تھی۔

"ثابت یہ ہوا کہ ان ای میل لیکس کا ذمہ دار صرف اور صرف وان فاتح تھا۔"

تالیہ نے نالیاں جڑا ہاتھ لبوں پہ رکھ لیا۔

"یہ میری غلطی تھی.. میری لاپرواہی تھی.... میری غیر ذمہ دارانہ حرکت تھی کہ میں ایک پرائیوٹ سرور استعمال کرتا رہا جبکہ مجھے یہ ای میلز حکومتی سرور پہ کرنی چاہیے تھیں۔ اسے میری لاپرواہی کہیں یا ٹیکنالوجی سے نابلد ہونا... لیکن اس سارے معاملے میں اگر کسی کا قصور ہے تو وہ میرا ہے۔"

ہال کو سانپ سونگھ چکا تھا۔ صوفیہ رحمن نے دھیرے سے کاغذوں کا پلندہ میز پہ رکھ دیا۔ سب گردنیں اس کی طرف موڑے اسے بولتے سن رہے تھے۔

"اور جناب اسپیکر... ہم انسانوں کی خامی یہ نہیں ہے کہ ہم غلط کام کر بیٹھتے ہیں بلکہ یہ ہے کہ ہم اپنی غلطیوں کی ذمہ داری قبول نہیں کرتے۔ غلطی کی ذمہ داری لینا ان لوگوں کا کام ہوتا ہے جو اپنے معاملات میں سچے ہوتے ہیں۔ ہم سب غلطیاں کرتے ہیں۔ میں چاہتا تو کسی بھی technicality کے پیچھے چھپ سکتا تھا۔ کوئی قانونی شق.. کوئی دھوکا... کسی اور پہ الزام.... کچھ بھی مجھے بچا سکتا تھا..."

فاتح کو بولتے دیکھتی اس کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔

"لیکن اگر میں ایسا کرتا تو یہ میں نہ ہوتا۔ یہ وان فاتح نہ ہوتا۔ وان فاتح ایسا نہیں ہے۔ وان فاتح کو یہ عہدہ عزیز ہے لیکن وہ اس لیے اس عہدے کے لیے لڑتا تھا تاکہ لوگوں کو یہ بتا سکے کہ سچ بولنا کتنا اہم ہے۔ اس نے اتنے عرصے ایمانداری سے کام اس لیے کیا تاکہ دوسروں کو انسپائر کر سکے۔ ہمیں کسی کون گیم، کسی ٹیکنیکلٹی، کسی قانونی شق کے پیچھے چھپ کے خود کو بچانے کی ضرورت نہ پڑے اگر ہمیں

سچ بولنا آتا ہو۔ صرف سچ ہمیں آزاد کر سکتا ہے اور صرف سچ ہمیں بچا سکتا ہے۔"

وہ نم آنکھوں سے مسکرا دی۔ ہسپتال کے اس کمرے میں اس وقت بالکل خاموشی چھائی تھی۔ فاتح کی آواز کے سوا وہاں کوئی آواز نہ تھی۔ تالیہ کے سانس لینے کی بھی نہیں۔

"میں اپنے آپ کو ایک بہت اچھا پردھان منتری تصور کرتا ہوں۔ میں نے کبھی اپنے ملک کو نقصان نہیں پہنچایا۔ میں نے ہمیشہ اپنے لوگوں کی بہتری کے لیے فیصلے کیے ہیں۔ میں جانتا ہوں کہ میرے لوگوں کو اس بات نے دکھ پہنچایا ہے کہ ان کے پردھان منتری کی معمولی غفلت ان کے لیے ہزیمت کا باعث بنی ہے۔ یہ میری غلطی ہے... اور میں اس غلطی کی ذمہ داری قبول کرتا ہوں... اس لیے میرا اخلاقی فرض ہے کہ میں اس کرسی سے سبکدوش ہو جاؤں۔"

اس کو معلوم تھا وہ کیا کہنے جا رہا ہے۔ وہ اس کے الفاظ اس کے ذہن سے پڑھ سکتی تھی۔ اسے اسی دن کا ڈر تھا لیکن جب یہ دن آیا تو وہ غم زدہ نہیں تھی۔ کم از کم اتنی نہیں جتنا اسے خوف تھا۔

"میں... وان فاتح بن رامزل۔ ملائیشیا کے پردھان منتری کی حیثیت سے اخلاقی وجوہات پہ استعفیٰ دیتا ہوں۔"

یہ کہتے ہوئے اس نے ایک پرنٹ شدہ کاغذ اٹھایا اور اپنی کرسی کے پیچھے سے نکلا۔

ممبران پارلیمان ایک دوسرے کو مڑ مڑ کے دیکھ رہے تھے۔ کسی نے زبان دانتوں تلے دے ڈالی۔ کسی نے ماتھے پہ ہاتھ رکھ کے سر جھکا دیا۔ وہ اب ڈیسک کے عقب سے نکل کے روش پہ چلتا اسپیکر کے ڈیسک کی طرف جا رہا تھا۔

اوپر گیلری میں بیٹھے افراد اپنی اپنی جگہوں سے اٹھ کے اسے دیکھ رہے تھے۔

اپنی نشست سے اسپیکر کی کرسی تک کی واک بہت طویل تھی۔ اس واک کو عبور کرنے کی ہمت کرنا آسان نہ تھا۔

وان فاتح متوازن قدم اٹھاتا اسپیکر کے چبوترے تک آیا۔ اس کے چہرے پہ ایک مغموم مسکراہٹ تھی۔

اس نے کاغذ اسپیکر کو دیا تو اسپیکر اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔

فاتح واپس پلٹ گیا۔

گیلری میں موجود افراد تالیاں بجانے لگے۔

کسی ایک نے پہلی تالی پیٹی اور وہ تالیاں جنگل کی آگ کی طرح پوری گیلری میں پھیل گئیں۔ فاتح اسی مغموم مسکراہٹ کے ساتھ اپنی ڈیسک تک واپس آ رہا تھا۔ اس نے ہاتھ اوپر اٹھا کے تالیاں بجاتے لوگوں کو ہلکا سا لہرایا اور اس روش کی طرف بڑھ گیا جو خارجی دروازے کی سمت جاتی تھی۔

ممبران پارلیمان بے اختیار ڈیسک بجانے لگے۔ لیکن ان کے ڈیسک کا شور کم تھا۔ گیلری میں بیٹھے عوام کی تالیاں ان پہ حاوی ہو گئیں۔

وہ اپنے اوپر لگے سارے داغ ایک اخلاقی جرأت سے دھو چکا تھا۔

لوگ کھڑے ہوئے اسی طرح تالیاں بجاتے رہے۔ کسی آنکھ میں آنسو تھے۔ کسی لب پہ مغموم مسکراہٹ تھی۔ کوئی پریشان تھا۔ کوئی اندر سے خوش تھا۔ لیکن ان سب تاثرات اور جذبات پہ تالیوں کی گونج حاوی ہو گئی۔

یہاں تک کہ وان فاتح پارلیمان کے دروازے سے باہر نکل گیا۔

صوفیہ رحمن نے آہستہ سے کاغذ تہہ کر کے ایک فائل میں رکھ دیا۔ وہ مسکرا کے اپنی ہیروں جڑی انگوٹھی پہ ہاتھ پھیرنے لگی۔ اس کے گروہ کے ایک دوسرے کی طرف جھکے سر واپس سیدھے ہو گئے۔

اسکرین کو دیکھتی تالیہ نم آنکھوں سے مسکرائی۔

"یہ لوگ وان فاتح کو کیا نکالیں گے۔ وہ خود انہیں اپنی زندگی سے نکال کے جا رہے ہیں۔"

آنسو اس کے گال پہ پھسل رہے تھے۔ وہ اتنی غم

زدہ نہیں تھی جتنا اس کو خوف تھا۔

☆☆☆

سری پردھانیہ کی دیواریں اس سہ پہر مغموم سی خاموشی میں ڈوبی تھیں۔ پردھان منتری کے آفس کے باہر موجود اسٹافرز ڈھیلے ڈھالے انداز میں اپنے کام نمٹا رہے تھے۔ بار بار نگاہیں اس پاور آفس کے دروازوں کی طرف بلند ہوتی تھیں جہاں وان فاتح کچھ دیر پہلے اندر گیا تھا۔

وہ سب جانتے تھے کہ وہ اسے اپنے آفس میں آخری دفعہ دیکھ رہے تھے۔ عجیب غیر یقینی صورتحال بن چکی تھی۔

آفس کے اندر فاتح اپنی میز کے پیچھے کھڑا تھا۔ میز پہ ایک باکس کھلا رکھا تھا جس میں وہ اپنی چیزیں ڈال رہا تھا۔ آریانہ کی تصویر کا فریم۔ جولیانہ اور سکندر کے فریم۔ اپنی فلیگ پن۔ ایک ننھا سا پودا۔ اپنا چائے کا مگ۔

سامنے کھڑا شاہدان اداسی سے اسے دیکھ رہا تھا۔

"داتو سری.... ہم آپ کو بہت مس کریں گے۔"

فاتح نے سر اٹھا کے اسے دیکھا۔ مسکرایا۔ پھر سر نیچے کر کے اپنا کام کرنے لگا۔

"ٹوئیٹر پہ لوگ ابھی سے ٹرینڈز ٹوئیٹ کر رہے ہیں کہ وان فاتح اپنا استعفیٰ واپس لے لیں۔ اور آپ نے..." شاہدان نے ایک نظر میز پہ رکھے دوسرے استعفیٰ کو دیکھا۔ "آپ نے پارٹی کی رکنیت تک سے استعفیٰ دے دیا ہے۔"

"میرے سیاست کرنے کے دن ختم ہو چکے ہیں' شاہدان۔" وہ اپنا لیپ ٹاپ اندر رکھتے ہوئے بولا۔ "میں نے اس کرسی پہ کئی سال حکومت کی اور یہ جان لیا کہ یہ مجھے خوشی نہیں دے سکتی۔"

"لیکن آپ اس کرسی پہ رہ کے بہت کچھ کر سکتے تھے۔"

"اپنے ملک کے لیے کوئی کام کرنے کے لیے اس کرسی کی ضرورت نہیں ہوتی۔ مجھے یہ بات سمجھنے میں ایک عمر بیت گئی ہے۔ میں اس کے بغیر بھی بہت کچھ کر سکتا ہوں۔"

وہ مڑا اور پیچھے بنے کیبنٹ تک گیا۔ پھر سیاہ کور والی فائلز کا پلندہ اٹھایا۔ شاہدان تیزی سے آگے بڑھا اور جلدی سے باقی فائلز اٹھائیں۔ پھر دونوں نے ان کو باکس میں ڈالا۔

"آپ اب پردھان منتری نہیں رہے۔ ان فائلز کا کیا کریں گے؟"

"میں اب بھی ایک وکیل ہوں۔ اور مجھے کوئی چیز اتنی خوشی نہیں دے سکتی جتنی ان بے گناہ قیدیوں کی رہائی دے گی۔ یہ کرسی بھی نہیں۔"

"آپ ان کیسز پہ کام کریں گے؟" شاہدان نے خوش گوار حیرت سے دیکھا۔ فاتح نے ڈبہ بند کرتے ہوئے مسکرا کے اثبات میں سر ہلایا۔

"استعفیٰ دینے سے پہلے میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ میں ایک این جی او بناؤں گا جس کے ذریعے میں ان بے گناہ لوگوں کو انصاف دلواؤں گا۔ میرے پاس پیسہ بھی ہے اور تعلقات بھی۔ مجھے امید ہے کہ میں اس معاملے میں بہت کچھ کر سکتا ہوں۔ لیکن اس کے لیے مجھے نیک نیت لوگ چاہیے ہیں جو میرے ساتھ چلیں۔"

وہ ڈھکن بند کر کے رکا اور کچھ سوچتے ہوئے شاہدان کو دیکھا۔

"تم نے یہ فائلز اکٹھی کی تھیں۔ تم سے زیادہ ان لوگوں کا غم کسی کو نہیں ہے۔ تم چاہو تو میرے ساتھ آ سکتے ہو۔ میرے اس کام کا حصہ بن سکتے ہو۔"

شاہدان چند لمحے کچھ بول نہ سکا۔ پھر ہچکچایا۔

"کیا میں سوچنے کا وقت لے سکتا ہوں؟"

فاتح نے اثبات میں سر ہلایا اور ڈبہ اٹھائے آگے بڑھ گیا۔

جس وقت وہ باہر کھڑی اپنی کار میں بیٹھ رہا تھا' شاہدان تیزی سے بھاگتا اس کے پاس آیا۔ فاتح دروازہ بند کر چکا تھا۔ اسے آتے دیکھ کے کھڑکی کا

شیشہ نیچے گرایا۔ پھر مسکرا کے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔
"تم نے شاید فیصلہ کرلیا ہے؟"
شاہدان نے آہستہ سے اثبات میں سر ہلایا۔
"داتو سری... میں.. بہت خوش ہوں کہ آپ ان کیسز پہ کام کر رہے ہیں۔ اور میں آپ کو بیسٹ آف لک کہوں گا۔ لیکن..." شاہدان نے گردن موڑ کے اپنے پیچھے کھڑی سری پردھانہ کی پرشکوہ عمارت کو بے چارگی سے دیکھا۔
"لیکن حکومتی عہدہ چھوڑنا آسان نہیں ہوتا۔" فاتح نے گہری سانس لی۔ "میں سمجھ سکتا ہوں شاہدان۔ تمہاری جگہ کوئی بھی ہوتا تو یہی فیصلہ کرتا۔"
"سوری.. داتو سری۔" شاہدان نے بے چارگی سے شانے اچکائے۔ "لیکن یہ جاب... اور اگلے وزیراعظم کے ساتھ کام کرنے کا موقع... اسے چھوڑنا ناممکن ہے۔"
فاتح نے مسکرا کے سر کو جنبش دی اور شیشہ اوپر کر لیا۔ اس کی کار آگے بڑھ گئی۔
سری پردھانہ کے تمام ملازمین اپنی اپنی کھڑکیوں سے پردھان منتری کو رخصت ہوتے دیکھ رہے تھے۔
گیٹ پہ موجود اہلکار سلیوٹ کر رہے تھے۔ کوئی سینے پہ ہاتھ رکھے تعظیم پیش کر رہا تھا۔
وہ قومی میک اور ماڈل کی بنی کار میں بالآخر چھ برس بعد اس محل سے رخصت ہو چکا تھا۔
☆☆☆
ہسپتال کا کمرہ مختلف رنگوں کا امتزاج لیے باہر سے آتی روشنی سے منور تھا۔ ٹی وی اسکرین پہ ایک ہی خبر بار بار دکھائی جا رہی تھی۔ اب تو نیوز کاسٹر کی آواز سے اکتا کے تالیہ نے اسکرین میوٹ کر رکھی تھی۔ خود وہ بیڈ پہ اٹھ کے بیٹھی تھی۔ بیڈ کے ساتھ جڑی ٹرے سامنے سیٹ کر رکھی تھی جس پہ کھانے کے برتن سجے تھے۔
وہ ابھی تک ہسپتال کے گاؤن میں ملبوس تھی۔
کھلے بال کانوں کے پیچھے اڑس رکھے تھے اور چہرہ کمزور ویران سا لگتا تھا۔ وہ بے توجہی سے سوپ کے چمچ بھر کے پی رہی تھی۔
دیوار کے ساتھ ایڈم کھڑا تھا۔ سینے پہ بازو لپیٹے دیوار سے ٹیک لگائے وہ گردن موڑے اسکرین کو دیکھ رہا تھا۔
"استعفیٰ دینے کے علاوہ بھی اس مسئلے کا حل نکالا جا سکتا تھا۔" وہ افسوس سے بولا تو تالیہ نے نظریں اٹھا کے اسے دیکھا۔
"وہ وان فاتح ہیں۔ ان کا ضمیر ایسے مطمئن نہ ہوتا۔"
"مگر انہوں نے کوئی جرم نہیں کیا تھا۔ وہ محض ایک غلطی تھی۔ اگر میں ان کی جگہ ہوتا تو ایسا نہ کرتا۔ اس سے زیادہ اچھا حل نکالتا۔"
"چلو کم از کم اب سارے ملک کے اینکرز ہر وقت یہ تو نہیں کہیں گے کہ اگر میں ان کی جگہ ہوتا تو یہ کرتا۔" وہ تلخی سے مسکرائی۔ "انہوں نے خود کو ہر چیز سے آزاد کرلیا ہے۔"
ایڈم نے چہرہ موڑ کے تالیہ کو غور سے دیکھا۔
"آپ کو افسوس نہیں ہے کہ انہوں نے خود کو اپنے خواب سے دور کرلیا؟"
"وان فاتح بھی بھی lounge lizard بن کے نہیں رہ سکتے۔ وہ ایک خواب سے دستبردار ہو کے دوسرے کے لیے جدوجہد شروع کر دیں گے۔ میں ان کو جانتی ہوں۔" پھر اس نے پیالہ پرے دھکیلا اور سوچتی نظروں سے ایڈم کو دیکھا۔
"جب تم میرے پاس اس تاریک گلی میں آئے تھے... تو کیا میشا وہاں نہیں تھی؟"
"میشا سے آبسیس ہونا چھوڑ دیجیے۔ وہ نہ اس گلی میں تھی نہ ہی شاید اس ملک میں ہو گی۔ وہ سب آپ کی ہیلوسنیشن تھی۔ جب میں وہاں آیا تو آپ تنہا تھیں اور خود سے بول رہی تھیں۔ اور آپ بار بار گلی کے سرے کو دیکھتی تھیں جیسے وہاں آپ کو کوئی اور نظر آرہا تھا۔"

تالیہ نے الجھ کے کنپٹی کو چھوا۔ "مگر میں کیسے بچ گئی؟ مجھے تو ذوالکفلی نے زہر دیا تھا۔"

"آپ کو کسی نے زہر نہیں دیا تھا۔ کچرے کے کین سے کسی گلی سڑی چیز کے فیوم اٹھ رہے تھے شاید۔ اسی سے آپ کی طبیعت خراب ہوئی۔ یا شاید کوئی غلط چیز کھانے سے فوڈ پوائزننگ۔"

"تو وہ ذوالکفلی کا جادو نہیں تھا؟" اس نے تکیے سے سر ٹکایا اور آنکھیں موند لیں۔

"نہیں چے تالیہ۔ وہ کوئی جادو نہیں تھا۔ اور وہ خط... وہ بے شک ذوالکفلی نے لکھا تھا لیکن اس سے آپ کو کوئی نقصان نہیں پہنچا۔"

"کیا ایشا پکڑی گئی؟ کہیں اور سے؟" وہ بند آنکھوں سے بولی۔

"نہیں۔ ہمارے پاس اس کے خلاف کوئی ثبوت بھی نہیں۔ اس کی تلاش کروانا وان فاتح کو بے عزت کرنے والی بات ہے۔ اور اب ویسے بھی وہ پردھان منتری نہیں رہے تو یہ کیس ٹھپ ہو جائے گا۔"

"اور ایشا کبھی پکڑی نہیں جائے گی۔" وہ آنکھیں موندے بڑبڑائی۔ "اور خدا کرے وہ میرے خوابوں اور تخیل میں آنا بھی چھوڑ دے۔"

"ایشا کو بھول جائیں۔ کچھ مجرم کبھی نہیں پکڑے جا سکتے۔ جب اس کا وقت آئے گا وہ حساب دے گی۔ کیا آپ کو ابھی تک سمجھ میں نہیں آیا کہ وقت کے انتقام بہترین ہوتے ہیں؟"

تالیہ خاموش رہی۔ ایسے لگا جیسے وہ سو گئی تھی۔

"چلیں۔ اب آپ آرام کریں۔ میں چلتا ہوں۔" ایڈم نے سینے پہ بندھے بازو کھولے اور ایک افسوس بھری نظر اسکرین پہ ڈالی اور سر نفی میں ہلایا۔ "میں ان کی جگہ ہوتا تو ایسا نہ کرتا۔"

پھر دروازہ کھلنے اور بند ہونے کی آواز آئی۔

تالیہ نے آنکھیں نہیں کھولیں۔ اس کی بصارت کے پردے پہ ایک منظر ابھر رہا تھا۔

دوائیوں کا اثر جیسے جیسے کم ہوتا جا رہا تھا ویسے ویسے وہ منظر صاف ہو رہا تھا۔ دھند چھٹ رہی تھی۔

وہ کوڑے کے ڈمپسٹر کے ساتھ دو زانو بیٹھی تھی۔ اس کا جسم مفلوج ہو رہا تھا۔ آنکھیں دور گلی کے سرے پہ جمی تھیں جہاں ایک سفید ہرن کھڑا اسے دیکھ رہا تھا۔

ایشا اس کے سامنے پنجوں کے بل بیٹھی تھی۔ پھر اس نے تالیہ کی آنکھوں کے سامنے ہاتھ ہلایا۔ تالیہ کی پلکوں میں جنبش نہ ہوئی۔ ایشا نے دھیرے سے اس کی جیکٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالا اور اس کا فون نکالا۔ اسکرین روشن تھی۔ شاید فون کب سے بج رہا تھا۔ اس نے اسے ان لاک کر کے کان سے لگایا۔ تاریکی اور سناٹے میں وہ فون سے آتی آواز مدھم سی سن سکتی تھی۔

"چے تالیہ.. وہ خط.. وہ زہریلا ہے۔ اسے آپ کے بابا نے نہیں لکھا..." ہانپتی کانپتی آواز ایڈم کی تھی۔

"مجھے پتا ہے، ایڈم ڈیئر۔" ایشا سرد لہجے میں کہتے ہوئے اٹھی۔ "لیکن آپ کو دیر ہو چکی ہے۔ تالیہ پہ زہر اثر کر چکا ہے۔" وہ بات کرتے ہوئے اٹھی اور چند قدم کے فاصلے پہ جا کھڑی ہوئی۔ اس کی تالیہ کی طرف پشت تھی۔ فون سے آتی آواز رک گئی۔ وہ صرف ایشا کی آواز سن سکتی تھی۔

"میں تالیہ کے ساتھ ہوں۔ مسز شیلا کامل کے گھر کی پچھلی گلی میں ایک ڈمپسٹر کے ساتھ... ہوں؟ اچھا۔" وہ رک کے سنتی رہی۔ تالیہ کی نظریں ہرن پہ جمی تھیں۔ وہ اب پلٹ رہا تھا۔

"ذوالکفلی کے زہر کا تریاق کسی کے پاس نہیں ہے۔ سوائے ذوالکفلی کے۔ ظاہر ہے میں اسے لا سکتی ہوں۔ میں چوری کرنا جانتی ہوں۔" وہ سرد سا ہنسی۔ "خیر.. اگر آپ کو تریاق چاہیے تو وان فاتح سے کہیں کہ میرا کیس بند کر دیں۔ میری فائل کلوز کر دی جائے... کوئی مجھے تلاش نہیں کرے گا... مجھے آزادی سے رہنے دیں.. نہ آپ میرے راستے میں آئیں گے نہ میں آپ کے... آپ تالیہ کو

ہسپتال لے کر جائیں... آپ کو آپ کا تریاق میں پہنچا دوں گی... میں نے کہا نا... میں پہنچا دوں گی... لیکن میری اور آپ کی ڈیل خفیہ رہے گی...‘‘

ہرن اب پلٹ چکا تھا۔ سیاہی میں اس کی سفیدی غائب ہو چکی تھی۔ تالیہ کی آنکھیں بند ہو چکی تھیں۔ پلکوں کی ذرا سی جھری سے وہ دیکھ سکتی تھی کہ میشا جھک کے اس کی جیب میں فون ڈال رہی تھی۔ پلکیں بند ہونے سے پہلے اس نے دیکھا... وہ اب گلی کی دوسری سمت میں جا رہی تھی... وہاں ابھی سفید ہرن غائب ہوا تھا... اسے پیچھے گلی میں ایک ساتھ بہت سے لوگوں کی آواز آئی... دروازے کھلے... کوئی اسے پکار رہا تھا... پولیس کے جوتوں کی آواز... ایمبولنس کے سائرن... ایڈم کی آواز... لیکن اس کی آنکھیں بند ہو چکی تھیں..

تالیہ نے آنکھیں کھولیں۔ وہ اب کمرے میں اکیلی تھی۔

بالآخر خواب اور حقیقت میں فرق کرنا اسے آ گیا تھا۔

☆☆☆

تالیہ مراد کا اپارٹمنٹ آج دو دن بعد آباد ہوا تھا۔ لونگ روم کی بتیاں روشن تھیں۔ وسط میز پہ ٹوکری میں اس کا پاسپورٹ اور ٹکٹ کی کاپی رکھی تھی۔ ساتھ چائے کا بھرا ہوا مگ پڑا تھا۔ وہ سیاہ اور سفید لمبے فراک میں ملبوس تھی۔ بالوں کی چھوٹی سی فرنچ چوٹی بنا رکھی تھی۔ چہرہ پہلے کی نسبت بہتر لگتا تھا۔

وہ صوفے پہ بیٹھی اداس مسکراہٹ سے اس پاسپورٹ اور ٹکٹ کو دیکھ رہی تھی۔ فلائٹ کل رات کی تھی۔ اس نے ایڈم اور داتن کو پرسوں کا وقت بتایا تھا۔ وہ ان کو درست وقت نہیں بتانا چاہتی تھی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ کوئی اس کے پیچھے آئے۔ وہ لوگ اگر اس کے پیٹھ پیچھے میشا سے ڈیل کر سکتے تھے تو وہ بھی اپنے فیصلے تنہا کر سکتی تھی۔

دروازے کی گھنٹی بجی تو وہ چونکی۔ کلائی پہ بندھی گھڑی دیکھی۔ اس وقت کون؟

وہ اٹھ کے دروازے تک آئی۔ پھر میجک آئی سے باہر جھانکا۔ پھر گہری سانس لے کر پیچھے ہوئی اور دروازہ کھولا۔

سامنے فاتح کھڑا تھا۔

سفید شرٹ اور بلیک پینٹ میں ملبوس.. جیبوں میں ہاتھ ڈالے.. وہ مسکرا کے اسے دیکھ رہا تھا۔

’’کیسی ہو؟‘‘

’’آپ کیسے ہیں، داتو سری؟‘‘ پھر رکی۔ ’’اب تو آپ کو داتو سری نہیں کہنا پڑے گا نا؟‘‘

’’جب میں نے آخری دفعہ چیک کیا تھا تو میں اس ملک کا وزیراعظم نہیں تھا۔‘‘ وہ خود ہی آگے بڑھ آیا۔ اسے پیچھے ہونا پڑا۔

اندر آ کے وہ طائرانہ نگاہوں سے گردن گھما کے اطراف کا جائزہ لینے لگا۔

’’اور جب میں نے آخری دفعہ چیک کیا تھا تو تم بہت امیر تھیں۔ پھر اتنا چھوٹا اور عام سا فلیٹ؟‘‘

لونگ روم کے وسط میں کھڑے ہوئے فاتح نے حیرت سے اسے دیکھا۔ سیاہ سفید فراک والی لڑکی مسکرا کے کندھے اچکاتے ہوئے سامنے آئی۔

’’حالم کو اونچے گھروں کا اب شوق نہیں رہا۔ ویسے بھی یہ ایک عارضی ٹھکانہ تھا۔‘‘ پھر کچن کاؤنٹر کی سمت چلی گئی۔ ’’چائے پئیں گے؟‘‘

’’میں نے زندگی میں ایک بات سیکھی ہے کہ جو لوگ چائے کو انکار کرتے ہیں، ان سے دوستی نہیں رکھنی چاہیے۔‘‘

وہ مسکرا کے کہتا ہوا آگے آیا اور بڑے صوفے پہ بیٹھا۔ ٹانگ پہ ٹانگ جمائی اور پوری توجہ سے اسے دیکھنے لگا جو کچن میں کام کر رہی تھی۔

’’میشا کا کچھ پتا نہیں چلا؟‘‘ فاتح کی طرف پشت کیے وہ کیتلی میں چائے کا پانی رکھتے ہوئے بولی۔

’’میں پردھان منتری نہیں ہوں اس لیے مجھے کچھ علم نہیں۔‘‘ وہ بظاہر لاعلمی سے بولا۔ تالیہ مسکرا کے رہ گئی۔ کچھ باتوں کا ان کہا رہ جانا ہی اچھا ہوتا ہے۔

''کیا تم ابھی تک مجھ سے ناراض ہو؟''

''نہیں فاتح! میں آپ سے شاید پہلے بھی ناراض نہیں تھی۔ وہ صرف وقتی غصہ تھا۔ اب تو یاد بھی نہیں کہ کس بات پہ تھا۔'' وہ سر جھٹک کے اب مگ نکال رہی تھی۔ ابلتے پتوں کی مہک سارے میں پھیل گئی تھی۔

''تو پھر جا کیوں رہی ہو؟''

اس کا انداز ایسا تھا کہ تالیہ کے کام کرتے ہاتھ رک گئے۔ حلق میں ایک گولا سا اٹکنے لگا۔ پھر اس نے تھوک نگلا۔ آنسو بھی نگل لیے۔ اور کیتلی اٹھا کے چائے مگ میں انڈیلنے لگی۔

''کیونکہ مجھے اس ملک میں نہیں رہنا اب۔''

سنہری دھار اب مگ میں گر رہی تھی۔ اس سے خوشبو اڑاتی بھاپ اوپر اٹھ رہی تھی۔ کن انکھیوں سے اس نے دیکھا وہ ٹوکری میں رکھے اس کے کاغذ دیکھ رہا تھا۔

''یا شاید تم چناؤ نہیں کر پا رہیں؟''

''میں نے چناؤ کر لیا ہے۔'' وہ مگ ٹرے میں لیے سامنے آئی اور انہیں میز پہ رکھا۔ پھر فاتح کے مقابل صوفے پہ بیٹھی۔ وہ نارمل لگ رہی تھی۔ نہ پریشان۔ نہ اداس۔

دونوں کے درمیان اب ایک میز حائل تھی۔ اور دو چائے کے مگ۔

''میں جانتی ہوں کہ آپ مجھے روکنے آئے ہیں۔ یہ بھی جانتی ہوں کہ آپ نے اپنی کرسی بچانے کے بجائے مجھے بچانے کا انتخاب کیا۔ لیکن میں نے وہ کاغذ آپ کو اس لیے دیے تھے تاکہ آپ انہیں سائن کر کے ہمارے درمیان سے مجبوری کا رشتہ ہمیشہ کے لیے ختم کر دیں۔ آپ اور میں کبھی بھی ساتھ نہیں چل سکتے۔ ہم دو بہت مختلف لوگ ہیں۔ میں آپ کی طرح سفید نہیں ہوں۔ میں سیاہ بھی نہیں ہوں۔ میں اس کے درمیان کچھ ہوں۔ مجھے اپنے آپ کو ڈھونڈنا ہے۔ آپ بھلے اس کاغذ پہ سائن کریں یا نہ کریں، آپ مجھے جانے سے نہ روکیں۔ آپ تالیہ کو تالیہ کی تلاش کے سفر میں جانے دیں۔''

''کیا تم نے ابھی تک خود کو تلاش نہیں کیا؟'' وہ اسے دیکھتے ہوئے نرمی سے بولا۔ چائے کے مگ ہنوز ان چھوئے رکھے تھے۔

تالیہ کا ذہن بھٹکا۔ اسے سبز آنکھوں والا سفید ہرن یاد آیا۔

''نہیں۔ میں ابھی تک خود کو جان نہیں پائی ہوں۔ میں ایک پیچیدہ انسان ہوں، فاتح۔ بہت پیچیدہ۔ مجھے ایک لمبے عرصے کے لیے اس سب سے دور جا کے خود کو سمجھنا ہے۔''

''اور تم کہاں جاؤ گی؟''

''مختلف ملکوں میں۔ مختلف تہذیبوں کے درمیان... ماضی کی یادوں.. اور حال کے لوگوں کے درمیان مجھے وقت گزارنا ہے۔ مجھے یہ دنیا بہت مشکل سے واپس ملی ہے۔ ہماری یہ دنیا جادوئی دنیا ہے فاتح۔ میں اس دنیا کو ایکسپلور کرنا چاہتی ہوں۔ میں ایک بیگ پیک کے ساتھ، کچھ بھی جمع کرنے کی تمنا کیے بغیر... پہاڑوں پہ چڑھنا چاہتی ہوں۔ سمندروں کا سفر کرنا چاہتی ہوں۔'' وہ کہہ رہی تھی اور اس کی آنکھوں میں ایک الوہی سی چمک تھی۔

''اور کیا ہے جو تم نہیں کرنا چاہتی؟''

''یہ کون گیمز... یہ ناٹک.. یہ حالم والے کام... میں ان سب سے دور جانا چاہتی ہوں۔ میں اسپین کے کسی کیفے میں سوپ بنانا چاہتی ہوں۔ میں پراگ کے کسی قلعے کے سامنے پینٹنگ بنانا چاہتی ہوں۔ میں آپ کے کسی سفر میں آپ کے ساتھ نہیں چل سکتی کیونکہ مجھے ابھی چند سال اپنی تلاش کے سفر پہ نکلنا ہے۔''

''تالیہ...'' وہ دھیمی آواز میں گویا ہوا۔ ''ایسا نہیں تھا کہ مجھے تمہاری بات کا یقین نہیں تھا۔ یعنی وہ جو تم نے ییشا کے متعلق کہا۔ تم کھل کے کہتیں تو میں مان جاتا۔ مگر اس وقت ماحول کچھ ایسا ہو گیا تھا کہ ہمارے درمیان تلخی در آئی۔ ورنہ تمہارے جاتے

ہی...''

''میرے جاتے ہی آپ نے اپنی سیکیورٹی ٹیم کو بیشا کو چیک کرنے کا کہا ہوگا۔ مجھے بعد میں اندازہ ہو گیا تھا۔'' وہ اداسی سے مسکرائی۔''میں نے کہا نا...اب تو مجھے یاد بھی نہیں کہ ہم کیوں لڑے تھے۔''

''اگر میں کہوں کہ مجھے تمہاری اور تمہیں میری ضرورت ہے۔اور یہ کہ تم میرے پاس رہو تو کیا تم رک جاؤ گی؟''

وہ اس کی آنکھوں میں دیکھ کے کہہ رہا تھا۔اس کا دل کمزور پڑنے لگا۔لیکن نہیں۔آج اسے مضبوط رہنا تھا۔

''آپ یہ نہ کہیں۔میں رکنا نہیں چاہتی۔''

فاتح نے شکست خوردہ انداز میں گہری سانس لی۔

''کیا تم کبھی واپس آؤ گی؟''

''میں نہیں جانتی' فاتح۔ لیکن میں آپ کو پوسٹ کارڈز بھیجا کروں گی۔'' اس کی آنکھیں ڈبڈبائیں۔

''اور تم اس پوسٹ کارڈ پہ واپسی کا پتا تحریر نہیں کیا کرو گی۔ میں سمجھ گیا۔'' اس نے جھک کے کپ اٹھایا اور واپس پیچھے ہوتے ہوئے گھونٹ بھرا۔ چائے قدرے ٹھنڈی ہو چکی تھی۔

''آپ وہ کاغذ سائن کریں یا نہ کریں...اب مجھے اس سے فرق نہیں پڑتا۔کیونکہ تالیہ کی زندگی میں اب کسی اور کی گنجائش نہیں ہے۔'' اس نے نم آنکھوں سے شانے اچکائے اور اپنا کپ اٹھایا۔اس کی چائے گرم تھی۔یا شاید ہاتھ ٹھنڈے تھے۔

''تمہیں مجھ سے ہمیشہ یہ گلہ ہوتا تھا کہ میں تمہیں بچانے نہیں آتا۔''

وہ جواب میں کچھ کہنے لگی لیکن فاتح نے ہاتھ کے اشارے سے اسے روک دیا۔

''اور مجھے خود سے یہ گلہ ہے کہ فاتح نے پچھلے چھ سال سے ... بلکہ چھ صدیوں سے ...تالیہ مراد کو بچانے کے سوا کچھ نہیں کیا۔''

تالیہ نے پلکیں جھکا دیں۔''آئی ایم سوری۔ مجھے ایسا نہیں کہنا چاہیے تھا۔لیکن پھر بھی میں آپ کا چناؤ نہیں کر سکی۔ہم دو بہت مختلف لوگ ہیں۔ہم کبھی بھی ساتھ خوش نہیں رہ سکیں گے۔''

''کیا تم کوشش بھی نہیں کرنا چاہو گی؟''

تالیہ نے چہرہ اٹھا کے اسے دیکھا۔اس کی آنکھیں بھیگی ہوئی تھیں۔

''کیا تم ابھی تک نہیں سمجھ سکیں کہ تم میری زندگی میں سب سے اہم انسان ہو' تالیہ؟''

وہ کہہ رہا تھا اور اس کے اندر کچھ موم کی طرح پگھلنے لگا تھا۔

(نہیں۔اسے پگھلنا نہیں تھا۔ورنہ وہ کبھی خود کو اس ملک سے آزاد نہیں کر سکے گی۔اسے یہاں سے دور جانا تھا۔بہت دور۔)

''تم سوچتی ہو کہ میری زندگی میں تمہاری جگہ ہے یا نہیں۔کیا تمہیں ابھی تک علم نہیں ہو سکا کہ میری زندگی ایک لمبے عرصے سے صرف تمہارے گرد گھوم رہی ہے۔جب سے تم میری زندگی میں آئی ہو' ہر چیز تمہارے متعلق ہوتی تھی۔ ہر قدم' ہر کام۔چاہے فاتح کو یاد تھا یا وہ بھول گیا تھا' فاتح رامزل کی زندگی تالیہ مراد کے گرد گھومنے لگی تھی۔کیا تالیہ مراد کو بھول گیا ہے کہ فاتح اس کے پیچھے اس دوسری دنیا تک گیا تھا؟''

''مگر پھر ہمارے درمیان چھ سال آ گئے۔'' وہ زخمی سا مسکرائی۔

''اور تالیہ کو بھول گیا کہ فاتح نے چھ سال پہلے استعفیٰ دے دیا تھا۔لیکن پھر میں نے وہ استعفیٰ واپس لے لیا تھا۔میں نے خود کو سنبھالا اور دوبارہ الیکشن لڑے تھے۔میں اپنے خوابوں کی طرف اس لیے چل پڑا کیونکہ تم یہ چاہتی تھیں۔کیونکہ میں نے تم سے وعدہ کیا تھا کہ میں کسی ٹراما کا شکار ہو کر اس سب کو نہیں کھوؤں گا جس کے لیے میں نے برسوں محنت کی ہے۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ تم کہاں ہو۔مگر ان چھ سالوں میں میں نے تمہارا بہت انتظار کیا تھا۔ مجھے

یقین تھا کسی ایک دن دروازہ کھلے گا اور سامنے تم ہوگی۔ یا فون بجے گا اور میں اسے اٹھاؤں گا اور تم بولو گی۔ میں نے کبھی یہ تصور نہیں کیا کہ تالیہ واپس نہیں آئے گی۔ ان چھ سالوں میں مجھے تمہاری ایک ایک بات یاد آتی رہی۔ تالیہ مراد کی یاد تالیہ سے بڑی ہوتی گئی۔ تمہاری کہی باتیں ازبر ہوگئیں مجھے۔ تمہیں پڑھنے کا فن آگیا مجھے۔"

"اب میں جا رہی ہوں۔ اب ان باتوں کا فائدہ؟"

"ہاں۔ تم جا رہی ہو۔ اب کیا فائدہ۔" اس نے گہری سانس لی۔ اس کے چہرے پہ ملال تھا۔ صرف ملال۔

"میں یہ نہیں کہوں گا کہ تالیہ! مجھے تم سے ایسی محبت ہے جو کسی نے کسی سے نہیں کی ہوگی۔ لیکن میں یہ ضرور کہوں گا کہ ہم نے دو دنیاؤں کا سفر ایک ساتھ کیا ہے۔ اگر تمہیں لگتا ہے کہ ہم دونوں مختلف انسان ہیں' یا ہماری زندگیوں میں ایک دوسرے کے لیے جگہ نہیں ہے تو تم نہ مجھے جانتی ہو نہ خود کو۔"

تالیہ کی آنکھ سے ایک آنسو گرا اور گال پہ لڑھکا۔ لیکن اس نے تہیہ کر رکھا تھا کہ وہ نہیں پگھلے گی۔ فاتح جو بھی کہے' وہ خود کو مضبوط رکھے گی۔

"میں نے خود کو چنا ہے۔ میں اپنے لیے سفر کرنا چاہتی ہوں۔ میں شاید کئی سال تک واپس نہ آؤں۔ آپ مان لیں کہ آپ میرا انتظار نہیں کر سکیں گے..."

وہ مسکرایا پھر کھڑا ہوگیا۔ "تمہارے خیال میں چھ سال میں نے اور کیا کیا ہے؟"

وہ دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ فاتح کو امید تھی کہ وہ اسے روک لے گی۔ وہ کہے گی کہ اتنا سب کچھ ہونے کے بعد اب تالیہ فاتح کو چھوڑ کے نہیں جا سکتی۔ وہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا دروازے تک آیا۔ ڈور ناب پہ ہاتھ رکھا۔ لیکن تالیہ نے اسے نہیں پکارا۔ وہ اپنی جگہ بیٹھی لب دانتوں سے کاٹتی رہی۔

وہ اپنا چناؤ کر چکی تھی۔

وان فاتح دروازے سے باہر نکل گیا۔ اس کا دل بوجھل تھا۔

☆☆☆

کافی شاپ کے کاؤنٹر کے ساتھ اونچے اسٹولز پہ اس صبح مختلف لوگ بیٹھے اپنی اپنی کافی سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ آج صبح سے بارش ہو رہی تھی ایسے میں شاپ کے اندر پھیلی روسٹ ہوئے کافی بینز کی مہک نے ماحول بنا رکھا تھا۔

باریستا ایک کے بعد ایک کافی کپ کاؤنٹر پہ رکھتی آوازیں لگا رہی تھی۔ ہر کپ پہ کافی لینے والے کا نام لکھا تھا۔

"انچے ساحر۔" (مسٹر ساحر۔) مصروف سے انداز میں اس نے آواز لگائی تو کاؤنٹر کی طرف پشت کیے کھڑا شخص اس جانب گھوما۔ اس نے سیاہ کوٹ کے اوپر سیاہ ہیٹ پہن رکھا تھا۔ مسکرا کے اس نے ٹشو سے کپ تھاما اور اسے لیے شاپ کے کونے میں بنی ایک میز تک آیا۔ اپنی کافی رکھ کے کاؤچ پہ بیٹھتے ہوئے اس نے عام سے انداز میں کہا۔

"میں کافی دیر سے تمہیں اپنا پیچھا کرتے دیکھ رہا ہوں' پتری تالیہ۔ تم سامنے آسکتی ہو۔"

ذوالکفلی نے مسکرا کے چہرہ اوپر کیا۔ اس کی چمکتی آنکھیں متلاشی انداز میں اردگرد گھومیں۔ اور پھر وہ اسے نظر آگئی۔ ایک ستون کے پیچھے سے نکلتی تالیہ۔

اس نے گلابی پھولدار فراک کے اوپر سرمئی ہیٹ پہن رکھا تھا۔ اس کے ہیٹ میں لگا پھول اور ساتھ جڑی موتیوں کی لڑی بھی سرمئی تھی۔ بال جوڑے میں بندھے تھے اور آنکھوں میں غصہ تھا۔ تنفر تھا۔

"میں تم سے آج ایک آخری بات کرنے آئی ہوں۔" وہ جارحانہ انداز میں سامنے والے کاؤچ پہ بیٹھی اور میز پہ اپنے دونوں ہاتھ رکھے۔

"میں سن رہا ہوں۔ مگر اتنے غصے میں کیوں ہو؟" ذوالکفلی نے مسکرا کے چینی کا پیکٹ اٹھایا اور

کافی میں چھڑکا۔ پھر اسٹک سے اسے ہلایا۔ پھر ڈھکن بند کر کے نظریں اٹھائیں تو وہ اسی طرح اسے گھور رہی تھی۔

"ویسے تم ابھی تک گئیں نہیں؟ تمہاری آج فلائیٹ ہے نا؟" اس نے ایک گھونٹ بھرتے ہوئے محظوظ انداز میں تالیہ کو دیکھا۔

"تم نے مجھے زہر کیوں دیا؟"

"کیا تم نے مجھے دھوکا نہیں دیا تھا؟ دونوں میں کوئی فرق ہے کیا؟"

"پہلے تم نے میرے باپ کو اپنے جادو میں دھکیلا۔ پھر مجھے۔ تمہارے پاس سارے سوالات کے جواب تھے لیکن تم ذوالکفلی۔ تم ہم سب کو اپنی انگلیوں پہ کٹھ پتلیوں کی طرح نچاتے ـــــ رہے۔" وہ چبا چبا کے کہہ رہی تھی۔ اس کے انداز میں غصے کے ساتھ بے بسی بھی تھی۔ "تم یہ سمجھتے ہو کہ تمہارے پاس بہت طاقت ہے۔ تم ہمیں ناکام ہوتے دیکھتے رہو گے۔ تم نے سب کچھ کیا۔ میں نے سب کچھ سہا۔"

"او تو یہاں وکٹم تم ہو؟" اس نے ابرو اٹھائی۔

"ذوالکفلی... سنو میری بات..." وہ آگے ہوئی اور مٹھی میز پہ زور سے رکھی۔ "تمہاری اور میری لڑائی آپس میں تھی۔ تم فاتح کو درمیان میں کیوں لائے؟"

"کیا تم اب تک یہ نہیں سمجھ سکی ہو کہ تم اور فاتح الگ نہیں ہو؟ چچ چچ۔" اس نے افسوس سے کہتے ہوئے گھونٹ بھرا۔ اس کی چمکتی آنکھیں محظوظ لگ رہی تھیں۔

تالیہ لب بھینچے ضبط سے اسے دیکھتی رہی۔ "تم نے فاتح سے ان کی کرسی چھینی صرف مجھے ہرٹ کرنے کے لیے۔"

"اور میں کامیاب ہو گیا۔"

"اور تم نے وہ خط لکھا مجھے گلٹ میں مبتلا کرنے کے لیے۔ جانتے ہو میرے دل پہ کیا گزری تھی۔"

"اور میں دوبارہ سے کامیاب ہو گیا۔"

"اور تم نے مجھے زہر دینا چاہا۔ لیکن میشا نے فاتح کے ساتھ ڈیل کر لی۔ تمہاری ایک اور اسٹوڈنٹ نے تمہیں دھوکا دے دیا۔

"میں پھر بھی ناکام نہیں ہوا۔ تمہیں تمہارا سبق مل چکا ہے۔ اور اس کو اس کا سبق میں دے دوں گا۔" وہ گھونٹ بھرتے ہوئے جتانے والے انداز میں بولا۔ "تم اب یہاں کیا لینے آئی ہو؟"

"تمہیں یہ بتانے کہ میں اس جنگ کو ختم کر رہی ہوں۔"

"ہوں۔ انٹرسٹنگ۔ لیکن کیوں؟ کیا تم میرا مقابلہ کرنے کی ہمت نہیں رکھتیں یا تمہارا خیال ہے تم اس ملک سے چلی جاؤ گی تو میں تمہارے پیچھے نہیں آ سکوں گا؟ میں دنیا کے ہر ملک، ہر جزیرے تک تمہارا پیچھا کروں گا۔"

"دیکھو ذوالکفلی..." اس نے بے بسی بھری سانس لی اور ذرا دھیمے انداز میں کہنے لگی۔ "تم میرے پیچھے نہیں آ سکتے۔ لیکن میرے کچھ اپنے ابھی یہاں موجود ہیں۔ اور مجھے ہرٹ کرنے کے لیے تم ان کو نقصان پہنچاؤ گے۔ مجھے معلوم ہے۔ میں تمہیں یہ کہنے آئی ہوں کہ تم ایسا مت کرو۔ میری تمہاری جو بھی لڑائی ہے اسے یہیں ختم کر دو۔"

"کیا تم مجھ سے معافی مانگ لو گی؟ اپنے استاد کو دھوکا دینے کی معافی۔"

"معافی؟" وہ طنزیہ مسکرائی اور پیچھے ہوئی۔ سر پہ رکھا ہیٹ ترچھا کیا۔ "میں تمہیں ایک نصیحت کرنے آئی ہوں۔"

"میں سن رہا ہوں۔" اس نے کپ رکھا اور بظاہر پوری توجہ سے اسے سننے لگا۔

"جانتے ہو انسان کو سب سے زیادہ اس کا کون سا عضو مشکل میں ڈالتا ہے؟ اس کی زبان۔ زبان سارے جھوٹ گھڑتی ہے۔ زبان ساری تکلیف دہ باتیں کہتی ہے۔ زبان انسان کو بناتی ہے۔ زبان اسے تباہ کرتی ہے۔ مگر یہ بغیر ہڈی کا نرم سا ٹکڑا ایک اور کام بھی کرتا ہے۔"

"کیا؟"

"جادو۔" وہ مسکرائی۔ اس کی آنکھیں چمکیں۔

”ابھی دنیا میں وہ جادو نہیں بنا جو آنکھوں یا ہاتھ کے اشارے سے ہو سکے۔ سارے جادو زبان سے ہوتے ہیں۔ سارے منتر اس زبان کو ہلا کے پڑھنے ہوتے ہیں۔“ وہ آگے کو جھکی اور اس کی چمکتی آنکھوں میں دیکھا۔

”اور میں تم سے تمہاری زبان چھیننے آئی ہوں۔“

”اچھا۔ وہ کیسے؟“ وہ مسکرا کے بولا۔

”باریستا کو ایک ہزار رنگٹ دے کر۔“

ذوالکفلی کی رنگت بدلی۔ اس نے چونک کے اپنے کپ کو دیکھا۔ پھر اس کے ابرو اکٹھے ہوئے۔

”تم جھوٹ بول رہی ہو۔ تم نے ایک دفعہ پہلے بھی مجھے زہر دینے کا ناٹک...“ اس کے الفاظ اٹکنے لگے۔ اس نے بے اختیار گردن پہ ہاتھ رکھا۔ آنکھیں بے یقینی سے پھیلیں۔

”کیا ہوا؟ دم گھٹتا محسوس ہو رہا ہے، ہے نا؟“ وہ ہمدردی سے دھیرے سے بولی۔ ”بلکہ... زبان مفلوج ہوتی جا رہی ہے نا؟ چچ چچ۔ اب تم کیسے بولو گے؟ اور بولو گے نہیں تو.... جادو کیسے کرو گے؟ اور جادوئی زہر کیسے بناؤ گے؟“

وہ کھانسا۔ اس کی آواز گھٹی گھٹی سی نکلی۔ اس نے ہاتھ سے تالیہ کی طرف اشارہ کیا اور زبان ہلانی چاہی۔ وہ مسکرا کے اسے دیکھے گئی۔ زبان کے بغیر سارے جادو ادھورے تھے۔

”صرف تم نہیں ہو جسے قدیم زمانے کی دوائیاں بنانی آتی ہیں۔ اور یہ دوا تو بہت آسان تھی۔ صرف تمہاری زبان سے چمٹ گئی اور اسے مفلوج کر دیا۔ چچ چچ۔ اب اگر تم جادو نہیں کر سکو گے تو ساحر کیسے کہلاؤ گے؟ پمبورو کیسے رہو گے؟“

اس کا چہرہ سفید پڑ رہا تھا۔ اس نے تیزی سے پانی کا گلاس غٹاغٹ پی لیا۔ پھر بولنے کی کوشش کی۔ لیکن زبان ہلنے سے انکاری تھی۔ وہ بے بسی سے مٹھیاں میز پہ مارنے لگا۔

”اور اس دوا کا کوئی تریاق بھی نہیں ہے۔ زبان کے زہر کا تریاق ویسے بھی کوئی نہیں ہوتا، ساحر۔“ وہ تلخی سے مسکرائی اور اٹھی۔

”تم نے ٹھیک کہا تھا۔ میں سفید گھوڑے والی شہزادی نہیں ہوں۔ اگر ہوتی تو تم سے صلح کر لیتی۔ میں سیاہ گھوڑے والی شہزادی بھی نہیں ہوں۔ ورنہ تمہیں جان سے مار دیتی۔ میرا رنگ کچھ اور ہے۔ ان دونوں کے درمیان کا۔“ اس نے سرمئی ہیٹ سر پہ سختی سے جمایا اور میز کے پیچھے سے نکلی۔ وہ اب سر جھکا کے کھانس رہا تھا۔

”اب تم کبھی جادو نہیں کر سکو گے نہ لوگوں کی زندگی سے کھیل سکو گے۔ اور جب تم جادو نہیں کر سکو گے تو تمہارے ساتھ وقت کے سارے دروازے بند ہو جائیں گے۔ پمبورو ختم ہو جائیں گے۔ اب وقت کے چکر میں کسی کی زندگی برباد نہیں ہو گی۔ تم اپنے جادو کے بغیر بالکل بے کار ہو، ذوالکفلی۔ اپنی زندگی کے بقیہ ایام تم چھوٹی موٹی چوریاں کر کے گزار سکتے ہو۔ گڈ لک۔“

اس نے سرمئی ہیٹ ترچھا کیا یہاں تک کہ اس کا آدھا چہرہ چھپ گیا اور دروازے کی طرف بڑھ گئی۔

ذوالکفلی اس کو نہیں سن رہا تھا۔ وہ مسلسل کھانستا ہوا کچھ بولنے کی کوشش کر رہا تھا۔ لوگ پریشانی سے اس کے گرد اکٹھے ہو رہے تھے۔

اس کا سیاہ ہیٹ فرش پہ جا گرا تھا۔ اکٹھے ہوتے مجمعے کے پیر اس ہیٹ کو چل رہے تھے۔ کپڑے کے چیتھڑے الگ ہو رہے تھے۔

☆☆☆

(میں ایڈم بن محمد ہوں۔ مراد راجہ کہتے تھے کہ میں چے تالیہ کے عام انسانوں کے خوشگوار انجام کی امید ہوں۔ مگر جانتے ہو میں اس سے پہلے کیا تھا؟)

کے ایل کا انٹرنیشنل ایئرپورٹ اس وقت بھانت بھانت کی قوموں کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ مختلف بولی بولنے والے، مختلف رنگ والے، مختلف لباس والے لوگ اپنے اپنے سامان اٹھائے آگے پیچھے جا رہے تھے۔ کسی کو منزل مل چکی تھی۔ کسی کو اب منزل

کے لیے روانہ ہونا تھا۔ کوئی تھکا ہوا تھا۔ کوئی سفر کے لیے تازہ دم تھا۔

(میں اتنا عام سا انسان تھا کہ جب بھی امیر اور مشہور لوگ دیکھتا' اداس ہو جاتا۔ احساس کمتری میں چلا جاتا۔ وہ لوگ اتنے چمک دار چہروں والے' اتنے دولت مند اور متاثر کن ہوتے تھے کہ مجھے اپنا آپ پہلے سے زیادہ عام لگتا۔)

وہ دونوں کندھوں پہ بیک پیک پہنے ائیر پورٹ کے باہر روڈ پہ کھڑی تھی۔ اس نے پاؤں کو چھوتی سفید میکسی پہن رکھی تھی اور بالوں کی اونچی پونی بنا رکھی تھی۔ ہوا سے چند لٹیں بار بار چہرے پہ آتیں جنہیں وہ ہٹا دیتی۔

(میں آئینے میں اپنے آپ کو دیکھ نہیں پاتا تھا۔ نہ مجھے اپنی رنگت اچھی لگتی نہ شخصیت۔ میرے اندر کچھ بھی نہیں تھا جو کسی کو متاثر کر سکتا۔)

وہ اکیلی آئی تھی۔ داتن اور ایڈم کو درست وقت نہیں معلوم تھا لیکن فاتح جانتا تھا۔ کیا وہ آئے گا؟

(اور پھر میں ملا ایک لڑکی سے۔ اور ایک آدمی سے۔ اور انہوں نے مجھے بتایا کہ ہاں' میں ان چمک دار لوگوں جیسا نہیں بن سکتا لیکن یہ لوگ بھی مجھ جیسے نہیں بن سکتے۔)

وہ سفید جوگرز سے قدم اٹھاتی اندر آ رہی تھی۔ وہاں روشنیوں کی ایک نئی دنیا تھی۔ بیگز اٹھائے لوگ آ جا رہے تھے۔ ایک دوسرے سے بے نیاز صرف اپنی منزل کو فوکس میں رکھے۔

کیا فاتح اس کو الوداع کہنے آئے گا؟ کیا وہ اس کو روکنے آئے گا؟

(میں نے جانا کہ یہ سارے امیر اور خوبصورت لوگ ایک جیسے ہیں۔ لیکن میں ان جیسا نہیں ہوں۔ مجھے ان جیسا بننا بھی نہیں ہے۔ مجھے اپنی نظروں میں معتبر بننا ہے۔)

وہ آگے بڑھتے ہوئے سوچ رہی تھی۔

اور اگر وہ آیا تو کیا وہ رک جائے گی؟

ورژن بننا ہے۔ پھر مجھے کسی کے چہرے کی چمک متاثر نہیں کرے گی۔)

ائیر پورٹ میں قدم قدم چلتی تالیہ کو پتا نہیں کیوں یقین تھا کہ وہ آئے گا۔ جیسے فلموں میں ہوتا ہے۔ وہ آئے گا اور اس سے کہے گا کہ وہ رک جائے۔ اس دفعہ وہ اس کو ناں نہیں کر پائے گی اور اپنا ٹکٹ پھاڑ دے گی۔ وہ رک جائے گی۔

(یوں میں نے خود سے سچا بننا سیکھ لیا۔ میں نے اپنے اصل ٹیلنٹ کو پہچان لیا۔ میں اپنی نظروں میں خوبصورت بنتا گیا تو دنیا والوں کی نظریں بھی مجھ سے متاثر ہونے لگیں۔)

وہ اب اپنا پاسپورٹ لیے قطار میں کھڑی تھی۔ گردن موڑے وہ متلاشی نگاہوں سے پیچھے دیکھ رہی تھی۔ کیا معلوم وہ وہیں کہیں ہو اور اسے تلاش کر رہا ہو؟

(یہاں تک کہ میری شخصیت ان چمک دار لوگوں سے زیادہ متاثر کن ہو گئی جو کبھی احساس کمتری میں مبتلا کرتے تھے۔ لیکن پھر مجھے ایک چمک دار چہرے والی لڑکی سے محبت ہو گئی۔ نہیں ہونی چاہیے تھی۔)

کیا وہ واقعی اس کے روکنے پہ رک جائے گی؟ مگر وہ تو دنیا کا سفر کرنے جا رہی تھی۔ وہ تو ملکوں ملکوں پھرنے جا رہی تھی۔ وہ تو اپنی تلاش کے سفر پہ روانہ ہو رہی تھی۔ پھر وہ کیوں رکے گی؟

(کیونکہ اس محبت نے مجھے سمجھایا کہ ہر انسان کا ایک دائرہ ہوتا ہے۔ سب اپنے دائرے میں تیر رہے ہیں۔ کچھ لوگوں کا دائرہ ہم سے کبھی مل نہیں پاتا۔)

وہ سر جھٹک کے آگے بڑھ گئی۔ کاؤنٹر کے پیچھے بیٹھی عورت اب اس کو اس کا بورڈنگ پاس دے رہی تھی۔ تالیہ نے پاس پکڑا اور آگے بڑھ گئی۔

(میں نے جان لیا کہ میرا اور اس کا دائرہ مختلف ہے۔ ہمارا دائرہ ایک دوسرے میں ضم نہیں ہو سکتا۔ مجھے اپنے دائرے میں چلنا ہے اور اسے اپنے دائرے میں۔)

وہ ایک لمحے کے لیے رکی اور مڑ کے دیکھا۔

دوڑائی۔ ہر چہرے کو دیکھا۔ وہ وہاں نہیں تھا۔ وہ نہیں آیا تھا۔

(میں نے یہ بھی جان لیا کہ اس کا دائرہ کسی اور سے ملتا ہے۔ وہ دونوں چمک دار چہروں والے لوگ ہیں۔ میرے جیسے لوگ ان جیسے کبھی نہیں بن سکتے۔ اور وہ مجھ جیسے نہیں ہو سکتے۔ پھر میں اپنا دائرہ چھوڑ کے کیوں بھٹک جاؤں؟)

اس نے گہری سانس لی اور آگے بورڈنگ لاؤنج کی طرف بڑھ گئی۔ اب وہ چاہتا بھی تو اس کے پیچھے وہاں نہیں آسکتا تھا۔

لاؤنج کے اندر آکے اس نے صوفے پہ اپنا بیک پیک دھرا اور خود ساتھ بیٹھ گئی۔ نظریں گھڑی کی طرف اٹھ گئیں۔ بورڈنگ شروع ہونے میں پچاس منٹ رہتے تھے۔

(اور تب میں نے فیصلہ کیا کہ مجھے کسی دوسرے کے دائرے میں نہیں جانا۔ بلکہ دو محبت کرنے والوں کو ان کے دائرے میں رہنے دینا ہے۔)

تالیہ نے اپنے سیل فون کو دیکھا۔ کوئی کال نہیں۔ کوئی میسیج، ای میل کچھ بھی نہیں۔

کیا وہ فاتح کے روکنے پہ رک جائے گی؟ کیا اسے رک جانا چاہیے؟

(اپنی محبت سے دست برداری کا فیصلہ دل کاٹ دیتا ہے۔ اس کے بعد انسان دنیا میں یوں چل پھر رہا ہوتا ہے جیسے اندر سے مر چکا ہو۔ کسی بھٹکتی روح کی طرح۔)

ہاں۔ وہ رک جائے گی۔ کسی نے اندر سے کہا۔ تو پھر اس سفر کا کیا؟ وہ سفر جو اس کے لیے ضروری تھا؟

اس نے سر ہاتھوں میں گرا دیا۔ ذہن الجھتا جا رہا تھا۔

(اس فیصلے کا غم ختم ہونے میں عرصہ لگ جاتا ہے۔ لیکن مجھے امید ہے کہ ایک نہ ایک دن یہ غم ختم ہو جائے گا۔)

یہ پہلی دفعہ نہیں تھا جب وہ فاتح کو چھوڑ کے جا رہی تھی۔ وہ اس کے پیچھے اس کا انتظار کیا کرتا تھا۔

وہ قدیم ملاکہ میں ایک پنجرے میں قید تھے۔ ایڈم اور تالیہ نکل آئے لیکن فاتح نہیں نکل سکا۔

اسے دولت امان کے آفیسرز گرفتار کر کے لے گئے تھے۔ اور اس کے انتظار میں وان فاتح روز وہاں آتا تھا۔ اس کے لیے خط لکھتا تھا۔

مراد نے فاتح کو سلاخ دے ماری تھی۔ وہ غصے میں فاتح اور ایڈم کو چھوڑ کے مراد کے پیچھے لپکی تھی اور وہ چھ برس تک اس کا انتظار کرتا رہا تھا۔

(مجھے جس سے محبت ہوئی، وہ کسی اور کے ساتھ اپنی زندگی گزارنا چاہتی ہے۔ کچھ لوگ ہمارے لیے نہیں ہوتے۔ ہم دعائیں کریں یا جادو، وہ ہمیں نہیں ملیں گے۔ ان لوگوں کے ملنے کی خواہش کو ترک کرنا دل مار دیتا ہے۔)

وہ اس کے پیچھے آتا تھا۔ یا اس کا انتظار کرتا تھا۔ پھر آج کیوں نہیں آیا؟

(اور میں ایڈم بن محمد اپنا دل اس امید پہ مار رہا ہوں کہ کبھی نہ کبھی میرا یہ زخم بھر جائے گا۔ کبھی تو میرا خدا میرے دل کو پھر سے تندرست کر دے گا۔)

بورڈنگ میں اب پچیس منٹ رہتے تھے۔ تالیہ نے فون اٹھایا اور فاتح کے گھر کا نمبر ملایا۔

"ہیلو؟" کسی ملازم نے اٹھایا۔

"کیا وان فاتح گھر پہ ہیں؟"

"جی۔ وہ اسٹڈی میں ہیں۔ آپ کون؟" اس نے بنا کچھ کہے فون رکھ دیا۔

(لیکن اب اس زخمی دل کے ساتھ میں آگے کیسے بڑھوں؟ موو آن کیسے کروں؟ کوئی دوست کوئی غم گسار، کوئی ہے میری مدد کے لیے یہاں؟)

وہ گھر پہ تھا؟ اس نے بے یقینی سے فون کو دیکھا۔ اس کا گھر پتراجایا میں تھا۔ ایئرپورٹ سے قریباً گھنٹے بھر کی مسافت پہ۔ وہ اگر آتا بھی تو پچیس منٹ میں یہاں نہیں پہنچ سکتا تھا۔

وان فاتح اس کو روکنے نہیں آئے گا۔ اس کو روکنے کوئی نہیں آئے گا۔

(کچھ فیز ہوتے ہیں جن میں ہمارے اپنے

ہمیں بچاتے ہیں۔ کسی تاریک گلی میں گرے پڑے مرتے ہوئے انسان کو بچالیتے ہیں۔ لیکن ہر فیز میں ہمیں نہیں بچایا جاتا۔)

تالیہ نے بورڈنگ پاس اونچا کر کے دیکھا۔ اسے عقب میں دیوار پہ لگی گھڑی نظر آرہی تھی۔ کوئی اس کو روکنے نہیں آنے والا تھا۔

(کچھ فیز ایسے ہوتے ہیں جن میں کوئی کسی کو بچانے نہیں آتا۔ مووآن کرنے کا فیز بھی ایسا ہی ہے۔)

وہ اٹھی۔ بیک پیک کندھوں پہ ڈالا اور اس دروازے کی سمت بڑھی جس سے وہ آئی تھی۔

(یہ سفر انسان کو تنہا کرنا پڑتا ہے۔ اس میں اپنی بھلائی کے فیصلے بھی اسے تنہا کرنے پڑتے ہیں۔)

واپس باہر نکل کے وہ سیدھی ایک کچرے کے کین تک آئی۔ بورڈنگ پاس کے دو ٹکڑے کیے اور اسے کین میں اچھال دیا۔

(اس فیز میں کوئی اس کی مدد نہیں کر سکتا۔ کوئی اس کو اس کی مشکل سے نہیں نکال سکتا۔ زندگی کے سب سے بڑے فیصلوں میں انسان تنہا ہوتا ہے۔)

اب وہ تیز قدموں سے ٹیکسی اسٹینڈ کی طرف بڑھ رہی تھی۔ اس کے چہرے پہ مسکراہٹ تھی۔

(اور ہم سب کو اپنے مشکل فیصلے خود کرنے کی عادت ڈال لینی چاہیے۔ کسی دوسرے کے آنے کا انتظار کیے بغیر۔)

وہ ٹیکسی کی پچھلی سیٹ پہ بیٹھی شیشے سے باہر بھاگتی عمارتوں کو دیکھ رہی تھی۔ انسان ساری دنیا کا سفر جس خوشی کی تلاش میں کرتا ہے وہ اس کے اپنے شہر اور اپنے گھر میں اس کا انتظار کر رہی ہوتی ہے۔

(کیونکہ اگر ہم اپنی محبت کھو بھی دیں... تب بھی ایک شے ہمارے پاس باقی رہتی ہے۔ وقت۔)

وہ فاتح کے گھر میں داخل ہوتے ہی سیدھی اسٹڈی کی طرف بڑھی تھی۔

(کسی کو اللہ نے شکل زیادہ اچھی دی ہے اور کسی کو دولت۔ ہر شے میں اللہ کی تقسیم مختلف ہے۔ لیکن وقت ہر ایک کو برابر کا ملتا ہے۔ غلام کو بھی۔ بادشاہ کو بھی۔ سب سے بڑا کنگال وہ ہوتا ہے جو وقت ضائع کرے۔)

اس نے دھڑکتے دل کے ساتھ اسٹڈی کا دروازہ کھٹکھٹایا۔

(صرف ایک چیز محبت کے زخم پہ مرہم رکھتی ہے۔ تندرست نہیں کرتی لیکن مرہم ضرور رکھتی ہے۔ اور وہ ہے خود کو کسی نئے خواب کی جستجو میں چھوڑ دینا۔ ایڈم بن محمد نے بھی ایک نیا خواب بُن لیا ہے۔)

☆☆☆

وان فاتح نے دروازہ کھولا۔ وہ کسی اور کے گمان میں کچھ کہنے لگا تھا۔ اسے دیکھ کے وہ رک گیا۔ چند لمحے خاموشی کی نذر ہو گئے۔ دونوں کے درمیان بس ایک کھلا دروازہ تھا۔ اور اس کو پار کرنا وقت کے دروازوں کو پار کرنے سے زیادہ مشکل فیصلہ ثابت ہوا تھا۔

یہ فیصلہ تالیہ مراد کو تنہا ہی کرنا تھا۔

''آپ نے کہا تھا' کبھی مجھ سے ملنے آؤ، حالم۔'' وہ نم آنکھوں سے مسکرائی۔

''اور میں نے کہا تھا کہ کیا تم کوشش نہیں کرنا چاہتیں؟'' اس نے مسکرا کے دروازہ کھول دیا اور خود پیچھے ہٹ گیا۔

''میں کرنا چاہتی ہوں۔'' تالیہ نے اثبات میں سر ہلایا اور چوکھٹ پار کی۔

''میں پوری دنیا کا سفر نہیں کرنا چاہتی فاتح۔ اگر ہم اندر سے ناخوش ہوں تو نہ بڑے گھر ہمیں خوش کر سکتے ہیں نہ ہی دنیا بھر کے خوبصورت نظارے۔ تنہا سفر بہت مشکل ہے۔ اور میں یہ نہیں کر سکتی۔ ہم مختلف ہیں تو کیا ہوا۔ ہم ایک دوسرے کو نہیں سمجھتے تو کیا ہوا۔ ہم ایک جیسے ہوتے تو زندگی بورنگ ہو جاتی۔ ہم ایک کوشش کر سکتے ہیں۔ ساتھ رہنے کی۔ اپنا گھر خود بنانے کی۔''

وہ اسٹڈی کے وسط میں کھڑے ہوئے کہہ رہی تھی۔ اس کا سفید بیک پیک ابھی تک اس کے کندھے پہ تھا۔ اور اس کی سیاہ آنکھوں میں نمی تھی۔

فاتح ٹیبل کے کنارے پہ بیٹھا اور مسکرا کے

سامنے کھڑی لڑکی کو دیکھا۔
"تم مجھے سمجھتی ہو یا نہیں.. میں تالیہ کو اچھے سے سمجھتا ہوں۔ نہ میں سفید ہوں۔ نہ تم سیاہ ہو۔ ہر شخص کا اپنا رنگ ہوتا ہے۔ اور انسان اپنے اصل رنگ سے نہیں بھاگ سکتا۔ مجھے معلوم تھا تم واپس آجاؤ گی۔ میں تمہارے انتظار میں تھا۔ ایک دن بعد یا ایک سال بعد۔ تم ضرور آؤ گی۔"
"اسی لیے آپ میرے پیچھے ایئرپورٹ نہیں آئے؟" اس نے گلہ کیا۔
"نہیں۔ کیونکہ فلائٹ مِس کرنے کا فیصلہ تمہیں اور صرف تمہیں کرنا تھا۔ اور مجھے امید تھی تم یہ ضرور کرو گی۔ میں نے کہا نا' میں تمہیں جانتا ہوں۔"
اس کے سامنے کھڑے ہوئے وہ مسکرا کے کہہ رہا تھا۔
اس کا انداز پرسکون تھا۔ نرم اور اپنائیت لیے۔
"مجھے کیا معلوم کہ آپ کو یقین تھا یا نہیں۔"
اس نے ابرو اٹھایا۔
فاتح نے اس سے نظریں ہٹائے بغیر میز سے ایک فائل اٹھا کے اس کے سامنے کی۔
"میں ایک آرگنائزیشن بنا رہا ہوں جس کا مقصد بے گناہ قیدیوں کو قانون کے شکنجے سے نکالنا ہے۔ لیکن مجھے کیسے معلوم ہوگا کہ کون سا قیدی بے گناہ ہے اور کون جھوٹ بول رہا ہے۔ اس کے لیے مجھے ایک انویسٹی گیٹر چاہیے۔ اور میں نے اپنے لیے کس انویسٹی گیٹر کا نام لکھا ہے.. تم دیکھ سکتی ہو۔"
تالیہ نے خوش گوار حیرت سے فائل کھولی۔
وہاں انویسٹی گیٹر کے خانے میں ایک لفظ جگمگا رہا تھا۔
حالم۔
اور تالیہ بنت مراد کھلے دل سے مسکرا دی۔
وہ ایک دفعہ پھر ایک خواب بُن رہا تھا اور وہ اس خواب میں اس کا ساتھ دینے کے لیے ہمیشہ کی طرح تیار تھی۔

☆☆☆

دو ماہ بعد:

بہار 2023
وہ ایک روشن دن تھا۔ نہ دھوپ تیز تھی نہ چھایا بہت ٹھنڈی تھی۔ بہار کی خوش گوار ہوا سارے میں چل رہی تھی۔
کوآلالمپور کے ڈاؤن ٹاؤن میں ٹریفک سست روی سے چل رہا تھا۔ سڑک کے دونوں اطراف خوب صورت فٹ پاتھ بنے تھے جن پہ لوگ دونوں اطراف میں چلتے ہوئے جا رہے تھے۔
ایسے میں صوفی ایک گتے کی ٹرے میں کافی کے چار بڑے کپ پھنسائے تیز تیز چل رہی تھی۔ تیز چلنے سے اس کی بالیاں جھول رہی تھیں اور ماتھے پہ خفا سی سلوٹیں دکھائی دیتی تھیں۔
اسٹریٹ کے وسط میں اس نے ایک شیشے کا دروازہ کھولا۔ دروازے کے اوپر ایک پلیٹ لگی تھی جس پہ تحریر تھا۔
"ایڈم بن محمد.... کیمپین آفس۔"
صوفی اندر داخل ہوئی تو وہاں باہر سے زیادہ شور سنائی دیا۔ وہ ایک شاپ تھی جو حال ہی میں کرائے پہ لی گئی تھی۔ فرش اور دیواریں خالی تھیں۔ نیا فرنیچر ایک کونے میں رکھا تھا۔ چند ورکرز بھاگتے دوڑتے کام کاج کرتے دکھائی دے رہے تھے۔ کوئی انٹرنیٹ کی وائرز لگا رہا تھا۔ کوئی کمپیوٹرز سیٹ کر رہا تھا۔ کوئی ہدایات دے رہا تھا۔
ایک بڑی شاپ کے تین حصے کر کے درمیان میں دروازے لگائے جا رہے تھے۔ ایک آفس نما کمرے میں صد شکر کہ میز رکھی تھی۔ اس کے پیچھے ایڈم بن محمد بیٹھا تھا۔ وہ لیپ ٹاپ کھولے ساتھ کھڑے لڑکے کو اسکرین پہ کچھ دکھا تا ہدایات دے رہا تھا۔
صوفی اس کی طرف آئی اور کافی کی ٹرے میز پہ رکھی۔
"آپ کی کافی.. باس!" اس کا کپ نکال کے سامنے رکھا۔
"تھینک یو' صوفی۔" ایڈم نے مسکرا کے کپ اٹھایا تو صوفی نے دونوں آنکھیں پھیلا کے تعجب سے

اسے دیکھا۔
"جب آپ نے کہا تھا کہ آپ وان فاتح کی چھوڑی نشست پہ الیکشن لڑیں گے تو مجھے یقین نہیں آیا تھا کہ آپ سیاست میں آ سکتے ہیں۔ لیکن... واؤ... آپ تو مجھ سے خوش اخلاقی سے بات کرنے لگے ہیں۔ آپ کا مستقبل روشن ہے' باس۔"
ایڈم نے جواباً کچھ تیکھا نہیں کہا۔ بلکہ مسکرا کے کافی کا گھونٹ بھرا۔ پھر میز کے پیچھے سے نکلا اور آگے بڑھ گیا۔ صوفی نے دوسرا کپ وہاں کھڑے نوجوان کو تھمایا اور ٹرے لیے ایڈم کے پیچھے آئی۔
"نہیں... بینر کو ذرا دائیں جانب کرو..." وہ کافی کپ پکڑے' گردن اٹھائے' سامنے والی دیوار پہ بینر آویزاں کرتے ورکرز کو کہہ رہا تھا۔ وہ سیڑھی پہ چڑھ کے چھت کے قریب بینر کو چسپاں کر رہے تھے۔ بینر ابھی اکٹھا تھا سو معلوم نہیں ہوتا تھا کہ اس میں کیا لکھا گیا ہے۔
صوفی ٹرے میں دونوں کپ لیے کھڑی وہیں ان نوجوانوں کو بینر آویزاں کرتے دیکھنے لگی۔ پھر کھنکھاری۔
"کہہ دو' صوفی۔ یہی کہنا چاہتی ہو نا کہ میں الیکشن ہار جاؤں گا؟"
"آپ کے پولز اچھے جا رہے ہیں۔ آپٹکس بھی آپ کے حق میں ہیں۔ لیکن..." اس نے سوچنے والے انداز میں کہا۔ "آپ کو یقین ہے کہ آپ ایک ممبر پارلیمنٹ بننا چاہتے ہیں؟"
ایڈم نے چہرہ اس کی طرف موڑا تو لبوں پہ مسکراہٹ اور آنکھوں میں چمک تھی۔
"پتا ہے صوفی... میں کتنی کتابیں لکھ لوں... میں کتنے شوز کر لوں... میں کتنا بول لوں... میں ملک میں اصل تبدیلی نہیں لا سکتا جب تک میں پاور میں نہ ہوں۔ اگر میں ممبر پارلیمنٹ بن گیا تو میرے پاس اختیار ہوگا۔ میں پالیسیز بنا سکوں گا۔ میں کچھ پریکٹیکل کر سکوں گا۔"
"اور آپ کی رائٹنگ؟"
"وہ ساتھ ساتھ چلتی رہے گی۔ جیسے بہت سے سیاستدان کتابیں لکھتے ہیں' میں بھی لکھتا رہوں گا۔" وہ مسکرا کے واپس دیوار کو دیکھنے لگا۔ "تھوڑا سا اور دائیں جانب۔" اونچی آواز میں ہدایت دی۔
"آپ یہ کیوں کرنا چاہتے ہیں؟"
"کیونکہ میں وان فاتح کی جگہ ہوتا تو وہ غلطیاں نہ کرتا جو انہوں نے کیں۔ ان کے کچھ فیصلے غلط تھے۔ صرف ان پہ تنقید کرنا مسئلے کا حل نہیں ہے۔ میں ان کی جگہ لے کر درست فیصلے کرنا چاہتا ہوں۔" گھونٹ بھر کے کپ نیچے کیا اور مسکرا کے بولا۔
"مجھے' صوفی' ایک نیا خواب مل چکا ہے۔"
"ایک نئی کافی لانے والی لڑکی بھی رکھ لیں۔ اب میرے کام بھی بڑھ چکے ہیں۔" وہ منہ بنا کے پیچھے سے پکار کے بولی۔
ایڈم اسے نظر انداز کیے ہال نما شاپ کے دوسرے کونے کی جانب بڑھ گیا۔ وہاں ایک میز پہ دو ورکرز کھڑے کمپیوٹرز سیٹ کر رہے تھے۔ داتن ان کے سر پہ کھڑی ہدایات دے رہی تھی۔ ایڈم کی طرف اس کی پشت تھی۔
"تھینک یو... داتن..." اس نے مسکرا کے اسے مخاطب کیا تو وہ گھومی۔ عینک کے اوپر سے اسے دیکھا۔ اور کندھے اچکائے۔
"اب تم غلطی کرنے کا سوچ ہی چکے ہو تو ظاہر ہے مجھے تمہارا ساتھ دینا پڑے گا۔" گہری سانس لے کر بولی۔
"ہاں نا... آخر دوست کس لیے ہوتے ہیں؟" وہ مسکرا کے اطراف میں دیکھ رہا تھا۔ اتنے دن سے اس آفس پہ کام جاری تھا اور بالآخر اس کی شکل نکلتی آ رہی تھی۔
"تمہارے مخالف امیدوار پہ میں نے اپوزیشن ریسرچ کی ہے۔ تمہارے کام آئے گی۔" داتن نے معنی خیز انداز میں ایک فولڈر اس کے سامنے رکھا۔ وہ اسے دیکھ کے سوچ کے بولا۔
"آپ کو کیا لگتا ہے... میں یہ الیکشن جیت

جاؤں گا؟"

"مجھے لگتا ہے کہ تم جیت بھی جاؤ... تب بھی سیاست میں آنا تمہاری غلطی ہے... اور ہر انسان کو اپنی غلطی خود کرنے دینی چاہیے۔"

"اچھا... اگر میں اتنا غلط ہوں تو آپ میرا ساتھ کیوں دے رہی ہیں؟"

"کیونکہ لڑکے! الیکشن اس دنیا کا مہذب ترین 'کون' ہے۔ اور میں اس کون گیم کا حصہ ضرور بننا چاہوں گی۔"

داتن مسکرا کے بولی۔ "اور تم اگر ممبر پارلیمنٹ بننے میں خوش ہو تو میں بھی خوش ہوں۔"

"ممبر پارلیمنٹ؟ اونہوں۔" ایڈم نے کافی کا گھونٹ بھرا اور اسے باہر آنے کا اشارہ کیا۔ دونوں ساتھ ساتھ چلتے ہال کے وسط میں آئے۔ نوجوان اب بینر چسپاں کر چکے تھے۔ ایک نے ڈوری کھولی اور نیچے گرا دی۔ کسی آبشار کی طرح بینر نیچے گرا اور ساری دیوار پہ چھا گیا۔

"میں ممبر پارلیمنٹ نہیں... ایک دن اپنے ملک کا وزیر اعظم بنوں گا... لیانہ صابری۔"

"وزیر اعظم؟" لیانہ نے تعجب سے اسے دیکھا۔

"ہاں... کیونکہ اگر میرا خواب مجھے ڈرائے گا نہیں تو یہ بڑا خواب نہیں ہوگا۔"

وہ چہرہ موڑ کے دیوار کو دیکھنے لگا۔ وہاں نیلے رنگ کے انتخابی نشان کے ساتھ ایڈم کا سوٹ میں ملبوس فل سائز پورٹریٹ نظر آ رہا تھا۔ سارے ورکرز اور اسٹافرز اپنے اپنے کام روک کے اس خوب صورت اور بارعب پوسٹر کو دیکھ رہے تھے۔ گردنیں اٹھائے۔ آنکھوں میں چمک لیے۔ منہ سے واؤ کہتے... توصیفی انداز میں سر دھنتے....

ایک نئے خواب کا سفر شروع ہو چکا تھا۔

☆☆☆

وہ ایک طویل سڑک تھی۔ شہر کے مضافات میں واقع یہ جگہ ایک ننھی سی پہاڑی کی مانند تھی۔ یہاں بے ہنگم ٹریفک کا شور تھا نہ دھواں۔ دور دور تک سبزہ زار تھا اور درمیان میں بنی یہ سڑک۔

سڑک کے دونوں اطراف میں چیری بلاسم کے درختوں کی قطار تھی۔ درخت اتنے گھنے تھے کہ یہ دھوپ کا راستہ روکے ہوئے تھے۔ سڑک پہ چھایا سی تھی۔

درختوں کے اوپر تازہ تازہ پھول کھلے نظر آ رہے تھے۔ گلابی اور سفید پھول... اتنے نرم گویا کاٹن کینڈی ہوں.. یا... بادل کے ٹکڑے۔

سڑک کے اختتام پہ ایک گھر تھا۔ دو منزلہ لکڑی کا گھر جس کی مخروطی چھت بھی لکڑی کی بنی تھی۔ اس کی بالائی بالکونی کے کھلے دروازے سے لگتا تھا کہ وہ کسی کا گھر ہے۔

البتہ نچلی منزل کے ہال کمرے میں لگی میز کرسیوں سے معلوم ہوتا تھا کہ یہاں کوئی قہوہ خانہ تھا۔ دروازے پہ لگی لکڑی کی تختی پہ انگریزی میں "جیا" لکھا تھا۔

اندر آؤ تو وہ کوئی سیاحوں کے لیے خصوصی طور پہ بنائی کافی شاپ تھی۔ اس کو قدیم زمانے کے آرکیٹیکچر پہ آراستہ کیا گیا تھا۔ آئل پیسٹل سے بنی قدیم ملاکہ کی یادگار پینٹنگز۔ برتن بھی پرانی طرز کے تھے۔

البتہ دیوار پہ لگا مینیو نئے زمانے کا تھا۔ گو کہ ویٹرز پرانے زمانے کے سفید باجو کرنگ میں ملبوس تھے لیکن کافی کے روسٹ ہوئے بینز کی مہک بتاتی تھی کہ وہ ایک تھیمڈ کافی شاپ تھی۔

شاپ کے مالک بالائی منزل پہ رہتے تھے۔ باہر سے اندازہ ہوتا تھا کہ ان کی رہائش گاہ چھوٹی اور سادہ سی ہے۔ شہر سے دور... خوبصورت مگر سادہ سے طرز زندگی۔ اور سامنے چیری بلاسم کے درختوں کی قطار۔

درختوں کی اس دو رویہ قطار کے ساتھ ایک جگہ سڑک کنارے ایک بنچ رکھا تھا۔

اس بنچ پہ فاتح بیٹھا تھا۔ سیاہ ڈریس شرٹ پہنے' آستین پیچھے کو موڑے' وہ ٹانگ پہ ٹانگ جمائے' ایک فائل کی ورق گردانی کر رہا تھا۔ دفعتاً اس نے سر اٹھا کے دیکھا تو سامنے کافی شاپ سے تالیہ چلی آ رہی تھی۔

اس کے کھلے بال کندھوں سے نیچے گر رہے تھے۔اس نے سادہ باجو کرنگ پہن رکھا تھا۔ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی جس سے بال اڑ رہے تھے۔اس کے ہاتھ میں کافی کے دومگ تھے۔فاتح نے اسے دیکھا اور مسکرایا۔وہ بھی مسکرا دی۔پھر قریب آئی اور ایک مگ اسے تھمایا۔

''تھینک یو۔'' اس نے مسکرا کے مگ تھاما۔وہ اپنا مگ لیے ساتھ بیٹھی اور گردن اٹھا کے درختوں کو دیکھا۔

''ساکورا ہانامی...بالآخر ان درختوں نے پھول اٹھا لیے ہیں۔''

''ہاں۔اور دیکھو یہ کتنے خوبصورت ہو گئے ہیں۔جب ہم نے یہ گھر لیا تھا تب یہ ویران اور خالی تھے۔لیکن وقت انسان کو پھل دے دیتا ہے۔'' وہ دونوں ساتھ ساتھ بنچ پہ بیٹھے درختوں پہ آئی بہار دیکھ رہے تھے۔

''وقت۔'' وہ مسکرائی۔پھر جیسے کچھ یاد آیا۔

''آپ کی سکندر سے بات ہوئی؟''

''وہ کال کرلے گا۔'' وہ مطمئن تھا۔جب تالیہ ان کی فیملی کا حصہ بنی تو سکندر اور جولیانہ نے ان کے ساتھ رہنے سے انکار کر دیا تھا۔جولیانہ نے کہا کہ وہ بورڈنگ شفٹ ہونا چاہتی ہے اور زندگی میں پہلی دفعہ ایک نارمل ہائی اسکول میں داخلہ لینا چاہتی ہے۔سکندر اپنی یونیورسٹی کے ہاسٹل میں شفٹ ہو گیا تھا۔جولیانہ باپ کو فون کرتی تھی اور ایک دفعہ ملنے بھی آئی تھی لیکن سکندر نے رابطہ منقطع کر رکھا تھا۔

''اور اگر اس کی ناراضی ختم نہ ہوئی؟'' تالیہ نے افسوس سے پوچھا۔

''تالیہ...اگر مجھے لگتا کہ وہ اپنی ناراضی ختم نہیں کرے گا تو میں اسے ہاسٹل نہ جانے دیتا۔وہ میرا بیٹا ہے۔میں اسے جانتا ہوں۔وہ چند ماہ میں ٹھیک ہو جائے گا۔''

وہ مسکرا دی۔جو شخص اس کے ساتھ بیٹھا تھا وہ ایسا ہی تھا۔ہر حالت میں پرامید۔ہر شخص کے اندر کی اچھائی پہ یقین رکھنے والا۔

''فاتح...میں خوش ہوں۔اس بات پہ کہ میں نے درست فیصلہ کیا۔'' ہوا چیری بلاسم کی شاخوں کے درمیان سے سرسراتی ہوئی گزر رہی تھی۔وہ دونوں ایک گلابی لبادہ اوڑھے درخت تلے بیٹھے تھے۔تالیہ بول رہی تھی اور وہ مسکراتے ہوئے اسے سن رہا تھا۔ہوا سے اس کے بال پیچھے کو اڑ رہے تھے۔

''اگر اس روز میں آپ کو چھوڑ کے چلی جاتی تو میں بہت اکیلی رہ جاتی۔میں دنیا میں کھو جاتی اور میری دنیا میرے اندر کھو جاتی۔میں یہ نہیں کہتی کہ اب میں نے خود کو دریافت کر لیا ہے لیکن میں کوشش کر رہی ہوں۔'' پھر اس نے فاتح کے ہاتھ میں پکڑی فائل کو دیکھا۔''ان لوگوں کے کام آنا...ان کے لیے عدالتوں میں لڑنا...یہ بہت تھیراپیوٹک ہے' فاتح۔مجھے یہ سکون دنیا کی کسی وادی' کسی ساحل پہ نہ ملتا۔اگر میں آپ کو چھوڑ جاتی تو میں بہت اکیلی رہ جاتی۔''

وہ یہ اعتراف آج کل اکثر کیا کرتی تھی۔ بالآخر وہ خوش تھی اور اپنی خوشی اسے تعجب میں مبتلا کر دیتی تھی۔

''اور میں بھی اس بات پہ خوش ہوں کہ تم نہیں گئیں۔مجھے یقین تھا کہ تم نہیں جاؤ گی۔جب میرے ہاتھ سے کرسی نکلی تو بہت سے لوگ ساتھ چھوڑ گئے، صرف تم نہیں گئیں۔لیکن تالیہ اگر تم چلی جاتیں تو میرے پاس کچھ بھی نہ بچتا۔میں نہیں جانتا کہ اصل محبت کیا ہوتی ہے۔عصرہ کہا کرتی تھی کہ وان فاتح کو صرف وان فاتح سے محبت ہے۔یا شاید آریانہ سے۔'' وہ یاد کر کے سوگوار سا مسکرایا۔''لیکن جو میرے اور تمہارے درمیان ہے۔وہ محبت سے زیادہ قیمتی ہے۔اس لیے..میں بھی خوش ہوں کہ تم نہیں گئیں۔''

ہوا کا ایک تیز جھونکا آیا تو تالیہ نے پل بھر کو آنکھیں موند لیں۔پھر گردن اٹھا کے اوپر دیکھا۔سر پہ گلابی پھولوں کی چھاتا تنی تھی۔

''میں کبھی کبھی اس بات پہ حیران ہو جاتی ہوں کہ میں بالآخر خوش کیسے ہوں۔میں کبھی زندگی میں ایک لمبا عرصہ اتنا خوش نہیں رہی۔''

''کیا اب تمہیں وہ سفید ہرن نظر آتا ہے؟''
''بہت کم۔'' وہ اوپر نظر آتے پھولوں اور ان کے جھروکے سے دکھائی دیتے آسمان کو دیکھ رہی تھی۔
''لیکن میں خوش ہوں کہ اب مجھے وہ خواب بھی نہیں دکھائی دیتے۔ مجھے زندگی ان پریڈیکٹیبل اچھی لگ رہی ہے۔ کسی ایک خواہش کے پیچھے اندھا دھند بھاگنے کے بجائے... سکون سے لوگوں کے کام آنا... اور سادگی سے رہنا... مستقبل کی فکر اور ماضی کے ملال سے خود کو آزاد کر کے رہنا اچھا لگ رہا ہے۔ لیکن فاتح...'' اس نے گردن نیچے کی اور اس کی طرف دیکھا تو اس کی آنکھوں میں ڈر سا تھا۔
''کیا یہ سب ہمیشہ ایسا رہے گا؟ ہم ہمیشہ ایسے خوش رہیں گے؟''
اس نے گہری سانس لی۔ کافی کا آخری گھونٹ بھرا اور فائل بند کی۔
''نہیں تالیہ۔ وقت ایک سا کبھی نہیں رہتا۔ یہ سارے چیری بلاسم بھی ایک دن گر جائیں گے۔ اگلی بہار میں یہ درخت پھر سے پھول اٹھا لیں گے۔ درخت کبھی پھول دیتا ہے۔ کبھی پھل۔ اور کبھی اس پہ پت جھڑ کا وقت آ جاتا ہے۔ شاید کچھ عرصے بعد ہم دونوں بھی ایک بورنگ روٹیننگ کپل بن جائیں۔ لیکن یہ اہم نہیں ہے۔ اہم یہ ہوتا ہے کہ انسان پہ جیسا بھی وقت آئے... وہ اپنی ذات سے دوسرے انسانوں کی بھلائی کے کام کرتا رہے۔''
''اور ان کاموں کے لیے اگر ہم ابھی شہر کے لیے نہ نکلے تو ہمیں دیر ہو جائے گی۔'' وہ دونوں ایک ساتھ اٹھے۔ تالیہ نے خالی مگ کچرے کے کین میں ڈالے۔ پیچھے مڑ کے کافی شاپ کے دروازے پہ کھڑے ہیڈ ویٹر کو ہاتھ ہلایا۔ اس نے ماتھے تک ہاتھ لے جا کر سلام کیا۔ پھر وہ فاتح کے ساتھ آگے بڑھ گئی۔
چیری بلاسم کے درختوں کے سایے میں وہ دونوں چلتے جا رہے تھے۔
''آپ ہمیشہ یہ کیوں کہتے ہیں کہ آپ نہیں جانتے محبت کیا ہوتی ہے؟'' وہ آگے بڑھتے ہوئے بولی۔ ''میں تو ہمیشہ بڑے فخر سے کہتی ہوں کہ مجھے آپ سے محبت تھی اسی لیے میں اس روز ائیر پورٹ سے واپس آئی۔''
''ہر بات بار بار بتانا ضروری ہے کیا؟'' وہ گہری سانس لے کر بولا۔ وہ دونوں اب بینچ سے دور ہوتے جا رہے تھے۔ یہاں سے ان کی پشت دکھائی دے رہی تھی۔
''کچھ باتیں آپ ایک دفعہ بھی نہیں بتاتے۔''
''مثلاً؟''
''آپ نے مجھے کبھی نہیں بتایا کہ چابی کے بدلے آپ نے یان سوفو کو کیا دیا تھا؟'' وہ مسکراہٹ دبا کے بولی۔ یہ بات اس کا فاتح کو تنگ کرنے کے لیے ایک ہتھیار کی حیثیت اختیار کر چکی تھی۔
''تالیہ... ریلیکس۔'' اس نے گہری سانس لی۔
''میں نے اسے کچھ نہیں دیا تھا۔''
''آپ یہ کہہ رہے ہیں کہ اس نے اپنے دل کی اچھائی کے ہاتھوں مجبور ہو کے ہمارے لیے چابی بنائی؟ ناممکن۔''
''میں یہ کہہ رہا ہوں کہ میں نے اسے کچھ نہیں دیا تھا۔ سوائے بھاگ جانے کے محفوظ راستے کے۔ اس نے بغاوت میں اپنی جان بچا لی... کیا یہی کافی نہیں ہے؟'' وہ دونوں اب دور سے بہت چھوٹے نظر آ رہے تھے۔ ان کی آوازیں مدھم ہو چکی تھیں۔
ہوا کا ایک تیز جھونکا آیا۔ اور بینچ کے قریب ایک گلابی چیری بلاسم کا پھول ٹوٹ کے آن گرا۔

☆☆☆

563 برس قبل، قدیم ملاکہ کے سلطنت محل کے اس منظر میں واپس چلتے ہیں جب وان فاتح ملکہ یان سوفو کے سامنے کھڑا تھا۔
اس نے ایک رقعہ ملکہ کی طرف بڑھایا تھا۔ ملکہ نے کاغذ کی تہیں کھول کے اسے پڑھا۔ پھر چونک کے چہرہ اٹھا کے اسے دیکھا۔ پھر اس نے تمام کنیزوں اور غلاموں کو وہاں سے جانے کا اشارہ کیا۔
جب وہ دونوں تنہا رہ گئے تو ملکہ نے اسے

قریب آنے کا اشارہ کیا۔ سیاہ قبا میں ملبوس فاتح مسکرایا اور اس کے عین سامنے آکھڑا ہوا۔
"بغاوت؟ میرے آقا کے خلاف بغاوت ہو رہی ہے؟ کیا تم بھی اس کا حصہ ہو؟" وہ تندی سے اسے دیکھتے ہوئے بولی۔
جواب میں فاتح وہ سب کہتا گیا جو وہ کہنے آیا تھا۔
"آپ یہ بات پہلے ہی جانتی ہیں کہ میں اور تاشہ وقت کے مسافر ہیں۔ ہمیں اپنی دنیا میں واپس جانا ہے۔ صرف آپ ہماری مدد کر سکتی ہیں۔ میں آپ کو راجہ کا سامان لا کے دے سکتا ہوں۔ آپ نے ہمیں چابی بنا کے دینی ہوگی۔"
"اور بدلے میں؟"
"بدلے میں میں آپ کو بغاوت کی خبر دے رہا ہوں۔ آپ یہاں سے فرار ہو کے اپنی جان بچا لیجیے گا۔"
"وان فاتح..." وہ مسکرائی۔ "تم نے اپنے پتے جلد دکھا دیے۔ بہت جلد۔ میں چابی بنانے سے انکار بھی کر سکتی ہوں اور بغاوت کے بارے میں تم پہلے ہی بتا چکے ہو۔ میرا کوئی نقصان نہیں ہوگا۔" اس نے رقعہ میز پہ ڈال دیا۔ "اور تمہیں کیوں لگا تھا کہ میں تمہیں چابی بنا دوں گی؟"
"میں آپ کو بدلے میں اس اطلاع سے زیادہ کچھ نہیں دے سکتا، ملکہ۔ آپ چاہیں تو مجھے چابی بنا کے نہ دیں۔ لیکن اس چابی کو بنا کے آپ خود کو کیا کچھ دے سکتی ہیں، یہ سوچا ہے آپ نے؟"
ملکہ نے تھوک نگلا۔ اس کے تاثرات قدرے بدلے۔ "تمہاری پیشکش کیا ہے؟"
"میں نے کہا نا... میں آپ کو کچھ نہیں دے سکتا۔ لیکن... آپ خود کو ایک تحفہ دے سکتی ہیں۔ اس دنیا میں آپ کے لیے کچھ نہیں رکھا۔ ہماری کتابوں میں لکھا ہے کہ آپ چند سال بعد طاعون سے ہلاک ہو جائیں گی لیکن تب تک آپ کئی سال سے گمنامی میں ہوں گی۔ کسی کو نہیں معلوم کہ وہ سچ تھا یا جھوٹ۔ مستقبل کا حال کسی کو معلوم نہیں ہوتا، ملکہ۔ آپ اپنا مستقبل خود بنا سکتی ہیں۔"

یان سوفو کھڑی ہو گئی۔ اس کی رنگت گلابی پڑ چکی تھی۔ "کیا تم مجھے اپنی دنیا میں لے جا سکتے ہو؟"
"میں آپ کے لیے کچھ نہیں کروں گا۔ لیکن اگر آپ میرے لیے چابی بنا سکتی ہیں تو اپنے لیے چابی آپ کو خود بنانی ہو گی۔" اس نے شانے اچکا دیے۔ "اور میری مدد کے بغیر آپ ایک چابی بھی نہیں بنا سکتیں۔"
وہ چند لمحے وہیں کھڑی رہی۔ اس کے چہرے پہ ایک رنگ آ رہا تھا اور ایک جا رہا تھا۔ آنکھوں میں عجیب سا سحر چھانے لگا تھا۔
"تمہاری دنیا کیسی ہے، وان فاتح؟"
"آپ کی دنیا جیسی نہیں ہے۔"
"اونہوں... کچھ تو ہے اس دنیا میں جو تم دونوں ملاکہ کی حکمرانی کو ٹھوکر مار کے واپس اس میں جانا چاہتے ہو۔ کچھ تو جادوئی ہے تمہاری دنیا میں۔" وہ پراسرار انداز میں مسکرائی۔ "چلو آج سے ہم اپنی دشمنی ختم کرتے ہیں۔ میں تمہارے لیے چابی بنا دوں گی۔ اور تم مجھے یہاں سے جانے کا محفوظ راستہ دے دو گے۔"
فاتح نے اثبات میں سر کو جنبش دی۔ وہ منظر وقت کی دھول میں تحلیل ہو گیا۔

☆☆☆

واپس 2023 کے بہار کے موسم میں آتے ہیں۔
ملاکہ شہر کے اس قدیم چرچ کے اندر ایک اعترافی کمرہ بنا تھا۔ وہ چرچ اب خالی تھا اور ویران تھا۔ اندر کوئی ذی نفس نہ تھا۔ ایسے میں اس اعترافی کمرے کے فرش سے کھڑ پڑ کی آواز سنائی دینے لگی۔ چرچ کے ہال میں پھرتے چوہے تیزی سے کونوں کھدروں میں جا دبکے۔
فرش پر بنا ڈھکن ہٹا کے ایک ہاتھ اوپر آیا۔ پھر پورا وجود۔ اوپر آ کے اس نے ڈھکن بند کیا۔ چغے میں ملبوس اس وجود نے لباس سے گرد جھاڑی۔ پھر اعترافی کمرے کا جالی دار دروازہ کھولا۔ پھر اس نے چغے کی ٹوپی پیچھے گرائی اور گردن اٹھا کے اس قدیم چرچ کو دیکھا۔

یان سوفو کا چہرہ کھڑکی سے آتی مدھم روشنی میں بھی دمک رہا تھا۔ وہ آج بھی ویسا ہی تھا۔ دودھ کی طرح ملائم اور نازک۔

اس کے چغے کے اندر ایک پوٹلی بندھی تھی جس میں سونے چاندی اور قیمتی ہیروں سے مزین زیورات تھے۔ گردن میں ایک زنجیر تھی جس سے ایک سنہری چابی لٹک رہی تھی۔ یان سوفو قدم قدم چلتی... اردگرد تعجب سے دیکھتی... چرچ سے باہر نکلی...

دروازہ بند کرتے ہوئے اس نے جھک کے چابی پہ پھونک ماری۔ ایک پنکھ سا اس سے نکلا... اور ہوا میں سست روی سے اڑنے لگا۔ وہ اس پنکھ کا تعاقب کرنے کے لیے پلٹی تو ٹھٹھک کے رک گئی۔

اس کے سامنے ایک لمبی سڑک تھی۔ سڑک کے گرد دور تک دکانیں تھیں۔ ریستوران تھے۔ وہاں تیز آوازیں تھیں۔ زن سے گزرتی گاڑیاں تھیں۔ وہ بے یقینی سے ایک سرے سے دوسرے سرے تک جاتی گاڑیوں کو دیکھ رہی تھی۔ وہ اتنی تیز چلتی تھیں گویا کسی کے اوپر سے گزر جائیں گی۔

اس کی متحیر نظریں فٹ پاتھ پہ چلتے لوگوں پہ پڑیں۔ انہوں نے بہت سے رنگ پہن رکھے تھے۔ ایسے رنگ جو یان سوفو نے کبھی دیکھے بھی نہ تھے۔ وہ چمکتے ہوئے ہنستے مسکراتے لوگ تھے۔ ان کے ہاتھوں میں چمکتی چیزیں تھیں۔ ان کے جوتے تک چمک رہے تھے۔

وہ پنکھ کے تعاقب میں آگے بڑھی لیکن اس کی متحیر نظریں ابھی تک اطراف کا جائزہ لے رہی تھیں۔

سڑک کنارے جگہ جگہ کارٹ دھکیلتے لوگ کھڑے تھے۔ ان کے کارٹ میں رنگ برنگی چیزیں تھیں۔ گلابی روئی جیسی کپاس سے بنی چیزیں۔ ہر رنگ کے مشروب کی بوتلیں۔

آسمان سے زوردار چنگھاڑ سنائی دی تو اس نے گھبرا کے سر اٹھایا۔ اس کے عین سر کے اوپر سے ایک اڑن کھٹولا تیزی سے گزر رہا تھا۔ یان سوفو نے دھیرے سے چہرہ نیچے کیا۔ سامنے کھڑا ایک شخص اپنے ہاتھ میں پکڑے ریموٹ کی مدد سے ایک ڈرون کیمرے کو فضا میں اڑا رہا تھا۔ اس کا کیمرہ کسی اڑنے والی مکڑی کی طرح درختوں کے اوپر ہوا میں تیر رہا تھا۔

یان سوفو کے لب بالآخر مسکراہٹ میں ڈھلے۔ یہ دنیا بہت خوب صورت تھی۔ یہ دنیا جادوئی دنیا تھی۔ شاہِ چین کی بیٹی کو اس کو خوابوں کی طلسماتی سرزمین مل گئی تھی۔

لیکن اس سے پہلے اسے پمبورو کے راہبر کو ڈھونڈنا تھا۔ وہ پنکھ کے پیچھے چپ چاپ چلتی گئی۔ وہ اسے گھاس اور پارک کے اندر سے گزارتا آگے لے جا رہا تھا۔ اس کے جادو نے اسے بتایا تھا کہ سابقہ پمبورو راہنما اپنا جادو اور ذہنی توازن دونوں کھو چکا تھا۔

اور پمبورو راہبر کی جگہ کبھی خالی نہیں رہتی۔ وہ جگہ اب بھر چکی تھی۔ اور جس نے اس جگہ کو بھرا تھا... یان سوفو اس کا چہرہ اپنے پیالے میں دیکھ چکی تھی۔ اسے وہ چہرہ پسند آیا تھا۔

اسے وہ پنکھ اسی کے گھر لے جا رہا تھا۔

قریباً دس منٹ تک چلتے رہنے کے بعد بالآخر شاہِ چین کی بیٹی ایک کالونی کے سرے پہ آرکی۔ اس کالونی میں گھروں کی ایک قطار تھی۔

وہ پنکھ تیسرے نمبر کے گھر کے گیٹ کے پاس زمین پہ گر گیا تھا۔

یان سوفو نے مسکراتی نظریں اٹھائیں۔ اب اسے اس گھر کا دروازہ کھٹکھٹانا تھا اور شکار باز راہبر سے ملاقات کرنی تھی۔ راہبر کو معلوم تھا کہ وہ آرہی ہے۔ اور راہبر کو اس کا انتظار تھا۔

اس نے چغے کی ٹوپی پیچھے پھینکی اور پورے اعتماد سے آگے بڑھ گئی۔ پھر لکڑی کے گیٹ میں ہاتھ ڈال کے اسے کھولا اور اندر چلی آئی۔ اب وہ مرکزی دروازے کی طرف جا رہی تھی اور چھوٹے باغیچے میں لگے پھول اس کو دلچسپی سے دیکھ رہے تھے۔

سبز گھاس پہ اگے گہرے اور ہلکے نیلے پھول۔

جامنی اور پیلے پھول۔

سرخ اور نارنجی پھول۔

☆

نعیمہ ناز سلطان

تم مجھ سے نہ کہنا

انا بی کا بس نہیں چل رہا تھا۔ فجر کے بعد ہی کچن کی سرگرمیاں شروع کر دیتیں مگر بس...... یہ جو بس تھا یہ تھوڑا بہت بریرہ پر ہی چلتا تھا۔

حمرہ تو کچن کے نام پر کانوں کو ہاتھ لگانے کے بجائے ان میں ہینڈ فری ٹھونس لیتی تھی اور انا بی کی ڈانٹ ڈپٹ جو بالآخر سگھڑاپے کی ایک طویل تقریر پر ختم ہوتی تھی، وہ بریرہ کی سماعتوں کو ہی برداشت کرنی پڑتی تھی۔

"ارے بٹیا! آج تو چھٹی کر لیتیں۔" حمرہ کی تیاری دیکھ کر انا بی بلبلائیں۔ یہ لڑکی بھی بس......

"جلدی آ جاؤں گی۔ آج سٹرڈے ہے۔ اسکول تو آف ہے، ٹیچرز میٹنگ ہے۔ دو تین گھنٹے لگیں گے بس...... لیکن جانا ضروری ہے۔"

حمرہ نے جلدی جلدی بولتے ہوئے، اس سے بھی جلدی بالوں میں برش پھیر کر ہیئر اسپرے کیا اور دوپٹا اٹھایا۔ موبائل کا چارجر نکال کر اسے بیگ میں ڈالا اور اللہ حافظ کہتی ہوئی نکل گئی۔

"یہ لو...... یہ تو گئیں، اب کیا ہوگا۔" انا بی تو یوں متفکر تھیں جیسے آج کا پورا دن حمرہ بی بی کو ہی باورچی خانہ سنبھالنا تھا۔

"آپ کیوں پریشان ہو رہی ہیں؟ ریلیکس۔ وہ یہاں ہوتیں بھی تو انہیں کچھ نہیں کرنا تھا۔ سوائے ہر دو تین گھنٹے بعد چائے کا مگ مانگنے کے۔ مجھے بتا دیں، کیا کرنا ہے؟" بریرہ نے انہیں تسلی دی۔

"اصولاً تو حمو کو ہی چیزیں بنانا چاہئیں، آخر کو اس کے سسرال والے آ رہے ہیں۔" انا بی فریزر کھول کر جائزہ لے رہی تھیں۔

مکمل ناول

"اوئی، یہ نگوڑ مارے کباب اتنے سے رہ گئے۔ پچھلے ہفتے تو بنا کے رکھے تھے۔" انابی نے مایوسی اور بے بسی سے شاپر میں موجود گنتی کے چند کباب دیکھے اور فریزر بند کردیا۔

"کیونکہ آپ کی وہ نگوڑ ماری اور چہیتی بھانجی صاحبہ مارے باندھے کچن میں اگر آتی ہیں تو اسی غرض سے کہ کباب فرائی کیے اور سلائس میں دبا کے کھالیے۔"

بریرہ نے انہیں اطلاع دی تو انہوں نے سچ مچ سر پکڑلیا۔

"کیا بنے گا اس لڑکی کا؟"

"حالانکہ سوچنا تو یہ چاہیے کہ کیا بنے گا اس لڑکے کا؟" بریرہ نے مسکرا کر اپنی پیاری دادی جان کو دیکھا، جو اپنے ہونے والے داماد پر بھی ایسے ہی واری صدقے تھیں جیسے کہ اپنی بھانجی اور پوتی پر۔

"اللہ خیر کرے گا، سب ٹھیک ہوہی جائے گا۔ تم ایسا کرو بٹیا کہ کبابوں کے لیے گوشت اور دال ابلنے کو رکھ دو۔ ککر میں چڑھا دو، جلدی بن جائیں گے اور میرا بچہ! فٹا فٹ گاجریں کش کرلو۔ کچھ میں بھی کروالوں گی۔ دوپہر تک کباب اور حلوہ بن جائے تو مجھے اطمینان ہوجائے۔"

دادی جان نے حکم بھی بڑی لجاجت سے دیے تھے۔ پرانی ملازمہ کی زچگی کے سبب اسے چھٹیاں دی ہوئی تھیں، وگرنہ بریرہ کے لیے اتنا کام اکٹھا نہ ہوتا۔

دوپہر میں ایک ڈیڑھ بجے تک جب حمرہ واپس آئی تو بریرہ کبابوں کی ٹکیاں بنارہی تھی اور انابی گاجر کے حلوے میں چمچہ چلارہی تھیں۔

"اف...... کتنی مزے کی خوشبوئیں اٹھ رہی ہیں۔ پیٹ میں دوڑتے چوہوں کی بھی رال ٹپک پڑی۔" حمرہ بیگ صوفے پر پھینک کر سیدھی کچن میں ہی وارد ہوگئی۔

"چکھا نا تو، نمک مرچ ٹھیک ہے یا نہیں؟" حمرہ نے کباب کی ایک ٹکیہ اٹھائی اور کھانے لگی۔

"اسکول والے چھٹی کے دن میٹنگ پر بلا لیتے ہیں۔ کھانے پینے کو کچھ نہیں دیتے؟" انابی نے چولہے کی آنچ دھیمی کی۔ حلوہ اب سمٹ رہا تھا۔ گھی اوپر آگیا تھا۔

"ریفریشمنٹ دیا تھا، سب ہضم ہوگیا اور یہ آپ کیا کررہی ہیں؟" حمرہ نے آگے بڑھ کر پتیلے میں جھانکا۔

"واؤ، گاجر کا حلوہ۔ بن گیا......؟ ٹیسٹ کروں؟"

"ہرگز نہیں۔ مہمانوں کے لیے بنایا ہے۔ شام سے پہلے کوئی ہاتھ بھی نہ لگائے۔" انابی نے اعلان کرکے ڈھکن بند کیا۔

"مہمان......؟ اوہ...... تو یہ سب ان کی خاطر داری کے لیے ہورہا ہے۔ کیا ضرورت ہے خود کو ہلکان کرنے کی۔ بازار میں ایک سے ایک چیزیں ملتی ہیں، منگوا لیتے باہر سے۔" حمرہ نے اعتراض کیا۔

"اے لو۔ بازار کی چیزوں پر تو ہم نے کبھی عام مہمانوں کو نہیں ٹرخایا۔ یہ تو خاص مہمان ہیں۔ دو چار چیزیں تو گھر کی بنی ہوئی ہونی چاہئیں۔ مہمان کو اپنی عزت اور اہمیت کا احساس ہوتا ہے۔" انابی سٹر پٹر چلتی ہوئی باہر آگئیں اور لاؤنج میں بچھے صوفے پر براجمان ہوگئیں۔

"ایویں، دوسروں کے لیے خود کو تھکانے کی کیا ضرورت ہے۔ آن لائن آرڈر کرکے شام میں سب چیزیں منگوا لیتے۔" حمرہ نے کباب کا آخری ٹکڑا منہ میں رکھتے ہوئے پھر اپنی بات دہرائی۔

"ہاں بھئی! کیوں نہیں۔ اب تو سارے کام اس موئے "آن لائن" نے سنبھال لیے ہیں۔ ایسا کرتے ہیں، شادی بھی آن لائن کردیتے ہیں تمہاری۔ نہ کوئی آوے، نہ کوئی جاوے۔" انابی کے جلال کا وقت شروع ہوگیا تھا۔ حمرہ کان دبا کر فوراً اندر سٹک لی۔

"ویسے آئیڈیا برا نہیں ہے۔ آن لائن شادی، کم لوگ...... کم خرچ...... کم سیاپے......" کپڑے تبدیل کرتے ہوئے حمرہ اس نئے خیال پر غور کررہی

تھی۔

☆☆☆

دو دن میں آگے پیچھے سارے مہمان آ گئے اور فلیٹ کے دونوں بیڈ روم، ڈرائنگ روم اور ٹی وی لاؤنج ہر جگہ بڑوں اور بچوں سے بھر گئی بلکہ کچن اور باتھ روم بھی خالی نہیں تھے کہ ایک جگہ خواتین اور دوسری جگہ کو بچوں نے ٹھکانا بنایا ہوا تھا۔

"کیسی ہے لڑکی، خوب صورت بھی ہے یا ایویں لٹو ہو گئے؟" بڑی بھابھی نے اپنے مخصوص تیکھے انداز میں سوال کیا۔

"آپ لوگ جا تو رہے ہیں، دیکھ لیجیے گا۔" فخر حیات نے لاپروائی سے جواب دیا۔

"ظاہر ہے جہاں تمہاری مرضی ہو گی وہیں جانا پڑے گا۔" انہوں نے آئینے میں اپنا جائزہ لیا۔ قیمتی، جدید فیشن کا جوڑا، ہیئر اسٹائل، میک اپ، ہلکی پھلکی جیولری...... ان کا مقابلہ صرف ان لوگوں سے نہیں تھا جہاں وہ جا رہی تھیں بلکہ اپنی نند اور دیورانی کے مقابلے میں بھی بہتر اور برتر نظر آنا تھا اور اس کے لیے انہوں نے محاورتاً نہیں بلکہ حقیقتاً ایڑی سے چوٹی تک کا زور لگا لیا تھا۔ اب آئینے میں جائزہ لے رہی تھیں کہ کہیں کوئی خامی، کوئی کمی تو نہیں رہ گئی۔ مگر یہ بس اپنے دل کی تسلی کے لیے تھا۔ آئینہ وہ خامیاں اور برائیاں تھیں دکھاتا جو دوسرے لوگ دکھاتے اور بتاتے ہیں۔

"یار ببلو! ایک کام تو کر۔" ماموں صاحب نے اپنے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بھانجے صاحب کو مخاطب کیا۔

"اب سارے کام سنبھال کر رکھ لیں ماموں حضور! وہ جو آنے والی ہیں آپ کے گھر، ان کی خدمت میں پیش کیجیے گا اور ان سے کروائیے گا۔ دن رات لگے چوبیس گھنٹوں میں چھتیس بار چائے بنوانی ہو یا روز روز پتلونوں اور قمیصوں میں بٹن ٹانکنے ہوں یا ہر وقت کھو جانے والی چھوٹی بڑی چیزیں ڈھونڈ کر دینی ہوں، اب کسی چیز، کسی کام کے لیے مجھے پکارنے کی زحمت بالکل بھی نہ کریں۔"

ببلو بڑی فرصت سے پیر پھیلائے، بیڈ پر لیٹا تھا۔ ماموں جان کھونٹے سے بندھنے جا رہے تھے اور اس کی جتنی خوشی بھانجے صاحب کو تھی، شاید ہی کسی کو ہو کہ ماموں کے بعد پھر کھونٹے سے بندھنے کی باری بھانجے صاحب کی ہی تھی اور ہر ایک کی طرح انہیں بھی بور کے لڈو کھانے کے بہت ہی ارمان تھے۔

"ابھی ابھی کا کام ہے بچے بالکل ارجنٹ۔" ماموں جان نے ببلو کی تقریر کو صبر و تحمل سے سن کر کہا۔

"کہیے؟" بے چارے ببلو کو اٹھنا ہی پڑا۔ بے شک جب تک ماموں کا ولیمہ نہیں ہو جاتا، اس کی جان چھوٹنے والی نہیں تھی۔

"سارے بچوں کو پارک لے جا، ذرا تفریح ہو جائے گی سب کی۔"

"کس کی تفریح؟ ان بچوں کی یا انہیں دیکھنے والوں کی؟"

ببلو اگر اس شر انگیزی کا مظاہرہ بچوں کی امیوں کے سامنے کرتا تو تینوں کی تینوں پنجے جھاڑ کر نہیں بلکہ تیز کر کے ببلو کے پیچھے پڑ جاتیں۔

"گھر کے سب بڑے تو "وہاں" جا رہے ہیں تو بچوں کو پارک لے جا۔ ورنہ پورا قافلہ بلکہ بارات وہاں جانے کے لیے تیار ہے۔"

"جانے دیں نا، آپ کو کیا مسئلہ ہے؟ سب کو شوق آ رہا ہے نئی نویلی ممانی اور چچی دیکھنے کا۔ اچھا ہے معصوم جانوں کی خواہش پوری ہو جائے گی۔" ببلو نے لیٹے لیٹے ہی بول بال کر اپنی جان چھڑانی چاہی مگر فخر حیات اتنی آسانی سے جان چھوڑنے والے کہاں تھے۔

"مسئلہ یہ ہے کہ ان میں کوئی بھی جان اتنی معصوم نہیں ہے۔ سب کے سب ایک سے بڑھ کر ایک آفت کے پرکالے ہیں۔ ابھی صرف بڑوں کو جانے دیتے ہیں، ان سب کو سمیٹ کر تو کہیں لے جا۔ جلدی کر ببلو! اب اٹھ جا۔" انہوں نے ببلو کی ٹانگ کھینچی۔

''افوہ۔ پیچھے ہی پڑ جاتے ہیں آپ۔'' وہ بھناتا ہوا اٹھ کر بیٹھا۔

''بعد میں بھی تو سب کی اصلیت کھلے گی۔ اچھا ہے پہلے سے تیار ہوں گی کہ کس قسم کے سسرالی بچوں سے واسطہ پڑنے والا ہے۔''

''بعد کی بعد میں دیکھی جائے گی۔ ابھی فرسٹ امپریشن اچھا پڑنا چاہیے۔'' ماموں جان اپنی بات پر اڑے ہوئے تھے۔

''اچھا تو ایسا کریں، ان ''بڑے بچوں'' سے کہہ دیں، اپنے اپنے چھوٹے بہن بھائیوں کو سامنے پارک میں لے جائیں۔''

''ببلو کے بچے!'' ماموں جان نے اپنا پورا زور، رعب اور استحقاق استعمال کرتے ہوئے ببلو میاں کا کان پکڑ کر مروڑا۔

''اُف...... جا رہا ہوں۔ کان تو چھوڑیں میرا۔ بغیر کان کے دولہا بنا اچھا لگوں گا کیا؟'' ببلو صاحب بلبلا اٹھے۔

☆☆☆

مہمانوں کا استقبال انابی نے کیا تھا اور ڈرائنگ روم میں اکیلی ہی نبرد آزما تھیں۔

''کہاں کے ہیں آپ لوگ؟ خاندان کیسا ہے؟ گھر میں اور کون کون ہے؟ آپ اکیلی کیوں رہتی ہیں یہاں؟'' سب سے زیادہ اور تابڑ توڑ سوالات بڑی بھابھی کی طرف سے ہو رہے تھے اور ان کے شوہر کے بس میں تو تھا نہیں، انہیں خاموش کرانا یا آنکھیں دکھانا۔ چھوٹی بھابھی موڈی تھیں، کسی وقت جیٹھانی سے اتفاق ہوتا، تو کبھی اختلاف۔ رہ گئیں آپا جان تو وہ کچھ دیر جز بز ہو کر اور چند بار پہلو بدلنے کے بعد انابی سے مخاطب ہوئیں۔

''میرا خیال ہے، حمرہ سے مل لیں ہم لوگ؟''

''ہاں ہاں، کیوں نہیں۔ میں ابھی بلاتی ہوں۔'' انابی اٹھ کر باہر آ گئیں۔

''چلو بیٹا! مہمانوں سے مل لو۔'' وہ کمرے میں حمرہ کے پاس آئیں جو بریرہ کے ساتھ بیٹھی تھی۔

ہمیشہ کی طرح ویل ڈریسڈ، نک سک سے تیار وہ کبھی بھی سر جھاڑ منہ پہاڑ قسم کے حلیے میں نہیں رہتی تھی مگر پھر بھی انابی کو نہ جانے کیوں کچھ کمی سی لگ رہی تھی۔

''بیٹا! دو چار چوڑیاں ڈال لیتیں ہاتھوں میں۔''

''یہ پہنا ہوا ہے انابی! کافی ہے۔'' حمرہ نے کلائی آگے کی۔ جس میں ایک اسٹائلش سا کڑا پہنا ہوا تھا۔

''اب تو ایک ہی بار پہنی جائیں گی چوڑیاں۔'' بریرہ نے اسے چھیڑا۔

''تم بہت چہکنے لگی ہو، خیریت تو ہے؟'' حمرہ نے اسے گھورا۔

''ایویں!'' بریرہ نے کندھے اچکائے۔

حمرہ ڈرائنگ روم میں پہنچی اور ہونے والے سسرالیوں سے پہلی ملاقات کی۔ ملاقات کیا تھی بس چھوٹا موٹا انٹرویو ہی تھا۔ تعلیم، جاب، پسند ناپسند سے لے کر بڑی بھابھی نے کتنے ہی سوالات کر ڈالے تھے۔ چھوٹی بھابھی نے بھی حسب توفیق حصہ لیا۔ آپا جان نے بس ایک پیاری سی مسکراہٹ کے ساتھ حمرہ کو دیکھا اور بولیں۔

''اللہ اس پیاری سی جوڑی کو ہمیشہ خوش رکھے، آمین۔''

پھر وہ دھیمے دھیمے لہجے میں فخر حیات کے بارے میں بتانے لگیں۔

انابی، بریرہ کے ساتھ کچن میں مصروف تھیں۔ کباب فرائی کیے گاجر کا حلوہ گرم کیا۔ چکن رول، سموسے، گلاب جامن، چھولے، دہی بھلکے...... معقولات وما کولات سے میز لبالب بھر گئی۔

''بہت تکلف کر لیا آپ نے۔'' آپا جان نے آہستہ سے انابی کو مخاطب کیا۔

''چلیے، ہم نے تو کر لیا تکلف...... مگر اب آپ لوگ مت کیجیے۔'' انابی مسکرائیں۔

''بھئی۔ کباب بہت مزے دار ہیں اور گاجر کا حلوہ شاندار۔'' بڑے بھیا نے انابی کی ہدایت پر عمل

کرتے ہوئے بالکل بھی تکلف سے کام نہیں لیا، نہ کھانے میں نہ تعریف میں۔

"تم نے بنائے ہیں؟" بڑی بھابھی نے حمرہ کو مخاطب کیا۔

"نہیں۔" حمرہ بی بی نے نفی میں سر ہلایا۔

"حلوہ بنایا ہوگا پھر؟" انہوں نے قیاس آرائی کی۔

"انابی نے بنایا ہے۔" حمرہ نے بتایا۔

"چنا چاٹ بہت ذائقہ دار ہے۔" چھوٹی بھابھی چاٹ کی شوقین تھیں۔

"یہ بریرہ کا کارنامہ ہے۔" حمرہ نے اطلاع دی۔

"تم کیا چیز اچھی بنالیتی ہو؟ فخر تو عمدہ کھانوں کا بڑا شوقین ہے۔" بڑی بھابھی نے غور سے حمرہ کو دیکھا۔

"میں......؟" حمرہ نے ان کے سوال پر غور کیا۔ "کباب فرائی کرلیتی ہوں اگر بنے ہوئے رکھے ہوں تو......"

"اور؟"

"اور......؟" حمرہ بی بی نے مزید یادداشت کھنگالی۔ "اور چائے بنالیتی ہوں، آملیٹ اور ہاں نوڈلز بھی۔"

"اچھا۔" انہوں نے ذرا بے یقینی سے پہلے حمرہ کو پھر اپنی پلیٹ میں رکھے چکن رول کو دیکھا۔

انابی اور بریرہ چائے لے کر آئیں تو حمرہ کے انٹرویو کا سلسلہ ختم ہوگیا تھا۔ سب لوگ اشیائے خورونوش سے خوب انصاف کررہے تھے مگر بڑی بھابھی کے دل میں کھدبد مچی ہوئی تھی۔ واپس آنے کے بعد جب سارے بڑے یک زبان ہوکر انابی کے طریقے سلیقے، تہذیب اور شائستگی کی تعریف کررہے تھے۔ بڑی بھابھی سے برداشت نہیں ہوا۔

"کچھ آتا جاتا تو ہے نہیں، محترمہ بتارہی تھیں کہ کچن سے کوئی لگاؤ نہیں۔ اچھے کھانے، کھانے کا شوق ہے، بنانے کا نہیں۔" انہوں نے من وعن حمرہ کے الفاظ دہرائے۔

"شادی سے پہلے اکثر لڑکیوں کا یہی حال ہوتا ہے۔ جب سر پر پڑتی ہے تو سب سنبھال لیتی ہیں۔" آپا جان نے رسان سے انہیں جواب دیا۔

"دیکھ لینا، ہوٹل بازی ہی چلے گی روزانہ۔ فائدہ کیا ہوگا فخر کو شادی کا؟ ہوٹلنگ سے نجات تو نہیں ملنے والی بلکہ اب دو کے بجائے تین افراد کا کھانا آئے گا۔" انہوں نے ذرا جھک کر دیورانی کے کانوں میں سرگوشی کی۔

"ہم کیا کہہ سکتے ہیں بھئی۔ فخر جانیں، ان کا کام۔" دیورانی صاحبہ نے بے نیازی سے کندھے اچکائے۔

"عمر بھی ٹھیک ٹھاک ہے۔ کیا دیکھا فخر نے؟"

"فخر کون سا لڑکے ہیں۔ ان سے دو سال ہی تو چھوٹے ہیں۔ ہماری شادی کو بھی دس سال ہوگئے ہیں۔ ویسے عمر جو بھی ہو، حمرہ ہے تو بہت پیاری۔" چھوٹی بھابھی نے ان کے اعتراض کو کوئی خاص اہمیت نہیں دی۔

"ہاں بھئی، ہمیں کیا۔ میاں بیوی راضی تو کیا کرے گا قاضی۔" بڑی بھابھی نے بھی فوراً پٹری بدل لی۔

بلو صاحب بچوں کو واپس لے آئے تھے اور چھوٹے بڑے سارے بچے مل کر فخر کا گھیراؤ کیے ہوئے تھے۔

"ہمیں بھی چچی جان کو دیکھنا ہے۔"

"کیسی ہیں ممانی؟" آپا جان کی بڑی بیٹی مریم نے بے حد اشتیاق سے سوال کیا۔

"یار! اس فوج کو کیسے بھیجا جائے وہاں؟" ایک درجن بچوں کے جھرمٹ میں گھرے فخر حیات پریشانی کے عالم میں بھانجے سے مخاطب تھے۔

"بچوں کو وہاں لے جانے کے بجائے ایسا کرتے ہیں کہ "شیر" کو یہیں بلالیتے ہیں۔" بلو نے مشورہ دیا۔

"اپنے گھسے پٹے لطیفے اپنے پاس ہی رکھو۔"

ماموں نے اسے گھورا۔
''اتنا کیوں پریشان ہو رہے ہیں۔ بچوں کا شوق ہے پورا کردیں۔ اپنے ساتھ لے جائیں، کون سا بہت دور جانا ہے۔ سامنے ہی تو دروازہ ہے ان کا۔''
ببلو موبائل ہاتھ میں لیے جانے کیا اسکرول رہا تھا، ایک کے بعد ایک آپشن کھولے چلے جا رہا تھا۔
''میں لے کر جاؤں؟''
''ہاں، اسی بہانے چکر لگالیں۔'' ببلو بھی کچھ کم نہیں تھا۔
''وہاں جانے کے لیے مجھے کسی بہانے کی ضرورت نہیں ہے۔ ویسے بھی جا سکتا ہوں۔'' انہوں نے مصنوعی خفگی دکھائی، وگرنہ اپنے نامعقول بھانجے کا یہ مشورہ انہیں بہت ہی معقول لگا تھا۔
''ایسا کرتا ہوں پہلے کال کر کے پوچھ لیتا ہوں۔'' فخر نے اپنا فون جیب سے نکالا۔
''کیا ضرورت ہے کال ضائع کرنے کی۔ دو قدم پر دروازہ ہے، کھٹکھٹا کے پوچھ لیں۔'' ببلو نے دوسرا معقول مشورہ دیا۔
''آں...... آپا اور بھابھی جان کیا سوچیں گی؟'' فخر حیات نے سر کھجاتے ہوئے بے حد معصومیت سے ببلو کو دیکھا۔
''انہوں نے کیا سوچنا ہے، انہیں بھی معلوم ہے کہ اچھا بھلا سنجیدہ اور سمجھ دار انسان بھی ایسی حالت میں بے وقوفانہ حرکتیں کرنے لگتا ہے۔''
''کیسی حالت میں؟'' ماموں جان کا بس نہیں چل رہا تھا کہ اس بار کان کے بجائے بھانجے کی گردن مروڑ دیں۔ ''کس قدر بولتے ہیں آج کل کے جوان؟ چہ پدی...... چہ پدی کا شوربا۔''
مگر آئیڈیا اچھا دیا تھا۔ سارے بچوں کو ایک منٹ انتظار کا کہہ کر وہ اپنے فلیٹ سے باہر نکلے، ویسے بھی ان کے سارے بڑے اس وقت ڈرائنگ روم میں بیٹھے آئندہ کا لائحہ عمل طے کر رہے تھے۔ جھٹ منگنی، پٹ بیاہ قسم کی باتیں ہو رہی تھیں۔

فخر حیات اپنے فلیٹ سے نکل کر سامنے فلیٹ کی بیل بجا رہے تھے۔
''کون؟'' حمرہ نے پوچھتے ہی جواب کا انتظار بھی نہ کیا اور دروازہ کھول دیا۔
''جی...... میں ہوں۔'' جانے کیوں اچھے بھلے پُراعتماد فخر حیات گڑبڑا گئے۔
''فرمایئے۔'' حمرہ بی بی خلاف توقع فرد کو دیکھ کر کچھ پزل ہوگئیں۔ انہیں لگا تھا کہ ببلو آیا ہے جسے سنک کا پائپ چیک کرنے کے لیے کہا تھا۔
''میں یہ کہہ رہا تھا کہ بچے آنا چاہتے ہیں آپ سے ملنے کے لیے۔''
''موسٹ ویلکم۔ کہاں ہیں بچے؟'' حمرہ نے موصوف کے دائیں بائیں دیکھا۔
''گھر پر ہیں۔ میں پوچھنے آیا تھا، لے آؤں انہیں؟''
''تو اس میں پوچھنے کی کیا بات ہے؟'' حمرہ کو بے ساختہ ہنسی آگئی۔ فخر جاتے جاتے چند پل کو ٹھہر گئے۔
''آپ کی ہنسی بہت خوب صورت ہے۔'' اپنی بات کہہ کر وہ تو چل دیے اور اندر آتی ہوئی حمرہ سوچ رہی تھی کہ واقعی ہنسی خوب صورت ہے یا ہنسی کے متعلق کہی گئی بات؟
''ہیلو۔'' بریرہ اتنے زور سے کان میں چیخی تھی کہ حمرہ اچھل ہی پڑی۔ پہلے تو اپنا کان سہلایا پھر بریرہ کو گھور کے دیکھا۔
''کیا بات ہے؟ اتنی زور سے کیوں چیخ رہی ہو؟''
''کیونکہ نارمل آواز آپ کی سماعتوں تک پہنچ نہیں رہی۔ تین بار پوچھ چکی ہوں آپ سے کوئی جواب نہیں۔ نہ جانے کن خیالوں میں گم ہیں۔''
''کیا پوچھ رہی تھیں؟''
''آپ نے ببلو کو کال کی؟ سنک بھر رہا ہے۔ پانی نہیں جا رہا۔''
''ہاں ابھی آ رہے ہیں وہ لوگ۔'' حمرہ نے

اسے تسلی دی۔
"لوگ......؟ مطلب؟"
"وہ جو پہلے بڑے آئے تھے، اب ان کے بچے آرہے ہیں مجھ سے ملنے۔"
"اس کا مطلب ہے کہ ایک بار پھر کچن میں گھسنا پڑے گا۔ اب آپ کو ہیلپ کروانی ہوگی۔ تھک گئی ہوں میں۔"
"کولڈ ڈرنک سرو کر دینا۔ بچے ہی تو ہیں۔ ساتھ میں چپس، نمکو سے بہل جائیں گے۔"
حمرہ کے مشورے کوئی نئے نہیں تھے بریرہ کے لیے۔ افسوس سے سر ہلاتے ہوئے اس نے اپنی عزیز از جان پھوپھو کو مخاطب کیا۔
"آپ کے سسرال والے ہیں وہ۔ چپس نمکو پر ٹرخایا نا تو انابی کچا کھا جائیں گی ہم دونوں کو۔"
"اچھا نا۔ کرم ہی تو کرنا ہے سب کچھ، کروالوں گی۔" حمرہ نے ہاتھ ہلا کر بات ہی ختم کر دی۔
ذرا دیر میں دوسری قسط کے مہمان بھی آ گئے۔ ایک درجن بچے، پہلی جماعت سے لے کر بارہویں جماعت تک کے۔ ہر سائز، ہر عمر کے بچے...... فخر حیات اور بلو میاں سمیت ڈرائنگ روم میں آدھے لوگ صوفوں پر بیٹھے تھے، آدھے کھڑے تھے۔
"بچوں! لاؤنج میں آجاؤ آپ لوگ۔" حمرہ سب کو لاؤنج میں لے آئی۔ جہاں کچھ لوگ صوفوں پر براجمان ہو گئے۔ باقی ڈائننگ ٹیبل کی کرسیوں پر سما گئے۔ فخر حیات ڈرائنگ روم میں حیران پریشان بیٹھے تھے، جو سوچ کر آئے تھے وہ تو ہوا نہیں۔ سارے ارمانوں پر پانی پھر گیا تھا۔ اتنے میں انابی آ کر حال احوال دریافت کرنے لگیں۔ ایک آہ بھر کر وہ ان کی طرف متوجہ ہو گئے۔
بلو میاں کچن میں گھسے سنک کا پائپ چیک کر رہے تھے۔
"آپ لوگ اس میں کچرا نہ جانے دیا کریں، چائے کی پتی وغیرہ بھی چھان کے برتن دھویا کریں۔"
"یہ آپ کی ممانی جان کے کارنامے ہیں۔ برتن دھوتی ہیں اور ہر شے سنک میں بہا دیتی ہیں۔" بریرہ نے تیکھے لہجے میں جواب دیا۔ بلو میاں کی فہمائش اسے اچھی نہیں لگی تھی کہ وہ خود بھی ان سب باتوں کا خاص خیال رکھتی تھی مگر بس یہ جو پھوپھو محترمہ تھیں، ان کا کوئی جواب نہ تھا۔
"ہماری ممانی تو اب بنیں گی وہ، پہلے تو آپ کی پھوپھو ہیں۔" بلو کو اس کا تیکھا لہجہ اچھا نہیں لگا۔
"اب اسے ایسے ٹھیک کیجیے گا کہ پھر خراب نہ ہو۔"
"احتیاط کیجیے گا، پھر خراب نہیں ہوگا۔" بلو میاں نے فضا میں پھیلتی کباب تلنے کی خوشبو محسوس کی۔ دنیا کی سب سے بہترین خوشبو، اس کے لہجے میں خود بخود نرمی اور حلاوت آ گئی۔
"یہ لیجیے، یہ ٹھیک ہو گیا ہے۔" بلو میاں خوش گوار مسکراہٹ کے ساتھ اٹھ کھڑے ہوئے۔
"شکریہ۔" بریرہ کی ساری توجہ کبابوں کی طرف تھی۔
"بلی بٹیا! ٹیبل لگا دیں۔" انابی آ گئیں۔
"جی بس، پانچ منٹ۔" بریرہ نے دوسرے چولہے پر گرم ہوتے گاجر کے حلوے کو الٹ پلٹ کیا۔ بلو میاں لاؤنج میں تشریف فرما ہو گئے۔ انابی ڈرائنگ روم میں گئیں۔
"چلو بیٹا! آپ بھی لاؤنج میں آجاؤ۔ سب کے ساتھ بیٹھ کر چائے واے پیو۔"
انابی کی پیش کش نے فخر صاحب کے دل کی ایک نہیں کئی کلیاں کھلا دیں۔ ان کلیوں کو ساتھ لیے وہ خوشی خوشی لاؤنج میں آئے اور ان کے وہاں جاتے ہی حمرہ بی بی ایکسکیوزمی کہہ کر اٹھیں اور اندر کمرے میں چل دیں۔ فخر حیات کی ساری کلیاں کھلتے ہی مرجھا گئیں۔
"بھئی فخر میاں! بات یہ ہے کہ ہمارے خاندان میں بلکہ پہلے اکثر گھرانوں میں رواج تھا کہ جس سے لڑکی کا رشتہ طے ہو رہا ہو یا ہونے والا ہو، اس کے سامنے آنے سے گریز کیا جاتا ہے۔ ہماری

خواہش ہے کہ کچھ رسم و رواج باقی رہیں تو اچھا ہے۔ جب تک ہم ہیں، پھر ہمارے بعد کیا ہو خدا جانے۔" انابی نے فخر حیات کا اُترا ہوا چہرہ دیکھ کر وضاحت کی۔

"جی، پہلے تو یہی رواج تھا شاید۔" فخر میاں نے مسکرانے کی کوشش کی۔

"اب تو دور بدل گیا ہے انابی! اب ان سب باتوں پر کون عمل کرتا ہے۔" بہلو کو اپنے ماموں کے دل کی مرجھائی کلیوں پر ترس آنے لگا۔

"اللہ کے بنائے دن رات وہی ہیں جو کہ تھے۔ انسان بدل جاتا ہے مگر بھئی کوئی ہمیں دقیانوسی کہے یا کچھ اور...... ہمیں یہ رواج پسند ہیں۔ اب دیکھو، بچے کہاں تک کہنا مانتے ہیں اور عمل کرتے ہیں۔ ہمارا کام تھا بتانا، سو بتا دیا۔" انابی کی باتیں بچے بھی غور سے سن رہے تھے۔

"آنٹی ہیں انٹرسٹنگ۔" مناہل نے اریبہ سے سرگوشی کی۔

"یہ تو ہے۔" اریبہ نے تائید میں سر ہلایا۔ پھر بریرہ کو ٹرے لاتا دیکھ کر کھڑی ہو گئی۔

"میں ہیلپ کروادوں آپ کی۔" مناہل نے بھی اس کی پیروی کی۔

"بس یہ ایک دو ڈشیں ہیں اور گلاس وغیرہ۔" بریرہ نے تکلف سے کام لینے کے بجائے دوستانہ انداز اختیار کیا۔

"بھئی بچوں! تم سب کے آنے سے ہمارے گھر میں رونق ہو گئی ہے۔ جب تک یہاں ہو، آتے جاتے رہنا۔" انابی نے سب کو پیش کش کی۔

"میرا تو یہاں سے جانے کو دل نہیں چاہ رہا۔" زید نے اعلان کیا۔

"ہاں تو رک جاؤ، دو گھنٹے بعد آنٹی تمہیں خود چھوڑنے آئیں گی۔ اس سے زیادہ تو تمہیں کوئی برداشت نہیں کر سکتا۔" زید کی آپی نے پھلجڑی چھوڑی۔

"ارے بھئی، بچوں کی وجہ سے تو دنیا میں رونق ہے، روشنی ہے اور وہ بچہ ہی کیا جو شرارت نہ کرے۔

اب کیا بتاؤں بچوں! آپ لوگ ہنسو گے۔ ہم خود بچپن میں بہت شرارتیں کرتے تھے۔ چھوٹے بڑے سب کی ناک میں دم کیا ہوا تھا۔" انابی بڑے مزے سے اعتراف کر رہی تھیں اور جملہ حاضرین کھانے پینے کے ساتھ ساتھ ان کی باتوں سے بھی لطف اندوز ہو رہے تھے۔

"ہمارا آدھا بچپن تو سمجھو درختوں کی شاخوں پر گزرا تھا۔ پرندوں اور بندروں سے زیادہ ہمارا بسیرا ہوتا تھا درختوں پر۔" انابی بچوں کے درمیان ایک بچی بن گئی تھیں۔

"سچ میں، آپ درختوں پر چڑھتی تھیں؟" زارین نے بے حد حیرانی سے ان بوڑھی اور سوبر قسم کی خاتون کو دیکھا۔

"ارے بھئی، بوڑھے تو ہم اب ہوئے ہیں، ہر بڑھاپے کا ایک بچپن ہوتا ہے۔ جوانی ہوتی ہے۔" انابی نے زندہ دلی سے کہا۔

☆☆☆

فخر حیات کے سارے فیملی ممبرز کچھ ہی دنوں کے لیے آئے تھے۔ جھٹ پٹ ہی سارے معاملات طے ہو رہے تھے۔ آنے والے جمعہ کی ایک گلابی سی شام میں حمرہ بی بی کی مخروطی انگلی میں ایک خوب صورت سی انگوٹھی سج گئی۔

دو روز بعد اتوار کو لڑکے والوں کی طرف سے بلاوا تھا۔ انابی، بیٹے بہو اور ایک دو اور قریبی عزیزوں کو فخر حیات کے گھر لے کر گئیں۔ ہونے والے دولہا میاں کے لیے انہوں نے ایک قیمتی گھڑی خریدی تھی۔ وہ پہنا کر، مٹھائی کھلا کر رسم کر دی۔ ان ہی تقاریب میں شادی کی تاریخ بھی طے ہو گئی تھی۔

بہلو میاں کی خوشی اور مصروفیات دونوں کا ہی کوئی ٹھکانا نہیں تھا۔ ماموں جان نے تقریباً سارے ہی کام بھانجے کے ذمے لگا دیے تھے۔ اچھے سے میرج ہال کا بندوبست، کیٹرنگ اور مینیو کا انتخاب، دعوت نامے چھپوانے اور بانٹنے کا کھڑاگ...... اس کے علاوہ چھوٹے بڑے کئی کام تھے جو بہلو صاحب

کے ناتواں کاندھوں پر تھے۔
''ببلو یار! وہ نکاح خواں کا بھی تو بندوبست کرنا ہے۔ کوئی ہے نظر میں؟'' آئینے کے سامنے کھڑے اپنے بال اور مونچھیں سنوارتے ہوئے فخر حیات کو اچانک یاد آیا۔
''وہ جو ایک اتنی لمبی سی لسٹ بنائی ہے نا آپ کی شادی خانہ آبادی کے سلسلے میں، اس میں ٹاپ آف دی لسٹ یہی کام ہے۔'' بھانجے صاحب نے اطلاع دی۔
''تیری یہی بات مجھے بہت پسند ہے بھانجے! بعض انتظامی معاملات میں تیرا سگھڑاپا بالکل خواتین والا ہے۔ ذمہ داری اور سوجھ بوجھ بھی ہے۔ بس تو کھانا ذرا ڈھنگ کا پکانا سیکھ لے پھر تو......''
''جی ہاں پھر تو کوئی بھی اچھی لڑکی مجھے خوشی خوشی رخصت کرا کے اپنے گھر لے جاسکتی ہے۔'' ماموں جان کے تبصرے نے ببلو میاں کا ایسا جی جلایا کہ بس......
''خوشی کا موقع ہے یار! ایسے دل نہ جلا۔'' ماموں جان آئینے کے سامنے ہر زاویے سے اپنا جائزہ لے رہے تھے۔
''آپ کی شادی کے سارے کام، معاملات اور انتظامات میرے کاندھوں پر ہیں۔ آپ کو تو بس شیروانی پہن کر دولہا بننا ہے اور اپنی بارات کی قیادت کرنی ہے۔ گھن چکر تو میں بنا ہوا ہوں۔ پھر بھی کھانا پکانے کا، سیکھنے کا طعنہ دیتے رہتے ہیں۔ میں کوئی لڑکی ہوں جو کچن کا سگھڑاپا سیکھوں کہ پرائے گھر جانا ہے؟'' ببلو میاں نے لڑاکا عورتوں کی طرح ماموں جان کو باتیں سنانا شروع کردیں۔
''مجھے ایسا کیوں لگ رہا ہے جیسے میں نے تیری دم پر پاؤں رکھ دیا ہے؟'' فخر حیات نے پیچھے مڑ کر بغور اس کا جائزہ لیا۔
''یہ بتایئے، کہاں تو آپ شادی کو گلے کا پھندا اور بیوی کو موت کا فرشتہ سمجھتے اور کہتے تھے، اب یکا یک کیا انقلاب آ گیا؟'' بابر عرف ببلو نے تیکھے لہجے میں وار کیا۔
''بس یار! کیا بتاؤں، کیا انقلاب آ گیا۔ تیری سمجھ میں نہیں آئیں گی یہ باتیں، تو ابھی بچہ ہے۔'' ماموں نے اسے اور چڑایا۔
''ماموں! ذرا غور سے دیکھیں۔ یہ بچہ اب بڑا ہو گیا ہے۔'' ببلو صاحب یہ تو سمجھ گئے تھے کہ ماموں جان بوجھ کے اسے تپا رہے ہیں۔ اس لیے ذرا دھیما پڑ گئے۔
''کیا بڑا ہوا ہے؟ بس قد ہی لمبا ہے۔ عقل تو ساری ٹخنوں میں ہے۔''
''شکر کریں، عقل ٹخنوں میں ہے، سر میں ہوتی تو اس سے کام لیتا اور آپ کے چکروں میں خوار ہونے کے بجائے مزے سے پیر پھیلا کر سوتا۔'' ببلو نے جتایا۔
''ببلو میاں! تمہاری ممانی گھر آ جائیں پھر تم پیر پھیلا کر سونا۔ جی بھر کے آرام کرنا۔ کس نے روکا ہے۔'' ماموں کے لہجے میں اتنا پیار اور شفقت تھی کہ ببلو دو منٹ پہلے کی ساری باتیں فراموش کرنے پر غور کر رہا تھا۔ مگر اگلے ہی لمحے کچھ یاد آیا تو چونک پڑا۔
''میں نے سنا ہے انہیں کھانا پکانا نہیں آتا؟'' ببلو کو ایک نئی فکر نے آن گھیرا۔
''پکاتے پکاتے آ جائے گا' تجھے بھی تو الٹا سیدھا کچھ نہ کچھ آ ہی گیا۔'' فخر نے لاپروائی سے جواب دیا۔
''اور اگر نہ آیا تو؟''
''پھر میرا پیارا بھانجا کس لیے ہے؟'' ماموں نے آگے بڑھ کر ببلو کا گال تھپتھپایا اور کمرے سے باہر نکل گئے۔
''ہائیں!'' ببلو کی حیران پریشان نگاہیں دروازے پر ٹکی تھیں جہاں سے ماموں گزر کر گئے تھے۔

☆☆☆

صبح کی ٹھنڈی روشنی دھیرے دھیرے جہاں کو اپنی گرفت میں لے رہی تھی۔ حمرہ بالکنی میں کھڑی

پھیلتے اجالے کو دیکھتی رہی۔ انا بی ڈھیرے ڈھیرے تسبیح کے دانے گرا رہی تھیں۔ اب سردی کا زور بہت کم ہو گیا تھا۔ تھوڑی تھوڑی سرد ہوا چہرے سے ٹکراتی اچھی لگ رہی تھی۔ کچھ دیر اس تروتازہ صبح کی خوش گوار ہوا اور اجالے سے لطف اندوز ہونے کے بعد حمرہ کچن میں چلی گئی۔ کچھ دیر بعد وہاں سے پلٹی تو اس کے ہاتھ میں چھوٹی سی ٹرے تھی جس میں دو مگ چائے کے رکھے تھے۔

انا بی کی تسبیح مکمل ہو گئی تھی۔ وہ بھی اندر لاؤنج میں آ گئیں۔

"حمو بٹیا! اپنے کپڑوں کے جوڑ ٹانک کر لیتیں۔ آج رات کو ہم تینوں بیٹھ کر پیکنگ کر لیں گے۔ اور شام کو تو رضیہ بھی آ جائے گی۔" انا بی نے حمرہ کو مخاطب کیا۔

"سوٹ کیس میں رکھ دیے ہیں سارے جوڑے۔ بعد میں الماری میں ہینگر کرنے ہیں پھر ان سب تکلفات کی کیا ضرورت ہے؟" حمرہ نے چائے کا سپ لیا۔

"مگر......"

"انا بی! یہ جو فخر صاحب کی بڑی بھابھی ہیں، کچھ الگ مزاج کی ہیں۔ بہت سوالات اور اعتراضات کرتی ہیں۔" حمرہ نے انا بی کی بات کاٹتے ہوئے موضوع بدلا۔ پیشانی پر سوچ کی لکیریں واضح تھیں۔

"دنیا میں ہر طرح کے لوگ ہوتے ہیں۔ الگ الگ طبیعت، خصلت اور مزاجوں کے مالک، ویسے تمہیں کون سا ان کے ساتھ رہنا ہے۔ وہ لوگ تو مہمان ہیں، چلے جائیں گے۔ بیاہ کے بعد جتنے دن تمہارے ساتھ رہیں، اچھے برتاؤ کا مظاہرہ کرنا۔ کسی کی کوئی بات بری لگے یا رویہ ناگوار ہو تو برداشت سے کام لینا۔" انا بی نے روایتی قسم کی نصیحتیں شروع کر دیں۔

"انا بی! سارے پندونصائح لڑکیوں کے لیے ہی کیوں ہوتے ہیں۔"

"کیونکہ ان ہی کی طاقت سے، ایثار سے، تحمل سے گھر بنتا ہے اور آنے والی نسلیں سنورتی ہیں۔"

"اور اس لیے بھی کہ لڑکے نصیحتوں کو ایک کان سے سن کر دوسرے کان سے باہر نکال دیتے ہیں۔ عمل کہاں سے کریں گے۔" بریرہ نے دلائی سے منہ باہر نکالا اور دخل در معقولات کی۔

"جاگ گئیں تم؟"

"جی ہاں، میرے سرہانے بیٹھ کر اپنا سسرال ڈسکس کریں گی تو نیند کیسے آئے گی؟" بریرہ نے ایک جماہی لی۔

"ویسے آپ کے سسرال میں ہے ہی کون جو آپ کو فکر ہو رہی ہے؟" بریرہ نے لیٹے لیٹے سوال کیا۔

"فکر تو خیر نہیں، بس یوں ہی بڑی بھابھی کا خیال آیا تو انا بی سے کہہ دیا۔"

"ان کے علاوہ باقی سب لوگ تو خاصے معقول قسم کے ہیں۔"

"ببلی بٹیا! آج ذرا اپنے باوا کو تو فون کر دینا۔ کارڈ چھپ گئے تو لے آئیں پھر بانٹنے بھی ہیں۔" انا بی کو آج کے دن کا پہلا کام یاد آیا۔

"میری شکل دیکھتے ہی سارے کام یاد آ جاتے ہیں۔" بریرہ نے جھٹ سے دلائی میں منہ چھپایا۔

"اٹھ جا بچی! آج بازار بھی جانا ہے۔"

"ان بڑی بچی کو لے کر جائیں نا، ان کی شاپنگ ابھی کہاں پوری ہوئی ہے۔"

"ارے ہاں، ہم تینوں ہی جائیں گے۔ مجھے بھی کچھ لینا ہے، کچھ تمہاری چیزیں ہیں، کچھ حمو کی ہیں۔ اٹھ جاؤ تو لسٹ بنا لینا۔" انا بی نے چائے کا مگ خالی کر کے ٹرے میں رکھا۔

"اگلے ایک گھنٹے میں اٹھ جانا۔" حمو بی بی نے بریرہ کے منہ سے دلائی سرکائی۔

"ابھی ہوئی تو ہوں۔"

"اٹھ کر کھڑی ہو جانا اور کھڑی ہو کر کچن میں چلی جانا اور شرافت سے ناشتہ بنا لینا۔" حمرہ نے

عادت کے مطابق حکم چلایا۔

"اب تو ناشتہ خود بنانے کی عادت ڈال لیں۔ اپنا بھی اور ساتھ میں کم از کم دو افراد کا بھی۔" بریرہ نے مشورہ دیا۔

"کیوں؟"

"کیوں کا کیا مطلب؟ بھول گئیں دو ہفتے بعد رخصت ہو کر سسرال جا رہی ہیں۔" بریرہ نے یاد دلایا۔

"اوہ، تو کیا ہوا۔ سامنے ہی تو ہے۔" حمرہ کا اطمینان قابل دید تھا۔

"کن چکروں میں ہیں آپ؟" بریرہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔

"بھئی، کسی چکر میں نہیں ہوں۔ تم پریشان مت ہو۔" حمرہ نے مسکرا کر تسلی دی مگر بریرہ کے چہرے کے تاثرات تبدیل نہ ہوئے۔

"شادی کے اگلے روز آپ کا ناشتہ لے کر آئیں گے ہم۔ اس کے بعد کوئی امید نہیں رکھیے گا۔" بریرہ نے تنبیہ کی اور حمرہ کی ہنسی چھوٹ گئی۔

"انابی کی تقاریر کا اتنا تو اثر ہوا ہے کہ میں نے سسرال جا کر کم از کم تین بندوں کا ناشتہ بنانے کا فیصلہ کر لیا ہے۔" حمرہ نے اعلان کیا۔

"واقعی؟"

"ہاں، ناشتہ بنانا کون سی راکٹ سائنس ہے یا توپ چلانی ہے۔ چائے بنانی آتی ہے مجھے۔ انڈا تلنا، سلائس سینکنا کون سی بڑی بات ہے؟"

"سچ میں؟" بریرہ حیرت سے آنکھیں پھاڑے اپنی پیاری پھوپھو کو یوں دیکھ رہی تھی جیسے وہ کوئی خلائی مخلوق ہو۔

☆☆☆

آپا بی، بڑی بھابھی اور چھوٹی بھابھی سمیت چھوٹا سا قافلہ کار میں سوار تھا۔ ڈرائیونگ سیٹ پر بلو صاحب، فرنٹ سیٹ پر حمرہ آ کر بیٹھ گئی۔

بریرہ کے لیے پچھلی سیٹ پر تینوں خواتین کے درمیان جگہ نکالی گئی۔ بس بے چاری بریرہ پھنس پھنسا کر کسی طرح بیٹھ ہی گئی مگر پورے راستے وہ جس طرح خود کو ایڈجسٹ کرنے کی کوشش کرتی رہی۔ وہ ہی جانتی تھی، شہر کا مشہور اور معروف بازار آ گیا تھا۔ طارق روڈ پر ڈالمین کے آگے ساری سواریوں کو اتار کر بابر تو پارکنگ کے لیے مناسب جگہ تلاش کرنے لگا۔

"آپ لوگ جب شاپنگ مکمل کر لیں تو مجھے کال کر دیجیے گا۔ میں آ جاؤں گا۔"

آپا بی کو بتا کر وہ صاحب تو چل پڑے۔ خواتین کی شاپنگ میں ساتھ ساتھ چل کر خوار ہی ہونا تھا اور اپنی ٹانگیں توڑنی تھیں۔ اس سے بہتر بندہ گاڑی میں ہی سکون سے بیٹھ کر ایف ایم سن لے۔ بلو میاں چلے گئے اور حمرہ اپنی سسرالی خواتین کے ہمراہ اپنی شادی کی خریداری میں مگن ہو گئی۔ مگر بڑا ہی تھکا دینے والا مرحلہ تھا۔ حمرہ ساتھ تو آ گئی تھی مگر اس نے معاملہ ان سب کی پسند پر چھوڑ دیا تھا۔ اب جو بھی جوڑا آپا بی کو پسند آتا، اس پر بڑی بھابھی کو، کوئی نہ کوئی اعتراض ہوتا اور جو بڑی بھابھی کو اچھا لگتا اسے چھوٹی بھابھی مسترد کر دیتیں۔ اور چھوٹی بھابھی جس جوڑے کو منتخب کرتیں، اسے آپا بی اور بڑی بھابھی مل کر ریجیکٹ کر دیتیں۔

دو تین گھنٹے گزر گئے۔ بریرہ کی انجوائے منٹ اب بوریت اور تھکن میں بدل رہی تھی۔

"پھوپھو! آپ ہی سلیکٹ کر لیں اپنا برائیڈل ڈریس۔ چل چل کر میرا تو حشر برا ہو گیا ہے۔ ایک آدھ گھنٹہ اور گزرا تو بھوک سے پیٹ میں چوہے دوڑنے لگیں گے۔ جو کھا پی کر آئے تھے، وہ چلنے پھرنے اور بار بار سیڑھیاں اترنے چڑھنے میں سب ہضم ہو گیا۔" بریرہ ساتھ ساتھ چلتے ہوئے حمرہ کے کانوں میں اپنا دکھڑا سنانے لگی۔

"اسی لیے کہتی ہوں روزانہ واک کیا کرو۔ ایکسرسائز کیا کرو۔ اتنی جلدی نہیں تھکوگی۔" حمرہ نے انابی کا روپ دھار لیا اور بلی کو نصیحت کی۔

"آپ کو بہت مزا آ رہا ہے، یہاں تین گھنٹے

واک کرنے میں؟"
"واقعی، تھک گئی ہو؟" پھوپھو نے بھتیجی کو ہمدردی سے دیکھا۔
"ہاں نا۔" بریرہ نے چہرے پر بے چارگی کے آثار سجائے۔
"تو پھر نمٹاتے ہیں اس کام کو۔" حمرہ کے قدم تیز ہوگئے۔
اور پھر واقعی اگلے ایک گھنٹے میں اس نے فٹافٹ اس کام کو نمٹا ہی دیا۔ بارات اور ولیمے کے دونوں جوڑے بھی خرید لیے، ان کے ساتھ میچنگ جیولری، شوز دیگر جو بھی ضروری اشیاء تھیں، سب خرید لیں اور ڈیڑھ گھنٹے بعد وہ سب فوڈ کورٹ میں بیٹھے معقولات و ماکولات سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔
آپا جان نے کال کر کے ببلو میاں کو بھی بلالیا تھا۔
"ارے ببلو! شوارما تو بالکل ہی پھیکا سیٹھا ہے۔ کچھ بھی تو ذائقہ نہیں اس میں۔ وہ جو تم نے گھر میں بنایا تھا، بس ویسا ہی لگ رہا ہے۔" بڑی بھابھی نے شوارما کھاتے ہوئے اپنے بے لاگ انداز میں تبصرہ کیا۔
"کوئی نہیں، ببلو نے تو اتنے مزے کا شوارما بنایا تھا۔ سب چٹ ہوگیا تھا۔" چھوٹی بھابھی نے ببلو کی حمایت میں بیان دیا۔
"ارے بھئی تمہیں تو یہ پانی کا گلاس بھی بھر کر تمہارے ہاتھ میں دے دے، تم اسے بھی کولڈ ڈرنک سمجھ کر پیتی ہو۔" بڑی بھابھی نے ٹھٹھا لگایا۔
"محنت تو بہت کی تھی ببلو نے۔" آپا جان کو بھانجے کا اترا ہوا چہرہ دیکھ کر ترس آ گیا۔
"لاکھ محنت کرلو، کچن کے کام لڑکوں کے بس کے تھوڑی ہیں، عورتوں کا کام ہے۔ لڑکے تو بس الٹا سیدھا پکا کر ٹائم پاس کر لیتے ہیں۔ ویسے بھی حمرہ آجائیں گی گھر میں تو ببلو کو کچن سے نجات مل جائے گی۔"
بڑی بھابھی نے حمرہ کی طرف دیکھا۔
"کیوں؟"
"پتا نہیں۔" حمرہ نے بڑی سچائی سے کندھے اچکادیے۔
بس بریرہ نے اپنی پھوپھو جانی کو گھور کے دیکھا تھا۔ ببلو میاں کا چہرہ اور بھی بے چارہ سا ہوگیا اور باقی جملہ خواتین ایک دوسرے کو دیکھ رہی تھیں۔

☆☆☆

گھر آکر جب تک حمرہ نے شاپنگ کا حال احوال اور تفصیلات انابی کے گوش گزار کیں تب تک تو بریرہ صبر اور ضبط کر کے بیٹھی رہی اور جب سارا شاپنگ نامہ ختم ہوا تو وہ شروع ہوگئی۔
"شادی ہو رہی ہے آپ کی، تھوڑی ڈپلومیسی سیکھ لیں۔ کیا ضرورت تھی، سب کے سامنے کندھے اچکا کے سچ بولنے کی؟ صرف مسکرا دیتیں، وہ سب خود ہی مطلب نکالتے رہتے۔"
"کیا کیا سیکھوں؟ تھوڑا سگھڑاپا۔ کچھ سلیقہ مندی، اچھے اخلاق، کچھ سادگی، کچھ چالاکی۔ ارے شادی ہے یا کالے پانی کی سزا؟" حمرہ نے مسکرا کر سوال کیا۔
"اے نوج۔ شادی کیوں ہوگی بھلا کالے پانی کی سزا؟ اتنا خوب صورت اور محترم رشتہ ہے دو انسانوں کے درمیان۔" انابی نے مداخلت کی۔
"دو انسانوں کے نہیں، دو خاندانوں کے درمیان اور بعض اوقات دونوں خاندان ان دو افراد کی زندگیوں اور معاملات میں بری طرح دخل اندازی کر جاتے ہیں۔" حمرہ نے اپنی رائے کا اظہار کیا۔
"حمو بیٹی! خاندانی نظام میں جہاں اچھائیاں ہیں، وہاں کچھ خامیاں بھی آ گئی ہیں مگر یہ اس نظام کی نہیں، انسانوں کی غلطی ہے۔" انابی نے ہمیشہ کی طرح بات اور بحث کو سمیٹ لیا مگر بریرہ خاتون کی فکر ابھی ختم نہیں ہوئی تھی۔ انابی سے مخاطب ہو کر بولی۔
"انہیں سکھا دیں، سسرال میں کیسے رہتے ہیں؟ بلکہ یہ بتا دیں کہ سسرال والوں سے کیسے بی ہیو کرنا

ہے۔“
”اے ہائے، سسرال میں ہے ہی کون؟ شادی کے بعد سب اپنے اپنے گھروں کو چل دیں گے۔ ایک وہ بچہ ہے بے چارہ (بلو) اور یہ دونوں مل جل کر گزر بسر ہو ہی جائے گی۔ تم کیوں اتنا ہولائے جا رہی ہو؟“ انا بی نے پوتی کو ڈپٹ کر جواب دیا۔
”لو بھئی، سب ٹینشن فری ہیں۔ خالہ بھی، بھانجی بھی، ایک ہم ہیں ایویں پریشان ہو رہے ہیں۔“ بریرہ بڑبڑانے لگی۔
”کاہے کی پریشانی ہے تمہیں؟ اور بالوں میں تیل کب سے نہیں ڈالا‘ کیسے جونا بنے ہوئے ہیں۔ بس لیا...... شیمپو تھوپ لیا۔ ہو گئی بالوں کی دیکھ بھال۔ دیکھنا ذرا، اچھے بھلے بال تھے، کیسی موٹی چوٹی تھی جب تک میرا ڈنڈا رہا۔ اب ذرا ڈھیل دے دی، نہ تیل لگے نہ چوٹی ہو۔ ساری زلفوں کو لپیٹ لپاٹ کر، جوڑا باندھ کر سر پر نکالیا۔“
ہر دو تین ہفتے بعد بریرہ کو اس قسم کا لیکچر سننا پڑتا تھا کہ انا بی نے اس کے بالوں پر خاص محنت کی تھی اور وہ لاپروائی دکھا کر ساری محنت پر پانی پھیر رہی تھی۔
☆☆☆
گھر میں ایک شور شرابا ہنگامہ بپا تھا۔ مناہل اور لائبہ نئے اسٹائل کے بال کٹوا کر آئی تھیں۔ اب دو گھنٹے سے آئینے کے سامنے کھڑی ہر زاویے سے خود کو دیکھ رہی تھیں کہ اس نئے انداز میں شکل پہلے سے بہتر لگ رہی ہے یا نہیں۔ مناہل تو چھتیس بار اپنی زلفیں آگے پیچھے کر کے دیکھ چکی تھی اور مطمئن نہیں ہو رہی تھی۔ اوپر سے بلو بھائی کے تبصرے، دونوں کا دل جلانے کے لیے کافی تھے۔
بڑی بھابھی اور چھوٹی بھابھی کوئی اسپیشل فیشل کروا کر آئی تھیں پارلر سے، اور ایک دوسرے کے چمکتے چہرے دیکھ کر اندازہ لگانے کی کوشش کر رہی تھیں کہ ہمارا چہرہ بھی اسی طرح لشکارے مار رہا ہے یا نہیں۔
آپا جان درزی کے پاس دو گھنٹے بیٹھ کر ارجنٹ جوڑا سلوا کر لائی تھیں اور اب دوپٹے پر لگی کرن میچنگ کی نہیں لگ رہی تھی۔ باری باری سب سے پوچھ چکی تھیں اور سب کے یقین دلانے پر بھی وہ کچھ غیر مطمئن ہی تھیں۔
فخر اس ادھیڑ بن میں تھے کہ روزانہ کھرچ کھرچ کر شیو کریں یا خط چھوڑ دیں۔ بلو میاں سے مشورہ لینا، بے کار تھا، وہ بے چارہ پہلے ہی سر، گاڑی اور پیر پہیہ کیے ہوئے، گھن چکر بنا ہوا تھا۔
بڑے سے لے کر چھوٹے تک، جس کو بھی کوئی کام تھا۔ اس کے لیے بلو میاں کو ہی زحمت دیتا کہ اس کے علاوہ اندر باہر کے چکر لگانے والا کوئی نہ تھا۔
”توبہ ہے ماموں! شادی خانہ آبادی آپ کی ہے اور شامت میری آئی ہوئی ہے۔“ بلو میاں، تھکے ہارے بازار سے آئے تھے۔ آتے ہی سامان پھینک پھانک بیڈ پر آڑے ترچھے پڑ گئے۔
”شادی سے پہلے کی شامت شادی کے بعد کی شامت سے بہتر ہے بیٹے۔“ فخر حیات نے موبائل اسکرین پر نظریں جمائے جمائے فلسفہ بگھارا۔
”ٹیلر نے بلایا ہے آپ کو۔ شیروانی چیک کر لیں، عین وقت پر کوئی گڑبڑ ہوئی تو......“
”اچھا اچھا، ٹھیک ہے۔ چلا جاؤں گا۔“ لمبی تقریر کے ڈر سے فخر نے اسے فوراً ہی روک دیا۔
”سہرے کا آرڈر رہ گیا ہے۔ لمبائی بتا دیں کتنی رکھنی ہے تو اس کام سے بھی نمٹیں۔“
”سہرا؟ میں سہرا باندھوں گا؟“ فخر نے بے یقینی سے سوال کیا۔
”ظاہر ہے، آپ کی بارات جائے گی تو آپ ہی سہرا باندھیں گے۔“ بلو نے یاد دلایا۔
”نہیں یار! بڑا عجیب لگے گا۔ چھوڑ، بس ہار کافی ہیں گلے میں ڈالنے کے لیے۔ سہرا وہرا رہنے دے۔“ فخر حیات نے انکار میں سر ہلایا۔
”شادی جیسا کام کرنا عجیب نہیں لگ رہا، سہرا باندھنا عجیب لگے گا۔ واہ بھئی واہ۔ گڑ کھائیں گے مگر گلگلوں سے پرہیز۔“

”گڑ کھا رہا ہوں کافی ہے۔ گلگلے کھانا ضروری نہیں ہے۔“

”انابی کی خواہش بلکہ فرمائش...... بلکہ مطالبہ ہے کہ دولہا سہرا باندھ کر آئے گا ورنہ انٹری کی اجازت نہیں دی جائے گی نہ ہی دلہن۔“

”بکواس...... جھوٹ بول رہا ہے نا؟“ ماموں نے بے اعتباری سے بھانجے کو گھورا۔

”آپ خود پوچھ لیں جا کر۔“ ببلو میاں بے حد پراعتماد تھے۔ فخر حیات کا اعتماد ڈانواڈول ہونے لگا۔

”اب میں ایسی باتیں پوچھتا اچھا لگوں گا۔“ وہ سوچ میں پڑ گئے۔

”تو پھر سہرے کی لمبائی بتا دیں۔“ ببلو نے جھٹ سے سوال دہرایا۔

”اگر ضروری ہے تو بنوا لے، زیادہ لمبا نہ ہو نہ زیادہ بھاری۔ بس ہلکا پھلکا چھوٹا سا بنوا لے۔“ ماموں جان نیم رضامندی سے گویا ہوئے۔

”ٹھیک ہے۔“ ببلو میاں بھی مطمئن ہو گئے۔

”پتا نہیں سہرا باندھ کر کیسا لگوں گا؟“ ہونے والے دولہا میاں پریشان تھے۔

”ویسے ہی جیسے سارے دولہا حضرات لگتے ہیں۔ ویسے کسی زمانے میں سارے دولہا حضرات آپ کو چغد لگا کرتے تھے، یاد ہے؟“ ببلو نا ہنجار نے گزرے زمانے کی باتیں یاد دلائیں۔

”جو وقت بیت گیا، سو بیت گیا۔ ماضی کو یاد کرنے کے بجائے حال کی بات اور مستقبل کی فکر کرو۔“ ماموں جان نے فلسفے کا سہارا لیا۔ جیسے ان کے ماضی قریب و بعید کے سارے افکار و خیالات اس میں چھپ جائیں گے۔

☆☆☆

دن تو یوں پر لگا کر گزرتے چلے گئے کہ پتا ہی نہیں چلا۔ کل مایوں تھی، جو دولہا دلہن دونوں کے اپنے اپنے گھروں میں تھی اور دونوں ہی گھروں میں ہڑبونگ مچی ہوئی تھی۔ دولہا میاں کا گھر تو مہمانوں سے بھرا ہوا تھا ہی، انابی کے فلیٹ میں بھی مہمانوں کی آمد اور رونق شروع ہو گئی تھی۔ انابی کے بیٹے بھی اپنے کنبے سمیت موجود تھے۔ انابی خوشی سے نہال تھیں۔ انہوں نے سارے قریبی رشتے داروں کو دعوت دے کر بلایا تھا کہ کم از کم ایک دو روز تو رک جائیں اور مدعوئین نے ان کی خواہش کا احترام کیا تھا۔

حمرہ کی ننھیال اور ددھیال کی کزنز بھی آئی ہوئی تھیں اور تین خواتین انابی کی ہم عمر بھی تھیں۔ سارا دن کچن میں کچھ نہ کچھ پکتا رہتا۔ ہر وقت برتن دھلتے رہتے، ایک ملازمہ مستقل تو تھی ہی۔ دو اور بھی جز وقتی طور پر رکھ لی گئی تھیں۔

”کتنا مزا آ رہا ہے۔“ بریرہ بھی انابی کی طرح بہت خوش تھی، جن رشتے داروں سے عرصے میں ملاقات ہوتی تھی۔ ان سے دن بھر گپ شپ ہو رہی تھی۔

”بھئی یہی مواقع ہوتے ہیں خوشی کے، ملنے ملانے کے۔ ہمارے بچپن کا ہمیں یاد ہے۔ خاندان میں جہاں بھی شادی بیاہ ہوتا تھا۔ مہینہ مہینہ بھر پہلے رشتے دار ٹھہرنے کے لیے آ جاتے تھے۔ محبت، خلوص، وقت سب کی فراوانی تھی۔ رزق میں بھی بہت برکت تھی۔ اب تو یہ رواج بھی عنقا ہو چلا ہے، ایک تو مہنگائی نے سب کو مار دیا ہے۔ پھر آپس کی رنجشیں عداوتیں ہیں جو میل ملاقات اور آنے جانے سے لوگ رک گئے۔ کچھ مصروفیات بھی بڑھ گئیں، کیا مرد، کیا عورتیں، کیا ان کے بچے...... ہر کوئی دو وقت کی روٹی کمانے یا اپنا مستقبل بنانے کی فکر میں سرگرداں ہے۔“

انابی اپنی ہم عمر اور ہم خیال خواتین کے ساتھ بیٹھی حسب معمول ماضی کو یاد کر کر کے آہیں بھر رہی تھیں۔

”ٹھیک کہہ رہی ہو رخشندہ! بڑی بڑی خوشیوں کی تلاش میں لوگ چھوٹی چھوٹی خوشیوں سے بھی خود کو محروم کر بیٹھے ہیں۔“

بڑی دادی نے ایک آہ بھری۔ ان کے تین

بیٹے تھے۔ تینوں ہی ملک سے باہر تھے۔ پہلے تو پھر بھی دو تین سال میں کوئی نہ کوئی بیٹا پاکستان کا چکر لگا لیتا تھا مگر اب فیملی مصروفیات اور اخراجات بڑھنے کے سبب، تینوں ہی دیارِ غیر کے ہو رہے تھے۔

انہیں پانچ سال ہو گئے تھے، اپنے بیٹوں کو گلے لگائے ہوئے، مواصلات کے جدید ذرائع کے سبب سب کو دیکھ لیتی تھیں، بات کر لیتی تھیں مگر......

"شکر ہے کہ بچے جہاں ہیں، اپنے اپنے گھروں میں خوش ہیں۔" انابی نے ان کا قلق محسوس کر کے تسلی دی۔

"ہاں، بس یہی سوچ کر دل کو بہلا لیتے ہیں۔"

"یاد ہے فیروزہ آپا! بڑے ماموں جان کی شادی میں کیسے ڈھولک بجا بجا کر حلق پھاڑ پھاڑ کر سب نے گیت گائے تھے۔ آپ کتنا اچھا ڈھولک بجاتی تھیں۔" جہاں آرا نے یاد دلایا۔

"اے ہاں، اب تو برسوں گزر گئے۔ نہ ڈھولک بجانی یاد رہی نہ ہی گیت گانے۔"

فیروزہ آپا مسکرائیں تو ان کی نقلی بتیسی چمک اٹھی، جس کی وجہ سے وہ اپنی عمر سے ذرا کم لگ رہی تھیں۔

"اماں! لونگوں سے ہنڈیا بھر دیو رے، الائچیوں سے ہنڈیا بھر دیو رے۔" جہاں آرا گنگنائیں۔

"پڑھ کے الحمد، سہرا جو سجایا بنے کے سر پر۔"

انابی کو ایک اور بھولا بسرا گیت یاد آیا۔

"بنو تیرے ابا کی اونچی حویلی
بنو میں ڈھونڈتا چلا آیا"

☆☆☆

دوپہر کی دھوپ بالکنی کے ذریعے کمرے میں رچی بسی تھی۔ ساری لڑکیاں اپنے اپنے کاموں میں مگن تھیں۔ کوئی بالوں میں رولر لگا رہی تھی۔ کوئی آج کے دن پہننے کا جوڑا، جیولری وغیرہ سیٹ کر کے رکھ رہی تھی۔ کوئی ماسک لگا کے بیٹھی تھی اور ان سب کو گھور گھور کر دیکھ رہی تھی، جو اسے ہنسائے جا رہی تھیں۔

کوئی نہانے جا رہی تھی اور سب کی سب تنبیہہ کر رہی تھیں۔ دس منٹ کے اندر اندر آنے کی، لڑکیوں کی ہنسی اور آوازوں سے پورا گھر بھرا ہوا تھا۔ تب ہی حوریہ بھاگی بھاگی حمرہ کے پاس آئی۔

"حمو آپا! آپ کے پاپا آئے ہیں۔"

"پاپا......!" حمرہ بے اختیار کھڑی ہو گئی۔ پرسوں بات ہوئی تھی ان سے فون پر، وہ بیمار تھے۔ کہہ رہے تھے کہ اتنا لمبا سفر کرنا ان کے لیے ممکن نہ ہوگا لیکن وہ بہت خوش تھے۔ بہت دعائیں دے رہے تھے۔

"سچ کہہ رہی ہو؟" حمرہ نے بے یقینی سے حوریہ کو دیکھا۔

"آپ خود دیکھ لیں۔" حوریہ نے سامنے اشارہ کیا۔ واکنگ اسٹک کے سہارے چلتے ہوئے وہ حمرہ کی جانب ہی آ رہے تھے۔ ان کی بیوی اور بیٹا بھی ان کے ہمراہ تھے۔

"آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی، آپ نے اتنا لمبا سفر کیوں کیا؟" حمرہ نے ان کے گلے لگتے ہوئے گلوگیر آواز میں کہا۔ وہ پچھلے کئی برسوں سے امریکہ میں تھے۔ اب تو بہت بوڑھے اور کمزور لگ رہے تھے۔

"ڈاکٹروں نے تو منع کیا تھا مگر میں نے سوچا کہ جس خوشی کا برسوں سے انتظار کر رہا ہوں، اس میں شریک ہونے سے کیسے رہوں؟"

انہوں نے حمرہ کا سر چوما۔ آخری بار پانچ سال پہلے وہ پاکستان آئے تھے۔ حمرہ سے گاہے بگاہے ٹیلی فونک رابطہ رہتا تھا۔ جب سے وہ گردوں کے عارضے میں مبتلا ہوئے تھے۔ حمرہ کی شادی کے لیے بہت فکر مند رہتے تھے مگر حمرہ ان کے سمجھانے پر بھی شادی کے لیے راضی نہیں ہوئی تھی۔

"اور جب قسمت "ہاں" کہتی ہے تو انسان کی زبان سے بھی ہاں نکلتی ہے۔" رات میں اطمینان سے بیٹھے جب سب کے ساتھ باتیں کر رہے تھے تو انہیں خیال آیا۔

"میاں! بہت کمزور اور بوڑھے ہو گئے ہو۔ اتنی عمر تو نہیں تمہاری۔" فیروزہ آپا نے ہمدردی سے انہیں مخاطب کیا۔

"بیماری ہی ایسی لگ گئی ہے۔ سارا جسم گھلا دیا۔" ان سے پہلے انابی آزردہ ہو کر بول اٹھیں۔

"ہمت نہیں تھی آپا! بس کیسے سفر کر کے یہاں تک پہنچا ہوں، میں ہی جانتا ہوں۔ مگر بہت خوش ہوں۔ کوئی نہیں جانتا کتنی شدت سے خواہش تھی میری کہ حمو کا گھر بس جائے۔ میری زندگی میں ہی۔ اپنی آنکھوں سے یہ خوشی دیکھ لوں۔" بہنوئی صاحب نے انابی سے کہا۔

"اللہ کا شکر ہے، اس نے تمہاری آرزو پوری کر دی۔ ہمیں بھی بہت زیادہ فکر تھی حمو کی۔ بن ماں کی بچی ہے۔ لوگ تو ہم سے ہی سوال جواب کرتے تھے، بس میاں! بات یہ ہے کہ خدا کے گھر دیر ہے اندھیر نہیں۔ ہر کام اپنے وقت پر ہوتا ہے۔"

انابی کے چہرے پر بڑا سکون و اطمینان تھا۔ خوشی تھی۔ خوش تو حمرہ بھی بہت تھی۔ زندگی کے اس اہم خوشی کے موقع پر فطری طور پر اسے اپنی ماں کی بہت یاد آ رہی تھی۔ والد اگرچہ حیات تھے مگر اپنی بیماری کی وجہ سے اتنا لمبا سفر کرنے سے قاصر تھے۔ حمرہ ان کی مجبوری کو سمجھتی تھی اور اسے قبول کر چکی تھی مگر انہوں نے اپنی تکلیف اور بیماری کے باوجود یہاں آ کر اپنی بیٹی کی خوشیوں کو دوبالا کر دیا تھا۔

پچھلے کچھ دنوں سے وہ کھوئی کھوئی، پریشان سی تھی۔ آج بہت دنوں بعد دل سے مسکرائی تھی۔ ماضی کی تکلیف دہ یادوں اور باتوں کو فراموش کرنے میں ہی عافیت اور طمانیت ہے۔

☆☆☆

چاروں طرف مختلف سائز و اقسام کے برتن اور بچوں میں گھرے بلو میاں کے دونوں ہاتھ میدہ گوندھ گوندھ کر شل ہو گئے تھے۔ چکن میں تکہ مسالا لگا کر فرائی کر کے ایک طرف رکھا ہوا تھا بلکہ اسے حفاظتی تحویل میں لیا ہوا تھا کہ بعض پیٹو قسم کے بچوں سے اتنا صبر نہیں ہو رہا تھا کہ پیزا بننے کا انتظار کرتے لہٰذا وہ پہلے ہی فرائی چکن پر ہاتھ صاف کرنے کے چکر میں تھے مگر بلو بھائی اس معاملے میں پکے "بھائی" تھے۔ بوٹی اچکنا تو دور کی بات، کسی کو قریب بھی نہیں آنے دیا۔ جب تک "ڈو" تیار ہوئی، مناہل اور لاریب نے کچن صاف کر کے واپس اسی حالت میں لانے کی کوشش کی جیسے وہ پہلے تھا۔ بڑی مشکل سے یہ مرحلہ بھی سر ہوا۔

بلو بھائی روٹیاں بیل رہے تھے، مناہل اور لاریب چکن پنیر اور میش کی ہوئی مختلف سبزیاں ان پر لگا رہی تھیں۔

"بن گیا تم لوگوں کا پیزا؟" چھوٹی بھابھی کمرے سے نکل کر آئیں اور کچن میں جھانکا۔

"بس ممانی! مما، آنٹی! بننے ہی والا ہے۔" بلو سمیت تین بچوں نے بیک وقت اپنے اپنے رشتوں کے حساب سے انہیں مختلف جواب دیے۔

"میں کچھ ہیلپ کروا دوں؟"

"نہیں نہیں۔ ہم خود کریں گے۔" سب کے سب یک زبان ہو گئے۔ سوائے بلو میاں کے، جو اپنے چھوٹے چھوٹے کزنز کے فرمائشی پروگرامز تلے پسے جا رہے تھے۔

"خدا کسی کو چھوٹے چھوٹے کزنز کا بڑا بھائی نہ بنائے۔ اگر بنائے تو لحاظ اور مروت نہ عطا فرمائے۔" اپنی دکھتی ہوئی کمر کو سیدھا کرتے ہوئے بلو صاحب سوچ رہے تھے۔

"اور اگر یہ سب عطا فرمائے تو کوکنگ کا شوق اور ہنر ودیعت نہ فرمائے۔" عقل نے مزید صلاح دی۔

"ہاں یہ تو ہے مگر...... مگر یہ خوشی کا موقع اور سب کا ساتھ یہ بھی تو کم کم ہی ملتا ہے۔" ایک نظر سب کے چمکتے چہروں پر ڈالی۔

"آج کی مصروف زندگی میں جو لوگ خلوص اور محبت کے ساتھ رشتے نبھائیں وہ قابل احترام

ہیں۔"

☆☆☆

مایوں کے زرد جوڑے میں حمرہ پھول کی طرح کھلی ہوئی تھی۔ بریرہ نے بول بول کر بلکہ چھیڑ چھیڑ کر ناک میں دم کیا ہوا تھا۔ دوسرے جملہ حاضرین کی تھی تھی بند ہونے کا نام نہیں لے رہی تھی۔

"یہ عمر ہی ایسی ہے۔ بات بے بات ہنسی کا فوارہ چھوٹتا رہتا ہے۔ ہم لوگ بھی اس عمر میں تھے تو بڑوں سے اسی بات پر بار بار ڈانٹ کھاتے رہتے تھے۔" رابعہ خاتون کے اعتراض پر انابی نے لڑکیوں کی حمایت میں بیان جاری کیا۔

"کتنی ہنسی آتی تھی، جیسے کسی نے ڈھیروں ڈھیر لطیفے سنائے ہوں۔ مگر اس عمر کی ہنسی لطیفوں کی محتاج نہیں ہوتی۔ بس کسی ایک کی طرف سے پھلجڑی کا آغاز ہوتا ہے اور پھر ایک ایک کر کے ساری پھلجڑیاں روشن ہو جاتی ہیں۔" انہوں نے قل قل کرتی لڑکیوں کو پیار سے دیکھا اور دعا دی۔

"اللہ اس ہنسی کو ہمیشہ سلامت رکھے۔"

"گفٹ پسند آئے آپ کو؟" بریرہ اب ذرا انسانیت اور سنجیدگی کے جامے میں آ کر حمرہ سے تحائف کی بابت پوچھ رہی تھی جو اس کے والد اور والدہ لے کر آئے تھے۔

"محبت اور خلوص سے دیا گیا ہر تحفہ بہت قیمتی ہوتا ہے۔" حمرہ نے سچائی سے جواب دیا۔ سوتیلے رشتوں میں اپنائیت کے رنگ کم ہی ہوتے ہیں بلکہ ہوتے ہی نہیں۔ مگر یہ خاتون جو اس کی دوسری والدہ تھیں، دھیمے اور اچھے مزاج کی مالک تھیں۔ پھر ساری عمر وہ ایک دوسرے سے دور ہی رہیں۔ چند بار ہی ایسے مواقع آئے جب ملنا جلنا اور آمنا سامنا ہوا۔ اگر قربتیں کچھ مسائل کو جنم دیتی ہیں تو دوریاں بعض مسائل کو پیدا نہیں ہونے دیتیں جو قربت کی وجہ سے ہوتے ہیں۔

اب وقت گزر گیا تھا۔ پلوں کے نیچے سے بہت پانی بہہ چکا تھا۔ حمرہ گزرے وقت، حالات اور واقعات پر کڑھنا اور جلنا چھوڑ کر خوش ہونا اور خوش رہنا سیکھ رہی تھی۔ اسے تو اپنے باپ کے ساتھ ان مہمانوں کی آمد بھی بری نہیں لگی تھی جو کہنے کو اس کے سوتیلے رشتے تھے مگر ان کی آنکھوں میں اپنائیت کے رنگ تھے۔

"جو وقت اچھا گزر جائے غنیمت ہے بیٹا! اور ایسے لوگوں ــــ کے درمیان گزرے جو ہم سے محبت کرتے ہیں، ہماری پروا کرتے ہیں۔ ہمیں اہم سمجھتے ہیں تو ایسے قیمتی لوگوں کی اور ایسے قیمتی وقت کی قدر کرنی چاہیے۔" انابی کی باتیں، حمرہ اور بریرہ دونوں کے دل و دماغ میں محفوظ ہو جاتی تھیں اور گاہے بگاہے اجالوں کی طرح چمک اٹھتی تھیں۔

☆☆☆

شادمانی اور خوشیوں بھرے سارے پل ایسے گزر رہے تھے جیسا کہ ان کا وتیرہ ہے۔ یعنی تیزی سے اور چپکے سے بھی۔ حمرہ اور فخر حیات کی جوڑی بہت خوب صورت لگ رہی تھی۔

نکاح کے بعد دونوں ایک دوسرے کے ساتھ بیٹھے بہت مسرور تھے۔ حمرہ نے تو خیر انابی کی کڑی ہدایات کے نتیجے میں خود کو بہت کنٹرول کیا ہوا تھا۔ سر جھکا ہوا، نگاہیں نیچی، دانت اندر۔ وہ بالکل روایتی مشرقی دلہن لگ رہی تھی مگر دولہا میاں تو بالکل غیر روایتی دولہا تھے۔ کوشش کے باوجود ان کی بتیسی اندر ہو رہی تھی نہ زبان خاموش۔ ویسے انہوں نے کوشش تو بہت کی پُروقار اور سنجیدہ دولہا بننے کی، مگر قباحت یہ تھی کہ ماضی میں اس قسم کے یعنی خاموش اور سنجیدہ ـــــ قسم کے دولہاؤں پر وہ خوب ہنس ہنس کے تبصرے کرتے تھے کہ "زبردستی پکڑ کے لائے ہیں گھر والے...... مجبوری کی شادی، بے بس دولہا" اب ان کے بدتمیز قسم کے دوست یہی تبصرے یاد دلا کر انہیں خاموشی اور اطمینان سے بیٹھنے نہیں دے رہے تھے۔ کوئی نہ کوئی آ کر ایسا شوشا چھوڑتا کہ وہ جواب دینے پر یا قہقہہ لگانے پر مجبور ہو ہی جاتے۔ مزید سونے پر سہاگہ ان کا بھانجا، آج بھی وہ موصوف کسی قسم کا لحاظ

نہ کرنے پر تلے ہوئے تھے۔

"اونٹ پہاڑ تلے آ گیا آج۔" نکاح کے بعد ان الفاظ میں موصوف نے مبارک باد دی تھی۔

"میں نہیں چاہتا کہ اس خوشی کے موقع پر تو میرے ہاتھوں سے ضائع ہو۔" دولہا میاں نے دانت کچکچا کے پیارے بھانجے کو دیکھا تھا۔

"ہم کیوں ضائع ہوں گے؟ ذبح تو وہ بکرا ہوگا جو آج چھری تلے آیا ہے۔" ببلو میاں کی ہنسی بے قابو تھی اور دولہا میاں کا جلال۔

"خبردار جو میری بیگم کے سامنے اپنی بے لگام زبان کھولی۔" دولہا میاں بس بھانجے کی گردن دبوچتے دبوچتے رہ گئے۔

"میں نے کیا کہا ہے؟ آپ ہی کے الفاظ ہیں جو یاد دلا رہا ہوں۔" ببلو میاں نے شان بے نیازی اپنائی۔

"یہی موقع ملا ہے تجھے پرانی باتیں یاد دلانے کا؟" ماموں جھنجلائے۔

"آپ کے بہت سے اقوال زریں اسی مبارک موقع کے لیے ہی ہیں۔اس میں میرا کیا قصور؟"

بہت ہی پیاری سر جھکائے مشرقی سی دلہن کے پہلو میں بیٹھے مزے سے رشتے داروں کی مبارک بادیں وصول کرتے ہوئے بعض بدتمیز بلکہ خبیث قسم کے دوستوں کی آمد اور اپنے ہی انداز میں مبارک باد کچھ ایسی ہی تھی جیسے ٹھنڈی میٹھی کھیر کھاتے کھاتے کوئی چٹ پٹے، مرچیلے حلیم کا چمچہ کھلا دے۔

"مبارک ہو بھابھی! بڑے بہادر انسان سے شادی ہوئی ہے آپ کی۔" عماد بڑا پیارا بلکہ لاڈلا، چہیتا دوست تھا فخر کا اور چند برس پہلے اس کی شادی پر فخر صاحب نے جو اس کا ریکارڈ لگایا تھا وہ بھولا نہیں تھا۔

"یہ کیسی مبارک باد ہے؟" حمرہ کی سمجھ میں تو نہیں آیا مگر یوں ہی آنکھیں جھکائے جھکائے ہولے سے مسکرا دی۔

"یہ جو آپ کے دولہا صاحب ہیں اور ہمارے پیارے دوست۔ان کا قول تھا کہ شادی کی سولی پر خود کو ٹانگنا بڑا بہادری اور دلیری کا کام ہے تو آج یہ بھی ہم جیسے سورماؤں کے کلب میں شامل ہو گئے ہیں۔" عماد نے اپنی بات کی وضاحت بھی کی اور دوست موصوف کی ٹانگ بھی کھینچی۔

"اچھا؟" حمرہ کا دل تو چاہا کہ اس خوب صورت اقوال زریں پر ایک نظر موصوف کو گھور کے دیکھے مگر اس حرکت بلکہ جسارت پر انا بی کی گھوری برداشت کرنا بڑا دل گردے کا کام تھا۔ لہٰذا اس جسارت کو آئندہ مناسب وقت پر چھوڑتے ہوئے وہ خاموش ہی بیٹھی رہی۔

اور دولہا میاں کا بس نہیں چل رہا تھا کہ عزت مآب مہمان کو باعزت طریقے سے ان کی سیٹ تک پہنچا آئیں مگر آج ہی ان پر انکشاف ہوا تھا کہ اسٹیج پر بیٹھے دولہا سے زیادہ بے بس، بے اختیار اور بے چارہ کوئی اور نہیں ہوتا۔

کاش کہ کھانا کھل جائے تاکہ یہ منہ بولنے کے بجائے فقط کھانے کے لیے منہ کھولیں۔ اس مشکل وقت میں دولہا میاں نے اللہ سے رجوع کیا مگر ان کی دعاؤں کی قبولیت میں اور کھانا کھلنے میں ذرا وقت تھا اور اس وقت کا بلکہ سچویشن کا فائدہ اٹھانے کے لیے ایک اور دوست تشریف لے آئے تھے، معہ اپنی بیگم اور دو بچوں کے۔

"آداب عرض ہے بھابھی جان! اور آپ کی خدمت میں بھی سلام پیش ہے بادشاہ سلامت۔" وہ باری باری دونوں کو کورنش بجا لائے۔

"خاموش...... گستاخ!" دولہا نے آنکھوں ہی آنکھوں میں تنبیہ کی۔ مگر مہمان عزیز اس تنبیہ کو یکسر نظر انداز کر کے مزید گستاخی پر تلے ہوئے تھے۔

"بھابھی! یہ صاحب جو آپ کے پہلو میں بڑی شان سے دولہا بن کر تشریف فرما ہیں۔ آج سے کچھ عرصے پہلے تک کہا کرتے تھے کہ جنگل کا بادشاہ بھی اگر شادی کا بکھیڑا اور بیوی کا جھنجٹ پال لے تو

وہ نہ بادشاہ رہتا ہے نہ شیر۔ کچھ اور ہی بن جاتا ہے تو آج ہم سارے دوست یہ دیکھنے آئے کہ ہمارا پیارا شیر بکرا بنا ہے یا چوہا؟"

"ہیں...... ایسے نادر خیالات؟ شادی بکھیڑا، بیوی جھنجٹ...... دلہن بیگم کی کچھ حیرت زدہ اور کچھ غضب ناک نگاہیں بس اٹھی ہی تھیں کہ سامنے سے انابی آتی دکھائی دیں۔ حمرہ نے انتہائی لمبی گھنی اور مصنوعی پلکوں کی چلمن پھر سے گرا کر سر جھکا لیا۔

"ارے بھائی ہم نے سوچا، سلامی دے کر فارغ ہو جائیں پھر کھانا کھلواتے ہیں۔ تمہارے باوا بھی آ رہے ہیں۔" انابی نے باری باری پہلے دولہا پھر دلہن صاحبہ کو مخاطب کیا۔

"شکر ہے خدایا! میری زندگی کی مہربان پری بھیج دی آپ نے۔" فخر حیات چہرے کا پسینہ صاف کرتے اور گھبراہٹ دور کرتے ہوئے دل ہی دل میں اللہ کا شکر ادا کر رہے تھے۔

☆☆☆

ارمانوں سے بھری، خوشیوں سے مہکی، خوابوں سے سجی، حسین تعبیر جیسی رات مگر فخر حیات کے لیے یہ رات ایک کڑی اور سخت عدالت بن گئی تھی۔ سوالات اور اعتراضات کے جوابات دیتے دیتے وہ تھک رہے تھے مگر عدالت اپنی کارروائی میں بالکل چاق و چوبند تھی۔

"تو شادی کرنا، خود کو سولی پہ ٹانگنا ہے؟ شادی کے بعد شیر بھی بکرا بن جاتا ہے یا چوہا؟ شادی بکھیڑا ہے، بیوی ایک جھنجھٹ، بیوی کو گلے کا ہار بناؤ تو وہ پھانسی کا پھندا بن جاتی ہے؟ شادی ایک مصیبت، بیوی ایک بلا۔"

ملزم کا منہ اپنی صفائی دینے کے لیے کھلتا اور پھر بند ہو جاتا کہ عدالت کے تابڑ توڑ جملوں اور حملوں کی تاب کیسے لاتے؟

"تو آپ کے سارے گولڈن ورڈز (سنہرے اقوال) فقط بیوی کی شان میں کہے گئے ہیں۔ یہ جو شوہر نام کی ایک مخلوق ہوتی ہے اس کے بارے میں کیا خیال ہے؟"

آئی شیڈو، مسکارے، آئی لائنر اور مصنوعی پلکوں سے سجی بے حد حسین مگر ذرا شعلہ بار آنکھیں، ان پہ جمی ہوئی تھیں اور وہ زندگی میں پہلی بار ایسے مجرم کی طرح گھبرائے ہوئے تھے جو رنگے ہاتھوں جرم کرتے پکڑا گیا ہو۔

"یہ مخلوق تو ویسے بھی ایک چوہے یا بکرے میں تبدیل ہو جاتی ہے۔" بے چارے دولہے میاں ہڑبڑا کے بڑبڑائے۔

"مجھے ذرا بھی اندازہ نہیں تھا کہ شادی اور بیوی کے متعلق آپ کے خیالات "یہ" ہیں۔ وہ تو آپ کے آدھ درجن دوستوں نے بھانڈا پھوڑ دیا، وگرنہ میں تو بے خبر ہی رہتی کہ آپ کی نگاہوں میں میری کیا اوقات ہے؟ کیا حیثیت اور کیا وقعت ہے؟"

"دیکھیے، بات یہ ہے حمرہ! کہ وہ تو بس اپنے دوستوں سے مذاق مذاق میں کچھ کہہ دیا، ان باگڑبلوں نے ان باتوں کو گویا میرے برے وقت کے لیے حفظ ہی کر لیا۔ مگر حقیقت میں، میرا خیال ہے کہ شادی ایک انتہائی ضروری کام ہے جو ہر شریف انسان کو کرنا چاہیے۔ بھلا بیوی کے بغیر بھی زندگی کوئی زندگی ہے؟ بالکل اجاڑ، ویران، بیابان سی زندگی، ویسے اقبال بھی تو یہی کہہ گئے ہیں ناکہ "وجود زن سے ہے تصویر کائنات میں رنگ" تو ہر انسان اپنی ذات میں ایک کائنات ہے، اس کائنات کو رنگین بنانے کے لیے بیوی کا وجود از حد ضروری بلکہ ناگزیر ہے۔ یہ عورت ہے جو اپنی باتوں، مسکراہٹوں اور فرمائشوں سے گھر اور شوہر کو آباد کرتی ہے۔ ایک عورت عظیم ہے اور وہ بیوی بن جائے تو عظیم تر بلکہ ترین ہو جاتی ہے۔"

فخر حیات نے آنکھیں بند کر کے پوری تقریر جھاڑ دی اور پھر ڈرتے ڈرتے آنکھیں کھولیں تو ان پہ جمی شعلہ بار آنکھوں میں شعلوں کی جگہ دلچسپی نظر آ رہی تھی۔

"تقریر آپ اچھی کر لیتے ہیں۔"

"جی میں اسٹوڈنٹ لائف میں بہت اچھا ڈبیٹر تھا۔" فخر حیات، فخر سے بولے۔

"ہاں یاد آیا، آپ کے ایک دوست ذکر کر رہے تھے کہ آپ کی زندگی کی بہترین تقریر شادی کے موضوع پر ہی تھی شادی عذابِ زندگی۔" حمرہ کچھ سوچ کر بولی۔

اف یہ دوست، آدھے دوستوں نے بارات کے دولہا کی "واٹ" لگا دی، اب بقایا آدھے کل ولیمے کے دولہا کو "دھوئیں" گے۔

"اسٹوڈنٹ لائف کی باتوں اور خیالات کا عملی زندگی سے کیا تعلق؟ اسٹوڈنٹ تو ساون کے اندھے کی طرح ہوتا ہے جسے ہر وقت ہرا ہرا ہی سوجھتا ہے۔ اور مجھے علم ہوتا کہ اسٹوڈنٹ کی حیثیت سے کی گئی تقریر کی جواب دہی ایک شوہر کی حیثیت سے کرنی پڑے گی تو بخدا زندگی میں کبھی تقریر کے لیے منہ نہیں کھولتا۔"

دولہا میاں کی بے چارگی اور بے بسی اپنے عروج پر تھی اور پھر ایک معجزہ ہوا یا کم از کم فخر حیات کو تو معجزہ ہی لگا دلہن صاحبہ کھلکھلا رہی تھیں۔

"تو میں سمجھوں کہ میری جاں بخشی ہو گئی ہے۔" فخر نے اپنے اچھلتے کودتے، قلابازیاں کھاتے دل کو بمشکل قابو کیا۔

"فی الحال۔" عدالت عظمیٰ کی تنبیہی انگلی ان کی جانب اٹھی۔

"ہمیشہ کے لیے نہیں بلکہ آئندہ کسی مناسب وقت پر اگلی کارروائی تک عدالت برخاست کی جاتی ہے۔"

☆☆☆

اگلی صبح، جو تقریباً دوپہر میں ہوئی تھی ویسی ہی مصروف، مسرور اور ہنگامہ خیز تھی جیسا کہ عموماً شادی والے گھروں میں ہوتی ہے آپا جان، ملازمہ کی مدد سے جلدی جلدی بکھراوا، پھیلاوا اور ہر جگہ سوئے جاگے بچوں، بڑوں کو سمیٹ کر تیار ہونے کی صلاح دے رہی تھیں۔ بڑی بھابھی ان کے مشورہ دینے سے پہلے ہی اس پر عمل درآمد کے لیے میدان عمل یعنی سنگھار میز کے آگے ڈٹ چکی تھیں۔ چھوٹی بھابھی اپنی سب سے چھوٹی بٹیا کو فیڈر بنا کر دے رہی تھیں۔ جاگے ہوئے بچے ناشتہ مانگ رہے تھے۔

"ان جنوں بھوتوں کو کیوں اٹھا دیا آپ نے؟ ناشتے کی رٹ لگائی ہوئی ہے سب نے۔" چھوٹی بھابھی نے گھبرا کر اس پلٹن کو دیکھا جو ان کے سر پر ہی سوار ہو رہی تھی کیونکہ اس وقت کچن میں وہی دستیاب تھیں۔

"ارے ان سب سے حلیہ درست کرنے کو کہا ہے۔ ناشتہ تو دولہا دلہن کے ساتھ مل کر کریں گے، حمرہ کے گھر والے ناشتہ لے کر آ رہے ہیں۔ چلو بچو، جلدی سے ریڈی ہو جاؤ۔" آپا جان نے پہلے چھوٹی بھاوج کو پھر بچوں کو مخاطب کیا۔

"دلہن چچی کہاں ہیں؟" کسی بچی نے جماہی لیتے ہوئے سوال کیا۔

"وہ اپنے کمرے میں تیار ہو رہی ہیں۔ تم لوگ بھی فٹافٹ تیار ہو جاؤ۔"

گھڑی کی دونوں سوئیاں بارہ کے ہندسے پہ تھیں جب دلہن کے گھر سے مہمانوں کی آمد بمعہ "ناشتے" کے ہوئی انابی، بریرہ اور چند کزنز، حمرہ کے ابو، امی اور بھائی، باقی تو سب ڈرائنگ روم میں بیٹھے تھے، بریرہ، مناہل، لاریب اور دیگر لڑکیاں رنگ برنگے تھیلوں سے ناشتے کا سامان نکال کر سیٹ کرنے لگیں۔ حلوہ پوری، پراٹھے، بریڈ، مکھن، جیم، شہد، انڈے، ابلے ہوئے، فرائی، آملیٹ، کیک رسک، بسکٹ، مٹھائی، کیک اور موسم کے پھل کارن فلیکس، دودھ اور جوس کے ڈبے۔

پورے لاؤنج کی لمبائی میں بڑا سا دستر خوان بچھا کے سجا دیا گیا۔ بریرہ سمیت ساری لڑکیاں اب دلہن کے کمرے پہ دھاوا بول رہی تھیں۔ جہاں دولہا صاحب تو ڈرائنگ روم میں جا چکے تھے اور حمرہ تک سک سے تیار مہمانوں کے استقبال کے لیے موجود تھی۔ پیازی رنگ کا بھاری سا جوڑا، میچنگ جیولری، میک اپ پھر دلہناپے کا روپ۔

"یکا یک ہی اتنی حسین ہو گئیں آپ تو۔" بریرہ نے محویت سے انہیں دیکھا۔

"کتنی پیاری لگ رہی ہیں آپ؟" سب کی سب اپنے اپنے الفاظ اور انداز میں دلہن صاحبہ کی تعریف کر رہے تھے۔

”تھینک یو۔“ حمرہ مسکرا مسکرا کر داد وصول کر رہی تھی اور شکریہ ادا کر رہی تھی۔

”تھینک یو کس بات کا ہے؟“ بریرہ نے مسلسل شکریہ پہ الجھ کر سوال کیا۔

”اب تک کی زندگی میں اتنی ڈھیروں ڈھیر تعریف پہلے کبھی نہیں ہوئی جتنی اس ایک گھنٹے میں سن لی۔“ حمرہ نے جواب دیا۔

”تعریفیں تو فخر بھائی نے بھی کی ہوں گی، انہیں بھی تھینک یو تھینک یو کرتی رہیں؟“ شوخ اور باتونی علیزے نے سوال کیا۔

”تعریف تو کچھ خاص نہیں کی انہوں نے، ہاں تھینک یو کہا تھا۔“ حمرہ نے کچھ سوچ کر سادگی سے بتایا۔

”کس بات پہ، شادی کے لیے ہاں کرنے پہ؟“

”نہیں عدالت برخاست ہونے پہ۔“

”عدالت برخاست ہونے پہ؟“ سب کی سب ہکا بکا ایک دوسرے کو دیکھ رہی تھیں۔

☆☆☆

سرخ اور سرمئی امتزاج لیے بہت ہی نفیس کڑھائی والا کاٹن کا جوڑا پہنے، کانوں میں جھمکیاں ڈال کر اب بالوں میں برش کر رہی تھیں۔ شوہر نامدار، موبائل میں مگن تھے جب بیگم صاحبہ نے انہیں مخاطب کیا۔

”بات سنیں۔“

”جی۔“

”ہم، ہنی مون پہ کہاں جائیں گے؟“ لہجہ تو بہت شیریں تھا مگر سوال۔

”ہنی مون؟“ مجازی خدا کے حلق میں کچھ اٹک رہا تھا۔ موبائل ایک طرف رکھ کر انہوں نے کھنکھار کر پہلے حلق صاف کیا، ایک نظر اپنی عزیز از جان اور نئی نویلی بیگم کو دیکھا پھر ان کے چہرے پہ کچھ اس قسم کے تاثرات آ گئے کہ ”جان کی امان پاؤں تو کچھ عرض کروں؟“

”کیا ہوا آپ چپ کیوں ہیں؟“

”وہ دراصل بات یہ ہے کہ چھٹیوں کے فقط چار دن بچے ہیں۔ پانچویں روز آفس جوائن کرنا ہے۔“

”چار دن بچے ہیں؟ اتنی کم چھٹیاں لی تھیں آپ نے؟ کل تو ہمارا ولیمہ ہوا ہے۔“ حمیرہ نے حیران ہو کر کہا۔

”دو ہفتے کی لیو ملی تھی، ایک ہفتہ شادی سے پہلے کا تھا اور ایک شادی کے بعد کا۔“ فخر حیات نے سر کھجاتے ہوئے وضاحت کی۔

”شادی سے پہلے ہی ایک ہفتہ چھٹیوں میں ضائع کر دیا؟“

”ارے بھئی تیاریاں بھی تو کرنی تھیں شادی کی۔“ دولہا میاں نے بیگم کا بگڑتا مزاج دیکھ کر صفائی پیش کی۔

”شادی کی ساری تیاریاں تو ببلو نے کی ہیں، وہی بے چارہ ہر جگہ، ہر وقت بھاگ دوڑ کرتا رہا، آپ نے کیا تیر مارے ہیں؟“

”ایسی بات نہیں کہ ہر کام ببلو میاں نے ہی کیا ہے۔ کچھ تیر میں نے بھی مارے ہیں۔“

”مثلاً؟“

”مثلاً اپنے جوڑوں کا ناپ دینے خود گیا۔ اپنے جوتے خود خریدے اور، اور......“ وہ مزید کام یاد کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ جو بنفس نفیس اور بقلم خود کیے ہوں۔ مگر اور کوئی کام یاد نہیں آ رہے تھے۔

”میں یاد دلا دیتی ہوں۔“ حمرہ نے ان کی مشکل آسان کی۔

”شیروانی خود پہنی، سہرا خود باندھا، بارات لے کر آنے کی زحمت بھی خود ہی کی۔“

”بالکل بالکل، یہ تو اشد ضروری کام تھے جو میرے بغیر ہو ہی نہیں سکتے تھے۔“

”دیکھیے فخر صاحب ہنی مون پہ جانا ضروری ہے۔ لہٰذا آپ آفس سے کچھ دنوں کی ”لیو“ اور لے لیں۔“ حمرہ بی بی کے صبر کے پیمانے لبریز اور لہجہ سخت ہو گیا۔

”وہ تو شادی کے لیے ملتی ہے نا، اب دوبارہ یہی جرات کروں تو چھٹیوں کے لیے اپلائی کر سکتا ہوں۔“

فخر حیات نے ”آ بیل مجھے مار“ قسم کا مذاق کرنے کی جسارت کی۔

”اپنے مذاق اور فقرے بازی کم کریں اور

"تھینک یو۔" حمرہ مسکرا مسکرا کر داد وصول کر رہی تھی اور شکریہ یہ ادا کر رہی تھی۔

"تھینک یو کس بات کا ہے؟" بریرہ نے مسلسل شکریہ پہ الجھ کر سوال کیا۔

"اب تک کی زندگی میں اتنی ڈھیروں ڈھیر تعریف پہلے کبھی نہیں ہوئی جتنی اس ایک گھنٹے میں سن لی۔" حمرہ نے جواب دیا۔

"تعریفیں تو فخر بھائی نے بھی کی ہوں گی، انہیں بھی تھینک یو تھینک یو کرتی رہیں؟" شوخ اور باتونی علیزے نے سوال کیا۔

"تعریف تو کچھ خاص نہیں کی انہوں نے، ہاں تھینک یو کہا تھا۔" حمرہ نے کچھ سوچ کر سادگی سے بتایا۔

"کس بات پہ، شادی کے لیے ہاں کرنے پہ؟"

"نہیں، عدالت برخاست ہونے پہ۔"

"عدالت برخاست ہونے پہ؟" سب کی سب ہکا بکا ایک دوسرے کو دیکھ رہی تھیں۔

☆☆☆

سرخ اور سرمئی امتزاج لیے بہت ہی نفیس کڑھائی والا کاٹن کا جوڑا پہنے، کانوں میں جھمکیاں ڈال کر اب بالوں میں برش کر رہی تھیں۔ شوہر نامدار، موبائل میں مگن تھے جب بیگم صاحبہ نے انہیں مخاطب کیا۔

"بات سنیں۔"

"جی۔"

"ہم، ہنی مون پہ کہاں جائیں گے؟" لہجہ تو بہت شیریں تھا مگر سوال۔

"ہنی مون؟" مجازی خدا کے حلق میں کچھ اٹک رہا تھا۔ موبائل ایک طرف رکھ کر انہوں نے کھنکھار کر پہلے حلق صاف کیا، ایک نظر اپنی عزیز از جان اور نئی نویلی بیگم کو دیکھا پھر ان کے چہرے پہ کچھ اس قسم کے تاثرات آ گئے کہ "جان کی امان پاؤں تو کچھ عرض کروں؟"

"کیا ہوا، آپ چپ کیوں ہیں؟"

"وہ، دراصل بات یہ ہے کہ چھٹیوں کے فقط چار دن بچے ہیں۔ پانچویں روز آفس جوائن کرنا ہے۔"

"چار دن بچے ہیں؟ اتنی کم چھٹیاں لی تھیں آپ نے؟ کل تو ہمارا ولیمہ ہوا ہے۔" حمیرہ نے حیران ہو کر کہا۔

"دو ہفتے کی لیو لی تھی، ایک ہفتہ شادی سے پہلے کا تھا اور ایک شادی کے بعد کا۔" فخر حیات نے سر کھجاتے ہوئے وضاحت کی۔

"شادی سے پہلے ہی ایک ہفتہ چھٹیوں میں ضائع کر دیا؟"

"ارے بھئی تیاریاں بھی تو کرنی تھیں شادی کی۔" دولہا میاں نے بیگم کا بگڑتا مزاج دیکھ کر صفائی پیش کی۔

"شادی کی ساری تیاریاں تو ببلو نے کی ہیں، وہی بے چارہ ہر جگہ، ہر وقت بھاگ دوڑ کرتا رہا، آپ نے کیا تیر مارے ہیں؟"

"ایسی بات نہیں کہ ہر کام ببلو میاں نے ہی کیا ہے۔ کچھ تیر میں نے بھی مارے ہیں۔"

"مثلاً؟"

"مثلاً اپنے جوڑوں کا ناپ دینے خود گیا۔ اپنے جوتے خود خریدے اور، اور......" وہ مزید کام یاد کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ جو بنفس نفیس اور بقلم خود کیے ہوں۔ مگر اور کوئی کام یاد نہیں آ رہے تھے۔

"میں یاد دلا دیتی ہوں۔" حمرہ نے ان کی مشکل آسان کی۔

"شیروانی خود پہنی، سہرا خود باندھا، بارات لے کر آنے کی زحمت بھی خود ہی کی۔"

"بالکل بالکل، یہ تو اشد ضروری کام تھے جو میرے بغیر ہو ہی نہیں سکتے تھے۔"

"دیکھیے فخر صاحب! ہنی مون پہ جانا ضروری ہے۔ لہٰذا آپ آفس سے کچھ دنوں کی "لیو" اور لے لیں۔" حمرہ بی بی کے صبر کے پیمانے لبریز اور لہجہ سخت ہو گیا۔

"وہ تو شادی کے لیے ملتی ہے نا، اب دوبارہ یہی جرات کروں تو چھٹیوں کے لیے اپلائی کر سکتا ہوں۔"

فخر حیات نے "آ بیل مجھے مار" قسم کا مذاق کرنے کی جسارت کی۔

"اپنے مذاق اور فقرے بازی کم کریں اور

چھٹیاں بڑھوائیں۔" ہائی کمان کی طرف سے آرڈر آیا۔
"سرکار کی نوکری نہیں کرتا بیگم ...... انسانوں کی چاکری کرتا ہوں۔ اب مزید چھٹیاں مانگیں تو میری ہمیشہ کی چھٹی ہوسکتی ہے۔" موصوف نے موصوفہ کو ڈرایا۔
"کچھ نہیں ہوتا، ایک ہفتے کی لیو اور لے لیں۔ کہیں گھومنے چلیں گے۔" بیگم صاحبہ نے ان کے ڈراوے کا کوئی اثر نہ لیتے ہوئے ناک پر سے مکھی اڑائی۔
"اف، واقعی ان بیویوں کو کچھ سمجھانا، بھینس کے آگے بین بجانا ہے۔" فخر حیات اپنا سر پکڑ کر بیٹھ گئے۔

☆☆☆

میکے میں چوتھی کی دعوت بھی ہوگئی۔ سنہری و نیلی بنارسی ساڑھی میں حمرہ کا رنگ روپ اور اسمارٹ نیس اور بھی نمایاں ہوگئی تھی۔ مگر تمام وقت وہ کبھی سر پہ لگا جھومر ٹھیک کرتی پھر کبھی ساڑھی کا پلو سنبھالتی، کبھی چلتے چلتے خود کو سنبھالتی۔ بھاری بنارسی ساڑھی اوپر سے سارے تام جھام، ذرا دیر بعد ہی وہ گھبرا گئی۔
"ہائے انابی، یہ تو نہیں سنبھل رہی مجھ سے غرارہ نکال کر پہن لوں؟"
"کاہے نہیں سنبھل رہی؟ ساڑھی ہی ہے، نئی حکومت تو نہیں ہے۔ بھنو، ہم تو یہ لباس پہن کر گھر کے کام بھی کر لیتے تھے، تم سے ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں دو قدم چلنا محال ہو رہا ہے۔" شادی کے بعد حمرہ کی "عزت افزائی" میں انابی نے اضافہ کر دیا تھا۔ کسی اعتراض، کسی بات کو خاطر میں ہی نہیں لاتی تھیں۔
"آپ کی شادی تو حیدر آبادیوں میں ہوئی تھی۔ ان کا دن رات کا پہناوا تھا۔ آپ کو بھی اپنے رنگ میں ڈھال لیا۔ میں نے تو پہلی بار پہنی ہے۔ بار بار پیر الجھ رہا ہے۔" حمرہ نے اپنی مشکل کا اظہار کیا۔
"ذرا دیر کی بات ہے پھر عادت پڑ جائے گی، یہ بتاؤ، یہ جو فلمی لڑکیاں ہوتی ہیں ساڑھی پہن کر کیسے ناچ گانا کر لیتی ہیں؟"
"انہیں کیا معلوم، یہ محترمہ فلمی نہیں ڈرامائی ہیں۔" بریرہ نے سلاد سجاتے ہوئے دخل در نا معقولات کی۔
"انابی، بات کو کہاں سے کہاں لے جاتی ہیں۔ میرے مسئلے کا حل تو بتایا نہیں۔" حمرہ نے ایک بار پھر ڈگمگا کر چلنے کی کوشش کی۔
"چھوڑیں نا، ایک جگہ بیٹھی رہیں یا کھڑی رہیں۔ ویسے اچھی لگ رہی ہیں۔" بریرہ نے تسلی دیتے ہوئے تعریف کی۔
"ابھی مہمان آجائیں گے، ان کے سامنے کچھ گڑبڑ نہ ہو۔"
"کچھ نہیں ہوتا، چھتیس جگہ تو پنیں لگائی ہوئی ہیں آپ نے۔" بریرہ نے ٹماٹر کا پھول بناتے ہوئے حمرہ کے خدشے کو ہوا میں اڑایا۔
"ویسے ڈرامے سے یاد آیا، آپ اب بھی اکیلے ہی ڈرامہ دیکھتی ہیں یا فخر بھائی کے صبر کا امتحان لیتی ہیں انہیں دکھا دکھا کر؟"
"وہ کیا ڈرامہ دیکھیں گے وہ تو خود ایک ڈرامہ ہیں۔" حمرہ نے منہ بنایا۔
"واقعی؟"
"سچ میں۔" حمرہ یقین دلاتے ہوئے اسے بتانے لگیں۔
"میں نے کہا کہ راحت کاظمی کی پرسنالٹی اور اداکاری دونوں ہی بہت شان دار ہیں تو موصوف فرماتے ہیں یہ کون سی اداکارہ ہیں؟"
"پھر تو خیریت نہیں رہی ہوگی فخر بھائی کی۔" بریرہ نے ہمدردی سے سر ہلایا۔
"دل تو چاہ رہا تھا کہ یہی موبائل سر پہ دے ماروں، پھر میں نے سوچا چھوڑو، اتنا مہنگا نیا موبائل ہے، خوامخواہ ضائع ہوگا۔ ویسے غصہ تو بہت شدید آیا تھا مجھے۔"
"جی ہاں، میں آپ کے غصے کی شدت کو سمجھ سکتی ہوں۔" بریرہ نے پھر سر ہلایا۔
"بتاؤ ذرا، اس شخص نے زندگی میں کبھی کوئی ڈرامہ نہیں دیکھا، ایسا ہو سکتا ہے بھلا؟"
"ہونے کو تو اس دنیا میں کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ بائی داوے پھر فخر بھائی آخر کیا دیکھتے ہیں؟ آپ کے علاوہ؟"

''میرے علاوہ؟ صرف اور صرف ہالی وڈ موویز۔'' حمرہ بی بی نے بگڑے تیور اور گلابی رنگت کے ساتھ بتایا۔

''ایک بار میں روحی بانو کا پرانا ڈرامہ دیکھ رہی تھی۔ ایک سین موصوف کو دکھایا، اتنی زبردست اداکاری تھی۔ موصوف فرمانے لگے جتنی دیر میں یہ محترمہ چار ڈائیلاگ بول رہی تھیں اتنی دیر میں تو انجلینا جولی چالیس بندے پھڑکا دے۔''

''کیا چیز ہیں بھائی جان!'' بریرہ کی ہنسی نکل گئی۔ ''ہاؤ فنی؟''

''روحی بانو کی کیا ٹریجک زندگی اور موت تھی؟'' حمرہ اس بے مثل فنکارہ کی گرویدہ تھی۔

''آپ کے، اوہ سوری ہمارے مہمان آ گئے۔'' بریرہ دروازے کی سمت بڑھی اور اسے کھول دیا۔

☆☆☆

لاؤنج میں ایک ہنگامہ بپا تھا۔ چھوٹے بڑے سب ایک ہی جگہ حاضر تھے۔ بچوں کی چیاؤں پیاؤں اپنی جگہ تھی اور بڑوں کی آپس میں گفتگو بھی ہو رہی تھی۔ سارے شور شرابے کے باوجود، ساری خواتین ایک دوسرے سے با آسانی گفتگو کر رہی تھیں۔

''یہ ہنر، صلاحیت بلکہ خاص الخاص خوبی اللہ میاں نے صرف خواتین کو ہی دی ہے کہ وہ انتہائی شور شرابے اور ہنگامے میں ایک دوسرے سے با آسانی باتیں کر لیتی ہیں اور صرف بولتی ہی نہیں بلکہ ایک دوسرے کو بخوبی سن بھی لیتی ہیں۔'' ببلو میاں نے بے حد رشک سے لاؤنج میں بیٹھی جملہ خواتین کو دیکھا اور سوچا پھر اس کی تمام تر توجہ اور حسیات آپا جان کی طرف مرکوز ہو گئیں، جو کچھ کہہ رہی تھیں اور با آواز بلند بول رہی تھیں۔

''بھئی بات یہ ہے حمرہ! پرسوں تو سب کی روانگی ہے تو ہم سوچ رہے ہیں کہ کل تمہاری ''کھیر پکائی'' کی رسم کر لیتے ہیں۔ تمہارے گھر والوں کی بھی دعوت ہو جائے گی، کسی اور کو بلانا ہو تو بلا لینا۔''

''ٹھیک ہے، جیسے آپ کی مرضی۔'' حمرہ بی بی نے فرماں برداری سے سر ہلایا۔

''سوچ لو حمورانی! کھیر میں ہاتھ ڈالنے کے بعد ہر کام میں ہاتھ ڈالنا پڑے گا۔ سب کاموں کی ذمے داری جائے گی تم پہ۔'' بڑی بھابھی نے حسب عادت فقرے بازی کرتے ہوئے ٹھٹھا لگایا۔

''سب ہو جائے گا، تم ڈراؤ نہیں دلہن کو۔'' آپا بی نے نئی نویلی دلہن کو دلاسا دیا۔

''تین تو افراد ہیں گھر میں، یوں ہی ہو جائیں گے سارے کام، پتا بھی نہیں چلے گا۔ کون سا بڑا لمبا چوڑا کنبہ ہے۔'' چھوٹی بھابھی نے اپنے انداز میں حمرہ کی ہمت بندھائی۔

''جی......!'' حمرہ نے ایک نظر شوہر نامدار پہ ڈالی جو بڑی دلچسپ نگاہوں سے اسے دیکھ رہے تھے۔

علی الصبح آپا بی نے اٹھ کر دودھ کا دیگچہ چولہے پہ چڑھا دیا، چاول اور بادام بھگو دیے۔ ویسے تو کسی زمانے میں کھیر کے اوپر پستے کی ہوائیاں چھڑکی جاتی تھیں مگر پستے کی آسمان کو چھوتی قیمت نے انسانوں کی ہوائیاں اڑا دی تھیں لہٰذا اب صرف بادام کی ہوائیوں پر ہی اکتفا کیا جا رہا تھا۔

شام تک کھیر پکتی رہی۔ باری باری سب کی باریاں لگیں، درمیان میں ایک دو بار حمرہ نے بھی چمچہ چلا دیا، نک سک سے تیار، دھانی رنگ کا خوب صورت جوڑا پہنے، بالوں کو آگے سے ہلکا سا ٹوئسٹ کر کے پیچھے سے کھلا چھوڑ دیا تھا۔ لباس سے ہم رنگ جیولری تقریب کی مناسبت سے میک اپ، چوڑیاں، مہندی۔ آپا بی نے پانچ منٹ سے زیادہ حمرہ کو کچن میں نہیں ٹھہرنے دیا۔

''ساری عمر پڑی ہے کچن میں وقت گزارنے کے لیے، بس تم یہ چمچہ چلا کر رسم پوری کرو اور جا کر مہمانوں کو دیکھو۔''

حمرہ نے دو چار منٹ کھیر میں چمچہ چلایا اور سب نے یہ یادگار لمحہ موبائل میں محفوظ کر لیا۔ اس میں حمرہ کے مجازی خدا بھی شامل تھے۔

''انگلی کٹا کے شہیدوں میں نام ہو گیا؟'' حمرہ آ کر بیٹھی تو بریرہ نے اس کے کان میں سرگوشی کی۔

''چپ بدتمیز۔'' حمرہ بے اختیار ہنسی۔
انابی سب کے درمیان بیٹھی ماضی کی یادیں تازہ کر رہی تھیں۔
''بھئی آج کل تو بڑی آسانیاں ہیں، سہولتیں ہیں، پہلا سا زمانہ ہوتا تو بہو کے لیے بڑے سخت امتحان ہوتے تھے۔''
''کیسے امتحان؟''
''نئی نویلی بہو سے سل پہ مسالا پسوایا جاتا تھا یا پھر چٹنی، مسالا باریک ہوتا تو بہو محنتی اور سگھڑ خیال کی جاتی کبھی دال چاول ملا کر دے دیتے کہ دونوں کو الگ الگ کرو۔''
''کیوں؟'' حیرت میں ڈوبی کسی لڑکی کی آواز بلند ہوئی۔
''دیکھا جاتا تھا کہ پتّا مارنے کی صلاحیت ہے یا نہیں۔'' انابی نے مزے سے جواب دیا۔
''یہ کیا ہوتا ہے؟ پتّا مارنا۔''
''ارے بھئی ہوتا ہے کچھ، یوں سمجھ لو مستقل مزاجی اور صبر و برداشت کا سراغ لگایا جاتا تھا۔'' انابی نے سوچ کر کہا۔
''نانی جی! یہ سل کیا ہوتا ہے؟'' لائبہ کتنی دیر سے مخمصے میں تھی، بالآخر انابی سے پوچھ ہی بیٹھی۔
''بٹیا ہوتا نہیں ہوتی تھی یہ بھی، جب گھروں میں گرائنڈر مشین نہیں آئی تھی تو سل بٹا استعمال کرتے تھے چیزوں کو پیسنے کے لیے۔''
''اچھا!'' نئی پود کی آنکھوں میں حیرت اور بے یقینی تھی، ان میں سے کسی نے سل بٹے کی نہ شکل دیکھی تھی نہ ہی نام سنا تھا۔
''ویسے آج کل کی سسرال میں بہو کی آزمائش کیسے کی جائے گی؟ اب تو دنیا بہت بدل گئی ہے۔'' لاریب نے سوال اٹھایا۔
''دنیا کتنی ہی بدل جائے بٹیا، سسرال، سسرال ہوتا ہے چاہے بادشاہ کا گھر ہی کیوں نہ ہو۔'' انابی نے اپنے تجربے اور مشاہدے کی روشنی میں کہا۔
''آئی تھنک کہ آج کل کی بہوؤں کی آزمائش کچھ یوں ہو سکتی ہے کہ فیس بک فالوورز کتنے ہیں؟ یا بلیوٹوتھ اگر خراب ہو جائے تو ٹھیک کر سکتی ہے یا نہیں؟ موبائل ایپس کا استعمال کتنا آتا ہے وغیرہ وغیرہ۔'' مناہل کے سوالات پہ سب کے قہقہے گونج رہے تھے۔
''دنیا کمپیوٹر کی ہو یا روبوٹ کی، جب تک انسان کو خوراک کی ضرورت ہے پکانے اور پکانے والے کی بھی اہمیت ہے۔'' بریرہ نے انابی کے انداز میں بحث کو سمیٹا۔

☆☆☆

بالآخر مہمان بھی سارے رخصت ہوئے بھرا ہوا گھر ایک دم ہی خالی خالی لگنے لگا، بچے ہوں یا بڑے، گھر کی رونق انسانوں سے ہی ہوتی ہے۔ جس رات سب لوگ گئے۔ اس سے اگلی صبح فخر حیات کو آفس جوائن کرنا تھا۔ وہ صبح کے لیے موبائل میں الارم سیٹ کر رہے تھے۔ حمرہ بی بی ہاتھوں پہ لوشن کا مساج کر رہی تھیں۔
''بیوی، اگر جان کی امان پاؤں تو ایک سوال کروں۔''
''کیا مطلب ہے آپ کا؟ کیا میں ہٹلر کا فی میل ورژن ہوں یا پینڈٹ کوئین؟'' حمرہ نے ابرو چڑھائے۔
''عرض یہ ہے کہ صبح آپ اٹھ جائیں گی یا ببلو کی نیند خراب کروں؟'' فخر حیات نے بے حد شریفانہ انداز میں سوال کیا تھا۔
''نہ میں اتنی بری ہوں نہ اتنی پھوہڑ کہ اپنے شوہر کو صبح ناشتا نہ دے سکوں۔'' انابی کی برین واشنگ کا کچھ نہ کچھ تو اثر ہوا تھا۔ حمرہ کے چہرے پہ خفگی آ چلی تھی۔
''تمہارے چہرے پہ ناراضی کافی سوٹ کر رہی ہے۔ اچھی لگ رہی ہو مزید۔'' مجازی خدا نے جان بوجھ کے چھیڑا۔
''جی ہاں اکثر شوہر حضرات کو ناراض بیویاں اچھی لگتی ہیں۔ تم روٹھے ہم چھوٹے۔'' حمرہ نے ترچھی نگاہوں سے انہیں گھورا۔
''کیا واقعی ایسا بھی ہوتا ہے؟ سچ مچ جان چھوٹ جاتی ہے؟'' بے حد معصومیت سے سوال ہوا تھا اور حمرہ بی بی کوئی ایسی چیز تلاش کر رہی تھیں جس کا

نشانہ بالکل ٹھیک جا کر لگے۔

☆☆☆

صبح الارم کی آواز پہ حمرہ اٹھ بیٹھی، نیند شدید آ رہی تھی مگر دو چار جماہیوں کے بعد آنکھیں ملتے ہوئے پہلے غسل خانے پھر کچن میں گھس گئیں۔

"آپ کیا کھاتے ہیں ناشتے میں؟" کام کی شروعات کرنے سے پہلے حمرہ نے تیار ہوتے شوہر نامدار کو پکارا۔

"انڈا پراٹھا۔" فوراً جواب آیا۔

"انڈے تک تو ٹھیک ہے مگر پراٹھا؟" حمرہ کے حلق میں کچھ اٹکنے لگا۔

"پراٹھا؟ سچ مچ کا؟"

"جی ہاں سچ مچ کا، بل والا گول پراٹھا اور ہری مرچ پیاز کا آملیٹ۔"

"میں ٹرائی کرتی ہوں، اب جیسا بھی بنے، کھانا پڑے گا۔" حمرہ نے خود سے ہی سوال جواب کر کے فریج سے گندھا ہوا آٹا نکالا۔

"ویسے کوئی اتنا مشکل بھی نہیں ہوتا پراٹھا بنانا، انابی اور بریرہ کیسے کھٹا کھٹ اور فٹافٹ بناتی ہیں۔" حمرہ نے دونوں نیک بیبیوں کے بارے میں سوچا اور پیڑا بنانے لگی۔ جیسے تیسے پیڑا بن ہی گیا۔ گھی لگا کے اسے بل دار بھی کر لیا اور پھر بیل کر توے پہ ڈال دیا۔

یہ تو واقعی بہت آسان ہے۔ فٹافٹ بن گیا۔ حمرہ بی بی پراٹھا سینکتے ہوئے اپنی کارگزاری پہ پھولے نہیں سمارہی تھیں۔ بس دو قباحتیں تھیں جنہیں حمرہ نے جان بوجھ کر نظر انداز کر دیا۔ ایک تو پراٹھا دنیا کی طرح گول ہونے کے بجائے سری لنکا یا پاکستان کا نقشہ بن گیا تھا اور اس کے بل جگہ جگہ سے کھل گئے تھے۔ ان بلوں کو ایک دوسرے کے ساتھ جوڑنے اور جوڑے رکھنے کے چکر میں پراٹھا سکتا ہی چلا جا رہا تھا۔

اللہ اللہ کر کے وہ توے سے اترا تو آملیٹ کی باری آئی۔ پیاز، ہری مرچ کے ساتھ یہ مہم بھی پایہ تکمیل کو پہنچی۔

"ناشتہ کر لیں۔" ٹیبل پہ ناشتہ رکھ کر حمرہ نے آواز دی۔

"آ رہا ہوں۔" ٹائی کی ناٹ باندھتے ہوئے شوہر نامدار ڈائننگ ٹیبل کے قریب آئے۔ کرسی کھسیٹی اور پھر ان کی نگاہ میز پہ رکھے اس "کارنامے" پہ پڑی جو بیگم صاحبہ نے سرانجام دیا تھا۔

"یہ کیا ہے؟" فخر حیات کی بے یقین آنکھوں نے وہ لبوترا پراٹھا پہلے دیکھا پھر چھو کے دیکھا۔ جس میں کچھ خوبیاں تو پاپڑ کی تھیں پھر سارے بل ایک دسرے سے روٹھ کر الگ الگ ہو چلے تھے۔ خوش قسمتی سے جو حصہ ثابت تھا وہ جلا ہوا تھا۔

"پراٹھا ہے اور یہ آملیٹ، پیاز، ہری مرچ کا۔" حمرہ نے فخر یہ پیش کش والے انداز میں کہا۔

"پہلی بار بنایا ہے؟" فخر حیات نے پاپڑ نما پراٹھے کا ایک ٹکڑا توڑ کر منہ میں ڈالا اور چمچے سے آملیٹ کھایا جس میں موٹی موٹی ڈھو برا سی پیاز تھی۔ بے تحاشا ہری مرچیں اور برائے نام نمک تھا۔

"پکاتے پکاتے آ ہی جائے گا۔" حمرہ نے پراٹھے کی ہیئت اور ساخت پہ اب غور کیا تھا، جھٹ سے انابی کا قول دہرایا۔

جب تک تختہ مشق بنتے بنتے میرا تو دھڑن تختہ ہو جائے گا۔" فخر نے جیسے تیسے کھایا اور کھا ہی لیا۔

"مجھے کوئی شوق نہیں تھا بھی کوکنگ کا، آپ کے لیے جتن کیا ہے اتنا۔" حمرہ نے جتایا نہیں تھا۔ سادہ سے انداز میں بتایا تھا۔

"سو سوئٹ، ویسے مجھے یہ بات معلوم ہے۔" فخر مسکرائے پھر مزید بولے۔

"مہربانی آپ کی آپ نے اتنی زحمت کی۔"

"زحمت تو آپ نے کی ہے اسے کھانے کی۔" حمرہ نے صاف گوئی کا مظاہرہ کیا اور فخر کا قہقہہ بے ساختہ تھا۔

دوپہر میں نوڈلز کے دو باؤلز سے حمرہ کا اور ببلو کا گزارا ہو گیا۔ رات میں ببلو کی نائٹ شفٹ تھی فخر اور حمرہ ڈنر پہ باہر چلے گئے دو تین دن کچھ اسی طرح کی روٹین رہی۔ بریرہ ایک آدھ چکر لگا لیتی دن میں اور اپنی پھپھو جان پر بھی حیرت ہوتی اسے بھی ہنسی آتی۔

”راتوں رات بڑا انقلاب آ گیا۔ حیرت ہے، کبھی سوچا نہیں تھا کہ آپ ہوں گی کچن ہوگا اور تسلے میں آٹا، جسے گوندھنے بلکہ گھولنے کی کوشش کر رہی ہوں گی۔“ حمرہ آٹا گوندھنے کی مہم سے نبرد آزما تھی اور بریرہ کی لائیو کمنٹری جاری تھی۔

”زیادہ مذاق فرمانے کی بلکہ اڑانے کی ضرورت نہیں ہے یہ بتاؤ یہ کیسے ٹھیک ہوگا؟“ حمرہ نے بے حد پریشانی کے عالم میں آٹے کی شکل دیکھی جو واقعی پیڑے بنانے کے بجائے گلگلے بنانے کے لائق ہو گیا تھا۔

”اور آٹا ملائیں اس میں مگر صرف آٹا، پانی نہیں۔“ بریرہ نے ہنسی روکتے ہوئے مشورہ دیا۔

”بائی داوے آپ کی میڈ کہاں ہیں۔ جنہیں آپ کی مددگار کے طور پر رکھا گیا ہے؟“

”آج محترمہ نے چھٹی کرلی بس تو یہ سارا......“ حمرہ نے ایک بار پھر مزید آٹا ملا کر مکس کرنے کی کوشش کی۔

”کن چکروں میں پڑ گئی ہیں آپ، لائیں مجھے دیں۔“ بریرہ نے پہلے ہاتھ دھوئے پھر تسلہ اپنی طرف سرکا کر اس بگاڑ کو سدھارنے کی کوشش کرنے لگی۔

”سیدھا سیدھا آرڈر کر دیتیں کوئی ڈیل ویل بڑی جلدی، بڑی سگھڑ خاتون بن گئی ہیں۔“ ہاتھوں کے ساتھ بریرہ کی زبان بھی چل رہی تھی۔

”یہ دونوں کہتے ہیں کہ بازار کا کھانا کھا کھا کر دل بھر گیا ہے۔ گھر کا پکا ہوا، جیسا بھی ہو اچھا لگتا ہے۔“ حمرہ نے ہاتھ دھوتے ہوئے بتایا۔

”آپ کے ہاتھ کا تو جیسا تیسا ہی ملتا ہوگا بے چاروں کو۔“

”گوگل زندہ باد، ہنڈیا تو ٹھیک ٹھاک بن ہی جاتی ہے۔ روٹی اور پراٹھے میں بڑی گڑبڑ ہو رہی ہے۔ بے چارے شرافت سے حلق سے نیچے اتار لیتے ہیں۔“

”یقین نہیں آتا کہ واقعی تبدیلی آ گئی ہے؟“ بریرہ نے آٹے میں مکیاں ماریں۔

”اب کرلو یقین۔“ حمرہ نے پیچھے سے اس کی چوٹی کھینچی۔

”انابی کہہ رہی تھیں بچی کو ڈنر پہ بلالیں۔ چھٹی والے دن۔“ بریرہ نے آگاہ کیا۔

”نیکی اور پوچھ پوچھ۔“ حمرہ مسکرائی۔

☆☆☆

گورا چٹا بارعب چہرہ مگر باتوں میں بچوں کی سی معصومیت اور بے ساختگی کانوں میں سونے کی بالیاں، جن کے درمیان میں ایک سرخ موتی پڑا ہوا تھا۔ ایک ہاتھ میں چوڑیاں، دوسرا ہاتھ خالی، بال مہندی سے سرخ تھے، جن کو سمیٹ کر بڑے سلیقے سے پیچھے جوڑا باندھا ہوا تھا۔ ناک میں چمکتی ہوئی لونگ اور ویسی ہی چمک لہجے اور باتوں میں بھی۔

”ارے بھئی تمہارے ولیمے میں تو آئے تھے ہم سب، تمہیں یاد نہیں؟“ وہ خاتون جو خود کو فخر کی چچی کے طور پہ متعارف کرا رہی تھیں۔ اب حمرہ سے سوال کر رہی تھیں۔

”آں......وہ دیکھا ہوگا آپ کو......“

”ارے دیکھا کیا، تمہارے ساتھ بیٹھ کر فوٹو بھی بنوایا تھا۔“

”جی ضرور بنوایا ہوگا۔“ حمرہ کی شکل بے چاری سی ہونے لگی۔ فخر ابھی آئے نہیں تھے بہلو میاں بھی باہر نکلے ہوئے تھے۔ صد شکر کہ وہ تھوڑی ہی دیر میں آ گیا۔

”چھوٹی نانی، کیسی ہیں آپ؟ اور فہد بھائی کیا حال ہیں آپ کے۔“ بہلو بڑی بے تکلفی سے گفتگو میں مصروف تھا۔ حمرہ نے شام کی چائے اور ریفرشمنٹ تو سرو کر دیا تھا اب اسے رات کی فکر ہونے لگی کچھ سمجھ میں نہ آیا تو بریرہ کو فون کھڑکا دیا۔

”مہمان آئے ہیں، کھانا بنانا ہے۔“

”اچھا، میں ابھی آتی ہوں۔“ بریرہ تھوڑی دیر بعد آئی، اپنے ساتھ لایا شاپر اس نے کچن میں رکھا، مہمان خاتون سے علیک سلیک کے بعد وہ بریرہ کے پاس کچن میں آ گئی۔

”کوفتے اور کباب بنے رکھے تھے، وہ لے آئی، گریوی بنا کر کوفتوں کا فٹافٹ سالن بن جائے گا۔ بریانی بنا لیتے ہیں آپ کے فریزر میں کیا ہے؟“

"چلن ہے فریزر میں اچھی خاصی، اس کی بریانی بن جائے گی۔ تھوڑی مٹن بھی ہے۔" حمرہ فریزر کا جائزہ لے رہی تھی، اچانک چچی جان آگئیں۔

"ارے بھئی دلہن، کسی تکلف میں نہ پڑنا، میں تو پرہیزی کھانا کھاتی ہوں۔ ذرا سا سالن، ایک چپاتی۔"

"کیا تکلیف ہے آپ کو؟" حمرہ اور بریرہ نے ہمدردی سے انہیں دیکھا۔

"اللہ جانے، ڈاکٹر لوگ بتاتے تو کچھ نہیں بس کھانے پہ پابندی لگائی ہوئی ہے، چاول نہ کھاؤ، گوشت نہ کھاؤ، نمک، مرچ، تیل، کچھ نہ کھاؤ، پھر کیا کھائیں، ہوا؟ کاک پتھر۔" چچی جان کی بے ساختگی پہ دونوں کو ہنسی آرہی تھی۔

"میں آپ کے لیے ہلکے نمک مرچ اور آئل کا سالن بنادوں گی۔" حمرہ کی اتنی پیش کش پر ہی وہ نہال ہوگئیں دعائیں دینے لگیں پھر انابی آگئیں ان کے ساتھ باتوں میں لگ گئیں۔

حمرہ اور بریرہ نے مل کر چکن بریانی بنائی، کوفتے، کباب، مٹن، فخر آتے ہوئے فرائی فش اور آئس کریم لے آئے تھے۔ کولڈ ڈرنک کی جگہ بریرہ نے دہی کی میٹھی اور نمکین لسی بنائی تھی۔

پرہیزی سالن، چچی جان نے چند لقمے ہی کھائے پھر بریانی کی طرف بڑھادیا۔

"چکھ لیتی ہوں، کیسی ہے؟" اسی چکھا چکھی میں انہوں نے سب کچھ ہی کھالیا، فخر اور ببلو میاں اپنی مسکراہٹ دبائے بیٹھے تھے کہ ان کی عادت مزاج سے خوب واقف تھے۔ حمرہ البتہ پہلے حیران ہوئی پھر جیسے وہ بھی باقی سب کی طرح سب سمجھ گئی۔

چچی رکنے کے لیے آئی تھیں۔ ان کا پوتا فہد کھانے کے کچھ دیر بعد چلا گیا۔ انہیں ببلو کا کمرہ مل گیا۔ ببلو میاں نے لاؤنج میں میٹرس بچھالیا۔

☆☆☆

فخر موبائل لیے بیٹھے تھے، چہرے پہ سنجیدگی کے آثار تھے۔ کچھ سوچ کر حمرہ کو مخاطب کیا۔

"میرا خیال ہے کہ میں آپا جان کو فون کر دیتا ہوں، وہ چچی جان کو اپنے پاس بلوالیں گی۔"

"کیوں؟" حمرہ نے تعجب سے سوال کیا۔

"ایک آدھ دن کی مہمان داری الگ بات ہے، ہفتے بھر کی مہمان، تم کیسے مینج کروگی؟" فخر ہچکچائے۔

"میڈ روزانہ آتی ہے پھر بریرہ بھی سامنے ہی ہے، میں مینج کرلوں گی۔"

"سوچ لو، کوئی اعتراض تو نہیں ہوگا تمہیں، سسرالی رشتے داروں کی آؤ بھگت خدمت گزاری، تم نے کہا تھا کہ یہ سب تم سے نہیں ہوگا۔" فخر نے یاد دلایا۔

"ہاں، پہلے میں ایسا ہی سوچتی تھی، مگر اب مجھے محسوس ہوتا ہے کہ توازن کے ساتھ ہر رشتہ نبھایا جاسکتا ہے۔ چاہے میکے کا ہو یا سسرال کا۔" حمرہ نے پرخیال نظروں سے فخر کو دیکھا۔

"چچی جان بہت محبت اور خلوص کے ساتھ میرے پاس آئی ہیں۔ ان سے بے رخی برتنا، کوئی اچھی بات نہیں اور سچ کہوں تو وہ مجھے انابی جیسی لگی ہیں۔"

"سوچ لو، بعد میں ہم سے نہ کہنا۔" فخر کے چہرے پہ مسکراہٹ آگئی جیسے کوئی بوجھ دل سے اتر گیا ہو۔

"نہیں کہیں گے جناب، اور آپ بھی کچھ مت کہیے گا۔"

"کیوں...... کیوں؟" فخر سیدھے ہو بیٹھے۔

"روزانہ ہینڈ فری لگا کر ایک صدی پہلے کے ڈرامے دیکھنے لگ جاتی ہو، مجھ بے چارے کے دل کی باتیں، دل میں ہیں اب تک۔" شوہر صاحب نے سخت احتجاج کیا۔

"وہ باتیں میں جانتی ہوں، کہنا ضروری نہیں۔" حمرہ مسکائی، اس کا موبائل آن تھا۔ کمرے میں نیرہ نور کی سریلی آواز اپنے سر بکھیر رہی تھی۔

میں تم سے نہ پوچھو
تم مجھ سے نہ کہنا
دل کی ہیں جو باتیں
کہتے رہیں نیناں

☆

سارہ پیرزادہ
زنجیر ایام

رات کا دوسرا پہر تھا اور راجہ بازار راولپنڈی کی تنگ و تاریک گلیاں سنسان پڑی تھیں۔ سخت سردی کی وجہ سے تمام دکان دار دکانیں بند کر کے جا چکے تھے۔ راجہ بازار کی گلیوں سے نکل کر کچھ دور چلو تو وہاں متوسط گھرانوں کی ایک کالونی آباد تھی۔

اسی کالونی میں ایک بڑے چنار کے سائے میں کھڑے دو منزلہ گھر کی دوسری منزل میں ایک کمرے کی بتی اب تک روشن تھی۔

کمرے کی کھڑکی میں وہ کھڑا تھا۔ منظر میں سب سے الگ، سب سے اداس...... چنار کے پتوں پر نظریں گاڑے وہ ساری دنیا سے بیزار لگتا تھا۔ سارے جہاں سے خفا دکھتا تھا۔

اس کا ایسے وہاں کھڑے ہونا کوئی نئی بات نہ تھی۔ وہ اکثر یوں ہی کھڑکی میں بے حس و حرکت کھڑا رہتا تھا۔ لیکن چند دن سے وہ یہ کام بلاناغہ کر رہا تھا اور اب وہ رات بھر وہاں سے نہیں ہلے گا۔ یہ چنار سمجھتا تھا، ہوا باخبر تھی، چاند جانتا تھا۔

ہوا کا کوئی جھونکا جب چنار کے ساکت پتوں کو ہلاتا تو چاند ایک جھلک دکھا کر پھر چھپ جاتا۔ مگر اسے چاند سے کوئی غرض نہیں تھی۔ اسے ہوا سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔

وہ اس طرح رات بھر کھڑکی میں پہلی بار تب کھڑا رہا تھا، جب وہ پہلی بار اپنی ماں اور سامان کی ایک پوٹلی لے کر اس گھر میں آیا تھا۔ اس رات پہلی بار اس نے چنار کو اپنی درد بھری داستان سنائی تھی اور پھر یہ اس کا معمول ہو گیا۔

ایک رات اس نے یہیں کھڑے ہو کر اسی چنار کے سامنے یہ عہد کیا تھا کہ وہ اپنے باپ جیسا ظالم شوہر بنے گا، نہ ہی اپنے بھائیوں جیسا سنگ دل بیٹا۔ انسان کو کبھی کبھار کچھ عہد ٹوٹ جانے کا بوجھ بھی اٹھانا پڑتا ہے۔ لیکن عہد توڑنے کا احساس اسے بہت بعد میں ہوتا ہے۔ جب زنجیر ایام کی بہت سی کڑیاں آپس میں الجھ چکی ہوتی ہیں۔

☆☆☆

چائے میں پھینٹا چلاتے اس کے بازو تھک کر چور ہو گئے تھے لیکن چائے تھی کہ رنگ نکال ہی نہیں رہی تھی۔ اس کے ہاتھوں اور بازوؤں پر نیل پڑے تھے۔ اس کی ہڈیاں دکھ رہی تھیں۔ اس کے باوجود وہ

مکمل ناول

مسلسل ہاتھ چلا رہی تھی۔ کبھی دھیمی آنچ پر ابلتی چائے میں پھینٹا چلانے میں اور کبھی توے پر پراٹھا پلٹنے میں۔

"تم ناشتہ لا رہی ہو ذلیل عورت یا میں ایسے ہی نکل جاؤں کام پر؟"

رستم زمان نے چیخ کر کہا تو ہڑبڑاتی ہوئی نگینہ چائے کی پیالی میں چائے انڈیل کر پراٹھوں کی پلیٹ تھامے تیزی سے باہر آئی۔ چائے کی پیالی میز پر رکھتے ہوئے چائے تھوڑی سی چھلک گئی۔ اس نے ڈر کر رستم کو دیکھا جو اسے کھا جانے والی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

"جاہل عورت! خالی پراٹھا...... انڈا کدھر ہے؟ پتا ہے تمہیں کہ میں صرف پراٹھا گلے سے نہیں اتار سکتا۔" رستم نے پلیٹ اپنی طرف کھینچتے ہوئے کہا۔ نگینہ کچھ نہیں بولی۔ خاموش کھڑی رہی۔

"اب کھڑی میری شکل ہی دیکھتی رہو گی، جاؤ رات کا سالن بچا ہو تو لے کر آؤ۔" نگینہ تیزی سے کچن کی طرف بڑھی۔ زخم در زخم اس کی قسمت تھی۔

—— تذلیل اس کا نصیب......

"کیا فضول ذائقہ ہے چائے کا۔ کتنی دفعہ بتایا ہے کہ تھوڑا پکا لیا کرو چائے کو۔ ہاتھ کلائیوں سے جھڑ نہیں جائیں گے تمہارے اگر دو چار بار اور پھینٹا چلا لیتیں۔" چائے کا گھونٹ پیالی میں ہی اگلتا وہ چلا کر بولا۔

نگینہ نے سالن لا کر میز پر رکھا اور پھر خاموشی سے کھڑی ہو گئی۔ رستم کچھ دیر غصے سے اسے دیکھتا رہا پھر چائے کی پیالی اٹھا کر گرم گرم چائے اس کے اوپر پھینک دی۔

"باہر ہی کچھ کھا لوں گا۔" نگینہ کی آنکھ کھلی تو اس کا چہرہ پسینے سے شرابور تھا...... یا گرم گرم چائے سے جل گیا تھا، اسے احساس نہیں ہو پایا۔ اسے محسوس ہوا کہ کوئی آہستہ آہستہ اسے اماں پکار رہا ہے۔ غور کرنے پر سمجھ میں آیا کہ وہ فرزام کی آواز ہے۔

"اماں! میں نکل رہا ہوں۔ انٹرویو ہے ایک، آپ کے لیے چائے بنا دی ہے۔"

نگینہ نے دروازہ کھولا تو اس کا لاڈلا بیٹا سامنے کھڑا تھا۔

"میں نکل رہا تھا اماں! ناشتہ کر لیا ہے۔ آپ جتنی اچھی چائے تو نہیں بنائی لیکن گزارا ہے، پی لیجیے گا۔" فرزام نے اس کا ماتھا چومتے ہوئے کہا۔

"مجھے جگا لیا ہوتا بیٹا! اور ادھر دیکھو میری طرف، سوئے نہیں تم آج پھر رات بھر۔" نگینہ نے اس کے سوجن زدہ پپوٹوں کو دیکھ کر کہا۔

"ہاں، نیند نہیں آئی۔" فرزام نے آنکھیں ملتے ہوئے کہا۔

"میری بات کے بارے میں سوچا؟" نگینہ نے کھوجتی آنکھوں سے اسے دیکھا۔

"ناٹ اگین ماں۔" فرزام کوفت زدہ ہوا۔

"مشعل اچھی لڑکی ہے بیٹا!" نگینہ نے بے بسی سے کہا۔

"میں نے کب کہا کہ وہ اچھی لڑکی نہیں ہے اماں! ہو گی، بہت اچھی ہو گی...... مگر میں ان مسئلوں میں پڑنا نہیں چاہتا۔" جوتے کے تسمے بند کرتے فرزام بولا۔

"دن بھر پاگلوں کی طرح کام کرنے اور رات بھر کھڑکی میں کھڑے رہنے سے زندگی نہیں گزرتی فرزام!" نگینہ نے صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"ان دونوں کاموں سے جس دن تھک گیا تو بیٹھ جاؤں گا اماں!" رخ موڑے بنا تیزی سے کہہ کر وہ دہلیز پار کر گیا اور نگینہ اداس بیٹھی رہ گئی۔

☆☆☆

اداس سا فرزام سوچتا کہ کلاس کا سب سے لائق لڑکا یونیورسٹی سے نکلنے کے بعد کتنی جگہ مزدوری کرتا ہے، اگر کسی کو پتا چل جائے تو کیا ہو؟

وہ ہمیشہ کسی کلاس فیلو کے "ہائے فرزام! یہ سوال سمجھا دو...... بہت مشکل ہے" کہنے پر یہ سوچا

کرتا۔ ”اگر پتا چل بھی جائے تو کچھ نہ ہو“ یہ وہ تب سوچتا جب سوال سمجھنے والا ـــ سمجھ کر وہاں سے جا چکا ہوتا۔

وہ مناسب قد کاٹھ اور پرکشش نین نقوش والا لڑکا تھا۔ بڑی براؤن آنکھوں پر لمبی سیاہ پلکیں اور چہرے پر ہلکی بڑھی شیو اسے جاذب نظر بناتی تھی۔ ذہانت اس کی شخصیت کا خاصا تھی۔ چند پرانی گھسی ہوئی جینز اور عام شرٹس کو اگر فہرست میں شمار نہ کیا جائے تو وہ نظر بند کرنے کا تمام سامان رکھتا تھا اور اگر ان چیزوں کو فہرست میں شمار کرنے کے ساتھ اس کے پرانے جوتوں اور کھٹارا بائیک کو فہرست میں ڈال دیا جائے تو باقی چیزیں خود بخود فہرست سے نکل جاتی تھیں۔

یونیورسٹی سے نکلنے کے بعد وہ یونیورسٹی کے قریب ہی ایک ڈھابے پر برتن دھوتا تھا۔ یہ کام اس کو بہت احتیاط سے کپڑے بچا کر کرنا ہوتا تھا کیونکہ وہ اس کے بعد دو جگہ ٹیوشن پڑھانے جاتا تھا۔ وہاں سے فارغ ہو کر وہ ایک کنسٹرکشن پوائنٹ پر اینٹیں ـــ ـــ ڈھویا کرتا تھا۔

پنڈی جیسے علاقے میں ہر وقت کہیں نہ کہیں کوئی تعمیراتی کام لگا رہتا تھا۔ جس کی وجہ سے اسے آسانی سے کام مل جاتا تھا۔ گرم شہروں میں مزدور صبح یا پھر شام کو کام کیا کرتے تھے۔ جب گرمی کا زور کچھ کم ہوتا تھا۔

رات کا کھانا دونوں ماں بیٹا مل کر کھاتے تھے اور کھانے کے دوران تمام باتیں کر لیتے تھے۔ کچھ زبان سے بول کر کچھ خاموش رہ کر۔ اس کے بعد دونوں اپنے کمروں میں بند ہو جاتے۔ کون رات کو کب سویا؟ سویا بھی یا نہیں؟ اس کا اندازہ وہ صبح ناشتے کی میز پر ایک دوسرے کا چہرہ دیکھ کر لگا لیتے تھے۔

وجہ پوچھنے یا بتانے کی ضرورت دونوں کو پیش نہیں آتی تھی کیونکہ دونوں کے دکھ سکھ سانجھے تھے۔

ھانے کی میزان کے لیے واحد۔ جگہ تھی جہاں وہ ایک دوسرے کے ساتھ پرسکون وقت گزارتے تھے، کسی وحشت...... کسی خوف کے بغیر۔

☆☆☆

”اماں! مجھے ابا سے بہت ڈر لگتا ہے، جب وہ آپ سے اونچی آواز میں بات کرتے ہیں۔“ ننھے فرزام نے کہا تو نگینہ نے تڑپ کر اپنے بیٹے کی طرف دیکھا۔

”انہوں نے آپی کو بھی مارا تھا۔ ہم سب کہیں چھپ جاتے ہیں اماں! مجھے لگتا ہے وہ ہم سب کو مار دیں گے۔“

”نہیں...... ایسا نہیں ہوگا۔“ نگینہ نے اسے دونوں بازوؤں سے تھام لیا۔

”دیکھو فرزام! تمہارے ابا بہت اچھے ہیں۔ بس کبھی کبھار ان کو غصہ آ جاتا ہے۔ تمہیں ان سے ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے بیٹا! وہ تم سے پیار کرتے ہیں...... وہ نہیں ماریں گے تمہیں......“

”اور آپ کو؟“ اس نے ڈر کے پوچھا۔

”مجھے بھی نہیں ماریں گے...... چلو کھانا کھاتے ہیں۔“ وہ فرزام کے ماتھے پر بوسہ دیتی اسے کھانے کی میز پر لے آئی جہاں باقی بچے بیٹھے تھے۔ سفیان اور سلمیٰ۔

”آ جاؤ بلال بیٹا!“ اس نے اپنے تیسرے بیٹے کو آواز دی۔ بلال کے آنے پر سب نے کھانا شروع کیا۔

”یہ کیا آج پھر دال...... مجھے نہیں کھانی روز

دال۔" بلال نے پلیٹ اپنے آگے سے ہٹاتے ہوئے کہا۔

"بری بات ہے بیٹا! کھانے کی بے ادبی ہوتی ہے۔ایسے پلیٹ نہیں دھکیلتے سامنے سے۔"

"ابا تو روز ایسے ہی دھکیلتے ہیں۔ وہ بے ادب ہیں اماں؟" سفیان نے حیرت سے ماں کی طرف دیکھا۔

"کل تو ابا نے چائے آپ ـــــ پر پھینک دی۔ آپ کا منہ نہیں جلا اماں؟" بارہ سالہ سلمٰی نے بھی گفتگو میں حصہ ڈالا جو بہن بھائیوں میں سب سے بڑی تھی۔ نگینہ خاموشی سے سنتی رہی۔ وہ انہیں کیا بتاتی کہ جب دل ہی جل کر راکھ ہو چکا ہو تو جسم جلنے سے درد نہیں ہوتا۔

"تو میرے خلاف میرے بچوں کے کان بھر رہی ہے گھٹیا عورت؟" رستم کی آواز سن کر وہ سہم کر کھڑی ہوئی۔

"نن...... نہیں...... میں تو......"

"کیا میں تو...... کیا؟ بتا کیا بکواس کر رہی تھی؟ میں بے ادب ہوں...... اچھا......" وہ اس کی چوٹی پکڑ کر پوچھنے لگا۔

"اچھی بیوی تو خیر تو بن نہیں سکی، کم از کم اچھی ماں ہی بن جا ذلیل عورت۔ کس خاندان سے بیٹی اٹھا لایا ہوں خدایا! میری تو زندگی عذاب ہو گئی ہے۔"

"میرے بچوں کے سامنے میری تذلیل مت کرو رستم! ان کی نظروں میں مجھے مت گراؤ۔ میں تمہارے آگے ہاتھ جوڑتی ہوں۔"

نگینہ عاجز و ـــــ بے بس ہوئی...... التجا ہوئی اور ہمیشہ ہوتی رہی۔ ماں باپ کے گھر سے آ کر نگینہ نے سنتے رہنا سیکھا تھا۔ کبھی نہ بولنا سیکھا تھا۔

"اماں آ رہی ہیں گاؤں سے واپس...... کچھ ڈھنگ کا بنانا رات کو۔"

جب جی بھر کر رستم تذلیل کر چکا تو حکم سنا کر چلا گیا۔ بہت پڑھنے کی شوقین، بڑی باتیں کرنے والی نگینہ ہمیشہ کی طرح خاموش رہی۔

اماں واپس آ گئیں اور اس کی اذیتوں میں مزید اضافہ ہو گیا۔ نگینہ کی ہر غلطی نا قابل معافی، اس کی ہر خامی نا قابل برداشت اور اس کا میکہ بس گالیوں کے قابل......

☆☆☆

"کیا سوچ رہی ہیں پیاری اماں؟" فرزام نے لاڈ سے ماں کے گرد باز و حمائل کرتے ہوئے پوچھا۔

"کچھ نہیں، بس یوں ہی......" نگینہ نے جلدی سے آنسو پونچھتے ہوئے رخ موڑا۔

"آپ پھر پرانی باتیں یاد کر رہی ہیں نا، بھول کیوں نہیں جاتیں ماضی کو بھیانک خواب سمجھ کر۔" فرزام نے نگینہ کے ساتھ بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

"بھیانک خواب کبھی نہیں بھولتے بیٹا! ہر وہ خواب یاد رہتا ہے جس سے ڈر کر ہماری آنکھ کھل جائے۔ خیر چھوڑو...... یہ بتاؤ سفیان کی کال آئی؟ کیا بتا رہا ہے تھا، فرزانہ اور ننھی پری اب کیسی ہیں؟"

"آج سے پہلے کبھی آپ کے بیٹوں نے خود سے کال کی ہے؟ ہمیشہ آپ ہی کرتی ہیں اماں! پتا نہیں آپ ان لوگوں کی فکر کرنا چھوڑ کیوں نہیں دیتیں، جن کو آپ کی کوئی پروا نہیں ہے۔"

"ماں اپنے بچوں کی فکر کرنا کبھی نہیں چھوڑتی فرزام!"

"تو آپ کا ایک بیٹا آپ کے سامنے بیٹھا ہے، جی بھر کر فکر کیجیے...... اور اسی فکر میں چائے بھی پلا دیجیے۔"

"اسی لیے کہتی ہوں شادی کر لو تا کہ بوڑھی ماں کی ہڈیوں کو بھی تھوڑا آرام ملے۔ خود تو ویک اینڈ کے علاوہ تم گھر میں نہیں نکلتے، میں پورا دن گھر میں بور ہوتی ہوں۔" نگینہ نے اٹھتے ہوئے کہا۔

"پہلی بات...... میری ماں ابھی بوڑھی نہیں ہوئی۔ دوسری بات...... حرکت میں بہت برکت ہے اور آخری بات...... آپ کی بوریت مٹانے کے لیے یہ اتنی کتابیں ہیں نا۔" آخری بات اس نے تھوڑا چلا کر کہی تھی کہ کچن تک آواز جائے۔ ساتھ ـــــ

صوفے پر رکھی کتابیں الٹ پلٹ کر دیکھیں۔

''ہاں، بس شادی کی بات پر تمہیں ایسی ہی باتیں سوجھتی ہیں۔'' کچن سے ماں کی ناراض آواز ـــــ آنے پر اس نے ٹی وی ریموٹ اٹھا کر مسکراتے ہوئے ٹی وی آن کر دیا۔

☆☆☆

''ہاں تو محترمہ یہاں آرام فرما رہی ہیں۔''

یہ اس دن کی بات تھی جب نگینہ بخار میں تپ رہی تھی، لیکن اس کے باوجود اس نے سبزی بنائی اور دن کی روٹیاں ڈالنے کے لیے آٹا بھی گوندھ لیا تھا۔ بچوں کے اسکول سے آنے پر وہ دروازہ کھولنے گئی تو چکرا گئی۔ فرزام زبردستی اس کو بستر پر لٹا کر اس کا سر دبا رہا تھا، جب اماں نے دروازے سے جھانکا۔

''اماں کو بخار ہے دادو! ان کو تھوڑا آرام کرنے دیں۔'' فرزام نے کہا۔

''ہاں بھئی! تمہاری اماں کو آرام کرنے دیں۔ ایک زمانہ تھا جب شدید تکلیف میں بھی ہم کام کیا کرتے تھے۔ کچے ڈیرے پر لپائی کرتے تھے، دور دور سے پانی لاتے تھے۔ گھر سنبھالتے تھے لیکن مجال ہے جو منہ سر لپیٹ کر لیٹنا تو دور، تھکاوٹ سے آنکھیں میچنے کی اجازت بھی نہیں تھی ہمیں...... تمہاری ماں ٹھہری نخرے والی...... امیر میکے سے جو آئی ہے۔ سلمیٰ کو بھی کالج بھیج دیا ہے۔ بولا بھی تھا گھر بٹھاؤ ـ لڑکی کو۔ کچھ گھرداری سیکھ لے، کل کو ماں کی طرح دوسرے گھر جائے گی تو ہمیں ہی بے عزت کروائے گی نا۔ نہیں بھئی، ایف اے کرنا ہے محترمہ کو۔ تو اب کوئی روٹی بھی ڈال کر دے گا مجھ بوڑھی عورت کو یا بھوکی ہی پڑی رہوں۔'' ہاتھ ہلا ہلا کر بات کرتی وہ کمرے سے باہر چلی گئیں۔

''سفیان کو بھیجا ہے اماں! تندور سے لے آئے گا۔'' نگینہ نے نقاہت بھری آواز میں کہا۔

''ہاں، بس پیسے ضائع کروالے کوئی اس سے۔'' کچے صحن سے اماں نے چلا کر جواب دیا۔

''تو آپ ڈال دیجیے نا روٹی دادو! پیسے بھی بچ جائیں گے اور آپ کی ہڈیاں بھی زنگ لگنے سے۔'' فرزام نے بھی چلا کر جواب میں کہا۔

''بکواس بند کر تو سنپولیے۔ ماں کی زبان بولنے لگا ہے۔ آنے دے رستم کو تو واپس ...... غلط بات بالکل برداشت نہیں ہوتی مجھ سے۔'' دادو مخصوص انداز میں ہاتھ ہلاتی پھر دروازے میں آ چکی تھیں۔

''پھر تو یوں کہیے کہ آپ سے کچھ برداشت نہیں ہوتا دادو! کیونکہ صحیح باتوں کو برداشت کرنے کے لیے تو ویسے بھی کسی قسم کے تردد کی ضرورت نہیں پڑتی۔''

''بس کرو فرزام! جا کر یونیفارم چینج کرو۔'' نگینہ نے ڈر کر اماں کو دیکھا اور فرزام کو وہاں سے بھگانے کی کوشش کی۔

کبھی کبھی فرزام اسے ڈرا دیتا تھا۔ اس کی عمر بمشکل دس سال ہوئی تھی اور وہ باتیں کسی بڑے کی طرح سمجھتا اور کرتا تھا۔ اس کے دل میں سکون بھی اترتا تھا، جب وہ اس کے حق میں بولتا تھا مگر پھر بہت بری طرح ڈر بھی جاتی تھی۔ بلال اور سفیان تو زیادہ احساس نہیں کرتے تھے اور سلمیٰ زیادہ بولتی نہیں تھی مگر فرزام...... اس کا بس چلتا تو وہ ماں کو کہیں چھپا دیتا۔ ایسی جگہ جہاں اسے کام نہ کرنا پڑے، جہاں اسے باتیں نہ سننی پڑیں۔

☆☆☆

''کیا سوچ رہی ہیں پیاری اماں؟'' فرزام نے کھانے کی میز پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

''سلمیٰ کو یاد کر رہی تھی...... تم دعا کرتے ہو نا بہن کے لیے؟''

فرزام نے ماں کے ہاتھ چوم لیے۔ ''وہ بہت سکون میں ہوگی اماں! آپی نے بہت اچھا فیصلہ کیا تھا جانے کا۔ وہ بہت خوش ہوں گی۔ آپ اس کی طرف سے بے فکر ہو جائیں۔''

''جانتی ہوں...... پھر بھی تم دعا کیا کرو۔'' نگینہ نے سالن کا ڈونگہ فرزام کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

"ہم...... تو آپ کا فیورٹ قورمہ بنا ہے۔ اسی لیے یاد کیا جارہا ہے۔ ویسے ایک بات ہے اماں! ذائقہ بہت ــــ ہے آپ کے ہاتھ میں...... انت!"

"تم دنیا کے پہلے اور آخری انسان ہو جو یہ کہتا ہے۔" ڈونگہ اس کے ہاتھ سے لے کر نیچے رکھتے ہوئے نگینہ نے کہا۔

"کیونکہ فرزام کو جھوٹ بولنا نہیں آتا۔" فرزام نے پیار بھری نظروں سے ماں کو دیکھا۔

"مجھے یاد آیا...... سفیان کو کال کی تھی میں نے۔ یاد کر رہا تھا ہمیں...... بہو بھی چاہتی ہے کہ چند دن ہم وہاں جا کر رہیں۔ یاد کر رہے ہیں وہ ہمیں۔"

"میری بھولی اماں! یاد نہیں کر رہے ہیں وہ ہمیں، اصل میں چھوٹی کے بعد کام بڑھ گئے ہیں اور ان کو کوئی مفت میں کام کرنے والا چاہیے۔" فرزام کے لہجے میں تلخی گھل گئی۔

"ایسا بھی نہیں ہے فرزام! اتنا برا مت سوچو بیٹا اپنے بھائیوں کے لیے۔ اکیلے رہ جائیں گے ایسے تو ہم۔"

"ہم پچھلے کئی سال سے اکیلے ہی ہیں اماں! پیٹ کاٹ کر اپنی فیسیں پوری کرتا ہوں میں...... سلائی مشین کا پہیہ پورا دن گھماتی ہیں آپ تو راشن آتا ہے اس گھر میں۔ قسمت سے یہ دو کمروں کا خستہ حال گھر مل گیا ہے ہمیں، جس کا کرایہ کم ہے۔ رانا صاحب نے رحم کھا کر کرایہ نہیں بڑھایا چار سال سے...... اور میرے سگے بھائی، وہ خود سے کال بھی نہیں کرتے۔ مجھے چھوڑیں آپ کا ہی حال پوچھ لیا کریں۔" فرزام دکھ سے ہنسا۔

"بلال بھیجتا تو ہے کبھی کبھار پیسے...... اور سفیان بھی تو جب آتا ہے سودا ڈلوا جاتا ہے۔"

"بہت مہربانی ان کی، آپ مجھ سے تو نہ ہی امید رکھیں کہ میں وہاں جاؤں گا۔ ہاں اگر آپ جانا چاہتی ہیں تو گھر کی فکر مت کیجیے گا، میں سنبھال لوں گا۔" لہجے میں تھوڑی نرمی لا کر فرزام نے کہا۔

"کھانے پینے کی بھی فکر نہ کیجیے گا، میں ہوٹل سے لے آیا کروں گا اور چھوٹی کے لیے کوئی چھوٹا سا تحفہ بھی لے جائیے گا۔ خالی ہاتھ اچھا نہیں لگتا۔" وہ کہتے ہوئے اٹھنے لگا جب اس نے ماں کو مسکراتے ہوئے دیکھا۔

"کیا ہے؟ آپ کیوں مسکرا رہی ہیں؟" اس نے چڑ کر پوچھا۔

"پیار بھی کرتے ہو، جتانا بھی نہیں چاہتے۔" نگینہ نے برتن سمیٹتے ہوئے کہا۔

"کچھ بھی سوچتی رہتی ہیں آپ اماں!" فرزام نے کہا اور خجل سا ہو کر کمرے میں چلا گیا۔

نگینہ کی مسکراہٹ گہری ہو گئی۔

☆☆☆

وہ جاڑے کا ایک اور سخت اور بے رحم دن تھا۔ صحن میں لگے چند درختوں کے رنگ برنگے پتے پورے صحن میں بکھرے ہوئے تھے۔ صحن سے لکڑی کی سیڑھی اوپر جاتی تھی، جہاں چھوٹی سی بغیر کسی رکاوٹ کے چھت تھی اور ایک کمرہ جہاں کاٹھ کباڑ رکھا گیا تھا۔ یوں گزرتے وقت میں نگینہ کا سب سے چھوٹا بیٹا فرزام اب میٹرک کے امتحانات کی تیاری کر رہا تھا۔

سلمٰی کی شادی کے دن رکھے جا چکے تھے۔ گھر کا نقشہ مکمل طور پر بدل گیا تھا۔ کچھ نہیں بدلا تو وہ لہجہ تھا جس میں رستم یا اماں نگینہ سے بات کرتے تھے۔ چھت کے اوپر بنا واحد کمرہ اس غرض سے صاف کیا جا رہا تھا کہ مہمان زیادہ ہوں تو گھر کا کوئی فرد رات میں وہاں آ کر سو سکے۔

ضروری سامان ایک کونے پر جمع کرتے اور فالتو سامان باہر نکالتے نگینہ سے کوئی ناقابل تلافی غلطی ہوئی۔

وقت سفاک بنا...... لمحہ ٹھہر گیا۔

رستم کوئی چیز لے کر نگینہ کی طرف بڑھا۔ قریب تھا کہ وہ نگینہ کا قصہ ہی تمام کر دیتا، جب کوئی بیچ میں آیا۔

سلمٰی...... بے چاری سلمٰی...... خاموش

سلمیٰ...... آج خاموشی توڑنے کے ارادے سے ماں اور باپ کے بیچ آ گئی۔

جانے سے پہلے ایک بار سب ٹھیک کرنے کی خواہش میں۔ دیوار سے قریب، اتنی قریب کہ ایک قدم پیچھے کرتی تو صحن میں جا گرتی۔

"بس کر دیں ابا! جب سے آنکھ کھلی ہے، اس دنیا میں اپنی ماں کو پٹتے دیکھ رہی ہوں۔ گالیاں سنتے دیکھ رہی ہوں۔ بس کیوں نہیں کر دیتے آپ؟ کس جرم کی سزا ہے جو ختم ہی نہیں ہوتی۔ کیا آپ کو مکافات عمل پر یقین نہیں؟ آپ کو ڈر نہیں لگتا کہ یہ سب آپ کی بیٹی کے ساتھ ہوگا؟ چھوڑیں انہیں...... آپ یہ نہیں سوچتے کہ اللہ کو کیا جواب دیں گے آپ؟"

"چپ کر...... چار جماعتیں پڑھ کر مجھے سکھانے چلی ہے۔ ہٹ آگے سے...... غصہ نہ دلا مجھے ورنہ تیری ماں کی جگہ تجھے مار......"

یہ کہتے ہوئے رستم نے سلمیٰ کو اپنے آگے سے ہٹانا چاہا، جب اس کا پاؤں دیوار سے ایک قدم پیچھے ہوا۔ ہوا میں...... اس کے ہاتھوں نے کسی چیز کو تھامنا چاہا لیکن کوئی چیز اس کے ہاتھ نہ آئی۔ اسے بچپن کا وہ خواب یاد آیا جس میں وہ اونچائی سے گرتی ہے مگر زمین پر ٹکرانے سے پہلے اس کی آنکھ کھل جاتی ہے۔

اس نے آنکھیں بند کر لیں، اس امید پر کہ نیچے ٹکرانے سے پہلے اس کی آنکھ کھل جائے گی...... مگر ایسا نہیں ہوا۔

زنجیر ایام کی تمام کڑیاں ایک ساتھ ٹوٹ گئیں۔
سلمیٰ آزاد ہوئی...... سلمیٰ مر گئی......

☆☆☆

"سلمیٰ...... سلمیٰ......!"

"کچھ نہیں ہوا اماں! لیں پانی پئیں۔"

"وہ میری موت مر گئی فرزام! وہ میرا مقدر تھا۔ وہ کیوں بیچ میں آ گئی؟ میری سلمیٰ...... چھت سے گر گئی میری بچی...... ڈولی اٹھنے کے بجائے جنازہ اٹھ گیا اس کا۔ ہائے میری بچی...... وہ میری موت مر گئی۔"

"کوئی کسی کی موت نہیں مرتا اماں! آپی کی موت ایسے ہی لکھی تھی۔ انہیں ایسے ہی مرنا تھا۔"

فرزام اسے سمجھاتا۔ بلال اور سفیان ماں کے آنسو پونچھتے اور وہ بڑبڑاتے ہوئے دوبارہ بے ہوش ہو جاتی۔ محلے والے جو گزرے کل کی لڑائی سن کر چھتوں پر آ گئے تھے، وہ سلمیٰ کی موت کے بعد رستم کو تھانے بند کروا آئے۔

چند دن میں رستم رہا ہو کر گھر آ گیا۔ سلمیٰ کی موت حادثہ ٹھہری۔

یہ سلمیٰ کی موت کے چند دن بعد کی بات ہے، جب فرزام کی دادو نے اس کے ماموں کو کھانے پر بہت باتیں سنائی تھیں۔ طنز کے شہد میں ڈوبی ہوئی باتیں......

فرزام کبھی سمجھ نہیں پایا کہ اس کے ننھیال والوں کا آخر ایسا کیا قصور تھا جو انہیں خاموش رہنے پر مجبور کرتا تھا۔ سب سہنے پر مجبور کرتا تھا۔ بہت بعد میں پتا چلا کہ اس کی نانی نے پسند کی شادی کی تھی، والدین کی مرضی کے خلاف...... کچھ گناہوں کا حساب بھی تو نسل در نسل چکانا پڑتا ہے۔

ماموں بھی بہت دیر خاموشی سے سنتے رہے۔ پھر جب اٹھ کر جانے لگے تو دادو نے انہیں روک کر کہا۔

"ارے میاں! تم نے تو کچھ کھایا ہی نہیں، بیٹھ جاؤ۔ کچھ کھا کر جاؤ۔"

"بہت کھا لیا خالہ! سوچتا ہوں اتنا سب ہضم کیسے ہوگا۔ نگینہ کا ہاضمہ بہت مضبوط ہے، اللہ تمہارے لیے آسانیاں کرے، بہن!"

یہ کہہ کر ماموں چلے گئے۔ نگینہ کے گھر میں اس کے میکے کا کوئی آدمی آخری بار دکھائی دیا تھا۔

"دیکھا رستم تو نے، مجھ پر طنز کر کے گیا ہے۔ تیری ماں پر...... تیری غیرت نہ جاگی؟"

لیکن ابا خاموش رہے اور اس کے بعد وہ ہمیشہ ہی خاموش رہے۔ شاید سلمیٰ کی موت انہیں بہت کچھ

سمجھا گئی تھی۔ لیکن انہیں بہت دیر سے سمجھ میں آیا۔ ایک جان کا زیاں ہو چکا تھا۔

سلمٰی جاتے جاتے اپنی خاموشی اپنے باپ کو تھما گئی تھی۔

☆☆☆

''اور پتا ہے، اذلان اتنا مانوس ہو گیا ہے مجھ سے۔ پورے گھر میں دادو...... دادو کرتا گھوم رہا تھا۔''

فرزام مسکرا کر پوری توجہ سے ماں کو سن رہا تھا۔ وہ آج حیدرآباد سے واپس آئی تھیں اور کافی خوش گوار موڈ تھا ان کا۔

ماں کی باتیں سن کر فرزام نے یہ فیصلہ کیا کہ اماں کو مہینے میں ایک بار وہ حیدرآباد بھیج دیا کرے۔

''تم سن رہے ہو نا میری بات؟'' فرزام نے کسی بات کا جواب نہ دیا تو نگینہ نے پوچھا۔

''جی اماں! سن رہا ہوں۔ کیا بتا رہی تھیں آپ؟''

نگینہ نے پہلے تو اسے گھوری سے نوازا پھر سلسلہ کلام دوبارہ جوڑ لیا۔

''میں بتا رہی تھی کہ چھوٹی گڑیا کا نام ''اسوہ'' رکھا ہے۔ مجھ سے کہہ رہا تھا سفیان کہ میں چاہوں تو بدل دوں نام۔ میں نے کہا نہیں بھئی، بہترین نام ہے۔ اسوہ...... اچھا ہے نا؟'' رک کر فرزام سے پوچھا۔

''جی اماں! ان کے بچے ہیں، انہوں نے سوچ کر ہی نام رکھے ہوں گے۔''

''اتنے متنفر نہ ہو بھائی سے بیٹا!''

''نہیں ہوں اماں! بہت محبت کرتا ہوں دونوں بھائیوں سے۔ مگر پہلے جیسا مقام نہیں دے پاتا۔ یہ میرے بس میں نہیں ہے اماں!''

''کچھ مجبوریاں ہوتی ہیں بیٹا سب کی، جب تمہاری شادی ہو گی، بچے ہوں گے تو تم سمجھ جاؤ گے۔'' نگینہ نے اس کے بال سہلاتے ہوئے کہا۔

''ہاں، ٹھیک ہے۔ چلیں، اب سو جاتے ہیں۔ آپ بھی بہت تھکی ہوئی ہوں گی۔'' وہ اٹھنے لگا۔

''دور ہی بھاگنا ہمیشہ اس موضوع سے۔'' نگینہ نے مصنوعی خفگی سے کہا۔

''اوکے باس۔'' وہ ہنستا ہوا کمرے میں چلا گیا۔

☆☆☆

سلمٰی کی موت کے بعد رستم بہت کم عرصے ہی دکان پر پابندی سے جا پایا۔ وہ اکثر بیمار رہنے لگا تھا۔ بلال نے اپنی مرضی سے ایف اے کے بعد پڑھائی چھوڑ دی تھی اور اب وہ ابا کے ساتھ دکان کے کاموں میں ہاتھ بٹاتا تھا۔

سفیان نے اخبار کے دفتر میں نوکری شروع کر دی تھی اور فرزان نے ایف۔ ایس۔ سی میں ایڈمیشن لے لیا تھا۔ زندگی پھر سے اپنی ڈگر پر آ گئی تھی لیکن سلمٰی کی موت سب کچھ بدل گئی۔

رستم نے نگینہ کو مارنا چھوڑ دیا تھا، جھڑکنا چھوڑ دیا تھا۔ کھانے میں اور باقی چیزوں میں نقص نکالنا چھوڑ دیا تھا۔ ماں کی باتوں میں آ کر بیوی کو کچھ کہنا چھوڑ دیا تھا۔ حقیقت کسی آئینے میں بنے اپنے عکس کی طرح اس پر واضح ہوئی تھی۔

اس کا دل ملال، شرمندگی، دکھ اور اذیت سے بھر گیا تھا۔ اس کے بال اچانک سفید ہو گئے تھے۔ چہرے کی جھریاں بڑھ گئیں۔

وہ وقت نہیں بدل سکتا تھا۔ وہ گزرا وقت واپس نہیں لا سکتا تھا۔ وہ سلمٰی کو واپس نہیں لا سکتا تھا۔

اس کے رب نے اس سے ناراض ہو کر اپنی رحمت اس سے چھین لی تھی اور یہ احساس اسے اندر سے کھا رہا تھا۔ پچھتاوے کی دیمک اس کے احساسات چاٹ رہی تھی۔ شرمندگی کی آگ اس کا اندر جھلسا رہی تھی۔

اور اسے معلوم تھا کہ یہ سب اس کا مقدر کر دیا گیا ہے۔ اس کی زندگی کے بقایا لمحات ایسے ہی گزرنے تھے۔

☆☆☆

فرزام یونیورسٹی سے اپنے فائنل سمسٹر کا رزلٹ

دیکھ کر گھر آ رہا تھا۔ جب اس نے عجیب سانحہ دیکھا۔ اس کے پسندیدہ چنار کے درخت کے نیچے چند لوگ کھڑے چنار کاٹنے کی باتیں کر رہے تھے اور ایک بزرگ مسلسل اس کام کی مخالفت کر رہے تھے۔ وہ اداس دل کے ساتھ گھر آ گیا۔ اب رات کیسے خوب صورت لگے گی جب اس کی کھڑکی کے سامنے وہ درخت نہ ہوگا۔

"کیا ہوا بیٹا؟ رزلٹ اچھا نہیں آیا کیا؟" نگینہ نے اسے منہ لٹکائے بیٹھے دیکھا تو پوچھا۔

"اماں! وہ چنار کاٹ رہے ہیں۔" نگینہ کو بات سمجھ میں آ گئی۔

"ہاں بیٹا! آسیہ بتا رہی تھی۔"

"میں کیسے رہوں گا اماں؟" نگینہ نے حیرت سے بیٹے کو دیکھا۔

"کیا مطلب بیٹا! درخت ہی ہے۔"

"درخت نہیں ہے صرف اماں! میری راتوں کا حصہ ہے وہ...... میری باتیں سنتا ہے وہ۔"

نگینہ نے بیٹے کو ایسے دیکھا جیسے ڈاکٹر نفسیاتی مریض کو دیکھتا ہے۔

"میں بات کروں گی بیٹا! ہم وہ درخت کٹنے نہیں دیں گے۔" نگینہ کو یاد آیا جب بچپن میں ان کے صحن سے گلاب کا واحد پودا کسی نے اکھاڑ دیا تھا، تو فرزام کتنا غمگین ہوا تھا۔ اسے تین دن بخار رہا تھا۔

"رزلٹ کیسا رہا بیٹا!" اس نے دھیان بٹانے کے لیے پوچھا۔

"فرسٹ ڈویژن امی!"

"ماشاء اللہ، کیا ارادہ ہے؟"

"اپلائی کروں گا کچھ جابز کے لیے۔ فی الحال سونا چاہتا ہوں۔"

وہ کمرے میں آ کر سونے کے بجائے کھڑکی میں کھڑا ہو گیا۔ چنار کے نیچے کھڑے لوگ جا چکے تھے۔ پتا نہیں ان میں کیا فیصلہ ہوا۔ اس درخت کے ساتھ فرزام کی بہت سی یادیں جڑی تھیں۔ ہوا سے درخت کے پتے سرسرانے کی آواز، خزاں میں پاؤں کے نیچے پتے چرچرانے کی آواز، اس درخت کے پیچھے نظر آنے والی چاندنی کی ایک جھلک...... اور اس درخت کا چار سال مسلسل اس کو سننا۔ وہ درخت نہ رہا تو وہ بات کس سے کرے گا؟

اچانک کچھ یاد آنے پر وہ پردے برابر کرتا الماری کی طرف آیا۔

پرانی لکڑی کی الماری میں کتابیں سلیقے سے دھری تھیں۔

کہاں گئی، کہاں گئی...... یہاں ہی تو رکھی تھی۔ کتابوں کو ادھر اُدھر کرتے تیزی سے چلتے اس کے ہاتھ اچانک رک گئے تھے، جب مطلوبہ چیز اسے نظر آئی۔ وہ ایک کالے رنگ کی موٹی سی ڈائری تھی۔

☆☆☆

سلمٰی کو دنیا سے گزرے پورا ایک سال گزر گیا تھا۔ اس ایک سال میں آئی بڑی تبدیلیوں میں سے ایک یہ بھی کہ فرزام کی دادو کا لہجہ کافی بدل گیا تھا اور دوسری یہ کہ رستم بستر تک محدود ہو کر رہ گیا تھا۔ وہ بالکل خاموش ہو گیا۔ وہ ایک سال میں اس قدر بوڑھا ہو گیا تھا کہ چلنے پھرنے سے بھی قاصر تھا۔ نگینہ اس کا مکمل خیال رکھ رہی تھی۔

ایک دن فرزام اپنے کمرے کی صفائی کر رہا تھا، جب اسے الماری کے سب سے نچلے خانے میں ایک چھوٹا سا بکسہ ملا، جس پر چھوٹا سا تالا لگا تھا۔ فرزام نے تالے کو جھٹکا دیا تو زنگ آلود تالا فوراً کھل گیا۔ اس کے اندر کالے رنگ کی ایک موٹی سی ڈائری تھی، وہ سلمٰی آپی کی ڈائری تھی۔ اسے پتا ہی نہیں تھا کہ آپی کو ڈائری لکھنے کی عادت ہے۔

وہ سلمٰی کی روزمرہ کی باتیں پڑھتا گیا۔ آخری صفحے پر وہ ٹھٹک کر رکا تھا۔

"آج ابا نے میری شادی طے کر دی ہے۔ مجھے بالکل کوئی خوشی محسوس نہیں ہو رہی۔ عام لڑکیوں کی طرح میں نے کوئی خواب نہیں دیکھا۔ اس لیے کہ میں نے ابا اماں کو دیکھا ہے...... انہیں دیکھنے کے بعد مجھ میں خواب دیکھنے کی کوئی بھی سکت باقی نہیں رہی۔

میں اس رشتے سے خوف کھاتی ہوں۔ میں دل سے یہ چاہتی ہوں کہ میری شادی نہ ہو۔ مجھ میں اماں جتنا صبر نہیں، میں مر جاؤں گی۔ اللہ! میری زندگی مشکل نہ کرنا، مجھے سنبھال لینا۔"

ڈائری پڑھ کے وہ دیر تک روتا رہا۔ اس کی آپی کو اللہ نے سنبھال لیا تھا۔ وہ ڈائری کو سینے سے لگا کر رو رہا تھا، جب اماں گھبرائی ہوئی اس کے کمرے میں داخل ہوئیں۔

"فرزام...... فرزام! تمہارے ابا......!" وہ اتنا کہہ کر واپس پلٹ گئیں۔ فرزام آنسو صاف کرتا ان کے پیچھے لپکا۔

ابا کی حالت واقعی خراب تھی۔ فرزام نے ڈاکٹر کو بلانا چاہا تو رستم نے روک دیا۔

"ڈاکٹر کو مت بلاؤ۔ نگینہ! مجھے معاف کر دو۔ میں تمہارا گناہ گار ہوں۔ میں اپنی بیٹی کا گناہ گار ہوں۔ مجھے معاف کر دو کہ میری اذیت کچھ کم ہو۔"

وہ ہاتھ جوڑ کر گڑگڑانے لگا۔

"مجھے معاف کر دو...... ورنہ...... اللہ مجھے معاف...... نہیں کرے گا۔ مجھے ہر گالی...... سب طعنے...... معا...... ف کر...... دو نگینہ!"

وہ شدید تکلیف میں تھا۔ لفظ ٹوٹ ٹوٹ کر اس کی زبان سے ادا ہو رہے تھے۔ نگینہ رونے لگی۔

"میں نے آپ کو معاف کیا رستم زمان! میرا اللہ آپ کو معاف کرے۔"

رستم نے جڑے ہاتھ گرا دیے۔ روتے روتے اس کی ہچکی بندھ گئی۔ پھر اسے صبر آ گیا۔ اس کی اذیت کم ہوئی تو نیند آ گئی...... پھر وہ سو گیا۔

نگینہ چارپائی کے کونے پر ٹکی اس کے پاؤں دباتی رہی۔ رستم ایک عرصے کے بعد اتنا پرسکون سویا تھا۔ اس کے سینے سے بوجھ کم ہو گیا ہو جیسے......!

☆☆☆

"اماں! میں نے سوچا ہے کہ میں ایسا گھر خریدوں گا جس کے سامنے بڑا سا درخت ہو۔ پھر چاہے وہ چنار کا نہ ہو۔ مجھے درخت بہت پسند ہیں اماں۔"

رات تک فرزام کافی سنبھل چکا تھا۔ درخت نہیں کاٹا گیا تھا۔ شاید بزرگ کی بات مان لی گئی تھی۔ اس لیے وہ کھانے کی میز پر کافی فریش تھا۔

"ان شاء اللہ ضرور۔ پھر ہم اس کے صحن میں ڈھیر سے پودے لگائیں گے۔"

"میں کل اخبار لاؤں گا اور اچھی اچھی جابز کے لیے اپلائی کروں گا۔ میں سوچ رہا ہوں اماں! کہ ہمارے گھر کے سامنے بڑا سا پورچ ہو جس میں......"

موبائل کی تھرتھراہٹ پر وہ خاموش ہوا۔ موبائل پر کوئی انجان نمبر جگمگا رہا تھا۔

"ہیلو!" دوسری طرف سے سلام کیا گیا۔

"وعلیکم السلام! میں نے پہچانا نہیں۔ آپ کون؟"

"حیدرآباد والے گھر میں فون کیا تھا تو پتا چلا کہ آپ اور نگینہ بہن راولپنڈی میں رہتے ہیں۔ وہاں سے آپ کا نمبر ملا۔" بھاری مردانہ آواز میں کہا گیا۔

"ٹھیک ہے، مگر آپ ہیں کون؟"

"نگینہ بہن سے بات ہو سکتی ہے میری؟"

فرزام نے الجھ کر فون کان سے ہٹایا اور ایک نظر اسکرین کو دیکھتے ہوئے فون ماں کو پکڑا دیا۔

"وعلیکم السلام۔ الحمدللہ۔ کون بات کر رہا ہے؟ ارے اسلم بھائی! کیسے ہیں بھائی...... اور بچے کیسے ہیں؟"

فرزام سوالیہ ابرو اٹھا کر ماں کو دیکھتا رہا۔

"جی جی، خیر خیریت......"

"حکم کیجیے بھائی!"

"جی، میری آپی کی امانت ہے وہ...... مجھے جان سے زیادہ پیاری ہے۔"

"جی...... جی......" نگینہ بات کرتے کرتے میز سے اٹھ گئی اور فرزام سوچتا رہ گیا کہ اسلم بھائی آخر کون ہیں؟

☆☆☆

"فرزام کے ابا! انھیں کھانا کھا لیں۔"

جب رات تک رستم نہ جاگا تو نگینہ اسے جگانے کے لیے آ گئی۔ ٹانگیں ہلانے پر بھی رستم نے آنکھیں نہ کھولیں تو اس نے ڈرتے ہوئے رستم کا ماتھا چھوا۔ اس کا ماتھا ٹھنڈا تھا۔ برف کی طرح ٹھنڈا۔

نگینہ نے منہ پر ہاتھ رکھ کر اپنی چیخ دبائی، پھر چارپائی کے پاس بیٹھ کر رونے لگی۔ رونے کی آواز سن کر اماں اور رستم کے تینوں بیٹے بھی آ گئے۔

سب رو رہے تھے اور فرزام سوچ رہا تھا کہ کیا واقعی یہ اتنا بڑا زیاں ہے کہ آنسو بہائے جائیں؟

فرزام نے ماں کو دیکھ کر سوچا جو زارو قطار رو رہی تھی۔ ایسے جیسے کسی بچے سے اس کا پسندیدہ کھلونا چھن جائے۔ ایسے جیسے کسی انسان کا سب سے قیمتی اثاثہ چھن جائے۔

''اگر ابا بیمار نہ ہوتے اور اماں سے معافی مانگے بغیر گزر جاتے تو کیا تب بھی اتنی ہی شدت سے روتیں؟''

فرزام نے سوچا اور پھر رونے لگا۔ ایسے جیسے سب سے مہربان چھاؤں والا پیڑ کٹ جائے۔ ایسے جیسے سب سے محفوظ پناہ گاہ چھن جائے۔

رستم کی موت کے چند دن بعد فرزام نے سلمیٰ کی ڈائری کا پہلا صفحہ لکھا تھا اور اس کے بعد وہ اکثر اس ڈائری میں اپنے احساسات بھی قلم بند کرتا رہا۔

☆☆☆

وقت تیزی سے پر لگا کر اڑ رہا تھا۔ ایف ایس سی کے بعد اپنے ایک دوست کے ساتھ مل کر نمل یونیورسٹی میں فرزام نے بی بی اے کے لیے اپلائی کر دیا، جہاں اتفاق سے اس کا داخلہ بھی ہو گیا۔ بلال کی شادی بھی ان دنوں میں ہی تھی۔ بلال اور سفیان دونوں جانتے تھے کہ فرزام کو پڑھنے کا شوق ہے۔ اس لیے ان دونوں نے مل کر اس کی پڑھائی کی ذمہ داری سنبھال لی۔

پہلی فیس اماں کی سونے کی چوڑیاں بیچ کر پوری ہوئی اور یوں فرزام کا یونیورسٹی میں داخلہ ہو گیا۔ فرزام راولپنڈی میں ہی ہاسٹل میں شفٹ ہو گیا۔ اس دوران ان کے ایک جگہ ہوم ٹیوشن کی نوکری جس سے چھوٹے موٹے خرچ پورے ہو جاتے۔ باقی کے پیسے بلال اور سفیان بھیج دیتے تھے۔

فرزام ذہین تھا اس لیے اسے پڑھائی میں کبھی کوئی مسئلہ نہیں ہوا۔

بلال کی شادی ہو گئی اور دکان بھی خاصی چلنے لگی۔

سفیان نے تعلیم کے بعد صحافت کو ہی بطور پیشہ اپنا لیا۔ پہلے کی نسبت ان کا گھرانا بہت خوش حال ہو گیا تھا۔ دادو اپنے رویوں پر شرمندہ تھیں۔

ایک دن نگینہ ان کو کھانا دے رہی تھی، جب وہ رونے لگیں۔

''مجھے لگتا تھا تو مجھے رستم کے بعد گھر سے نکال دے گی۔ میرے ساتھ وہ سب کرے گی جو میں نے تیرے ساتھ کیا۔'' رونے کے درمیان ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں اماں نے کہا۔

''سچ کہوں گی اماں! کئی بار میرا دل چاہا کہ میں آپ کو اور رستم کو زہر دے کر بھاگ جاؤں لیکن اپنے بچوں کے لیے میں نے یہ نہیں کیا۔ رستم کے جانے کے بعد میرا دل چاہا، ہاتھ تھام کر آپ کو گھر سے باہر کر دوں لیکن میں ڈر گئی اس بات سے کہ میری بہوویں کل کو میرے ساتھ یہ نہ کریں۔ مکافات عمل کا چکر بہت وسیع ہوتا ہے اماں! نسلوں تک پرانے گناہوں اور کوتاہیوں کا تاوان بھرنا پڑتا ہے۔ کسی ایک مقام پر کوئی ایک بدل جائے، پرانی رسمیں بدل دے تو اگلی نسلیں سکون میں رہتی ہیں۔''

''تو مجھے معاف نہ کرنا بیٹی! میں نے بہت برا کیا ہے تیرے ساتھ۔'' اماں رو دی تھیں۔

''رستم کو معاف کر دیا ہے اماں! تو آپ کو بھی کر دوں گی۔ وقت لگے گا مگر کر دوں گی۔ آپ نے واقعی بہت زیادہ برا کیا تھا اماں! لیکن وہ سب ماضی کی باتیں ہیں۔ آپ انہیں سوچ سوچ کر ہلکان نہ ہو، انہیں اب بدلا نہیں جا سکتا۔'' نگینہ نے کہا۔

''جب تو نے پہلی بار کھانا بنایا تھا تو میں نے

تیرے ہاتھ میز پر رکھوا کر تیری انگلیوں پر اپنی چھڑی سے مارا تھا کیونکہ کھانے میں نمک کم تھا۔" اماں اپنی کہے گئیں۔

"آپ کی دوا پھر بدل دی ہے ڈاکٹر نے۔ آپ کو خود بھی کوشش کرنا ہوگی ورنہ آپ ٹھیک نہیں ہوں گی۔" نگینہ نے جیسے سنا ہی نہیں۔

"میں نے رستم سے جھوٹ بولا کہ تو مجھ سے بدتمیزی کرتی ہے حالانکہ تو نہیں کرتی تھی۔ وہ میرے سامنے تجھے میری ہی لاٹھی سے مارتا رہا، میں چپ رہی۔" اماں کے رونے میں شدت آ گئی تھی۔

"اگلے دن تو آٹا گوندھ رہی تھی، بازو کہنیوں تک چڑھا کر۔ میں نے دیکھا تیرے بازوؤں پر نیل تھے، مجھے ترس نہ آیا۔ میں نے اسی رات تجھے پھر پٹوادیا۔" اماں کی ہچکی بندھ گئی۔

"ہم عورتیں غلط کرتی ہیں اماں! اپنے جیسی دوسری عورتوں پر ترس نہیں کھاتیں، جو اپنے لیے سوچتی ہیں، وہ دوسروں کے لیے نہیں سوچتیں۔"

"میں نے تیرے خلاف، تیرے میکے کے خلاف اس کے اتنے کان بھرے کہ اس کے اندر کا اچھا انسان مرگیا۔ وہ میرے جیسا ہوگیا...... بہت برا......" اماں اپنے ہاتھوں سے ماتھا پیٹنے لگیں۔

"سلمٰی کی موت اسے سمجھا گئی، میں نہ سمجھ سکی۔ میں نے اپنے بچوں کی زندگی رول دی...... ہائے، اللہ مجھے معاف نہیں کرے گا۔"

"وہ بہت رحیم ہے اماں! وہ آپ کو معاف کردے گا۔" نگینہ نے یقین دلانا چاہا۔

"میں نے تجھے پورا پورا دن بھوکا رکھا اپنی انا کی تسکین کے لیے، کس چیز کی طلب تھی مجھے؟ کہ میرا بیٹا مجھ سے زیادہ کسی سے محبت نہ کرے یا اپنی بہو کی میں اس سے زیادہ بے عزتی کروں جتنی میری ساس نے میری کی تھی۔"

"بس کریں اماں! اس سے پہلے کہ میں آپ کو معاف کرنے کا ارادہ ترک کردوں۔" یہ کہہ کر نگینہ نے اماں کو گلے لگالیا۔

☆☆☆

بلال کی شادی سے پہلے نگینہ نے تینوں بیٹوں کو بٹھا کر کچھ باتیں کی تھیں۔ اچھی اور بری ساس بننے کے درمیان اس کی اپنی چوائس حائل تھی اور اس نے رسوم توڑنے کا سوچا۔ اس نے فیصلہ کیا کہ وہ اماں کی طرح ان کی ساس سے زیادہ ظالم نہیں بنے گی بلکہ اس سے زیادہ نرم ہوجائے گی جتنی وہ اپنے بچوں کے لیے ہے۔

"بیٹا! عورت بے شک کم عقل ہوتی ہے، جلد باز ہوتی ہے اور زبان کی کمزور بھی۔ مرد کو ایسے ہی اسے اپنانا ہوتا ہے بیٹا! وہ کسی کانچ کی ننھی گڑیا، کسی شہزادی جیسی کمزور ہوتی ہے، جسے اس کی دنیا سے اپنا کے مرد اپنی دنیا میں لے آتا ہے۔ اس سے اس کے پرانے رشتے، پرانا ماحول سب چھوٹ جاتا ہے۔ شروع کا عرصہ اس کے لیے بہت مشکل ہوتا ہے۔ ایسے میں اس کا شہزادیوں کی طرح خیال رکھنا ضروری ہے۔ اس کے لیے سخت نہ بننا بیٹا! تم سے تمہارے رویے کا سوال ہوگا۔ اسے عزت اور محبت دینا بیٹا۔ اسے بس یہ چیزیں چاہیے ہوتی ہیں، اسے بس ان دو چیزوں سے تسخیر کیا جاسکتا ہے۔ بدلا جاسکتا ہے۔"

آج دولہا بنا سفیان اماں کی یہ نصیحت یاد کررہا تھا اور اس کے پیچھے کھڑا فرزام بھی۔ دور کھڑا ننھے طلحہ کو سنبھالتا بلال بھی یہی بات سوچ رہا تھا۔ صاعقہ یقیناً اس کے لیے بہترین شریک سفر ثابت ہوئی تھی۔

"ایکسکیوزمی۔ آپ دولہا کے بھائی ہیں؟" فرزام کھانے کے انتظامات دیکھ رہا تھا، جب پیچھے سے کسی کی آواز اس کے کانوں میں پڑی۔ خوب صورت، شیریں آواز...... پرکشش طلسماتی آواز۔

"جی!" فرزام اسے ایک نظر دیکھ کر واپس مڑ گیا۔

"میں فرزانہ آپا کی کزن ہوں واہبہ! ہماری آپا زبان کی تیز ہیں کافی، مگر دل کی بہت اچھی ہیں تو خیال رکھیے گا۔"

"بہتر۔" فرزام نے جان چھڑا کر وہاں سے

جانا چاہا۔

"ویسے سنا ہے، آپ بی بی اے کر رہے ہیں۔ اس کے بعد کیا ارادہ ہے، آگے پڑھیں گے؟"

"ابھی سوچا نہیں...... ایکسکیوزمی۔" فرزام اسے نظر انداز کر کے وہاں سے چلا گیا لیکن پھر اگلے کئی دن وہ اسے نظر انداز نہیں کر پایا۔ ہر فنکشن میں اس سے ایسے ہی بے تکے سوال پوچھتی رہی، جس کا شروع میں وہ عدم توجہی سے اور بعد میں شوق سے جواب دیتا رہا۔

وہ مسلسل کئی دنوں سے کسی کی توجہ کا مرکز تھا، اس کے لیے یہ احساس نیا تھا۔ دل میں اٹھتی واہبہ واہبہ کی گردان نئی تھی۔ کانوں میں گونجتا وہ شیریں لہجہ نیا تھا۔ وہ لاشعوری طور پر واہبہ کی باتوں کا عادی ہوتا گیا۔ اس کا منتظر رہنے لگا۔

سفیان کی شادی کے بعد موسم گرما کی چھٹیوں کی وجہ سے فرزام حیدر آباد ہی میں رک گیا۔ واہبہ بھی چند دن فرزام کے گھر رہ گئی تھی۔ اس دوران ان کی اچھی خاصی بات چیت ہو گئی جو کہ واہبہ کے جانے کے بعد فون پر بھی جاری رہی۔

فرزانہ واقعی تیز طرار تھی مگر دل کی اچھی تھی۔ سب کا خیال رکھتی تھی۔ دونوں بھابھیوں کی آپس میں خوب جم گئی تھی۔ اماں اور دادو بھی خوش تھیں۔ فرزام بھی خوشی خوشی واپس ہاسٹل گیا۔

☆☆☆

فرزام جتنا خوش گھر سے آیا تھا، اتنا خوش زیادہ دن۔ رہ نہیں پایا۔ یہ تو وہ پہلے سے جانتا تھا کہ واہبہ راولپنڈی میں رہتی ہے۔ شاک اسے تب لگا جب وہ ایک دن اس سے ملنے یونیورسٹی آ گئی۔

فرزام کا دوست طاہر اس کا پرانا کلاس فیلو نکلا۔ جانے سے پہلے فرزام نے اسے روک کر آئندہ آنے سے منع کر دیا۔ اس ملاقات کے بعد اس کی کالز اور میسجز کم ہوتے ہوتے ختم ہو گئے۔ یہاں تک بھی ٹھیک تھا۔ فرزام اس کو اس کی ناراضی سمجھتا رہا۔

پھر ایک دن اس نے واہبہ کو طاہر کے ساتھ بائیک پر بیٹھے دیکھا۔ وہ دونوں ہنس رہے تھے اور فرزام کا دل جل کر راکھ ہوا یا جم کر پتھر۔ وہ سمجھ نہیں پایا۔

ماحول کی تبدیلی کے لیے وہ چند دن کے لیے حیدر آباد آ گیا۔ لیکن وہاں پہنچ کر اس نے ماحول میں عجیب تناؤ محسوس کیا پھر اس نے وہم سمجھ کر ٹال دیا۔

ایک دن وہ باہر سے واپس آیا تو اس نے گھر میں عجیب آوازیں اٹھتی محسوس کیں، جیسے کوئی چلا رہا ہو۔ غصہ کر رہا ہو۔ وہ جلدی سے گھر کے اندر داخل ہوا۔

"نہیں بیٹا! دخل نہیں دے رہی۔ میں صرف کہہ رہی ہوں کہ چٹنی لنگری پر پیسو تو ذائقہ الگ ہوتا ہے گرائنڈر سے۔"

"رہنے دیں اماں! پتا ہے مجھے۔ طعنہ تھا نا یہ کہ ہم کام نہیں کر سکتے۔"

فرزام نے دیکھا اس کی ماں سر جھکائے کھڑی تھی اور فرزانہ ان پر چیخ رہی تھی۔ وہ زبان کی بری ہے یہ تو واہبہ نے اسے بتایا تھا۔ لیکن اتنی زیادہ ہے، یہ نہیں بتایا تھا۔

"ارے بہن! تمہیں تو ابھی چند مہینے ہوئے ہیں، میں ڈیڑھ سال سے یہ سب برداشت کر رہی ہوں۔"

یہ فرزام کی بڑی بھابھی تھیں، جن کو وہ بہت نرم دل اور اماں کی خیر خواہ سمجھتا تھا۔ فرزام نے دکھ اور بے یقینی سے بھابھی کی طرف دیکھا۔

بھابھی کی جیسے ہی فرزام پر نظر پڑی، وہ مسکرا دیں۔

"ارے فرزام! تم آ گئے۔ تمہارے دونوں بھائی تمہارا انتظار کر رہے تھے۔ کہہ رہے تھے فرزام آئے تو اکٹھے کھانا کھائیں گے۔"

کیا اس کے دونوں بھائی گھر پر تھے؟ یہ سب سن رہے تھے؟ اسے لگا اس کا دل پھٹنے والا ہے۔ اس نے ماں کو دیکھا جو اسے دیکھ کر سنبھل چکی تھیں۔ بالکل فریش...... جیسے کچھ نہ ہوا ہو۔ اس نے فرزانہ کو دیکھا

جو اوپن کچن میں بالکل سامنے گرائنڈر میں چٹنی بنا رہی تھی۔ اس نے بڑی بھابھی کو دیکھا، جو مسکرا کر برتن نکالنے لگی تھیں۔

''بلال بھائی...... سفیان بھائی......!'' وہ وہیں کھڑا چلانے لگا۔

''کیا ہوا؟ کیوں چلّا رہے ہو؟'' سفیان نے کمرے سے باہر نکلتے ہوئے پوچھا۔

''ارے...... کان تو کام کرتے ہیں آپ کے۔'' فرزام نے مصنوعی حیرت سے کہا۔

''مطلب کیا ہے تمہارا؟'' بلال کہنیوں تک چڑھائے بازو نیچے کرتے ہوئے بولا۔

''یہی کہ میرے چلّانے کی آواز آپ کے کانوں میں پڑ گئی مگر اپنی بیگمات کے چلّانے کی آواز آپ کو نہیں سنائی دی۔'' فرزام کی آواز اونچی ہو گئی۔

''میں نے منع کیا ہے ان کو بولنے سے۔ میرا اور میری بیٹیوں کا معاملہ ہے یہ۔'' نگینہ نے فرزام کو روکنا چاہا۔

''کاش...... کاش اماں! آپ نے بیٹیاں سمجھا ہوتا۔'' فرزانہ گرائنڈر سلیب پر پٹخ کر میدان میں آ گئی۔

''میں اپنی ماں کو ساتھ لے کر جاؤں گا اس بار۔ نہیں سنبھال سکتے ہیں آپ دونوں تو بتا دیا ہوتا مجھے۔'' فرزام اب تک بھائیوں سے مخاطب تھا۔

''رہنے دو میاں! تمہیں بتا دیتے...... جسے خود ہم سنبھال رہے ہیں۔ ہاسٹل اور فیسوں کا خرچا ہی کافی ہے۔ اماں کو لے جا کر خرچا ہی بڑھاؤ گے تم۔''

فرزام کو احساس ہوا کہ فرزانہ صرف زبان ہی کی نہیں بلکہ دل کی بھی بہت بری ہے۔

''ایسا نہیں ہوگا...... اماں! سامان باندھ لیجیے گا۔ کل میں آپ کو لے جاؤں گا۔''

یہ کہہ کر فرزام گھر سے باہر نکل گیا اور نگینہ اسے روکتی ہی رہ گئی۔ اور بھائی پکارتے رہ گئے۔

''مت کرو اس پر ظلم، معصوم بچی ہے۔ شیشے کی طرح صاف دل ہے اس کا۔ میں ظالم تھی میرے جیسے نہ بنو سب۔''

ایک چھوٹے سے کمرے میں لیٹا نحیف جسم بڑبڑاتا رہا مگر اٹھ کر باہر آنے کی ہمت نہ کر سکا۔

☆☆☆

فرزام نے راولپنڈی آتے ہی بہت مناسب کرائے والا مکان ڈھونڈنا شروع کیا۔ ایک دوست کے بتائے ہوئے ایڈریس پر اسے گھر تو مل گیا۔ کرایہ بھی مناسب تھا مگر ایک دن میں ایڈوانس اور سامان کا بندوبست کرنا فرزام کے لیے مشکل تھا۔

''اماں! آپ نے میری دلہن کے لیے جو کپڑے رکھے ہیں، وہ بھی رکھنا ساتھ میں۔''

گھر والوں کو صفائی کے لیے ایک دن دے کر فرزام واپس آ گیا۔ لمحوں میں ہی اس نے فیصلہ کیا تھا کہ ایڈوانس اور کرایہ کیسے ادا کرے گا۔ یہ تو طے تھا کہ وہ بھائیوں سے پیسے نہیں مانگے گا۔ اگلے دن وہ اماں کو لے کر راولپنڈی آ گیا۔ سونے کے چار کڑے بیچ کر اس نے گھر کا ایڈوانس، دو میٹرس، چند برتن اور کچھ کھانے پینے کا سامان خرید لیا۔

دو کمروں کے خستہ حال گھر میں سامان بہت کم تھا۔ فرزام کو اپنی کھڑکی کے سامنے نظر آنے والا چنار کا درخت بہت پسند آیا تھا۔ وہ اکثر جب اداس ہوتا تو کھڑکی میں کھڑا آدھی رات گزار دیتا۔ موجودہ وقت گزرے وقت سے چند لمحے ادھار لے کر اس کے ذہن کو تھما دیتا جنہیں وہ سوچتا رہتا۔ خاموشی سے چنار کو سنتا جاتا۔

ہاسٹل کے تھوڑے سے سامان میں سلمیٰ آپی کی ڈائری بھی تھی جس پر اب بھی کبھی کبھار وہ کچھ لکھ لیتا۔ یونیورسٹی کے قریب ہی ایک ڈھابے پر اسے برتن دھونے کا کام مل گیا۔ ٹیوشن وہ بدستور پڑھاتا رہا۔

بلال بھائی اکثر پیسے بھیج دیتے جن کو پہلے تو وہ نہ خرچ کرنے اور لوٹا دینے کی غرض سے جمع کرتا رہا۔ مگر ایک بار اماں بیمار ہوئیں تو اسے پیسے خرچ کرنے پڑے۔ پھر اس کے بعد وہ پیسے استعمال کرتا رہا۔ یہ سوچ کر کہ جب جاب لگی لوٹا دے گا۔

سفیان بھائی ایک بار آئے تو تمام سودا ڈلوا گئے۔ وہ یونیورسٹی سے آیا تو بس وہ واپس حیدر آباد نکلنے والے تھے۔

"جب بلال بھائی کے پیسے رکھ لیتا ہوں تو سامان کو کیسے منع کروں؟" فرزام نے سوچا۔

"مجھے معاف کر دینا فرزام! میں نے فرزانہ کو روکنے کی بہت کوشش کی تھی۔ ایک بار مارنے لگا تو اماں نے روک دیا۔ کہنے لگیں کہ میں رستم زمان نہ بنوں۔ اپنی ماں کے لیے بیوی سے نہ لڑوں۔" جانے سے پہلے سفیان نے بے بسی سے کہا تھا۔

"رستم زمان اور آپ کی ماں میں فرق تھا بھائی۔" فرزام نے دکھ سے کہا۔

"معاف کر دو...... اماں سے بھی معافی مانگ چکا ہوں۔ انہیں ساتھ لے جانے آیا ہوں۔ دادو کی صحت خراب ہے اور کوئی ان کا خیال نہیں رکھ پا رہا۔"

فرزام کو تب بستر پر لیٹے اس نحیف وجود کا خیال آیا۔ وہ اماں کے ساتھ خود بھی سفیان کے ساتھ چلا آیا۔ دادو کی حالت بہت خراب تھی۔ ان کو کھانا کھلانے اور باتھ روم میں لے جانے کے لیے ایک کام والی رکھ لی گئی تھی۔ اماں کو دیکھ کر وہ بہت خوش ہوئیں۔ فرزام اماں کو چھوڑ کر لوٹ آیا۔ مگر چند بعد اسے واپس جانا پڑا، دادو کی فوتگی پر۔

واہبہ کی بے وفائی کا غم اب تک فرزام کے ساتھ تھا۔ جنازے میں اسے دیکھ کر پھر تازہ ہو گیا۔ اس نے واہبہ سے کوئی بات نہ کی۔ نہ ہی اس نے اس قسم کی کوئی کوشش کی۔ اماں شاید اس کی پسندیدگی جانتی تھیں۔ ایک دن کہنے لگیں۔

"سوچ رہی ہوں فرزانہ سے بات کروں اور واہبہ کی طرف رشتہ لے کر جاؤں تمہارا۔"

وہ اماں کو کیا بتاتا؟ کہہ دیا کہ اسے دلچسپی نہیں۔

پھر کئی دن تک نگینہ اسے مناتی رہی اور پھر قصہ گول مول ہو گیا۔ فرزام کی زندگی اچھی گزر رہی تھی۔ مگر پھر ایک دن اس کے خالو کا فون آ گیا۔

☆☆☆

"مشعل...... مشعل بیٹا! آؤ کھانا کھا لو۔ فرزام کا فون آیا ہے، وہ لیٹ آئے گا۔" نگینہ کی آواز پر ڈائری مشعل کے ہاتھ سے چھوٹ گئی۔

"آئی اماں!" جھک کر ایک ہاتھ سے ڈائری اٹھاتے، دوسرے ہاتھ سے بکھرے بالوں کی لٹیں کان کے پیچھے اڑستے اس نے تقریباً چلا کر کہا اور کتابوں کے درمیان جگہ بنا کر ڈائری کو جگہ پر اسی طرح رکھ دیا کہ اسے کبھی وہاں سے نکالا نہیں گیا۔ اس کی سیاہ آنکھوں میں بے پناہ الجھن تھی۔ سانولا مگر پرکشش چہرہ ماتھے پر بل پڑنے سے اور پیارا لگنے لگا تھا۔

"فرزام کے خالو کی کال یعنی......"

"میرے بابا کی کال...... ایسا بھی کیا کہا ہو گا کہ فرزام کا سکون ہی برباد ہو گیا۔"

وہ سوچتی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئی۔ جہاں چھوٹی سی ٹیبل پر اس کی خالہ اس کا انتظار کر رہی تھیں۔

☆☆☆

"آپ شرمندہ کر رہے ہیں اسلم بھائی! حکم کیجیے کیا کام ہے۔"

نگینہ نے کمرے میں آ کر سوال پھر دہرایا تھا۔

"نگینہ آپا! آپ کو یاد ہے، آپ آخری بار فرح سے ملنے تب آئی تھیں جب مشعل ہوئی تھی۔ آپ نے کہا تھا کہ آپ کے بس میں ہو تو آپ آج ہی مشعل کا ہاتھ اپنے سفیان کے لیے مانگ لیں؟"

"جی جی بھائی۔ میں اپنی بہن سے آخری ملاقات کیسے بھول جاؤں؟" نگینہ نے آہ بھری۔

"میں بہت لڑا تھا آپ سے۔ میں نے کہا تھا کہ اپنی بیٹی کو کیوں اپنے ہاتھوں سے جہنم میں جھونکوں میں۔" اسلم رونے لگا۔ "جہنم تو یہ گھر بن گیا، میری بیٹی کے لیے جب سے فرح گئی ہے۔"

"کیا ہوا میری بچی کو بھائی؟ عفت نے کچھ کیا ہے؟ کیا وہ اس کے ساتھ اچھا برتاؤ نہیں کرتی۔" نگینہ نے سہم کر پوچھا۔

"کیا تم آج بھی میری بچی کو بہو بنانا چاہتی ہو؟

اپنے سفیان کے نکاح میں لینا چاہتی ہو؟'' نگینہ خاموش ہوگئیں۔

''سفیان کی شادی ہوگئی ہے بھائی، ہاں مگر فرزام ہے میرا چھوٹا بیٹا۔ دو ہی سال چھوٹا ہوگا مشعل سے۔ میں بات کروں گی اس سے بھائی، وہ ضرور مان جائے گا۔'' پوری بات سن کر نگینہ نے فیصلہ کرنے کے انداز میں کہا۔

''اسے مجبور مت کرنا نگینہ آپا! لیکن ایک باپ کی مجبوری سمجھنا جو خود اپنی بیٹی کے لیے رشتہ مانگ رہا ہے۔''

اسلم کی بے بس سی آواز فون سے ابھری اور کال کٹ گئی۔

نگینہ بہت دیر سوچتی رہیں پھر انہوں نے فرزام سے بات کرنے کا ارادہ کرلیا۔

☆☆☆

''آپ نے مجھ سے پوچھے بغیر میرا رشتہ طے کردیا؟ آپ یہ کیسے کرسکتی ہیں اماں؟''

''مشعل بہت پیاری بچی ہے بیٹا اور میری بہن کی نشانی ہے وہ۔'' اب نگینہ اسے رضامند کرنے کی کوشش کررہی تھیں۔

''کمال ہے اماں! جس بچی کو آپ نے آخری بار اس کی پیدائش کے وقت دیکھا تھا، جس سے کبھی ملی نہیں آپ، بات نہیں کی...... وہ آپ کو جان سے پیاری ہوگئی ہے اماں! جن خالو نے کبھی بات نہیں کی ان کو آج ہم یاد آگئے۔ عجیب...... میں تو سوچ رہا ہوں آخر ایسا کیا ہوا ہوگا کہ اچانک وہ داماد ڈھونڈنے لگے ہیں۔''

''فرزام! تم جانتے ہو کہ تمہارے ابا اور دادو کی وجہ سے ایسا تھا۔''

''اماں! لیکن پھر بھی...... کیسے میں انجان لڑکی سے شادی کرلوں بلاوجہ؟''

''میں کچھ نہیں جانتی...... میں زبان دے چکی ہوں اسلم بھائی کو۔'' نگینہ نے فرزام سے نظریں چراتے ہوئے کہا۔ یقیناً کوئی تو ایسی مجبوری ہوگی کہ اسلم بھائی نے انہیں کال کرکے کہا تھا۔ فرزام کچھ دیر سوچتا رہا پھر بولا۔

''اللہ کے لیے امی! یہ ظلم ہے مجھ پر۔ آپ نے اپنے بڑے بیٹوں کے ساتھ تو یہ زیادتی نہیں کی۔ میں پہلے ہی پریشان ہوں اماں! یہ نہ کریں میرے ساتھ۔''

''اسلم بھائی نے کال پہلے کی ہوتی تو میں یقیناً سفیان یا بلال کے ساتھ یہ کرتی۔ تم ایک بار میرے ساتھ لاہور تو چلو۔ ان لوگوں سے ملو، مشعل کو دیکھ لو۔ پھر کرلینا فیصلہ۔'' وہ تین دن سے اسے منانے کی کوشش کررہی تھیں۔

''اگلے پورے دو ہفتے میرے جاب انٹرویوز ہیں، میں کہیں نہیں جاسکتا۔'' فرزام نے اماں کو کمرے میں جاتے دیکھ کر احتجاجاً کہا۔

''صبح آٹھ بجے، ہمیں بس اسٹاپ پر پہنچنا ہے۔ تیار رہنا۔'' نگینہ نے دروازہ بند کردیا۔

''اماں!'' فرزام جھنجلاتا ہوا اپنے کمرے میں چلا گیا۔

☆☆☆

سورج سوا نیزے پر آچکا تھا۔ پرندے تیز دھوپ سے چھپنے کی غرض سے واپس اپنے گھونسلوں میں جارہے تھے۔ مشعل کے کمرے میں اب تک اندھیرا تھا۔ اس نے پردے ہٹانے کی زحمت ہی نہ کی تھی۔ بیڈ پر الٹی لیٹی، بوجھل آنکھیں زبردستی بند کیے رات سے آنکھ لگنے کی منتظر تھی مگر نیند تھی کہ آکے ہی نہیں دے رہی تھی۔

''بس کردو آپی! اٹھ کر تیار ہوجاؤ۔ وہ لوگ پہنچنے والے ہیں۔''

عدینہ نے پردے ہٹاتے ہوئے کہا۔ پردے ہٹاتے ہی بیڈ پر اور اس کے اردگرد چیزوں پر روشنی پڑی۔

بیڈ کے ساتھ ٹیبل پر سلیقے سے کتابیں سجی ہوئی تھیں اور مشعل کے منہ کے آگے برام اسٹوکر کی ''ڈریکولا'' پڑی تھی۔ یہ وہ آخری کتاب تھی جو خود اسلم

نے اسے لے کر دی تھی۔ اسے بچپن سے مطالعے کا شوق تھا اور اسلم خود اس کے لیے کہانیاں لایا کرتے تھے۔ پھر یہ ایک کام بھی اس کے لیے، خاص اس کے لیے کرنا چھوڑ دیا گیا۔

پہلی بار جب اس نے ڈریکولا پڑی تھی، تب اسے خوف آیا تھا۔ مگر پھر وہ کتاب اس کی تنہائی کی ساتھی ہوگئی۔ وہ باقی کتابیں بھی پڑھتی رہی مگر یہ کتاب اس نے بار بار پڑھی۔ اسکول وہ پہلی جگہ تھی جہاں عدینہ اور عروبہ کو اس سے الگ کیا گیا تھا۔ پھر ہر چیز الگ ہوتی گئی۔ کھلونے، کپڑے سب کچھ......

فرح کے گزرنے کے بعد چند سال تک اسلم اس کی ضروریات پوری کرتے رہے مگر پھر عفت نے بتا نہیں ان کو کیسے اچھا ہونے کا یقین دلایا اور وہ بے پرواہو گئے۔ ایک عدینہ ہی جو کبھی کبھار اس سے کھیل لیتی، باتیں کرلیتی...... اور کام والی فیروزاں...... وہ فیروزاں جواب نہیں رہی تھی، اسے یاد آیا جب ایک دن فیروزاں پھٹے سر کے ساتھ ایک بار کام پر آئی تھی۔

''طلاق کیوں نہیں لے لیتی ہو تم فیروزاں! کیوں اتنی ذلت کی زندگی گزار رہی ہو؟'' اس کے ماتھے سے ہلدی سے رنگا کپڑا اتارتے ہوئے مشعل نے پوچھا۔

''توبہ باجی! اماں کہتی ہیں اچھی عورتوں کے جنازے اسی گھر سے اٹھتے ہیں جہاں ان کو ان کا خاوند بیاہ کر لے گیا ہو۔'' فیروزاں نے باقاعدہ کانوں کو ہاتھ لگائے۔

''پھر چاہے یہ جنازہ اسی خاوند کی وجہ سے اٹھے؟'' زخم صاف کر کے نئی پٹی کرتے ہوئے مشعل بولی۔

''باجی! اماں کہتی ہیں خاوند سے مار کھانے والی عورتیں جنتی ہوتی ہیں۔'' فیروزاں نے مدھم سی آواز میں کہا۔

''پھر چاہے وہ عورتیں لوگوں کے گھروں سے چینی پتی کی چھوٹی چھوٹی پوٹلیاں اپنی چادر میں باندھ لیا کریں اور مہینے کے سودے میں سے اپنا حصہ بھی نکال لیا کریں۔'' فرسٹ ایڈ باکس اٹھا کر الماری میں رکھتے مشعل نے بولا۔

''میں نے تو جی بس ایک ہی بار......'' فیروزاں ہلکے سے منمنائی۔

''دیکھو فیروزاں! یہ سچ ہے کہ اللہ نے مرد کو ہم پر حاکم بنایا ہے اور ہم سے کہیں زیادہ مضبوط بھی۔ لیکن اللہ نے کسی آیت، کسی حدیث کے ذریعے یہ نہیں کہا ہم عورتیں بلاوجہ شوہر کی مار کھائیں یا اس کی گالیاں سنیں۔ یہ بھی ہم پر ہرگز لازم نہیں ہوتا کہ ہمارا جنازہ اس گھر سے اٹھے جہاں ہم بیاہ کر جائیں۔ ہمارا دین ہمارے لیے بھی گنجائش نکالتا ہے، ہم بھی علیحدگی کا مطالبہ کر سکتے ہیں۔ سمجھ رہی ہوناں؟''

فیروزاں کے سامنے بیڈ کے پاس نیچے کارپٹ پر بیٹھی وہ اسے سمجھا رہی تھی۔ وہ سب جو اس نے کتابوں سے سیکھا تھا۔

''آپ اتنی سی عمر میں یہ باتیں کیسے کرتی ہیں باجی؟''

''باتیں کرنے کے لیے عمر نہیں عقل درکار ہوتی ہے بے وقوف عورت۔ اور باجی مت بولا کرو مجھے۔ چھوٹی ہوں میں تم سے۔ عقل تو تمہیں آنے گی نہیں۔ تم یہاں میرے کمرے میں آرام کرلو...... اور جو چپن کلر دیا ہے، میں نے وہ بھی کھالینا۔''

''آپی...... آپی جاگ رہی ہو؟ اٹھو تمہاری خالہ آرہی ہیں۔''

عدینہ کی آواز نے اسے سوچوں کے بھنور سے نکال پھینکا۔ ذرا سا سر اٹھا کر دیکھا تو کالی آنکھوں میں خفگی ہی خفگی تھی، بے چینی...... بے بسی تھی۔ دکھ تھے اور خالی پن...... سیاہ بالوں کی لٹوں کو چہرے سے ہٹا کر کانوں کے پیچھے اڑستی وہ دوبارہ اوندھے منہ لیٹ گئی۔ یہ تو طے تھا کہ وہ عفت سے بے عزتی کرائے بغیر نہیں ہلے گی اور ہوا بھی یہی۔

خیر وہ منہ ہاتھ دھو کر عفت کے زبردستی کے دیے ہوئے کپڑے زیب تن کیے باہر آئی تو پہلی نظر

فیروزاں کی بارہ سالہ بیٹی پر پڑی جو بہت احتیاط سے کراکری صاف کررہی تھی۔ اس کے ذہن نے پھر لمحوں کی بس پکڑی اور ماضی کے سفر پر نکل گیا۔

آج سے دس بارہ سال پہلے جب فیروزاں ان کے گھر آئی تھی تو وہ اس سے تھوڑی سی بڑی تھی، جتنی اس کی بیٹی اس وقت ہے۔ شاید سولہ سال...... مشعل کو بس یہ یاد تھا کہ اس نے تیرہ سالہ مشعل کو باجی کہا تھا جو اسے بہت برا لگا تھا۔ مگر وہ اسے ہمیشہ باجی ہی کہتی رہی۔ مرنے سے ایک دن پہلے تک بھی۔

مشعل اس دن لان میں بیٹھی کوئی کتاب پڑھ رہی تھی، جب فیروزاں کی بیٹی دوڑتی ہوئی گھر کے اندر داخل ہوئی۔ اس کی سانس پھول رہی تھی اور چہرے پر آنسوؤں کے نشان تھے۔ مشعل کو دیکھ کر وہ اسی کی طرف دوڑ آئی۔

"آپی...... مشعل آپی...... ابا نے اماں کو مارا ہے اور خود بھاگ گیا۔ اماں کے سر سے خون نکل رہا ہے اور وہ آنکھیں نہیں کھول رہی۔ میرے ساتھ چلیں...... اماں کو جگائیں چھوٹا رو رہا ہے۔" وہ آنسو صاف کرتے ہوئے بولی۔

"چلو۔" مشعل کتاب وہیں چھوڑ کر اس کے پیچھے بھاگی۔ اسلم جو کسی کام سے باہر نکل رہے تھے، ان کو دیکھ کر پریشانی سے ان کے پیچھے لپکے۔

جانے کن تنگ گلیوں سے گزر کر وہ فیروزاں کے گھر پہنچے، اس کا چار سالہ بیٹا اس سے لپٹ کر رو رہا تھا۔ فیروزاں نہیں رہی تھی۔ وہ اسے چپ نہیں کرا سکتی تھی۔ اس کا جنازہ اسی گھر میں رکھا تھا جہاں اس کا شوہر اسے بیاہ کر لایا تھا۔ اس کی موت اسی شوہر کی وجہ سے ہوئی تھی جو اسے تیرہ سال کی عمر میں بیاہ کر لایا تھا۔ کفن، دفن کا انتظام کر کے وہ بچوں کو اپنے ساتھ لے آئے۔

عفت کو مفت کی نوکر مل گئی۔ مشعل کی ضد پر فیروزاں کی بچی سے اسکول نہیں چھڑوایا گیا۔ فرق یہ تھا کہ وہ اسکول کے ساتھ گھر کے کئی کام بھی کرنے لگی۔ فیروزاں کا بیٹا بھی بہن کے ساتھ چپکا رہتا۔ اسی کے ساتھ سرکاری اسکول چلا جاتا۔

فیروزاں کو گئے پورا سال ہو گیا تھا اور اس ایک سال میں مشعل کی زندگی آسمان سے زمین ہو گئی تھی۔ جو تھوڑی بہت قدر تھی اس کی۔ اس گھر میں وہ اس نے گنوا دی تھی۔

☆☆☆

"اٹھ گئیں ملکہ عالیہ! تشریف رکھیے۔" ناشتہ کرتی عروبہ نے طنزیہ کہا۔

عروبہ کی آواز پر اس نے نظر ٹیبل پہ ڈالی۔ وہاں سب موجود تھے۔ اس کی موجودگی سے کوفت زدہ ہوئی۔ وہ دھیمے قدم چلتی کھانے کی میز تک گئی اور اپنی کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گئی۔

اس کے بیٹھتے ہی اسلم کرسی گھسیٹ کر کھڑے ہو گئے۔

"ارے آپ کہاں جا رہے ہیں؟ ناشتہ تو کرلیں۔" عفت نے کہا۔

"کرلیا...... دفتر پہنچنا ضروری ہے۔ ضروری میٹنگ ہے میری۔" اسلم یہ کہہ کر کوٹ کے بٹن بند کرتے باہر نکل گئے۔

"کتنا سمجھایا ہے، کھانے کی میز پر مت آیا کر۔ کچن میں کھانا کھا لیا کر کلموہی! میری بچیوں پر اپنی نحوست کا سایہ نہ ڈال۔"

عفت پلیٹ کو زور سے پٹختی اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کے ساتھ عروبہ بھی چلی گئی۔ اس نے عدینہ کی طرف دیکھا جو سکون سے ناشتہ کر رہی تھی۔

"ناشتہ کریں آپی! ذہنی مریض ہیں یہ سب۔" مشعل کو اپنی طرف دیکھتے پا کر اس نے کہا اور ایک اور ٹوسٹ اٹھا کر اس پر مکھن لگانے لگی۔ مشعل نے تشکر اور پیار بھری نظروں سے اسے دیکھا اور کپ میں چائے انڈیلنے لگی۔ اس سے کھایا تو نہیں جائے گا، اسے پتا تھا مگر عدینہ کا ساتھ دینے کے لیے ہی وہ چھوٹے چھوٹے گھونٹ بھرنے لگی۔ آج اس کی قسمت کا آخری فیصلہ ہونا تھا۔

☆☆☆

"اماں! مجھے آپ نے مجبور کیا تو میں کچھ غلط کردوں گا، بتا رہا ہوں۔" فرزام نے ہاتھ میں پکڑے ایڈریس پر ٹیکسی رکواتے ہوئے نگینہ سے کہا۔

"ہاں ٹھیک ہے، مل تو لو پہلے۔" نگینہ مسکراتی ہوئی ٹیکسی سے اتر گئی۔ کتنے عرصے بعد وہ اپنے کسی رشتے دار سے ملے گی۔ اس کی بہن کی آخری نشانی...... وہ بہت پرجوش تھی۔ مشعل کو دیکھ کر نگینہ کو لگا کہ وہ اس کی بہن فرح کا عکس ہے۔ اس کو گلے لگا کر محسوس ہوا جیسے وہ اس کی اپنی اولاد ہے۔ مشعل کو اس کی آغوش میں جا کر ایسا لگا جیسے وہ اس کی ماں ہے۔

خالہ بھی تو ماں جیسی ہوتی ہے ناں۔ نگینہ کے گلے لگ کر اس نے وہ سب آنسو بہا دیے جن پر ایک عرصے سے بند باندھے ہوئے تھے۔ فرزام نے غیر دلچسپی سے اسے دیکھا اور اندر چلا گیا۔ عفت نے ان کا پرتپاک استقبال کیا۔

"اسلم کی بہت ضروری میٹنگ تھی، اس لیے چلے گئے۔ بس پہنچتے ہوں گے۔"

عفت نے اسلم کی غیر موجودگی کی وجہ بیان کی۔

شام کو جب فرزام نے اسلم کو دیکھا تو وہ اسے بہت اچھا لگا۔ ایک ایسا شوہر جو بات بے بات اپنی بیوی کی تذلیل نہیں کرتا تھا۔ جو بلاوجہ اپنی اولاد کو نہیں جھڑکتا تھا۔ وہ ویسا باپ تھا جیسا فرزام، رستم کو دیکھنا چاہتا تھا۔

تب تک فرزام بہت پرسکون تھا جب تک اسے لگ رہا تھا کہ وہ صرف مشعل کو دیکھنے آیا ہے لیکن شام کو جب اس کی پیاری اماں، اسلم خالو کے ساتھ مل کر نکاح کا دن مقرر کر رہی تھیں، اس کے تو اوسان ہی خطا ہو گئے۔ وہ شاکی نظروں سے اماں کو دیکھتا رہا اور اماں نرمی سے اس کا ہاتھ دباتی رہیں کہ کچھ بولنا مت......

فرزام بہت دیر ضبط کر کے وہاں بیٹھا رہا اور پھر کچھ دیر بعد جب مبارک، مبارک کا شور اٹھا تو وہ باہر آ گیا۔ لان میں ایک کرسی پر بیٹھی مشعل کتاب پڑھ رہی تھی، اسے دیکھ کر اندر جانے لگی۔

"کیا آپ کو معلوم ہے، اندر کیا باتیں کی جا رہی ہیں؟" فرزام نے جلدی سے پوچھا مبادا وہ چلی نہ جائے۔

"جی۔" مشعل ٹھہر گئی مگر پلٹی نہیں۔

"تو آپ کو اس سب سے مسئلہ نہیں کوئی؟"

فرزام نے حیرت سے اس کی پشت کو دیکھا۔

"میرے مسائل کی اتنی خاص کوئی اہمیت نہیں ہے۔" کچھ دیر کی خاموشی کے بعد مشعل کی آواز ابھری۔

"لیکن مجھے مسئلہ ہے...... تو مہربانی کر کے آپ انکار کر دیں۔" فرزام نے کہا۔

تھوڑی دیر دونوں طرف خاموشی رہی۔ پھر مشعل نے پلٹ کر دیکھا۔ اس کی خالہ کا وجیہہ بیٹا اس کی طرف دیکھنا بھی گوارا نہیں کر رہا تھا۔ وہ گھاس کو دیکھ رہا تھا۔

"عجیب بات کرتے ہیں آپ...... مسئلہ آپ کو ہے اور انکار کر کے میں بری بن جاؤں۔"

فرزام نے چونک کر اسے دیکھا۔

"اول تو میرے اپنے مسائل حل نہیں ہوتے۔ دوئم میری بات کو اتنی اہمیت نہیں دی جاتی کہ میں جا کر کہوں کہ "یہ شادی نہیں ہو سکتی اور یہ شادی ٹل جائے"۔" اس نے ٹھہر کر فرزام کو دیکھا جو ضبط سے دانت پر دانت جما کر نہ کھڑا ہوا ہوتا تو صدمے سے اس کا منہ ضرور کھل گیا ہوتا۔ "تو میری طرف سے تو معذرت ہے، خود کر لیں کچھ۔"

مشعل سارے جہاں کا غصہ فرزام پر نکال کر وہاں سے چلی آئی۔ کمرے میں جا کر بہت دیر تک وہ خود کو داد دیتی رہی۔ اب تو یقیناً فرزام انکار کر دے گا۔ ہاں وہ اپنی خالہ سے مل کر بہت خوش تھی مگر اس نے سنا تھا کہ ان کے گھر والے بہت ظالم تھے۔ خالو نے تو اپنی بیٹی سلمٰی کو ہی مار دیا۔ ٹھیک ہے وہ اچھی نہیں تھی، اپنے گھر میں بھی اس کی اہمیت نہیں رہی تھی اور بقول عفت کے منحوس بھی تھی اور گناہ گار بھی۔ مگر پھر بھی اس نے کہہ دیا۔

کچھ دیر بعد خود کو دی گئی داد ملال میں بدل گئی۔

اب یقیناً وہ اس گھر میں مزید بری اور منحوس سمجھی جائے گی۔ کاش فرزام انکار نہ کرے اور وہ اس گھر سے جا کر یہاں رہنے والوں کی زندگی کو کم از کم آسان کر دے۔

☆☆☆

فرزام کچھ دیر بے حس و حرکت کھڑا رہا۔ اسے بالکل اندازہ نہیں تھا کہ وہ بول سکتی ہے اور اگر بول سکتی ہے تو اتنا بول سکتی ہے۔ کچھ دیر کے لیے کھڑا وہ انکار کرنے کا ہر ممکن طریقہ سوچتا رہا اور پھر سفیان بھائی کو کال ملالی۔ ارادہ یہ تھا کہ ان سے کہہ کر اماں کے آگے سفارش کروائے گا مگر اسے اندازہ نہیں تھا کہ اس کال کے بعد اس کا ذہن بالکل مفلوج ہی ہو جائے گا۔

"مانا کہ بہت خوشی ہوتی ہے، ایسے وقت میں مگر تھوڑا تو صبر کرو میرے بھائی! ہم بس نکل ہی رہے ہیں۔ ابھی تین دن ہیں نکاح میں یار۔"

سفیان کی بات سن کر اسے حیرت کے شدید جھٹکے لگے۔ وہ نکل رہے ہیں مطلب سب جانتے ہیں بلکہ سازش میں شریک ہیں اور نکاح تین دن بعد یعنی اصلی تین دن بعد ہے اور وہ سب شرکت کے لیے آ رہے ہیں تو سفارش تو ناممکن ہے۔ اس نے کچھ کہے بغیر فون کاٹ دیا۔ آخر ہمت یکجا کر کے وہ اندر چلا ہی گیا۔

"اماں! ایک منٹ میری بات سنیں۔" اس نے لاؤنج میں جاتے ہی کہا اور نگینہ کو لے کر ایک طرف آ گیا۔ نگینہ جانتی تھی کہ اسے کیا بات کرنی ہے۔ اس لیے اس نے سوال سے پہلے ہی جواب دینے کا فیصلہ کیا۔

"دیکھو بیٹا! میری بہن کی آخری نشانی ہے وہ۔ میں نے تمہیں منانے کی بہت کوشش کی لیکن تم نہیں مانے۔ سچ تو یہ ہے کہ میں پہلے ہی دن زبان دے چکی تھی۔ مجھے پتا ہے کہ تمہیں لگ رہا ہے کہ یہ تمہارے ساتھ زیادتی ہے اور یقیناً ہے...... مگر بیٹا! مجھ پر یقین کرو۔ مشعل تمہارے لیے بہترین انتخاب ہے، ٹھیک ہے وہ میرے سامنے نہیں پلی بڑھی۔ مگر مجھے یقین ہے کہ وہ ہمارے چھوٹے سے گھر کو جنت بنا دے گی۔

اپنی ماں کا مان رکھنا بیٹا۔"

نگینہ اس کے ماتھے پر بوسہ دے کر چلی گئی۔ وہ انکار نہیں کر پایا۔ ٹھیک تین دن بعد وہ رضامندی سے "نکاح شدہ" ہو گیا۔

"ہم بہت شکر گزار ہیں آپ کے۔ آپ نہ ہوتے تو پتا نہیں کون اپناتا مشعل جیسی۔"

فرزام کے ساتھ بیٹھی مشعل نے بے بسی سے عفت کو دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں التجا تھی۔

"خیر مٹھائی لیں نا آپ۔" عفت نے بات پلٹی لیکن چنگاری وہ پھینک چکی تھیں۔ نکاح کے بعد فرزام کی چھوٹی سی بارات حیدر آباد گئی تھی۔ سفیان اور بلال کی ضد پر اس کا ولیمہ حیدر آباد میں ہونا تھا۔

"اماں! میری بات سنیں۔ عفت آنٹی کیا کہہ رہی تھیں؟" حیدر آباد پہنچتے ہی فرزام نے ماں کو الگ لے جا کے پوچھا۔

"کچھ خاص نہیں بیٹا! اس کو عادت ہے بات کا بتنگڑ بنانے کی۔ تم دھیان مت دینا، مشعل کا خیال رکھنا۔ وہ بہت اچھی لڑکی ہے۔ بہت معصوم، بہت پاکیزہ۔" نگینہ ایک خوب صورت انداز میں اسے سمجھانے کی کوشش کر رہی تھی۔

"اماں! اس دوپٹے پر یہ شیشے کا کام چیک کر لیں۔ میں نے ابھی بنوایا تھا۔ اسے بھی مشعل کے لیے رکھ دیتے ہیں۔"

صاعقہ بھابھی کی بات پر نگینہ ادھر متوجہ ہو گئیں۔

فرزام کے دل میں وسوسوں نے سر اٹھانا شروع کر دیا تھا۔ چنگاری شعلہ بن گئی تھی۔ ایک تو اسے یہ دکھ تھا کہ اس کی مرضی کے بغیر اس کا نکاح کر دیا گیا۔ اوپر سے عفت کی بات...... وہ عجیب اضطرابی کیفیت میں باہر صحن میں آ کر ٹہلنے لگا۔

☆☆☆

مشعل کے کمرے میں اس کے جانے کے بعد بھی گھپ اندھیرا تھا۔ پردے آج بھی گرے ہوئے تھے۔ مشعل کی جگہ آج اسٹڈی ٹیبل کے پیچھے اسلم بیٹھے ہوئے تھے۔ "برام اسٹوکر" کی "ڈریکولا" کو سینے

سے لگائے۔ وہ اس دن بہت حیران ہوئے تھے جب انہوں نے مشعل کو عدینہ سے کہتے سنا تھا کہ ''ہارر'' اس کا پسندیدہ صنف ادب ہے۔ وہ اس وقت تقریباً سولہ سال کی تھی۔ اسلم حیران تھے کہ وہ بچپن میں بہت زیادہ ڈرا کرتی تھی۔ خیر جب وہ اگلی بار اس کے لیے کتاب خریدنے گئے تو انہوں نے دکان دار سے کوئی ہارر ناول مانگا تھا۔ اور دکان دار نے انہیں ڈریکولا پکڑا دی۔

آج جب اس نے اس کتاب کا کور پلٹا تو اسے اپنے سوال کا جواب ملا۔ پہلے ہی صفحہ پر دو اسٹکی نوٹس چسپاں تھے۔ ایک پر لکھا تھا۔

''وہ آخری چیز جو کبھی کبھی یہ احساس دلاتی ہے کہ میں بابا کی اولاد ہوں۔'' اور دوسرے نوٹ پر لکھا تھا۔

''مجھے ہارر پسند ہے، میں ڈراؤنی چیزیں اس لیے پڑھتی ہوں۔ تاکہ اصل زندگی سے ڈر ختم کرسکوں...... کیوں کہ مجھے یہ کام خود ہی کرنا ہے۔''

وہ کتاب کو سینے سے لگا کر پھوٹ پھوٹ کر رو دیے۔ انہوں نے اپنی بچی کو توجہ سے کتنا محروم رکھا تھا۔ فرح کے جانے کے بعد سے وہ کتنی اکیلی تھی۔ ماں کی قربت بھی اسے صرف دو سال ہی نصیب ہوئی۔

عفت سے اس نے مشعل کے لیے ہی شادی کی تھی۔ وہ بھی شروع میں اس کا خیال رکھتی تھی لیکن ایک سال بعد جب عروبہ اس دنیا میں آئی تو وہ مشعل سے غافل ہوتی گئی۔ عدینہ کے بعد تو مشعل کو بالکل نظرانداز ہی کر دیا گیا۔

اسلم بھی کاروبار میں اور اپنے دوسرے بچوں میں ایسے الجھے کہ مشعل کی طرف ان کی توجہ ہی نہ جاسکی۔

مشعل ان کی توجہ حاصل کرنے کے لیے شرارتیں اور اوٹ پٹانگ حرکتیں کرتی تو عفت کو غصہ آتا۔ وہ اسلم سے شکایت کرتی تو وہ اسے ڈانٹ دیتے۔ لیکن مشعل کی شرارتیں بھی اس دن ختم ہوگئیں جس دن اسلم نے پہلی دفعہ اسے مارا تھا۔

اس کے بعد اس نے یہ کہنا بھی چھوڑ دیا کہ اسے ڈر لگتا ہے۔ وہ اس گھر میں ہو کر بھی اس گھر کی نہیں رہی۔ مشعل نے اپنی ضروریات بتانا بھی چھوڑ دیں۔

ایک عدینہ سے وہ بات کرتی تھی کیوں کہ بچپن میں اسے سنبھالتی رہی تھی تو وہ اس کے قریب تھی اور فیروزاں سے کہ اس سے بھی بات نہ کرتی تو کوئی بات کرنے کے لیے بچتا ہی نا۔ شاید اس لیے وہ فیروزاں کے بعد اتنی اداس تھی اور اسلم سمجھ ہی نہیں پائے۔

وہ سوچوں میں گم اپنی غلطیاں دہرا رہے تھے، جب کسی نے آکر کمرے کی لائٹس روشن کر دیں۔ اچانک روشنی ہونے پر انہوں نے سختی سے اپنی آنکھیں میچ لیں۔

''آپ یہاں بیٹھے ہیں؟ میں پورے گھر میں آپ کو ڈھونڈ رہی ہوں۔'' عفت نے دروازے میں آکر کہا۔

''مجھے لگتا ہے میں اپنے فرائض پورے نہیں کرسکا عفت۔'' اسلم نے تکان بھرے لہجے میں کہا۔

''عجیب بات کرتے ہیں آپ، یوں کہیں کہ آپ کی بیٹی کو حقوق راس نہیں آئے۔ ہم نے تو بھی غلطیاں ہی سدھاری ہیں اس کی عمر بھر۔'' عفت نے جل بھن کر کہا۔

''اچھا اب، جاؤ! میں اکیلا رہنا چاہتا ہوں کچھ دیر۔ لائٹ آف کر کے جانا۔'' اسلم نے پھر آنکھیں موند لیں۔ عفت غصے میں لائٹ بند کر کے چلی گئی۔

☆☆☆

''کیا محترمہ یہ بتانا پسند کریں گی کہ ان کی اماں حضور کیا فرما رہی تھیں؟''

فرزام مشعل کے سر پر کھڑا اس سے پوچھ رہا تھا۔ مشعل نے جیسے نہ بولنے کی قسم کھالی تھی۔ دو تین بار پوچھنے پر بھی جب جواب نہ ملا تو فرزام نے زبردستی اس کا بازو کھینچ کے اٹھایا۔

''اترو میرے بستر سے۔ جہاں مرضی جاکر سو جاؤ، مجھے نظر نہیں آنا۔'' فرزام نے نفرت سے اسے دیکھا۔ ''زہر لگتی ہو تم مجھے...... اور اب تو اور بھی زیادہ بری لگنے لگی ہو۔''

مشعل آہستہ آہستہ چلتی سنگھار میز کے پاس آرکی اور جو تھوڑا بہت زیور اسے پہنایا گیا تھا۔

اتارنے لگی۔ فرزام منہ ڈھانپ کر سو چکا تھا۔ وہ چھوٹے سے صوفے پر جا کر سمٹ کر لیٹ گئی۔ زندگی کتنی عجیب ہے۔ جگہیں بدل رہی ہے لیکن حالات یکساں، یا شاید حالات بدل گئے۔ جیسے یہ کہ وہ کبھی صوفے پر نہیں سوئی، وہ کبھی اتنی بے بس نہیں رہی۔

''پتا نہیں ماما اتنی ظالم کیوں ہیں؟ میں جان چھوڑ تو رہی تھی ان کی...... میری غلطیوں پر پردہ تو رکھتیں وہ...... میرا ماضی میرے مستقبل کے راستے میں لاکھڑا کیا ہے۔ کیا میرے نصیب میں کوئی خوشی، کوئی سکون بھرا لمحہ نہیں؟'' مشعل کی آنکھیں نمکین پانیوں سے بھرنے لگیں۔ ان پانیوں میں غوطہ زن ہو کر وہ پھر ماضی کی دہلیز پر جا کھڑی ہوئی۔

فیروزاں کے جانے کے بعد اس سے بات کرنے والا کوئی بھی تو نہیں رہا تھا۔ ایک عدینہ تھی جو اسے کبھی کبھار پوچھ لیتی تھی۔ اسلم کی گفتگو تو ایک عرصے سے بس دو سوالات پر مشتمل تھی۔

''پڑھائی ٹھیک جا رہی ہے نا؟ کسی چیز کی ضرورت ہو تو بتانا۔''

اس کی زندگی میں تنہائی تھی اور تنہائی میں بے پناہ خوف۔ ایسے میں کتابیں اس کا واحد سہارا تھیں۔ کتابیں حقیقی دنیا سے فرار تھیں تو فرار ہی سہی۔ حقیقی دنیا سے آنکھیں چار کرنے کی سکت ویسے بھی اس میں نہیں تھی۔

☆☆☆

ایک دن وہ یونیورسٹی کی لائبریری میں بیٹھی کوئی کتاب پڑھ رہی تھی جب کسی نے آ کر اس کی ٹیبل پر کتاب اور بیگ رکھ دیا۔ مشعل نے حیرت سے اوپر دیکھا کیوں کہ وہ یونیورسٹی میں کافی لڑاکا مشہور تھی اور اس سے کم ہی لوگ مخاطب ہونا پسند کرتے تھے۔ ایک فائزہ تھی جو تین سال سے اس کا مزاج برداشت کر رہی تھی لیکن وہ کتابوں سے دور ہی رہتی تھی۔ اس لیے لائبریری اسے اکیلے ہی آ کر بیٹھنا پڑتا تھا۔

''کیا میں یہاں بیٹھ سکتا ہوں؟'' وہ ایک لمبے قد کا مناسب شکل و صورت والا لڑکا تھا۔ مشعل نے آج سے پہلے اسے کبھی نہیں دیکھا تھا۔

''جی۔'' مشعل نے آہستہ سے کہہ کر دوبارہ نظریں کتاب پر جمالیں۔

''میرا نام ابتسام ملک ہے۔ میں ابھی مائیگریشن کروا کر آیا ہوں اس یونیورسٹی میں۔ بس دس پندرہ دن ہوئے۔'' لڑکے نے بیٹھتے ہی کہنیاں میز پر ٹکا کر، ہاتھ پیالے کی صورت ٹھوڑی کے نیچے رکھتے ہوئے کہا۔

''اچھا۔'' مشعل نے ہلکا سا جواب دے کر پھر سے پڑھنا شروع کر دیا۔

''ویسے آپ کا نام کیا ہے؟ میں کچھ دن سے آپ کو آبزرو کر رہا ہوں اور جس کثرت سے آپ کتابیں پڑھتی ہیں، اس مناسبت سے آپ کا نام ''جون ایلیا'' ہونا چاہیے۔ آپ نے جون کی وہ نظم سنی ہے......''

''میری زندگی میں کتابوں کے سوا کچھ بھی نہیں'' مشعل نے نظم کا مصرع غلط پڑھنے پر اسے اچنبھے سے دیکھا لیکن اسے شرارت سے مسکراتے دیکھ کر اسے ہنسی آ گئی۔ بمشکل ضبط کرتی وہ دوبارہ کتاب کو دیکھنے لگی۔

''نام نہیں بتایا پھر آپ نے؟'' ابتسام نے ایک بار پھر پوچھا۔

''مشعل خان۔'' مشعل نے ساری کتابیں سمیٹ کر اٹھتے ہوئے کہا اور وہاں سے آ گئی۔

پھر ہر روز یہ ہونے لگا۔ وہ روز آ کر مشعل سے پوچھتا۔

''کیا میں یہاں بیٹھ سکتا ہوں۔''

اور پھر بیٹھتے ہی بولنا شروع کر دیتا۔ وہ زیادہ تر صرف سنتی اور کم بولتی تھی۔ پھر وہ لاشعوری طور پر اس کی منتظر رہنے لگی، جس دن وہ نہ آتا وہ اداس ہو جاتی۔

''مشعل!''

ایک دن وہ یونیورسٹی سے واپسی پر جب اپنی گلی میں پہنچی تو اسے لگا کوئی اسے پکار رہا ہے۔ پلٹ کر دیکھا تو دور سے ابتسام اس کی طرف آ رہا تھا۔ مشعل نے ڈر کر اپنے گھر کے دروازے کو دیکھا کہ کوئی باہر نہ ہو اور یہ منظر نہ دیکھ لے۔ خواہ مخواہ قیامت آ جاتی۔

''آپ یہاں رہتی ہیں؟'' ابتسام نے قریب آ کر پوچھا۔ مشعل نے اثبات میں سر ہلایا۔
''گریٹ...... میرے ایک دوست کا گھر ہے اس گلی میں۔ وہ سامنے نیلے گیٹ والا۔'' ابتسام نے باقاعدہ انگلی سے اشارہ کر کے بتایا۔
''میں چلتی ہوں۔'' مشعل نے کہا اور تیز تیز گھر کی طرف قدم اٹھانے لگی۔
پھر ہر گزرتے دن کے ساتھ ان کی دوستی بڑھتی گئی۔ مشعل کی تنہا اور تاریک زندگی میں وہ ایک دوست بن کر آیا تھا۔ ایک روشنی کا ذریعہ سا لگنے لگا تھا اور جب آنکھوں پر بے پناہ روشنی اچانک پڑتی ہے تو بینائی چلی جاتی ہے۔
مشعل کی بینائی گئی نہیں تھی لیکن کمزور ضرور ہو گئی تھی۔ پھر فون کالز، میسجز اور تصویروں کا تبادلہ بھی ہونے لگا۔
یونیورسٹی کا دور جیسے جیسے اختتام کی طرف جا رہا تھا، ان کی دوستی بڑھتی جا رہی تھی۔
مشعل ابتسام کو ہر خوف سے آگاہ کرنے لگی۔ بچپن سے لے کر اب تک کی کہانی سنا دی۔ ہم سب کو اپنی زندگی میں ایک سامع کی ضرورت ہوتی ہے اور وہ اسے میسر آ گیا تھا۔

☆☆☆

''یار! بابا کو پتا ہے کہ مجھے ڈر لگتا ہے۔ ہاں ٹھیک ہے، میں نے اب ان سے یہ کہنا چھوڑ دیا ہے لیکن ان کو پتا ہونا چاہیے کہ میں تنہائی سے خوف کھاتی ہوں۔''
''وہ سب تو ٹھیک ہے لیکن تم یہ بتانا پسند کرو گی کہ ہوا کیا ہے؟''
ابتسام نے فون پر دوسری طرف اس کی روہانسی آواز سن کر کہا۔ وہ اس کے ہر وقت رونے دھونے سے تنگ آ گیا تھا۔ باہر ملنے پر وہ تیار نہیں ہوتی تھی کبھی اور شریف اور اچھے انسان کا رول کر کے وہ تھک چکا تھا۔
''ماما کی بھانجی کی شادی ہے اور ماما چاہتی ہیں کہ میں نہ جاؤں وہاں۔ اور بابا مان بھی گئے، مجھے چھوڑ کر جا رہے ہیں۔ فیروزاں کے بچوں کے ساتھ۔'' اس بار اس نے باقاعدہ رونا شروع کر دیا۔
''تم ایک کام کیوں نہیں کرتیں؟ ہمارے ساتھ چلو نا آؤٹنگ پر۔ سب دوست جا رہے ہیں، لڑکیاں بھی ہیں...... بہت مزا آئے گا یار!'' ابتسام نے آخری پتا پھینکا۔
''نہیں...... مناسب نہیں لگتا۔ بابا سے اجازت بھی نہیں لی۔'' مشعل نے جھجک کر کہا۔
''چلو، ٹھیک ہے۔ یہ بتاؤ کب نکل رہے ہیں وہ لوگ؟'' ابتسام نے پوچھا۔
''بس کچھ دیر میں۔'' مشعل نے اداس آواز میں کہا۔
''اچھا سنو، دروازے اچھی طرح بند کر کے رکھنا اور ڈر لگے تو ٹی وی وغیرہ دیکھ لینا۔''
''تم کتنا خیال رکھتے ہو میرا ابتسام! تھینک یو۔ اچھا میں چلتی ہوں، بابا کو سی آف کر آؤں، بائے۔''
''ٹھیک ہے، بائے۔'' ابتسام نے فون بند کیا تو اس کے چہرے پر شیطانی مسکراہٹ تھی۔ اسے پتا تھا کہ اب کیا کرنا ہے۔

☆☆☆

''کیا ہوا؟ گاڑی ٹھیک تو ہے نا؟'' کئی بار گاڑی اسٹارٹ کرنے کے بعد اسٹارٹ نہ ہوئی تو عفت نے پوچھا۔
''نہیں...... پتا نہیں کیا مسئلہ ہے۔ رکو چیک کرتا ہوں۔''
اسلم کافی دیر بونٹ کھول کر دیکھتے رہے لیکن ان کی سمجھ میں نہیں آیا کہ اچانک کیا مسئلہ ہو گیا۔
''ایسا کریں، مکینک کو گھر بلوا لیں۔ اتنا ضروری نہیں ہے آج پہنچنا۔ ویسے بھی کل رات مہندی کی تقریب ہے۔ آج تو ویسے ہی چھوٹا سا پروگرام ہے بچیوں کے لیے۔''
کافی دیر تک جب مسئلہ سمجھ میں نہ آیا تو عفت نے کہا۔ پھر اسلم نے یہی کہا۔ مکینک کو گھر بلا لیا گیا اور وہ گاڑی اسٹارٹ کر کے ورک شاپ لے گیا۔

جانے کا ارادہ ایک دن کے لیے ملتوی ہو گیا۔
مشعل، ابتسام کو بتانا چاہتی تھی لیکن اس نے سوچا کہ وہ انجوائے کر رہا ہو گا تو کل بتا دے گی۔
اسلم رات کو صحن میں چہل قدمی کر رہے تھے جب انہیں محسوس ہوا جیسے کوئی ہیولا سا دیوار پھلانگ کر صحن میں اترا ہوا۔
"کون ہے وہاں؟" اسلم نے چلا کر کہا۔
ہیولے نے پلٹ کر دیوار واپس پھلانگنی چاہی لیکن اسلم اس تک پہنچ چکے تھے
"چور...... چوکیدار...... چوکیدار جلدی ادھر آؤ۔" اسلم نے پھر چلا کر کہا۔ چوکیدار اسلم کے ساتھ مل کر چور کو دبوچ چکا تھا۔ شور سن کر سب باہر آ گئے۔
وہ چور مسلسل "چھوڑیں مجھے...... چھوڑیں" پکار رہا تھا۔
مشعل نے پہلے آواز سے اور پھر چہرہ دیکھ کر اسے پہچانا۔ اس کی حالت ایسی ہو گئی جیسے وہ زندہ لاش ہو۔
"مشعل...... ان کو بتاؤ کہ میں چور نہیں ہوں۔" ابتسام نے خود کو چھڑانے کی مسلسل کوشش کرتے ہوئے کہا۔ رات ظالم بنی، وقت ٹھہر گیا۔ سب نے ابتسام سے نظریں ہٹا کر مشعل پر جما دیں۔
"انکل! آپ کی بیٹی نے بلایا ہے مجھے۔ کہہ رہی تھی کہ سب لوگ کسی شادی میں جا رہے ہیں۔ تم نے جھوٹ بولا تھا؟ مجھے پٹوانا چاہتی تھیں تم؟" ابتسام اس کے سر پر ایک کے بعد ایک بم پھوڑتا رہا۔
"بابا...... بابا...... یہ جھوٹ...... اللہ کی قسم...... نہیں...... میں......" مشعل کے لفظ کھو گئے۔
ایسا دھوکا...... اتنا بڑا دھوکا......
"ہائے میرے خدا...... میں مر کیوں نہ گئی یہ دیکھنے سے پہلے۔ میں نے اس دن ہی کیوں نہ سکینہ پر اعتبار کر لیا جب اس نے بتایا تھا کہ ایک لڑکا محلے میں کھڑا اس آوارہ لڑکی سے بات کر رہا ہے۔" عفت نے دونوں ہاتھ ماتھے پر رکھ کر زور زور سے چلانا شروع کر دیا۔
"آہستہ بولیں ماما! محلے میں آوازیں جا رہی ہیں۔" عدینہ نے کہا۔
"محلے میں تو بھائی اب ایسی خبریں جائیں گی ہی۔ ان باتوں کو کون چھپا سکتا ہے؟ تجھے شرم نہ آئی؟ میرے شوہر کی عزت کا لحاظ نہ کیا تو نے؟ ہمارے چہروں پر کالک ملنے جا رہی تھی تو؟" عفت نے اسے بازو سے پکڑ کر جھنجوڑ دیا۔
ابتسام آہستہ سے گیٹ کھول کر باہر نکل گیا۔ اب کسی کو پروا نہیں تھی کہ وہ رکا یا نہیں۔
"بابا......! میرا یقین کریں بابا! میں نے اسے نہیں بلایا۔ ہاں یہ سچ ہے کہ میں اس سے بات کرتی تھی لیکن بابا! آپ کی بیٹی اتنی بری نہیں ہو سکتی...... بابا! میں نے اسے نہیں بلایا۔"
مشعل اسلم کے قدموں میں بیٹھ گئی۔ اسلم بے حس و حرکت کھڑے رہے۔
"ہاں ہاں تو نے نہیں بلایا۔ اسے تو الہام ہوا تھا کہ ہم شادی میں جا رہے ہیں۔" عفت نے اس کی چوٹی پکڑ کر کھینچتے ہوئے کہا۔
"ماما! میں نے اسے بتایا تھا کہ آپ لوگ شادی میں جا رہے ہیں لیکن میں نے اسے نہیں بلایا ماما......!"
"بابا...... میری طرف دیکھیں بابا......! یہ جھوٹ ہے۔ یہ سب جو دکھ رہا ہے، یہ جھوٹ ہے بابا! پلیز مجھ پر یقین کریں بابا......!" مشعل نے اسلم کے پیروں کو تھام لیا۔
"ہاں یہ مہارانی سچی ہے۔ باقی سب جھوٹ...... بند کرو بی بی یہ ڈرامے۔" عفت نے پھر لقمہ دیا۔
اسلم اس کو ہٹاتے اندر کمرے کی طرف بڑھ گئے اور وہ بابا بابا چلاتی رہ گئی۔ اسلم کے پیچھے عروبہ اور عفت بھی اندر جا چکی تھیں۔ عدینہ نے مشعل کے سر سے اتری چادر درست کی اور اسے سہارا دے کر اٹھایا۔
"عدینہ! میں نے اسے نہیں بلایا۔" وہ عدینہ کے کندھے پر سر رکھ کر رونے لگی۔
"جانتی ہوں آپی! تم نے نہیں بلایا ہو گا اسے۔" عدینہ اس کا سر تھپکتی اس کو کمرے میں لے آئی۔
وہ پوری رات روتی رہی۔ اس کا سب کچھ ہی تو

لٹ گیا تھا۔ چاہے جانے کی خواہش میں، بنے جانے کی چاہت میں اس سے کتنی بڑی غلطی ہوگئی تھی بلکہ گناہ...... ایسا گناہ جس کا خسارہ تمام عمر باقی رہنا تھا۔ جس کی معاشرہ کبھی معافی دے ہی نہیں سکتا تھا۔

اس نے اپنا موبائل توڑ دیا۔ سم نکال کر دو ٹکڑے کردی اور پھر آنسو پونچھ کر بیٹھ گئی۔ یہ سوچنے کے لیے کہ کیا ہوگیا ہے؟ کیسے ہوگیا ہے؟

☆☆☆

''آپا! اس سے پہلے کہ آپ فرزام سے بات کریں۔ میں آپ کو کچھ بتانا چاہتا ہوں۔''

اسلم نے کئی دن سوچنے کے بعد ایک اہم فیصلہ کیا تھا۔ نگینہ آپا کو فون کرنے کا فیصلہ...... ان سے یہ منت کرنے کا فیصلہ کہ وہ مشعل کو اپنا لیں۔ کیوں کہ وہی تھیں جو فرح کی طرح سوچ سکتی تھیں، جو مشعل کو اب بھی خوش رکھ سکتی تھیں۔

''میں جانتا ہوں آپا! میری بیٹی سچ کہہ رہی ہے۔ وہ جھوٹ نہیں بولتی آپا! میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھا ہے، وہ سچی ہے...... لیکن کوئی بھی یقین نہیں کرے گا۔ اسے کوئی اپنانے نہیں آئے گا کیونکہ اللہ نے اس کی قسمت میں عفت جیسی ماں رکھی ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ آپ میرے دل سے سوچیں یا فرزام پر زبردستی اسے تھوپ دیں لیکن آپا! آپ ایک بار بات کریں اس سے...... اسے سب بتا دیں۔ اگر وہ انکار کرتا ہے تو بھی کوئی بات نہیں۔ جس رب نے اسے بنایا ہے وہ اس کے لیے اور رستے نکال لے گا۔''

اسلم نے آب دیدہ لہجے میں نگینہ سے گزارش کی تھی۔ فون بند کرنے کے بعد نگینہ نے ایک فیصلہ کیا تھا۔ مشعل کی غلطی پر پردہ رکھنے کا فیصلہ...... کہ وہ غلطی اس سے ماضی میں ہوئی تھی۔ اب دنیا بھر کو بتانے کا مطلب تھا، بات کو بڑھانا اور مشعل کو بلاوجہ ذہنی تکلیف دینا۔ اسے لگا تھا کہ سب آسانی سے ہوجائے گا اور ہو بھی جاتا اگر عفت عین نکاح کے وقت منہ نہ کھولتی۔

نگینہ نے بڑی مشکل سے فرزام کو اس کے کمرے میں بھیجا تھی۔ یہ تو واضح تھا کہ بات اب اس کو بتانی پڑے گی لیکن نگینہ مناسب موقع کا انتظار کررہی تھی۔

وہ چاہتی تھی کہ کم از کم اس کے باقی بیٹوں اور بہوؤں کو پتا نہ چلے۔ جن مسائل پر اللہ نے پردہ رکھا ہو۔ وہ دنیا کو بتائے نہیں جاتے۔

نگینہ نے اس رات اللہ سے اس بات کا حل مانگا۔ اللہ کا رحم مانگا۔ فرزام کے دل میں نرمی ڈالنے کا سوال کیا، مشعل کا اچھا مستقبل مانگا اور پھر وہ سکون سے سوگئی۔

☆☆☆

وہ جب صبح جاگی تو اس کی گردن میں تکلیف ہورہی تھی۔ چھوٹے سے صوفے پر ٹانگیں سمیٹنے سے اکڑ چکی تھیں۔ بیڈ خالی تھا۔ پتا نہیں کب فرزام کمرے سے جاچکا تھا۔ اس نے سوچنے کی کوشش کی کہ رات کب اس کی آنکھ لگی تھی لیکن اسے کچھ یاد نہ آیا۔

''اٹھ گئی میری بیٹی؟ ناشتہ کرکے تیار ہوجانا، کچھ محلے کی عورتیں دیکھنے آئیں گی۔'' نگینہ نے اس کا ماتھا چومتے ہوئے اس سے کہا۔ ایک دن کے بعد بخیر و عافیت ان کا ولیمہ نپٹ گیا اور وہ لوگ راولپنڈی آگئے۔ پنڈی آتے ہی فرزام نے ـــــ نگینہ سے کچھ پوچھنا شروع کردیا۔ مشعل جانتی تھی کہ وہ کیا پوچھ رہا ہے۔ اس لیے خاموشی سے نگینہ کا کمرا کھول کر خود کو اس میں قید کرلیا۔

☆☆☆

''کہاں! میری بھولی اماں! خالو نے آپ سے کہا کہ ان کی بیٹی معصوم ہے، آپ نے مان لیا۔ خالو نے کہا کہ ان کی گفتگو صرف فون تک محدود تھی، آپ نے یہ بھی مان لیا۔ آپ نے کیسے مان لیا اماں؟'' فرزام اپنی آواز دبانے کی کوشش کرتا ہوا بول رہا تھا۔

''جیسے میں نے یہ مان لیا تھا کہ تمہاری اور واہبہ کی گفتگو صرف فون تک محدود تھی۔''

''آپ میرا موازنہ کررہی ہیں اپنی بھانجی کے ساتھ۔''

''میں صرف اپنے دونوں بچوں کو ایک ہی ترازو میں تول رہی ہوں۔'' نگینہ کی آواز پرسکون تھی۔

"چلیں ٹھیک ہے۔ ایک پل کے لیے مان لیا کہ ان کی گفتگو فون تک محدود تھی۔ میں یہ کیسے مانوں کہ اس رات مشعل نے اس لڑکے کو نہیں بلایا؟"

"جو بات نہیں جانتے، اسے زبان سے مت کہو فرازم! زبان پر بہت پکڑ ہے۔"

"تو ایسا کرتا ہوں، میں کچھ کہتا ہی نہیں ہوں۔ جو مرضی کریں آپ۔"

فرزام نے کمرے میں جا کر دھڑام سے دروازہ بند کیا۔ کھڑکی تک آ کر پردہ ہٹایا تو حیرت کا شدید جھٹکا لگا۔ چاند بالکل واضح نظر آ رہا تھا...... اس کے اور چاند کے بیچ کوئی آڑ نہیں تھی۔ کوئی "چنار" نہیں تھا...... تو اس کی غیر موجودگی میں چنار تک کاٹ دیا گیا۔

اسے لگا چاند اس پر ہنس رہا ہے، ہوا اس کا مذاق اڑا رہی ہے۔ اس نے غصے سے پردے برابر کر دیے اور بیڈ پر آ کر گر گیا۔

تو کیا چیزوں کا اس کی زندگی میں آنا...... بلکہ زندہ انسانوں کا اس کی زندگی میں زبردستی آنا اور اس کی پسندیدہ چیز، اس کے دوست کا چلے جانا سب اس کی مرضی کی خلاف ہوا تھا؟ ماضی کے باقی ردوبدل کی طرح؟

اس نے اپنا آخری دوست، اپنی ڈائری ڈھونڈ کر اس سے بات کرنے کا فیصلہ کیا...... اور پھر قلم اور ڈائری تھام کو بیٹھ گیا۔

☆☆☆

"مجھ پر کوئی توجہ نہیں دیتا تھا خالہ! کوئی مجھ سے بات نہیں کرتا تھا۔ کیا ہر انسان کو کوئی سامع نہیں چاہیے ہوتا؟ کوئی ایسا جو اس کا خیال رکھے۔ اس سے محبت کرے...... کیا یہ سب ہر انسان کی ضرورت نہیں ہیں؟" نگینہ نے کمرے میں آ کر فرزام کی طرف سے معذرت کی تو مشعل بول اٹھی۔

"ایسا بالکل ہوتا ہے بیٹا! ہم سب کو ہر وقت کسی سامع کی ضرورت ہوتی ہے جو ہمیں سن سکے...... جس سے ہم ہر بات کر سکیں...... جو ہمارے منفی خیالات کو ہمارے اندر زہر بننے نہ دے...... جو ہمارے مثبت خیالات کی ہمارے اندر کھوج لگا سکے۔ ہمارا ناصح بن سکے۔ ضرورت کے وقت ہماری غلطیاں نکال سکے۔ ہمارا خیال رکھے۔ ہم سے بے پناہ محبت کرے۔"

"تو اگر ہم ایسے میں غلط انسان کا انتخاب کر لیں تو ہمارا جرم اتنا بڑا اور ناقابل تلافی ہو جاتا ہے؟" نگینہ نے مشعل کی آنکھوں میں دیکھا۔ اس کی آنکھیں خالی تھیں۔ کسی بھی احساس سے عاری تھیں۔

"نہیں میرا بیٹا! یہ اللہ کی طرف سے آزمائش ہوتی ہے۔ وہ اپنے بندوں کے دل میں رحم ڈال دیتا ہے۔ غلطیاں معاف ہو جاتی ہیں۔ بس تھوڑے صبر کی ضرورت ہوتی ہے۔"

"جتنے رحم دل ہم — اپنے لیے ہوتے ہیں اتنے دوسروں کے لیے نہیں ہوا کرتے خالہ!"

مشعل نے نگینہ کی طرف دیکھ کر نظریں جھکا لیں۔

"آپ کو پتا ہے خالہ! عروبہ سے بھی ایک ایسی غلطی ہوئی تھی۔ صرف تین سال چھوٹی ہے وہ مجھ سے...... لیکن خالہ اس کی غلطی پر ماما نے اسے معاف کر دیا سب جانتے ہوئے بھی۔ فرق صرف یہ تھا کہ اس پر سرِراہ چلتے کسی آدمی نے الزام نہیں لگایا اور سامنے اس کی سوتیلی ماں نہیں تھی جو زمانے بھر میں مشہور کرتی۔ ایک بات بتائیں خالہ! جب اللہ تعالیٰ کے ایک جیسے دو بندوں سے ایک جیسا گناہ ہو۔ تو ایسا کیوں ہوتا ہے کہ وہ کسی ایک کے گناہ پر پردہ رکھ لیتا ہے اور کسی ایک کو رسوا کر دیتا ہے؟"

"سچ کہا تم نے...... بہت مشکل ہے گناہ کا موقع پا کر بھی اس سے بچ نکلنا۔ خوش قسمت ہوتے ہیں ایسے لوگ...... لیکن تمہیں پتا ہے ان سے بھی زیادہ خوش قسمت کون لوگ ہوتے ہیں؟ وہ جن کو گناہ کی گہرائیوں سے اللہ کھینچ کر باہر لاتا ہے۔ تمہیں لگتا ہے اللہ نے تمہیں رسوا کر دیا ہے؟"

نگینہ نے ٹھہر کر اسے دیکھا جواب اسے ہی دیکھ رہی تھی۔ غور سے سنتی ہوئی اپنے سوالات کا جواب ڈھونڈتی ہوئی۔

"اللہ نے تمہیں رسوا نہیں کیا۔ اس نے تمہیں ایک بڑی رسوائی سے بچایا ہے، ذرا سا جھٹکا دے کر تمہیں

سمجھایا ہے کہ جس راستے پر تم چل نکلی ہو، وہ راستہ ٹھیک نہیں ہے۔ اس آدمی کی اصلیت دکھا کر تمہیں بتایا ہے کہ جس انسان پر اعتبار کر بیٹھی ہو وہ اصل میں اس قابل نہیں ہے کہ اس پر اعتبار کیا جا سکے۔ تم گمان بھی نہیں کر سکتیں کہ یہ نہ ہوتا تو کتنا غلط ہو جاتا۔" مشعل کی آنکھیں جھک گئیں۔ ٹھیک ہی تو کہہ رہی تھیں خالہ۔

"میرے ایک استاد محترم کہتے تھے کہ جب رسی کو ڈھیل دیتے جاؤ۔ دیتے جاؤ اور پھر اچانک اسے کھینچ لو تو رسی کو ایک جھٹکا لگتا ہے۔ ایسے ہی اللہ کرتا ہے اپنے بندوں کے ساتھ کہ انہیں ڈھیل دیتا ہے اور جب اسے لگتا ہے کہ —— اب اگر ڈھیل دی تو میرا بندہ گر جائے گا۔ تو وہ ایک جھٹکے سے اسے کھینچ لیتا ہے...... تب ہمیں بھی جھٹکا لگتا ہے۔ اور سمجھنے میں وقت بھی لگتا ہے کہ کیا ہو گیا ہے اچانک ہمارے ساتھ...... تم بھی خود کو وقت دو بیٹا...... کھینچی ہوئی رسی کو اصل حالت میں آنے میں تھوڑا وقت تو لگتا ہے۔"

"جی خالہ!" مشعل کی نظریں جھک گئیں۔

"سو جاؤ بیٹا! اور مجھے اماں بولا کرو...... خالہ بھی تو ماں جیسی ہوتی ہے۔"

"جی اماں!" مشعل کروٹ لے کر لیٹ گئی۔

ایک بار دل چاہا کہ خالہ سے لپٹ کر خوب خوب روئے۔ لیکن پھر وہ یہ ارادہ ترک کرتی آنکھیں سختی سے بند کر کے سونے کی کوشش کرنے لگی۔

☆☆☆

اگلی صبح فرزام کسی انٹرویو کا کہہ کر گھر سے نکل گیا۔ اس کا ارادہ تھا شام سے پہلے واپس نہیں آئے گا۔ کافی دن بند رہنے کی وجہ سے گھر گندا گندا لگ رہا تھا تو نگینہ نے صفائی مہم شروع کر دی۔ مشعل بھی اس کے ساتھ جت گئی۔

فرزام کے کمرے کی صفائی کرتے ہوئے اس کی نظریں پرانی لکڑی کی الماری پر ٹھہر گئیں جو کتابوں سے لدی ہوئی تھی۔ جلدی جلدی کمرہ صاف کر کے وہ الماری کے پاس جا کھڑی ہوئی...... کتابوں کی جھاڑ پونچھ کرتے اور ان کے ٹائٹلز پڑھتے ہوئے اس کا ہاتھ ایک کالے رنگ کی موٹی سی ڈائری پر آرکا۔

اس نے احتیاط سے اسے دو کتابوں کے بیچ سے نکالا اور الٹ پلٹ کر چیک کیا۔ مشعل نے ڈائری واپس رکھنی چاہی لیکن نہیں رکھ پائی۔ وہ سلمیٰ آپی کی ڈائری تھی لیکن تھوڑا آگے چل کے لکھائی بدل گئی تھی۔ یقیناً یہ لکھائی فرزام کی تھی۔

ڈائری کا ہر لفظ پڑھ کے مشعل کو پتا چل رہا تھا کہ مسئلے تو سب کے ہوتے ہیں اور بڑے بڑے ہوتے ہیں۔ آزمائشیں تو ہر ایک کی زندگی میں آتی ہیں وہ کوئی تنہا تو نہیں تھی۔ پڑھتے پڑھتے وہ اس صفحے تک پہنچی جہاں فرزام نے خالو کی کال کا ذکر کیا تھا۔

"مشعل...... مشعل بیٹا! آؤ کھانا کھالو۔ فرزام کا فون آیا ہے، وہ لیٹ آئے گا۔"

نگینہ کی آواز پر ڈائری مشعل کے ہاتھ سے چھوٹ گئی۔

"آئی اماں۔" جھک کر ایک ہاتھ سے ڈائری اٹھاتے اور دوسرے ہاتھ سے بکھرے بالوں کی لٹیں کانوں کان کے پیچھے اڑستے اس نے تقریباً چلا کر کہا۔

☆☆☆

"اماں! ایک بات بتائیں...... میں نے سنا ہے آپ کی زندگی میں بہت مشکلات تھیں پہلے۔" مشعل نے "پڑھا" کے بجائے "سنا" پتا نہیں کیوں استعمال کیا تھا۔

"کیا آپ کو کبھی کسی سہارے کی ضرورت نہیں پڑی؟ کبھی کسی سامع کی کمی محسوس نہیں ہوئی؟ کبھی دل نہیں چاہا کہ آپ کا خیال رکھا جائے اور آپ سے محبت کی جائے؟"

چھوٹے سے گھر میں شام کے وقت بھی اندھیرا سا محسوس ہوتا تھا۔ تمام پردے گرے ہوئے تھے۔ مکمل خاموشی میں کبھی نگینہ کی اور کبھی مشعل کی آواز ارتعاش پیدا کرتی اور پھر خاموشی چھا جاتی۔

"بالکل پڑی ہے...... بلکہ شروع شروع میں تو مجھے لگتا تھا کہ میں پاگل ہو جاؤں گی...... لیکن پھر مجھے ایک سامع مل گیا...... میری اس سے دوستی کافی عرصہ

لگا کر ہوئی لیکن ہو گئی۔

وہ میری باتیں سنتا تھا...... وہ میری باتوں سے تھکتا نہیں تھا۔ مجھے ٹوکتا نہیں تھا۔ میرا خیال رکھتا تھا۔ مجھ سے محبت کرتا تھا...... اور پتا ہے؟ جو باتیں میں اسے بتاتی تھی وہ کبھی کسی کے سامنے نہیں لاتا تھا۔'' نگینہ نے محبت بھرے لہجے میں کہا۔

''بہت خوش قسمت ہیں آپ اماں!'' مشعل نے تصور کر کے کہا۔

''ہاں بالکل! تم بھی بن سکتی ہو خوش قسمت...... وہ سب کو اپنا لیتا ہے۔ وہ سب کی سنتا ہے۔ اور کبھی نہیں تھکتا ہمیشہ سنتا ہے۔'' نگینہ نے ہونٹوں پر مسکراہٹ سجا کر کہا۔ مشعل الجھ کر دیکھنے لگی۔ اس کا دل دھڑکنے لگا۔

''کون؟'' مشعل نے پوچھا تو اسے اپنی آواز اجنبی لگی۔

''اللہ!'' نگینہ نے بتایا تو اس کی سماعت اس لفظ کو دہرانے لگی۔ بار بار ٹھہرے بغیر اس نے اس آواز کو روکنا چاہا لیکن یہ آواز اب ہر طرف تھی اندر باہر سب طرف تھی۔

''میں مجھے اللہ مجھے۔'' وہ سسکنے لگی۔ وہ تڑپنے لگی۔

''میں کیسے اس کے سامنے جاؤں؟ میں جانتی تھی کہ وہ راستہ غلط ہے۔ میں پھر بھی اس راستے پر چل نکلی اللہ مجھے اس راستے سے کھینچ کر لایا تو میں اللہ کی مصلحت نہ پہچان سکی۔ میں نے اللہ کو غلط کہا۔ میں کیا منہ لے کر جاؤں اس کے آگے وہ مجھے نہیں سنے گا وہ مشعل کو نہیں سنے گا۔'' آنسو اس کا دل بھگو رہے تھے۔ ''میں نے اسے پکارنا چھوڑ دیا۔ اس کے در پر جانا چھوڑ دیا وہ نہیں سنے گا۔''

''وہ ضرور سنے گا اپنی مشعل کی بات بلکہ وہ تو مشعل کا منتظر ہو گا۔'' نگینہ نے یقین دلایا۔ ایک امید کی مشعل اپنی مشعل کو تھمائی۔

''اللہ تعالیٰ اپنے پسندیدہ بندوں کو غلط راستوں سے جب کھینچ کر لاتا ہے تو وہ ہر قدم جو اللہ کی طرف اٹھتا ہے اللہ سے مزید قریب کر دیتا ہے۔ شیطان ہمارے دلوں میں گمان ڈالتا ہے کہ وہ نہیں سنے گا کہ ہمارے گناہ معاف نہیں کیے جائیں گے لیکن وہ سنتا ہے اس کی رحمت لامحدود ہے۔''

مشعل آنسو صاف کر کے کمرے کی طرف خاموشی سے نکل گئی نگینہ جانتی تھیں وہ کہاں گئی ہے۔ وہ اس ہستی سے ملاقات کرنے گئی تھی جو منتظر تھی کب سے، جس کے در سے کبھی کسی کو دھتکارا نہیں جاتا جس کی رحمت کبھی ختم نہیں ہوتی۔

☆☆☆

اگلے دن فرزام کو ایک کمپنی سے کال آ گئی۔ وہ بہت خوش تھا۔ وہ نگینہ کو انٹرویو کی پوری تفصیل بتا رہا تھا اور نگینہ بار بار اس کا ماتھا چوم رہی تھی۔''

مشعل نے اس خوب صورت منظر میں خود کو اضافی و غیر ضروری سمجھا، مگر جب اس نے کمرے میں واپسی کے لیے قدم بڑھائے تو نگینہ نے اسے آواز دے کر روک دیا۔

''میری بیٹی کے قدم اتنے بابرکت ہیں کہ ان کے اس گھر میں آتے ہی اتنی بڑی خوش خبری مل گئی۔'' نگینہ نے مشعل کو گلے لگاتے ہوئے کہا۔ فرزام کا تو دل ہی جل گیا۔ مطلب محنت ساری اس کی اور کریڈٹ سارا محترمہ کے قدموں کو......

''میں شکرانے کے نوافل ادا کر آؤں، بیٹھے میں کچھ بنا لینا آج بیٹا۔'' مشعل کا ماتھا چومتے نگینہ نے کہا۔

فرزام زہر آلود نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ جب سے پنڈی آئے تھے ان دونوں نے کوئی بات نہیں کی تھی......

''زیادہ خوش فہمیاں پالنے کی ضرورت نہیں ہے تمہیں...... اماں کی مرحوم بہن کی بیٹی ہو، اس لیے اماں محبت سے پیش آ جاتی ہیں اور میں بھی اس گھر میں تمہارا وجود برداشت کرنے پر مجبور ہوں۔ بہتر ہو گا اپنی حد میں رہو اور ہر معاملے میں دخل اندازی کرنے کی کوشش مت کرو۔''

مشعل اسے شکایتی نظروں سے دیکھتی کچن میں چلی گئی۔ تذلیل کے احساس سے اس کے گال جل

رہے تھے۔ آنسو روکتی وہ جلدی جلدی میٹھا بنانے کی چیزیں اکٹھی کرتی رہی۔ صد شکر کہ فیروزاں سے دوستی کی وجہ سے کچن میں رہ رہ کر اسے کھانا بنانا آ گیا تھا۔ کس چیز میں کتنا مسالا ڈالنا ہے، کس چیز کو کتنی دیر پکانا ہے، کتنی دیر بھوننا ہے اسے معلوم تھا۔ اکثر فارغ وقت میں وہ کچھ نہ کچھ پکا بھی لیتی تھی۔

لیکن اس وقت وہ پریشان کھڑی تھی۔ کیونکہ سامان کچھ خاص نہ تھا اور جو چیزیں تھیں ان میں میٹھے کے لیے بس دو چیزیں استعمال ہو سکتی تھیں۔ چاولوں کو پیس کر کھیر...... یا مونگ کو بھگو کر حلوہ اور یہ دونوں کام کرنے کا وقت نہیں تھا۔ پھر اس نے مونگ کو تھوڑی دیر ابال کر نرم کر لیا اور حلوہ ہی بنایا۔

خالہ نے رات کو حلوے کی بہت تعریف کی لیکن فرزام نے حلوہ چکھا تک نہیں...... اسے حلوے کی چوکور کٹی ٹکیاں کریلے لگ رہی تھیں۔

بڑی مشکل سے کھانے کی میز پر بیٹھا وہ اماں کی مشعل کے لیے تعریفیں برداشت کرتا رہا اور پھر اٹھ کر چلا گیا۔ صبح اس کے آفس کا پہلا دن تھا لیکن رات اس کی آنکھ بہت دیر سے لگی تھی۔ صبح مشعل کے جگانے پر اس کی آنکھ کھلی۔ صبح صبح اس کی شکل دیکھ کر اس کا دماغ خراب ہو گیا۔

"تمہاری ہمت کیسے ہوئی میرے کمرے میں آنے کی، تمہیں یہ اجازت کس نے دی ہے کہ تم منہ اٹھا کر پورے گھر میں گھومتی رہو۔"

"میں یہ کہہ رہی تھی کہ آپ لیٹ......" مشعل نے کہنا چاہا۔

"میں جتنا مرضی لیٹ ہو جاؤں یہ تمہارا مسئلہ نہیں ہے۔ سمجھ میں آیا تمہیں؟ اب گم کرو اپنی شکل میری نظروں کے سامنے سے۔" فرزام نے نفرت سے کہتے ہوئے کمبل میں منہ ڈھانپ لیا۔

"آپ کا آفس کا پہلا دن ہے آج۔" مشعل نے پھر بولنے کی کوشش کی۔

"میں کہتا ہوں، دفع ہو جاؤ یہاں سے۔" فرزام نے غصے سے کمبل ایک طرف پھینکا اور چلا کر بولا۔ مشعل ڈر کر کمرے سے نکل گئی اتنی بے عزتی۔

اماں نہ بھیجتیں تو وہ کبھی بھی نہ آتی۔ صبح سے اس کے کپڑے استری کر کے، اس کے لیے ناشتہ بنا کر ہمت جمع کر کے وہ اسے جگانے آئی تھی۔ کیونکہ اماں نے کہا تھا کہ کسی ایک کو جھکنا پڑتا ہے سب بدلنے کے لیے...... اس کی آنکھوں میں پانی جمع ہونے لگا۔ وہ کمرے میں جانے کے بجائے کچن میں چلی آئی۔

فرزام مشعل کے جانے کے بعد کچھ دیر اپنے غصے پر قابو پاتا رہا پھر تکیے کے پاس رکھی گھڑی اٹھا کر دیکھا تو ساڑھے آٹھ بج رہے تھے اور نو بجے اسے آفس پہنچنا تھا۔

اس کا تو دماغ بھک سے اڑ گیا۔ سامنے صوفے پر اس کے کپڑے استری شدہ رکھے تھے۔

کوئی اور وقت ہوتا تو وہ ان کپڑوں کو آگ لگا دیتا لیکن مجبوراً اس نے یہی کپڑے پہن لیے، جلدی سے تیار ہو کر وہ ناشتہ کیے بغیر آفس کے لیے نکل گیا۔

☆☆☆

دن یونہی گزرتے رہے مشعل نے اس میں بدلاؤ لانے کی تمام امیدیں ترک کر دی تھیں۔ وہ ہمیشہ اسے جھڑک دیتا...... بے عزتی کر دیتا...... ایک بار تو اس نے مشعل کو تھپڑ تک مار دیا۔ اس کے بعد مشعل نے اس سے بات کرنا چھوڑ دی۔ وہ دونوں ایک چھت تلے ایسے رہ رہے تھے جیسے ہمیشہ سے اجنبی ہوں۔ جیسے ہمیشہ کے لیے اجنبی ہوں۔

نگینہ نے فرزام سے بات کرنے کی بہت کوشش کی لیکن وہ کچھ سمجھنے کے لیے تیار ہی نہیں تھا۔ ایک دن تو اس نے حد ہی کر دی۔

"آخر ایسی کیا غلطی ہے جس کے لیے تم اس معصوم کو معاف کرنے کے لیے تیار ہی نہیں ہوتے؟" نگینہ نے پورا آدھا گھنٹہ بحث کرنے کے بعد تنگ آ کر پوچھا۔

"میں تنگ آ گیا ہوں اماں! بس کر دیں اب، آپ کیا سمجھیں گی آپ کی تو اپنی ماں!"

فرزام کو بولنے کے بعد احساس ہوا کہ وہ کیا

بول گیا ہے......

"کہہ دو کہ میری ماں نے بھی تو پسند کی شادی کی تھی گھر سے بھاگ کر......" نگینہ نے نظریں جھکا کر کہا۔ اس کی آواز اچانک بھاری ہوگئی تھی۔

"اماں...... میرا وہ مطلب......" فرزام کو سمجھ میں نہ آیا کہ وہ کیا کہے۔

"ان کے والدین نے انہیں معاف کر دیا تھا فرزام! میں نے ساری زندگی انہیں جائے نماز پر بیٹھ کر روتے دیکھا ہے، ہم کبھی نہیں جان سکتے کہ کون اللہ سے زیادہ قریب ہے۔ ہمارے اکثر لفظ گناہ بن جاتے ہیں فرزام ......لفظ زبان سے نکلنے سے پہلے سوچنا چاہیے۔"

نگینہ آنسو صاف کرتے ہوئے اپنے کمرے میں چلی گئی۔ مشعل کچن کی بوسیدہ دیوار کے ساتھ لگ کر روتی رہی۔ سب اس کی وجہ سے ہوا تھا۔ فرزام صوفہ پہ بیٹھا ملال میں ڈوبا رہا...... پھر اس کے بعد کئی دن تک اس چھوٹے سے سیلن زدہ گھر میں صرف سسکیوں کی آواز آتی رہی۔ کبھی گھر کے اس کونے سے کبھی اس کونے سے مشعل کی سسکیوں کی آواز۔

ایک کام جو مشعل چاہ کر بھی نہیں چھوڑ پائی تھی۔ وہ تھا فرزام کی ڈائری پڑھنا اور اس شام ڈائری پڑھنے کے بعد وہ فرزام کے لیے بھی روئی۔ اس نے زبردستی سب کی زندگیوں میں گھس کر سب کی زندگی خراب کردی تھی۔

"میں اپنے بھائیوں سے زیادہ سنگ دل بیٹا نکلا۔"

(ڈائری)

☆☆☆

فرزام اس دن بہت خوش تھا جس دن اسے آفس کی طرف سے اپارٹمنٹ اور گاڑی ملی۔ وہ اپنی گاڑی میں گھر آیا۔ کھانے پر اپنی پروموشن کا ذکر کیا تو کسی نے کوئی خاص توجہ نہ دی۔ نگینہ خوش تھی لیکن خوشی کا اظہار نہیں کرنا چاہتی تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ فرزام مشعل کے ساتھ اپنا رویہ درست کرے تو وہ فرزام کے ساتھ اپنا رویہ درست کریں گی۔ اس کی ضد تھی کہ فرزام مشعل کے لیے اپنا دل نرم کرے تو وہ بھی اپنے دل میں نرمی پیدا کرے گی۔

سب نے خاموشی سے کھانا کھایا اور وہاں سے اٹھتے وقت فرزام یہ کہہ کر کمرے میں آ گیا۔

"ضروری سامان پیک کرلینا۔ کل اپنے اپارٹمنٹ جانا ہے۔"

اس کے جانے کے بعد نگینہ کھل کر مسکرائی اور اللہ کا شکر ادا کیا۔

"کچھ میٹھا بنا لینا رات کے کھانے میں۔" اس نے پیار سے مشعل کی طرف دیکھ کر کہا۔

مشعل نے رات کے کھانے میں کھیر بنالی۔ فرزام نے کھانے کی میز پر کھیر دیکھ کر حیرت سے مشعل کو دیکھا لیکن وہ متوجہ نہیں تھی۔ اسے ایک انجانی سی خوشی ہوئی جیسے اس خاموش مبارک باد پر بہت مطمئن ہوا ہو۔

اس رات اس نے کھیر کھائی اور بہت شوق، بہت دل سے کھائی......اسے ذرا بھی کڑوی نہیں لگی۔ پتھر دل میں دراڑ پڑنے لگی تھی۔

☆☆☆

وہ ایک چھوٹا سا تین کمروں کا اپارٹمنٹ تھا۔ تھوڑا بہت فرنیچر فرزام لے کر آ چکا تھا۔ تھوڑا بہت بعد میں لے آیا۔ ماحول میں تناؤ اب بھی باقی تھا کہ گھر بدلا تھا لوگ وہی تھے۔ ایک دن فرزام ہمت کر کے نگینہ کے پاس اس کے کمرے میں چلا آیا۔ اس سے اماں کی سرد مہری برداشت نہیں ہوتی تھی۔

"اماں! کیا آپ مجھے معاف نہیں کریں گی؟ پلیز مجھے معاف کردیجیے۔ میں اپنے دل پر مزید بوجھ لیے نہیں پھر سکتا اماں۔" فرزام نے نگینہ کے پاؤں کی طرف بیٹھتے ہوئے کہا۔

"ضرور معاف کردوں گی۔ جس دن تم مشعل کو اپنا لوگے۔" نگینہ نے سائیڈ ٹیبل سے پانی کا گلاس اٹھا کر دو گھونٹ بھرتے ہوئے کہا۔

"یہ میرے لیے مشکل ہے اماں...... مجھے وقت لگے گا تھوڑا۔" فرزام نے نظریں جھکا کر کہا۔

"اور کتنا وقت لو گے فرزام! ایک ایسی غلطی کو معاف کرنے کے لیے جس سے تمہارا کوئی واسطہ ہی

نہیں، جس کو وہ ترک کر چکی ہے وہ اللہ سے معافی مانگ چکی ہے۔ ہم کون ہوتے ہیں کسی کو اس کے گناہوں پر تولنے والے؟ کسے خبر اللہ انہیں معاف کر کے ہم سے معتبر کر دے۔"

"لیکن میں یہ کیسے برداشت کروں اماں! کہ میری بیوی شادی سے پہلے کسی اور مرد سے بات کرتی تھی، ملتی بھی تھی۔"

"وہ ماضی میں کیا کرتی تھی یہ اس کا اور اللہ کا معاملہ ہے فرزام! تم یہ دیکھو کہ تمہارے نکاح میں آنے کے بعد وہ کیا کرتی ہے۔ اب کوئی خیانت کرے تو تم جو مرضی کرنا لیکن اس سے پہلے اس نے کیا کیا ہے اور کیا نہیں، تم یہ پوچھنے کا بھی حق نہیں رکھتے۔"

"لیکن اماں! یہ معاشرہ عورت کی ایسی غلطیاں برداشت نہیں کرتا، آپ کیوں نہیں سمجھ رہیں۔"

"اس لیے کہ معاشرہ ہم سے مل کر بنتا ہے فرزام! معاشرہ میں ہوں، معاشرہ تم ہو۔ تم مجھے بس ایک بات کا جواب دو۔ کیا اللہ نے کوئی حد بندی کی ہے کہ یہ گناہ میں صرف مرد کو معاف کروں گا اور عورت کو نہیں، پھر بھلے وہ شرمندہ بھی ہو؟ یا جن گناہوں کی اس دنیا میں سزا مقرر ہے، ان پر اللہ نے یہ کہا ہو کہ عورت اور مرد کی سزا الگ ہے؟ نہیں نا؟ پھر ہم کیوں بڑے بنے پھرتے ہیں۔"

"اماں میں صرف......" فرزام لاجواب ہوا۔

"سوچ لو فرزام! لے لو وقت۔ نہیں اپنا سکتے تو بتاؤ، اس بچی کو اس رشتے میں قید نہ کریں ہم؟ آج بھی اس دنیا میں اچھے لوگ موجود ہیں۔ کوئی اپنا ہی لے گا اسے۔"

نگینہ نے جیسے بات ختم کر کے کمبل درست کیا کہ اب مجھے سونے دو اور فرزام یہ سوچتا ہوا کمرے سے نکل گیا کہ......

"مشعل کو کوئی اور اپنا لے گا...... مشعل کو کوئی اور کیوں اپنائے گا۔ وہ اسے کیسے اور کیوں چھوڑے گا۔"

☆☆☆

"اماں کو میں کیسے سمجھاؤں؟ انہیں کیسے بتاؤں کہ میں مرد ہوں۔ میں کیسے جھک جاؤں ایک عورت کے سامنے؟ میں نے ہمیشہ ایک عورت کو جھکے ہوئے پایا ہے۔ ان غلطیوں پر بھی نادم پایا ہے جو اس نہیں کی...... اور ادھر یہ لڑکی ہے۔ غلطی پر ہے پھر بھی شرمندہ نہیں۔ یہ نہیں کہ معافی مانگ لے! اچھا ٹھیک ہے میں نہیں چھیڑتا اس کے ماضی کا قصہ، لیکن اسے کوشش کرنی چاہیے تھی نا، میں نے ایک بار دھتکارا تو وہ دوسری بار آتی۔ لیکن اس نے بات کرنا ہی چھوڑ دی۔ خود آئے اور مجھے اس بات کی گارنٹی دے کے دوبارہ یہ غلطی نہیں دہرائے گی تو میں کردوں گا معاف...... لیکن کم از کم میں جھکوں گا نہیں۔"

مشعل نے پڑھ کے ڈائری بند کردی۔ آج وہ بہت خوش تھی۔ بابا پہلی بار اس سے ملنے آرہے تھے اس نے طرح طرح کے کھانے بنائے تھے۔ پورا گھر سجا ڈالا تھا۔ کتابیں صاف کرتے وقت عادت سے مجبور ہو کر اس نے فرزام کی ڈائری اٹھالی کہ اب یہ واحد چیز تھی جو وہ شوق سے پڑھا کرتی تھی۔ لیکن آج ڈائری پڑھ کے اس کی خوشی پر اوس پڑ گئی۔

لمحوں میں ہی اس نے ایک فیصلہ کیا تھا۔ ڈائری واپس الماری میں رکھ کر وہ کچن میں چلی گئی۔

"اماں! میں چند دن کے لیے بابا کے ساتھ چلی جاؤں؟" اس نے ڈرتے ڈرتے نگینہ سے پوچھا۔

"ہاں میرا بچہ، ضرور جاؤ۔ یہاں اکیلی بور ہوتی رہتی ہو۔ جاؤ کچھ دن انجوائے کرو بیٹا۔"

نگینہ نے پیار سے کہا۔ وہ خوشی چہرے پہ سجائے سلاد سجانے لگی۔ بابا باہر فرزام کے ساتھ لاؤنج میں بیٹھے گپ شپ کر رہے تھے۔ بہت عرصے کے بعد خوب صورت ماحول میں کھانا کھایا گیا۔

"بابا! میں آپ کے ساتھ جانا چاہتی ہوں چند دن کے لیے۔ آپ کو کوئی مسئلہ تو نہیں ہوگا؟"

فرزام نے چونک کر مشعل کو دیکھا اور اسلم نے شرمندہ ہو کر نظریں جھکالیں۔

"نہیں بیٹا! مجھے مسئلہ نہیں ہے۔ ضرور چلو۔"

آنکھوں کی نمی چھپاتے اسلم نے کہا۔ کتنا دور رکھا تھا انہوں نے اپنی معصوم سی بیٹی کو۔

☆☆☆

پورے آٹھ مہینے کے بعد وہ اس گھر میں قدم رکھ رہی تھی۔ اسے لگ رہا تھا۔ عفت اس کے آنے پر بہت ناراض ہوگی، بہت ڈانٹے گی لیکن عفت نے ایسا نہیں کیا۔ وہ اسے گلے لگا کر رونے لگی اور روتی رہی۔

''مجھے معاف کردو میری بچی۔ میں نے تمہیں ممتا سے محروم رکھا۔ میں نے اسلم کو بھی تم سے دور کر دیا۔ میرا فرض تھا میں تمہیں سمیٹ لیتی، لیکن میں نے تمہیں بکھر جانے دیا۔ میں نے اپنی مشعل کو اندھیروں میں گم ہو جانے دیا۔ مجھے ڈر تھا کہ اسلم تم سے پیار کریں گے اور میرے بچوں کو وقت ہی نہیں دیں گے۔ مجھے معاف کر دو، ہم سب کو معاف کردو۔''

مشعل جب عفت سے الگ ہوئی تو وہاں موجود ہر انسان کی آنکھیں پرنم تھیں۔

''ہمیں...... خاص طور پر مجھے بہت دیر سے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔'' مشعل بغیر کسی احساس کے ان سب کو دیکھتی رہی۔

''بابا بہت بدل گئے ہیں آپی! اور ماما بھی۔'' اسے مسلسل خاموش دیکھ کر عدینہ نے کہا۔

''میں بھی بہت بدل گئی ہوں عدینہ! یقین کرو، میں وہ چار سال کی مشعل نہیں ہوں جسے عروبہ جیسے کھلونے چاہئیں۔ نہ میں فورتھ گریڈ کی اسٹوڈنٹ ہوں جسے فرسٹ پرائز ملنے پر بابا کی تھپکی اور پیار چاہیے۔ مجھے اب اندھیروں سے ڈر بھی نہیں لگتا۔ کسی ان چاہی چیز کی طرح گھر کے کونے میں پڑے رہنا میری قسمت ہے، اور اپنی قسمت میں قبول کر چکی ہوں۔ کسی بے کار چیز کی طرح ڈالے جانے کی مجھے عادت ہو چکی ہے۔

میں وہ بھی نہیں ہوں جسے اپنی صفائی میں ڈھیر بولنا پڑے اور اسے کوئی نہ سنے...... میں نے اپنے حق میں بولنا چھوڑ دیا ہے کہ دل بدلنے کی طاقت صرف میرے رب کے پاس ہے اور اس طاقت کے آگے دنیا کی ساری طاقتیں ہیچ ہیں۔ مجھے اب کسی کے بدل جانے سے فرق نہیں پڑتا۔''

وہ یہ سب نہیں کہنا چاہتی تھی لیکن اس نے یہ سب کہہ دیا۔ وہ فرشتہ نہیں تھی اس کے دل میں باتیں رہتی تھیں وہ فوراً ان باتوں کو جھٹک نہیں سکتی تھی۔

''ہاں مجھ سے غلطی ہوئی تھی لیکن ایسی بڑی نہیں جس کا مجھ پر الزام دھر دیا گیا۔ ایسی سنگین نہیں کہ مجھے رسوا کر دیا گیا۔ ایسی شدید نہیں کہ...... میرے شوہر سے نکاح کے فوراً بعد ایسی بات کہی جائے کہ میری آنے والی زندگی بھی مشکل ہو جائے...... آپ لوگ بڑے تھے، مجھے سمجھانے کے بجائے، درست راستے پہ لانے کے بجائے مجھے چھوڑ دیا...... بالکل اکیلا، ایسا تو نہیں کرنا چاہیے۔

ہر ایک کی قسمت میں اماں جیسی ساس تو نہیں ہوتی۔ ہر لڑکی کو اپنایا تو نہیں جاتا ایسے میں والدین بھی ٹھکرا دیں تو اس کے لیے تو کوئی جگہ ہی نہ بچے۔ آپ لوگ بڑے تھے، تجربہ کار تھے، جانتے تھے کہ انسانی دل چاہے کتنا بھی معصوم ہو اس میں کسی نہ کسی گناہ کی آلائش ضرور چھپی ہوتی ہے۔ آپ کو چاہیے تھا مجھے سمیٹے، مجھے توبہ کرنا سکھائیں، مجھے آگے بڑھنا سکھاتے۔ بابا! کم از کم آپ کو تو ایسا کرنا چاہیے تھا نا۔''

اسلم نے آگے بڑھ کر روتے ہوئے اسے سینے سے لگا لیا۔ انہیں لگا وہ وہی چار سال کی مشعل ہے۔ اسے آج بھی وہی سب چاہیے۔ وہ آج بھی اندھیرے سے ڈرتی ہے۔ مشعل نے کافی ضبط کیا مگر گرم گرم سیال مادہ اس کی پلکوں کی باڑ توڑ نکلا۔ ہر احساس کے بیان کو زباں درکار نہیں ہوتی۔ ہر جذبہ الفاظ کا محتاج نہیں ہوتا۔

وہی گھر تھا، وہی لوگ تھے...... لیکن سب بدل گیا تھا۔ اب رات کو کھانے کے بعد بہت دیر سب باتیں کرتے اور ان باتوں میں مشعل بھی ہوتی۔ ایک دن باتوں باتوں میں عفت نے پوچھ لیا۔

''بیٹا! فرزام تمہیں لینے نہیں آیا اب تک؟'' اب کی بار اس نے ماں بن کر پوچھا تھا۔ بیٹی کے سسرال کی طرف سے فکر مند ہو کر پوچھا تھا۔

''میں واپس نہیں جانا چاہتی......'' بہت دیر خاموش رہنے کے بعد مشعل نے کہا۔

"کیا فرزام اچھا برتاؤ نہیں کرتا تمہارے ساتھ؟" عفت نے خود فرزام کے دل میں شک کا بیج بویا تھا۔ اس کا دل کٹ کے رہ گیا۔ پھر بھی اس نے ایک موہوم سی امید کے ساتھ پوچھا۔

مشعل خاموش رہی۔ اسلم کافی دیر بیٹی کا چہرہ دیکھتے رہے پھر اٹھ کر مشعل کے سر پر ہاتھ رکھا اور بولے۔

"جو میری بیٹی کا فیصلہ ہوگا مجھے منظور ہے۔" یہ کہہ کر وہ کمرے میں چلے گئے۔

"کاش آپ کا یہ بھروسا مجھے پہلے ملا ہوتا بابا۔" مشعل نے دکھ سے سوچا اور آنکھیں موند لیں۔

☆☆☆

مشعل کے جانے کے بعد نگینہ بہت اداس تھی۔ فرزام کی طبیعت میں بھی عجیب بوجھل پن تھا۔ کئی دن تک تو اس نے ڈائری بھی نہیں لکھی۔ پھر جس دن اس نے ڈائری کھولی تو حیران رہ گیا۔

اس پر دو نہیں تین لوگوں کی لکھائی تھی۔ شروع سے اسے سلمٰی آپی نے لکھا تھا۔ وہاں سے آگے فرزام نے اور آخری دو صفحے......

"السلام علیکم!"

"میں بہت شرمندہ ہوں کہ میرے گناہوں کی فہرست میں ایک اور گناہ بھی شامل ہو گیا ہے، وہ یہ کہ میں آپ کی ڈائری پڑھتی رہی ہوں۔

آپ نے لکھا کہ آپ میرے آگے جھکنا نہیں چاہتے یقین کریں، میں بھی ایسا نہیں چاہتی...... آپ میرے لیے معتبر ہیں اور میں چاہتی ہوں آپ ہمیشہ رہیں۔

آپ نے لکھا ہے کہ میں آپ سے معافی مانگوں، میں کوشش کے باوجود ایسا کر نہیں سکتی۔ میری انا مجھے اس بات کی اجازت نہیں دیتی کہ ایسے در پر جا کر جھک جاؤں جہاں سے بار بار مجھے دھتکارا گیا ہے۔ بے عزت کیا گیا ہے۔ میرا دل مجھے اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ میں ایسے گناہ کی معافی مانگوں جو میں نے نہیں کیا اور جو کیا ہے، اس کی معافی میں اس ذات سے مانگ چکی ہوں جس سے مانگنی چاہیے تھی۔

بہت سوچ سمجھ کر میں نے اس بات کا فیصلہ کیا ہے کہ ہمارا ساتھ رہنا اب ممکن نہیں۔ میں بابا کے ساتھ جا رہی ہوں۔ مجھے لینے مت آیئے گا، اماں کے مجبور کرنے پر بھی نہیں، ہم دونوں کے لیے یہی بہتر ہے۔ یہ رشتہ آپ کے لیے کیا ہے، یہ میں نہیں جانتی، لیکن میرے لیے یہ رشتہ درد ہے اور ہم سب کسی نہ کسی درد کے اسیر ہوتے ہیں۔ اس قدر کہ کبھی اس کی تاثیر سے نکلنا نہیں چاہتے۔ اس حد تک کہ کوئی ہمارے سامنے اس درد کی دوا بھی لا کر رکھ دے تو ہم دوا لینا نہیں چاہتے۔

اور میں اس درد کی اسیر رہنا چاہتی ہوں۔ تو مجھ پر ایک مہربانی کیجیے گا۔ یہ رشتہ توڑیے گا مت، اپنا نام میرے نام سے جدا مت کیجیے گا۔ میں کبھی پلٹ کر نہیں آؤں گی۔ کبھی آپ کی زندگی میں حائل نہیں ہوں گی۔ اماں کو سمجھا دیجیے گا۔ ان کا خیال رکھیے گا۔ دوسری شادی بھی کر لیجیے گا کیونکہ اماں اکیلی بہت تنگ ہوتی ہیں۔

میں نہیں چاہتی کہ طلاق کے بعد رشتوں کا، الزامات کا، اور بے عزتی کا ایک اور سلسلہ شروع ہو اور میرے والدین کو اذیت اٹھانی پڑے۔ میں آپ کی عزت کرنا چاہتی ہوں تب تک جب تک زنجیر ایام کی تمام کڑیاں ٹوٹ کر مجھے زندگی سے آزاد نہ کر دیں...... مشعل!"

فرزام کافی دیر بے حس و حرکت بیٹھا رہا۔ پھر ڈائری کا صفحہ پلٹ کر قلم اٹھا لیا۔

"ٹھیک کہا تم نے...... ایک ایسی غلطی کی معافی نہیں مانگنی چاہیے جو کبھی کی ہی نہ ہو۔ آج محسوس ہوا ہے کہ اذیت چاہے جسمانی ہو یا ذہنی، اذیت ہی ہوتی ہے۔ آج احساس ہوا ہے کہ ظلم چاہے تشدد کی صورت میں کیا جائے یا بدصورت الفاظ کی صورت میں...... ظلم ظلم ہی رہتا ہے۔ اماں سچ کہتی ہیں تمہارے ماضی کے بارے میں سوال اٹھانے والا میں کوئی نہیں ہوتا...... ہر انسان کا ماضی ہوتا ہے جس کو بدلنا اس کے بس میں نہیں ہوتا۔ انسان بس اس پر نادم ہو سکتا ہے، اس پر توبہ کر سکتا ہے۔ ہمارے بس میں ہمارا حال ہوتا ہے جسے ہم دیکھ ہی نہیں پاتے۔ اس پر اتنی دھند چھائی

ہوتی ہے کہ حد نگاہ بس ماضی تک محدود رہتی ہے۔ کوئی شرمندہ ہو اور بدلنا چاہے یا بدل بھی جائے، ہم پھر بھی اس کا ماضی لیے اس کے سامنے کھڑے رہتے ہیں۔ دیوار بن کر...... درد بن کر...... ظلم بن کر۔"

☆☆☆

ایک سال لگا تھا فرزام کو یہ سمجھنے میں کہ میاں بیوی زندگی کی گاڑی کے دو ایسے پہیے ہیں کہ دونوں میں سے کوئی ایک بھی نہ ہو تو یہ گاڑی نہیں چلتی۔ کبھی کبھار ضرورت محسوس ہونے پر کسی ایک کو بھی جھکنا پڑے تو جھک جانا چاہیے۔ اماں کی بلال بھائی کو شادی سے پہلے کی گئی نصیحت کو فرزام نے بہت سوچا تھا۔

اور آج وہ مشعل کے گھر کے صحن میں کھڑا تھا جہاں مشعل ایک کتاب میں گم تھی۔ وہ آج بھی ویسی ہی تھی، سانولی مگر پرکشش، بالوں کی چند لٹیں آج بھی چہرے پر بکھری ہوئی تھیں۔

فرزام آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا اس کے پاس جا کھڑا ہوا۔

مشعل نے کسی کی موجودگی کے احساس سے نظریں اٹھائیں تو جھکانا بھول گئی۔ وہ کوئی خیال نہیں تھا، وہ سچ مچ وہاں موجود تھا۔

"اماں اکیلی بہت بور ہوتی ہیں تو سوچ رہا تھا کہ ان کے لیے ایک عدد بہو کا بندوبست کرلوں۔" فرزام نے آنکھوں میں شرارت بھر کر بولا۔

"دوسری شادی کی دعوت دینے آئے ہیں؟" مشعل نے کتاب بند کر کے پوچھا۔ اب وہ پرسکون تھی۔

"نہیں پہلی شادی بچانے۔" فرزام نے گہری نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

"میری طرف سے معذرت ہے۔" مشعل اٹھ کر اندر جانے لگی۔

"مشعل رکو۔" مشعل رک گئی مگر پلٹی نہیں۔

"میں جھکنا نہیں چاہتا تھا مگر میرا دل جھک گیا ہے، میں کیا کروں؟ میں چاہتا ہوں کہ ہم نئی زندگی شروع کریں گے۔ جب کبھی میری غلطی ہو تو تم مجھے معاف کر دینا۔ جب کبھی تم سے غلطی ہو تو میں تمہیں معاف کر دوں گا۔ میں چاہتا ہوں کہ تمہیں اپنی ڈائری پڑھنے کی سزا دوں...... اور تمہارا بہت خیال رکھوں۔"

مشعل مسکرائی مگر پلٹی نہیں۔ "یہ دعوے اور وعدے کب تک کے لیے ہیں؟"

"جب تک زنجیر ایام کی تمام کڑیاں ٹوٹ کر مجھے زندگی سے آزاد نہیں کر دیتیں۔" فرزام نے جیب سے کچھ نکال کر ایک گھٹنا زمین پر ٹیکتے ہوئے کہا۔

اسلم جو اپنے کمرے کی کھڑکی سے یہ منظر دیکھ رہے تھے، مسکرائے اور عفت کو آواز دی۔

"عفت! میری بیٹی کا سامان پیک کروا دو۔ وہ اپنے گھر جائے گی آج۔" اسلم نے جیسے یقین ہو کہ وہ آج ہی جائے گی۔

☆☆☆

"ہاں جمعہ والے دن تم سب نے آنا ہے، میں چاہتی ہوں میرے تینوں بچے اکٹھے ہوں۔ اپنی فیملیز سمیت۔"

نگینہ نے باری باری بلال اور سفیان کو کال کر کے کہا اور خود کچن میں مشعل کی پسندیدہ بریانی بنانے لگی، جیسے یقین ہو کہ وہ آج ہی آئے گی۔

☆☆☆

"مشعل پلیز۔" فرزام نے انگوٹھی کی خوب صورت ڈبیا کھولتے ہوئے کہا۔

مشعل کا دل چاہا کہ وہ بھاگ کر اپنے کمرے میں چلی جائے اور دروازہ ہمیشہ کے لیے بند کر دے لیکن زمین کی ساری کشش ثقل نے اس کے پاؤں تھام لیے، ساری ہوائیں اس کے راستے کی دیوار بن کر کھڑی ہوگئیں۔

مشعل نے سنا تھا کہ پیچھے مڑنے والے پتھر کے ہو جاتے ہیں مگر وہ پیچھے مڑ گئی...... اور پیچھے مڑتے ہی موم ہو گئی۔

فرزام ہاتھ میں خوب صورت سی انگوٹھی لیے ایک گھٹنا ٹیک کر بیٹھا تھا، اس نے مسکرا کر دو قدم آگے بڑھائے اور ہاتھ اس کے ہاتھ میں تھما دیا۔

☆

ذہن کی عمارت میں
یاد اک دریچہ ہے
اور اس دریچے کے گرد دُور تک پھیلا
وقت کا سمندر ہے
وقت کے سمندر میں دن، مہینے، لہریں ہیں
تند و تیز لہروں پر
تیرتے ہوئے لمحے، خوش گلو پرندے ہیں
یاد اک دریچہ ہے
جب کبھی اکیلے میں دل اُداس ہوتا ہے
ہم اس دریچے سے پار جھانک لیتے ہیں
وقت کے سمندر میں
خوش گوار لمحوں کی رنگا رنگ تصویریں
جان دار لگتی ہیں
اور زندہ رہنے کا
اک جواز بنتی ہیں

علی اصغر عباس

کہاں قاتل بدلتے ہیں، فقط چہرے بدلتے ہیں
عجب اپنا سفر ہے، فاصلے بھی ساتھ چلتے ہیں

بہت کم ظرف تھا جو محفلوں کو کر گیا ویراں
نہ پوچھو حالِ یاراں شام کو جب سائے ڈھلتے ہیں

وہ جس کی روشنی کچے گھروں تک بھی پہنچتی ہے
نہ وہ سورج نکلتا ہے نہ اپنے دن بدلتے ہیں

کہاں تک دوستوں کی بے دلی کا ہم کریں ماتم
چلو اس بار بھی ہم ہی سرِ مقتل نکلتے ہیں

حبیب جالب

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"تم لذتیں ختم کرنے والی چیز، یعنی موت کو کثرت سے یاد کیا کرو۔" (اسے ترمذی نے روایت کیا ہے اور کہا ہے یہ حدیث حسن ہے۔)

فائدہ:۔

موت کا تصور اور اس کا ذکر انسان کو دنیاوی لذتوں میں انہماک اور معصیتوں کے ارتکاب سے باز رکھتا ہے اس لیے کثرت سے موت کو یاد کرنا چاہیے اور موت کے بعد پیش آنے والے معاملات سے انسان کو غافل نہیں رہنا چاہیے۔

معیار،

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے سوال کیا گیا۔

"اگر کسی انسان کی قیمت طے کرنا چاہیں تو اس کا معیار کیا ہو سکتا ہے؟"

حضرت علی نے نہایت مختصر جواب دیا۔

"احساس ذمہ داری۔"

یعنی جس شخص میں جتنی زیادہ احساس ذمہ داری ہے وہ اتنا ہی قیمتی ہے۔

یاد رکھیے،

اشفاق احمد کہتے ہیں: "ہر روز کا ایک وظیفہ ہے یاد رکھیے کہ مجھے اپنے آپ کو درست کرنا ہے اور اپنا آپ سنوارنا ہے۔"

ضائع،

ایک معیاری پرچے کے مدیر کو ایک لڑکی کی لکھی ہوئی کہانی موصول ہوئی۔ مدیر نے لکھا۔

"محترمہ! آپ کی کہانی ہمارے معیار پر پوری اترتی ہے۔ یہ دلچسپ بھی ہے۔ ہم اس کو شائع کر رہے ہیں اور معاوضہ بھی بھیج رہے ہیں لیکن آپ کی تحریر پڑھنے میں ہمیں سخت دشواری ہوئی ہے۔ براہ کرم آپ ٹائپ شدہ مسودہ بھجوائیے۔"

لڑکی کی طرف سے جواب موصول ہوا۔

"مجھے ٹائپ کرنا آتا تو میں اپنا وقت کہانیاں لکھنے میں ضائع کرتی۔"

نادیہ۔ کراچی

کچھ کام کی باتیں،

☆ بے محل ہنسنا، غیر ضروری گفتگو کرنا اور غلط جگہ بیٹھنا بے وقوفی ہے۔

(رابرٹ ہیگر)

☆ ان کے لیے دنیا ایک طربیہ ہے جو سوچتے ہیں اور ان کے لیے المیہ ہے جو محسوس کرتے ہیں۔

(ارل آف آرفورڈ)

☆ عقل مند لوگ اندازہ نہیں کر سکتے کہ بے وقوف اب کیا کہنے والا ہے۔

(برائیٹ)

جواب،

ہجرتوں کے عذاب اچھے لگے
آنکھ میں تیرے خواب اچھے لگے
مجھ کو اپنے سوال سے بڑھ کر
آج تیرے جواب اچھے لگے

آسیہ جاوید۔ علی پور چٹھہ

سنہری باتیں،

- جو آدمی چھوٹی چھوٹی باتیں برداشت نہیں کر سکتا۔ وہ بڑا آدمی نہیں بن سکتا۔
- جس جگہ آپ کی بات کی قدر نہ ہو وہاں خاموش رہنا بہتر ہے۔
- پلٹ کر جواب دینا بے شک غلط بات ہے مگر سنتے رہیں تو لوگ بولنے کی تمیز بھول جاتے ہیں۔
- زمین پر بارش نہ ہو تو فصلیں برباد ہوتی ہیں اور جس گھر میں دین نہ ہو وہاں کی نسلیں برباد ہوتی ہیں۔
- اچھے دوست کے ساتھ دھوکا کرنا ایسے ہی ہے جیسے آپ نے ہیرا پھینک کر زمین سے پتھر اٹھا لیا ہو۔
- دنیا فتح کرنی ہے تو آواز اور لہجے میں نرمی پیدا کی جائے کیونکہ لہجے کا اثر الفاظ سے زیادہ ہوتا ہے۔

2021ء کی کہاوتیں،

- اگر مرغی کڑکنا چھوڑ دے تو آدمی نہیں جان سکتا کہ اس نے انڈا دیا ہے۔
- مرغ بانگ دینے سے پہلے آنکھیں میچ لیتا ہے کیونکہ بانگ اسے زبانی یاد ہوتی ہے۔
- نیند سب سے بڑی چور ہے، وہ انسان کی آدھی زندگی چرا لیتی ہے۔
- وہ زخم جو انسان خود اپنے آپ کو لگاتا ہے، بہت مشکل سے مندمل ہوتے ہیں۔
- ہر پرندہ اپنا ہی ترانہ گاتا ہے۔
- مذاق اور کھیل میں انسان اکثر سچ بات کہہ جاتا ہے۔
- بہرا خاوند اور گونگی بیوی بہترین جیون ساتھی ثابت ہوتے ہیں۔
- بے شرمی انسان کی آنکھوں میں نظر آ جاتی ہے۔
- پرندہ پنجرے میں گانا سیکھ جاتا ہے۔

شبانہ عندلیب۔ گوجرانوالہ

میسج،

میسج نہایت غیر اخلاقی کام ہے۔ جو بھی میسج ہو اس کو آنکھیں بند کر کے آگے بڑھا دینا۔ ایک بندہ ایک میسج کاپی کرتا ہے، وہ دو ہزار بندوں کو کر دیتا ہے۔ ہمیں بیماری پڑ چکی ہے گڈ مارننگ کے میسج کہنے کی۔ اتنے بڑے عہدوں پر بیٹھے ہیں۔ ان کو شعور نہیں ہے کہ یہ کمیونیکیشن کا ذریعہ ہے۔ میسج کرنے والا میسج بھیجے۔ بعض لوگوں نے ٹھیکہ لیا ہے دعائیں دینے کا۔ وہ دل سے دعا نہیں دیتے۔ یہ جو سطحی قسم کے میسج شروع کر دیے ہیں، اس سے معاشرے میں بڑی منافقت اور بے ہنگم قسم کی مہم چل رہی ہے۔ فارغ بیٹھے ہیں، میسج کر رہے ہیں۔

(قاسم علی شاہ)

شغل،

ایک سیاسی لیڈر سے دوسرے لیڈر نے کہا۔
"بھئی تم خوامخواہ اپنی تقریر لکھتے ہو، کئی لوگوں سے مشورہ لیتے ہو، ردو بدل کرتے ہو، پھر فائنل مسودہ تیار کر کے پرچیوں پر لکھ کر تقریر کرتے ہو۔ مجھے دیکھو! مجمعے کے سامنے جاتا ہوں اور بغیر سوچے سمجھے بولنا شروع کر دیتا ہوں۔"
"آپ کی تقریر سننے والوں کا بھی یہی خیال ہے۔" دوسرے سیاسی لیڈر نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

تعریف،

روزنامہ "کرانیکل" نے کسی بڑے جنرل کی وفات پر لکھا۔
"صرف موت ہی وہ دشمن تھی جس کے سامنے انہوں نے اپنا سر جھکایا۔"

سعدیہ عرفان۔ گارڈن

نمرہ، اقرا — کی ڈائری سے

موجودہ حالات کے تناظر میں لکھی گئی یہ غزل آپ سب کے لیے۔

جب ایک دشت کو خوش خبریاں سنائی گئیں
پھر اس زمین سے فصلیں نئی اگائی گئیں

میں جانتا ہوں کہ اس ایک شخص کی خاطر
کہاں کہاں سے یہ آسانیاں لائی گئیں

مجھے تو یاد نہیں شکل اپنے منصف کی
مجھے تو یاد سزائیں ہیں جو سنائی گئیں

ہمارے بچوں کا پرسان حال کوئی نہ تھا
ہماری یاد میں شمعیں بہت جلائی گئیں

پڑا جو کام تو پاؤں میں آ کے بیٹھ گئے
پھر اس کے بعد تو آنکھیں نہیں ملائی گئیں

بنا کے کشتیاں کاغذ کی شاہزادوں نے
ہمارے واسطے طغیانیوں میں لائی گئیں

ہماری دنیا کو دوزخ بنا دیا اور پھر
زمین پہ اپنے لیے جنتیں بسائی گئیں

خدا کے نام پر ہم نے بسائی جو بستی
خدا کے نام پر وہاں بستیاں جلائی گئیں

حقیقتوں کو چھپانے کی کاوشوں میں عطا
کہانیاں ہمیں کیا کیا نہیں سنائی گئیں

فاکہہ سہیل — کی ڈائری سے

میری ڈائری میں تحریر یہ نظم آپ سب قارئین کے لیے۔

کہو.....!
تمہیں کوئی فرق پڑتا ہے
میرے ہونے نہ ہونے سے
میرے ہنسنے سے، رونے سے
میرے لفظوں سے یا پھر
میرے بہت... خاموش ہونے سے
تمہارے پاس ہونے سے
یا تم سے دور ہونے سے
کہو
تمہارے دل پر کیا میرا اشک گرتا ہے
میرا خیال تمہیں لیے کبھی آوارہ پھرتا ہے
تصور کے پردوں میں میرا کوئی عکس ابھرتا ہے
جیسے تم مجھ میں رہتے ہو تم میں کوئی شخص رہتا ہے
کہو ہماری کمی یا دیر تمہاری نظر جب بھٹکتی ہے
کیا بڑے حوصلے سے بڑی مشکل سے پلٹتی ہے
کیا خوشبو میری کوئی تم میں جا سمٹتی ہے
میری یاد تمہارے دل میں بے حد مچلتی ہے
کہو کبھی باتوں ہی باتوں میں تمہارا ربط ٹوٹا ہے
بہت ضبط کرتے کرتے کیا کبھی ضبط ٹوٹا ہے
کوئی اپنا بہت اپنا کیا تم سے ایسے روٹھا ہے
خواب آنکھوں کے بتا، کیا پلکوں میں ٹوٹا ہے
کہو...!
تمہیں کوئی فرق پڑتا ہے۔

دمڑی نہیں بچتی۔

معذرت، معذرت...... بہت زیادہ۔ بات کہاں سے شروع ہوئی اور کہاں جا پہنچی۔

پر آج میں نے تمام تر مصروفیت کو پکڑ کر الماری میں بند کر ڈالا، ہاہاہا۔ اور وہاں سے کاغذ قلم نکال لائی۔

لیکن اس کے پیچھے بھی ایک وجہ ہے اور وہ ہے خواتین میں جبیں چیمہ سے ملاقات۔

بہت سے بھی زیادہ اچھا لگا۔ ان کو پڑھنا اور ان کے بارے میں پڑھنا۔ ماشاء اللہ تعلیم یافتہ خاندان، لیکن اس سے بھی بڑھ کر تربیت یافتہ خاندان کیونکہ تربیت کے بغیر تعلیم محض کاغذی ڈگری ہی ہے، جس پر پکوڑے، جلیبی رکھ کر کھا لینی چاہیے (ہے ناں؟)۔۔

ان کا جملہ...... ''میری بیٹی نے ہمیشہ لمبی اور فل آستینوں والی قمیص پہنی'' ان کی اسلامی تربیت کا آئینہ دار ہے۔

''میرے آدھے شوق اسامہ لے گیا، آدھے عمر لے گئی۔''

آنسوؤں میں بھیگا جملہ میرے دل کو بھی دکھی کر گیا۔ جبیں! اللہ آپ کو اس دکھ پر کیے گئے صبر کا اجر ضرور عطا فرمائے گا۔ اللہ آپ کو صحت اور بچوں کی عمر دراز فرمائے، آمین۔

فروری کے شمارے میں نوشین فیاض کا ناول ''عشق تم سے ہے'' پڑھا اور اچھا بھی لگا بہت۔ مکمل اور رواں تحریر تھی۔ لیکن کچھ معذرت کے ساتھ کہنا چاہوں گی کہ مہربانی فرما کر ناول میں اسٹار پلس والا انداز محبت تحریر نہ کریں۔

''اندھوں میں کانی رانی'' معذرت کے ساتھ۔ بلا مقصد اور غیر ضروری تحریر۔ وردہ بخاری کا ''وقت ایک آئینہ'' وہی روایتی موضوع۔

شکر ہے کہ قرۃ العین نے تھوڑا ہٹ کر لکھا۔ ہلکی پھلکی سی اچھی تحریر ہے۔ اور راحت جبیں ہمیشہ کی طرح تنقید کا پہلو چھوڑتی ہی نہیں، بس ان کے لیے تو تعریف ہی تعریف ہے (خوش رہو) میرے لحاف میں بھی موتی ٹنکے ہیں، بس ذرا رنگ کا فرق ہے۔ الفاظ کا ہیر پھیر بتاتا ہے کہ نرمین اور مراد کی شادی کے رنگ میں کوئی بھنگ ڈالنے

نادرۂ خاتون

خط بھجوانے کے لیے پتا۔
خواتین ڈائجسٹ۔ 37۔ اردو بازار کراچی۔
Email:Info@khawateendigest.com

نورین ظفر خان...... چکوال

ایک وقت تھا جب گرمیوں کے دن رلپنزل کے بالوں کی طرح طویل اور سنہری ہوتے تھے اور ان سنہری دنوں کی راتیں لسنو وائٹ جیسی روشن اور چاندی سی چمکتی تھیں۔

اب تو کچھ بھی پہلے جیسا نہیں رہا۔ نہ وہ دن اور نہ وہ راتیں۔

اور تو اور اپنے چچا آفتاب (سورج) بھی مشرق سے مغرب تک کا سفر گویا سنڈریلا کی طرح جادوئی رتھ پر سوار ہو کر کرتے ہیں۔ نہ آنے کا پتا نہ جانے کی خبر۔ تین پہر پر محیط دن بس تین پل کے دورانیے جیسا مختصر لگتا ہے۔

اب تو زندگی مشینی اور انسان چلتا پھرتا روبوٹ۔ پہلے صرف رزق سے برکت ختم ہوئی تھی پھر رشتوں میں برکت کا فقدان ہوا اور اب تو وقت بھی برکت سے خالی ہو گیا۔

زندگی کے بٹوے سے وقت کے سکے دن دن کر کے دھڑا دھڑ خرچ ہوتے چلے جاتے ہیں۔ اور آخر کار زندگی کا بٹوہ بالکل خالی ہو جاتا ہے کہ ایک سانس کی بھی

والا ہے، اللہ کرے یہ محض وہم ہی ہو۔

☆ پیاری نورین! ایک طویل مدت بعد آپ کو محفل میں دیکھ کر خوشی ہوئی۔ کن مصروفیتوں میں گھر گئی ہیں کہ اپنی پرانی محفل کو بھی بھول گئیں، دوست بھی یاد نہ رہے۔ جبیں چیمہ کا شکریہ جو آپ کو دوبارہ محفل میں لے کر آئیں۔

آپ کو پرچے کی تحریروں پر جو اعتراضات ہیں، وہ ہمارے سر آنکھوں پر۔ اپنے طور پر تو ہم ایسے ہر سین کو ایڈیٹ کرتے ہیں لیکن پھر بھی سہواً کہیں نہ کہیں کوتاہی ہو جاتی ہے۔ آئندہ مزید احتیاط کریں گے کہ آپ کو شکایت نہ ہو۔

اور جس طرح اس ماہ مصروفیت کو الماری میں بند کیا ہے آئندہ ماہ بھی اسے بند کر کے ہمارے لیے وقت نکال لیجیے گا۔

سعدیہ نواز......گاؤں ودھرا گجرات

تیسری چوتھی جماعت سے عمرو عیار، ٹارزن سیریز اور شہزادیوں کی کہانیاں پڑھتے ہوئے کب شعاع، خواتین ڈائجسٹ پڑھنے لگے، پتا ہی نہ چلا۔ پتا تو تب چلا جب کتاب میں رسالہ چھپا کر پڑھتے ہوئے رنگے ہاتھوں پکڑے گئے۔ پھر وہ دھلائی ہوئی کہ کیا ہی کوئی دھوبی کرتا ہوگا (کپڑوں کی)۔ اماں جان رسالوں کے سخت خلاف تو تائی جان ان کی ہم نوا۔ ہم تو جی آگے کنواں اور پیچھے کھائی کی عملی تصویر بن گئے۔ مگر ہم نے بعد میں تائی جان سے ایسا بدلہ لیا کہ چھٹی کا دودھ تو یاد آ ہی گیا ہوگا۔ بھئی ان کی دونوں بیٹیوں کو ڈائجسٹ پڑھنے پر لگا دیا (اچھا کیا ناں؟)۔ قصہ مختصر جو سفر پانچویں جماعت سے شروع ہوا، وہ تا حال جب ہم بی ایس سی کے پیپرز دے کر فارغ ہیں، جاری ہے اور اب بالآخر ہمادی سالوں کی محنت و مشقت کے بعد (منتوں ترلوں کے بعد) بابا جان خود ہمیں ڈائجسٹ لا کر دیتے ہیں۔

خیر اب آتے ہیں اس ماہ کے شمارے کی طرف۔ ''زندگی ہم تجھے گزاریں گے'' واہ، دل خوش کر دیا۔ نرمین کے ابا نے رشتے پر ہاں کر کے۔ ''رنگ ریز میرے'' عفت جی کچھ اسپیڈ پکڑو۔ ''سزا و جزا'' ویری ویل ڈن نگہت سیما جی۔ آپ کی ہر تحریر میری فیورٹ ہے۔ ''درد لا دوا پایا'' زینب کی محنت پر بہت رشک آیا۔ ''ہیر نہ آکھو کوئی'' واقعی جب کوئی ایک بار دل سے اتر جائے تو پھر بہت مشکل ہوتا ہے۔ ''اگر تم کرم فرماؤ'' ظاہر سی بات ہے جیسا کرو گے ویسا بھرو گے۔

باقی افسانے بھی ٹھیک ہی تھے۔ سب سلسلے شان دار تھے اور اب آتے ہیں اپنے موسٹ فیورٹ ناول ''حالم'' کی طرف۔ ہائے تالیہ مرنے والی ہے۔

جبیں چیمہ سے ملاقات بہت امپریسو رہی (بھئی سارا خاندان اتنا لائق فائق)۔

☆ پیاری سعدیہ! خواتین کی محفل میں خوش آمدید۔

زندگی میں ہم اکثر یہ غلطی کرتے ہیں کہ خود ہی فرض کر لیتے ہیں کہ دروازہ نہیں کھلے گا، اس لیے دستک ہی نہیں دیتے۔ انسان کو ہمت اور کوشش ضرور کرنا چاہیے۔ اب یہی دیکھ لیں آپ نے ہمت کی تو فوراً اجازت مل گئی۔ حالم کے بارے میں پہلے لکھتیں۔ اب تو اس کی آخری قسط ہے۔

فائزہ بھٹی......پتوکی

مارچ کا شمارہ 11 تاریخ کو ملا۔ ٹائٹل بس نارمل تھا۔ دل کو بھایا نہیں۔ خالدہ جیلانی کے لیے بہت سی دعائیں، ان کا جانا شاکنگ ثابت ہوا۔

سب سے پہلے راحت جبیں کی ''زندگی ہم تجھے گزاریں گے'' راحت! مجھے اس کو پڑھنا بہت اچھا لگ رہا ہے۔ انداز تحریر پہلے سے زیادہ اچھا معلوم ہوتا ہے۔

''درد لا دوا پایا'' اچھی پرسکون سی تحریر تھی۔ مگر آخر میں فریدہ عجلت کا شکار نظر آئیں۔ اگر تھوڑا سا اور لکھتیں تو زیادہ مزا آتا۔

مصروفیت ہی مصروفیت ہے۔ ٹائم ہی نہیں ملتا۔ اصل میں دس اپریل کو میری شادی ہے ان شاء اللہ۔ آپ کو آنا ہے لازمی۔

☆ پیاری فائزہ بہت مبارک ہو۔ آنا ممکن ہوتا تو ضرور آتے۔ لیکن ہماری دعائیں آپ کے ساتھ ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو ہمیشہ خوش و خرم اور شاد و آباد رکھے، آمین۔

ثنا عابد......قلعہ احمد آباد

"ہمارے نام" کو ہی پہلے دیکھا۔ ماشاء اللہ سے پہلے کی نسبت کافی اضافہ ہوا ہے قاری بہنوں کا۔ دلچسپ خطوط اور دلچسپ جگہیں جہاں جہاں سے لوگ لکھ کے بھیجتے ہیں، کبھی کبھی تو جگہوں کے نام دیکھ کر حیرانی ہوتی ہے۔ جیسے اس بار یہ نام "بستی سوکڑ جلبن"، وغیرہ۔ پیاری مدیرہ صاحبہ! میں نے ایک دفعہ پہلے بھی اپنے خط میں بتایا تھا، آج بھی تعریف میں سب سے پہلے یہی بات کہوں گی۔ آپ کا ہر خط کے جواب میں "پیاری" کہہ کر جواب دینا بہت اچھا لگتا ہے۔ دل خوش ہو جاتا ہے اس ایک پیاری کہنے سے۔ آج بھی سارے خطوط پڑھتے ہوئے یہی لگا کہ صرف یہی ایک ادارہ ہے جسے قارئین اور مصنفین کی دل جوئی کرنا آتا ہے۔ کوئی بھی سلسلہ ہو، یہاں ہر کسی کے لیے داد و تحسین، محبتیں، خلوص بھرپور توجہ سے بات سننا، خط پڑھنا، ان کے جواب اتنے اچھے انداز سے دینا، یقین مانیں کمال ہی تو ہے۔ قارئین کی تعریف اور پسندیدگی ہی اگر آپ کی محنت کا حصول ہے تو اس میں کوئی شک نہیں کیونکہ آپ نے بھی تو کبھی کسی کو شکایت کا موقع دیا ہی نہیں۔

سارے نئے نام تھے اس دفعہ لیکن تمام خطوط میں (فرزانہ جبیں، کراچی) کا خط مجھے پسند آیا کہ وہ اتنی پرانی قاری ہیں۔ "نفسیاتی الجھنیں" پڑھا۔ دلی دکھ ہوا۔ اکثر ایسے ہی حالات میں لوگوں کو دیکھ کر یقین ہی نہیں آتا کہ کیا واقعی یہ اسی دنیا کی باتیں ہیں جو ہمارے آس پاس آباد ہے۔ "موسم کے پکوان" میں سویٹ ڈش لب شیریں دل کو اچھی لگی۔ تب ہی تو فوراً واٹس ایپ اسٹیٹس پر سب سہیلیوں کے ساتھ شیئر کر دی کہ کوئی پیاری بہن بنا کر مجھے بھی کھلا ہی دے گی۔ کیونکہ خود تو میں کوکنگ سے بالکل ناواقف ہوں۔ بہت سست اور نکمی بھی۔

جبیں چیمہ سے ملاقات بہت اچھی لگی کیونکہ وہ مصنفہ ہیں۔

☆ پیاری ثنا! آپ کی محبتوں کے لیے تہ دل سے شکریہ۔ نمرہ احمد تک آپ کا پیغام ضرور پہنچائیں گے۔

فرحانہ مہناز......اسلام آباد

مارچ کے سرورق پر ماڈل کا ڈریس بہت پیارا تھا۔ "کرن کرن روشنی" میں استغفار بہت ہی عمدہ طریقہ سے بیان ہوئی۔ جبیں چیمہ سے ملاقات اچھی رہی۔ سب بہن بھائی اعلا عہدوں پر فائز، بہت اچھا لگا پڑھ کر۔ لیکن پھر ان کے بیٹے کی وفات کا پڑھ کر بہت افسوس ہوا۔ دعا گو ہیں اللہ تعالیٰ جبیں چیمہ کو صبر عطا فرمائے۔ شاہین رشید جی کافی مہینوں سے آپ جونیئر فنکاروں سے انٹرویو لے رہی ہیں، کسی سینئر سے بھی ہونا چاہیے۔ "ہمارے نام" میں نئی بہنوں نے شرکت کی۔ پرانی قاری بہنیں کہاں مصروف ہیں بھئی۔ "ہیر نہ آکھو کوئی" بہت ہی پاورفل افسانہ، لفظوں کی چنائی سے ہی معمار کا پتا چل رہا تھا۔ "اندھوں میں کانی رانی"، ہلکی پھلکی تحریر۔ "سزا و جزا" نگہت سیماجی ایک بار پھر خوب صورت سا ناول بنا وقفہ کے پڑھنا بہت اچھا لگا۔ "وقت ایک آئینہ" وردہ بخاری نے اچھا لکھا۔ ایسا آئینہ اولاد کی صورت میں سامنے آتا ہے لیکن آپ نے دیورانی پر ہی ختم کر کے منفرد بنا دیا۔ فریدہ بتول "درد لا دوا پایا" کچھ کمی سی لگ رہی تھی۔ "دوڑ" میں قرۃ العین اچھا پیغام لے کر آئیں۔ "زندگی ہم تجھے گزاریں گے" کہانی خراماں خراماں آگے بڑھ رہی ہے۔ بقول صفیہ مہر کہانی گاڑی بنگلہ کے بغیر بھی دلچسپ ہے۔ "اگر تم کرم فرماؤ" مکافات عمل پر مبنی کہانی اچھی تھی۔ مجھے گاؤں بہت پسند ہیں۔ ایسے گاؤں جن کے گرد نہر ہو، باغات، فصلیں اور سہولیات۔ گاؤں کی سیر کا بھی بہت شوق ہے بچپن سے۔ اس وجہ سے آپ کا باورچی خانہ بھی اچھا لگا تو پھر آپ لوگ مجھے کب بلائیں گی اپنے گاؤں۔ انتظار رہے گا۔ "نفسیاتی الجھنیں" پڑھ کر تو یہ شعر یاد آتا ہے......

ہاتھ الجھے ہوئے ریشم میں پھنسا بیٹھے ہیں
اب سمجھ میں نہیں آتا کون سے دھاگے کو جدا کس سے کریں

اللہ تعالیٰ ہی رحم کرے۔

☆ پیاری فرحانہ! آپ کی کہانیاں زیر غور ہیں۔ خواتین کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

آمنہ یامین ملک......دریا خان ضلع بھکر

ڈائجسٹ پڑھتے ہوئے کئی سال ہو چکے ہیں۔

شادی سے پہلے آسانی سے رسالہ پڑھ لیتی تھی لیکن اب شادی کے تین سال بعد حریم فاطمہ کی ذمہ داریوں کی وجہ سے وہ بات نہیں رہی۔ میرے شوہر ملک فرحان علی مجھے ہر ماہ خواتین، شعاع اور کرن لاکر دیتے ہیں۔ سسرال میں بھی کوئی روک ٹوک نہیں ہے، میری جیٹھانی اور بڑی سسٹر ثوبیہ یامین "کچن اور آپ" بہت شوق سے پڑھتی ہیں۔

نمرہ احمد کے "جنت کے پتے" پھر "نمل" اور اب "حالم" نے ہمیں اپنے سحر میں جکڑا ہوا ہے۔ راحت جبیں کا ناول "تتلی جیسا پیار" کے بعد "زندگی ہم تجھے گزاریں گے" بہت اچھا ناول ہے۔ بہت دل ربا انداز میں لکھتی ہیں آپ۔ "خط آپ کے" گوشی جمال کا خط بہت دل سے پڑھتی ہوں۔ فائزہ بھٹی کا افسانہ بہت اچھا تھا۔ ان کا خط نظر نہیں آتا، کہاں ہیں آپ؟ ثریا راجپوت آپ کا ناراضی سے بھرپور خط میں انجوائے کرتی ہوں۔ ثمینہ اکرم، کوثر خالد اور ریحانہ آنٹی آپ سب کے خط پسند آتے ہیں۔ "کچن اور آپ" بشریٰ یامین ملک کا بہت پسند آیا۔ خاص طور سے ٹپس (جو ہمیں بھی معلوم نہ تھیں)۔ ویسے ہماری یہ بہن بہت محنتی اور فرماں بردار ہے۔

☆ پیاری آمنہ! خواتین ڈائجسٹ سے آپ کی محبت ہماری محبتوں کا حاصل ہے۔ بہت شکریہ۔

بشریٰ یامین ملک......دریا خان، بھکر

"حالم" واؤ نمرہ ! کمال ہے۔ "رقص شرر" بہترین ناول، ویری گڈ۔ "زندگی ہم تجھے گزاریں گے" یہ سادہ سا ناول میرے دل کو چھو گیا۔ راحت جبیں کے لیے بہت سارے آم، ہاہاہا۔ لیکن وہ تو گرمیوں میں ہوتے ہیں۔ نمرہ احمد کی والدہ اور خالدہ جیلانی کی مغفرت کے لیے دعائیں۔ عفت سحر طاہر! آپ نے مجھ پر ذرا سا سحر بھی طاری نہیں کیا۔ اتنا عام سا لکھا ہوا ناول اور قسط بھی غائب اور اگر موجود ہوتی ہے تو بالکل نہ ہونے کے برابر۔

☆ پیاری بشریٰ! آپ اتنی مشکلات سے گزر کر خط لکھتی ہیں۔ ہم آپ کو مشورہ دیں گے کہ آپ نام بے شک نہ بدلیں، لیکن کاسٹ بدل دیں۔

آپ کی کہانیاں ابھی پڑھی نہیں گئیں۔

رضوانہ شکیل راؤ......لودھراں

چند باتیں اور سلسلے ایسے ہیں جو خواتین کو تمام رسائل سے ایک الگ مقام دیتے ہیں۔ "کہنی سنی" میں آپ کی باتیں اس قدر جامع اور خوب صورت ہوتی ہیں، کیا کہنے۔ پھر "کرن کرن روشنی" کی تمام باتیں دل کو چھو جاتی ہیں۔ "ہمارے نام" یہ سلسلہ بھی بہت اپنائیت لیے ہوئے ہے۔ تمام قاری بہنیں موتیوں کی لڑی کی طرح ہیں، ایک سے بڑھ کر ایک۔ جبیں چیمہ سے مل کر خوشی ہوئی۔ اللہ ہم سب کو دین کے رستے پر چلنے کی توفیق دے۔ خطوط میں گوشی جمال کی بکری کا دلی افسوس ہوا۔ گوشی بھئی تم اب کوئی افسانہ، ناولٹ لکھ ڈالو، جلد از جلد۔ ہمیں تو مستقبل کی بڑی رائٹر نظر آتی ہے تم میں۔ سائرہ رضا "ہیر نہ آکھو کوئی" اچھا موضوع تھا۔ سیدہ بخاری باورچی خانے میں بہت اچھی لگیں۔ وجہ؟ ہمارا کچن بھی آپ جیسا ہے مگر گیس کی سہولت سے محروم ہے ابھی۔ مگر شکر مالک کا بہت مطمئن ہیں پھر بھی۔

☆ پیاری رضوانہ! خواتین کی پسندیدگی کے لیے تہ دل سے شکریہ۔ آپ کا تبصرہ اتنا اچھا ہوتا ہے کہ پڑھ کر دل خوش ہو جاتا ہے۔

رخسار احمد......کراچی

2006ء سے خواتین ڈائجسٹ پڑھنا شروع کیا۔ میری بڑی باجی ہر ماہ خواتین اور شعاع باقاعدگی سے منگوایا کرتی تھیں۔ ان سے چھپ کر پڑھتی تھی۔ مریم عزیز کا ناول "یہ دلوں کے رشتے" پڑھنے کے بعد تو جیسے خواتین، شعاع سے ناتا ہی جڑ گیا۔ بے شمار کہانیاں پڑھیں نہ صرف خود پڑھتی تھی بلکہ اپنے بھائیوں کو بھی اس کام پر لگا دیا۔ بڑی باجی کی شادی کے بعد میں اور مجھ سے بڑی حنا ہم دونوں گرمیوں کی طویل دوپہر میں جب سب گھر والے سو رہے ہوتے تھے، ہم مزے سے رسالے پڑھتے۔ بے شمار کہانیاں ہیں جو مدتوں یاد رہیں گی۔ ان کہانیوں سے بہت کچھ سیکھا، گھر کی چار دیواری میں رہنے والی ہم بہنوں نے ان ناولوں کے ذریعے دنیا کی سیر بھی کی چونکہ میں بہن

بھائیوں میں سب سے چھوٹی ہوں۔ حنا کی شادی کے بعد اب صرف میں ہی رہ گئی ہوں۔ تاہم کچھ عرصے سے خواتین ڈائجسٹ سے اک اجنبیت کا احساس ہوتا ہے۔ نہ ہی وہ کہنہ مشق لکھاری رہیں اور نہ ہی ان کی معیاری تحاریر۔ جو قارئین یہ کہتی ہیں کہ تلخ حقائق پر مبنی کہانیاں رسالے میں شائع نہ کی جائیں اور مزاح سے بھرپور کہانیوں کی فرمائش کرتی نظر آتی ہیں۔ میں ان سے کہنا چاہوں گی کہ اگر ان کو مزاح پڑھنے کا اتنا ہی شوق ہے تو وہ لطائف کی کتابیں پڑھ لیا کریں۔ آپ نے ایک لڑکی کے افسانے کو محض اس لیے رد کردیا تھا کیونکہ وہ افسانہ تلخ حقائق پر مبنی تھا۔ اب بس وہی روایتی ساس بہو کی کہانیاں جن سے میں از حد بےزار آچکی ہوں۔ اب نئے معاشرتی مسائل کو ابھاریں۔ موجودہ دور کا سب سے بڑا مسئلہ ہے فیس بک، واٹس ایپ ہیں جو کہ نوجوان نسل کو تباہ و برباد کررہی ہیں۔

☆ پیاری رخسار! جو کہانی تلخ حقائق کی بنا پر رد کی اس میں قتل و غارت بہت تھی۔ باپ ایکسیڈنٹ میں مرگیا۔ بیٹی غربت کے ہاتھوں تنگ آکر غلط ہاتھوں میں پڑ گئی۔ پھر اسے کسی نے قتل کردیا۔ ماں پاگل ہوگئی۔ اب ایسی کہانیاں پڑھ کر کسی کو کیا سبق ملے گا۔ سوائے افسوس اور مایوسی کے۔ تلخ حقائق کے ساتھ کوئی سبق، کوئی امید کا پیغام ہوتو ہم ضرور شائع کریں گے۔

ج: پیاری گوشی! کونین کے (ک پر زبر) کے معنی دونوں جہاں، دوعالم اور دین و دنیا ہیں۔ ملیریا بخار میں جو کڑوی دوا دی جاتی ہے اسے کونین (ک پر پیش) کہا جاتا ہے۔

ہماری طرف سے نئے سال گرہ کی دلی مبارک باد اور تا زندگی خوشیوں کی دعائیں۔

شہزادی نذیر...... ساہیوال

اس مہینے کے ڈائجسٹ میں کرن کرن روشنی پڑھا بہت اچھا لگا۔ جس بات پر عمل کرنے کی کوشش کرتی ہوں وہ یہ ہے کہ عورتوں کو کثرت سے استغفار کرنا چاہیے۔ اس لیے گھر کا کام کرتے ہوئے استغفار پڑھنے کی کوشش کرتی ہوں۔

ہر مہینہ شروع ہوتے ہی ڈائجسٹ کا انتظار لگ جاتا ہے۔ "رنگ ریز میرے"، بہت شوق سے پڑھتی ہوں لیکن اس کی قسط اکثر غائب ہوتی ہے۔

گڑیا راجپوت، گوشی جمال اور ڈاکٹر فریال کے خط بہت شوق سے پڑھتی ہوں جی چاہتا ہے ان سے دوستی کرلوں۔ عمیرہ احمد کے ناول بہت شوق سے پڑھتی ہوں کافی عرصے سے ان کی کوئی کہانی پڑھنے کو نہیں ملی۔

خالدہ جیلانی کی وفات کا سن کر بہت افسوس ہوا۔ اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائے۔ راحت جبیں کا ناول زندگی ہم تجھے گزاریں گے ہمیشہ کی طرح بہت اچھا لگا۔

مجھ پر اپنے گھر کے کام کے علاوہ ایک ڈاکٹر باجی کے گھر کے کام کی بھی ذمہ داری ہے۔ لیکن میں اپنی ڈھیر ساری مصروفیات میں سے ڈائجسٹ کے لیے وقت نکالنا نہیں بھولتی۔ راتوں کو جاگ کر پڑھتی ہوں۔ آپ کو یہ جان کر شاید حیرانی ہو کہ میں نے کسی اسکول سے باقاعدہ تعلیم حاصل نہیں کی بلکہ صرف اپنے شوق سے گھر میں ہی پڑھنا سیکھا ہے۔

ج: پیاری شہزادی! ہمیں یہ جان کر واقعی حیرت کے ساتھ ساتھ بہت خوشی بھی ہوئی ہے کہ آپ نے کسی اسکول میں تعلیم حاصل نہیں کی۔ اتنا صاف ستھرا خط کوئی لفظ کاٹا نہیں۔ جملے مربوط اور بے حد خوب صورت لکھائی۔ اتنی اچھی لکھائی بہت کم لوگوں کی ہوتی ہے۔

اللہ تعالیٰ آپ کو زندگی میں آسانیاں اور خوشیاں دے۔ آمین

فرزانہ جبیں...... کراچی

سب سے پہلے "کرن کرن روشنی" سے دل و دماغ کو منور کیا۔ پھر چلے "حالم" کی طرف ہمیشہ کی طرح یہ قسط بھی جاندار رہی۔ نگہت سیما اور سائرہ رضا کی شمولیت نے دل خوش کردیا۔ سائرہ رضا کا افسانہ "ہیر نہ آکھو کوئی" بے مثال۔ سائرہ! آپ کمال کا لکھتی ہیں ہائے اسی لیے دوسری نظر کو حرام کہا گیا تھا غیر مرد سے بات کرتے ہوئے لہجے کو سخت رکھنے کا حکم یونہی تو

نہیں دیا گیا تھا اور عورت کا کوئی کام نہیں خوشبو لگا کر باہر نکلے۔ اگر مرد بے وفائی کرتا ہے اور جس کی خاطر کرتا ہے وہ بھی تو عورت ہے۔ آپ کی تحریر نے دل چھو لیا۔ نگہت سیما "جزا وسزا" لے کر آئیں۔ بہت خوب۔ ایسے ہی تو اللہ اور اس کے رسولؐ نے حسد سے منع نہیں فرمایا ہے۔ عطیہ خالد کا ناولٹ "اگر کرم تم فرماؤ" موضوع کے اعتبار سے بہترین تحریر ہے۔

ج: پیاری فرزانہ! بہت اچھا خط اور بہت اچھی لکھائی کے لیے شکریہ۔ شکستہ تحریریں ہم پڑھ تو لیتے ہیں لیکن اگر لکھائی اچھی ہو خط پڑھنے میں بہت لطف آتا ہے۔ آپ کی لکھائی واقعی بہت خوب صورت ہے۔

خواتین ڈائجسٹ کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

نادیہ نواز...... کراچی

خواتین سے میرا رشتہ بہت پرانا ہے جب میں آٹھویں کلاس کی طالبہ تھی اور اب میرا بڑا بیٹا کلاس آٹھویں کا طالب علم ہے۔ خواتین ڈائجسٹ کا ہر سلسلہ ہی بہت زبردست اور سبق آموز ہوتا ہے۔ کچھ نہ کچھ سیکھنے کو ضرور ملتا ہے۔

آپا جی آپ کو تو یاد ہی نہیں ہوگا میں نے بھی چھ سال پہلے ایک افسانہ تحریر کیا تھا جو کہ آپ کو پسند آیا تھا۔

☆ پیاری نادیہ! چھ سال پرانی بات اب ہمیں یاد نہیں۔ آپ کی کہانی قابل اشاعت ہوئی تو ضرور شائع کریں گے۔

عذرا پروین...... ٹنڈو جام

مارچ 2015ء سے میں خواتین ڈائجسٹ سے ملی ہوں، اس سے پہلے میں ایسے کسی بھی ڈائجسٹ سے متعارف نہیں تھی۔ بہت کچھ سیکھنے کو ملا۔

ج: پیاری عذرا! خواتین کی محفل میں خوش آمدید۔ آپ کا سوال نوٹ کرلیا ہے۔ ہم صائمہ اکرم چودھری تک آپ کا سوال پہنچا دیں گے۔

سارہ رحمٰن...... بستی سوکڑ

کوئی رائٹر نمرہ کے پاسنگ بھی نہیں ہے۔ "حالم" کی اگلے ماہ آخری قسط ہے۔ خوشی بھی ہو رہی ہے اور غم بھی۔ حالم کے اختتام پر عنیزہ سید، رفعت ناہید سجاد، سمیرا حمید، یا سائرہ رضا سے قسط وار ناول لکھوائیں۔ حالم کے ختم ہونے کے اگلے ماہ نمرہ احمد شعاع کے لیے ناول لکھیں۔ نگہت سیما کا "جزا وسزا" پڑھا ناول بہت ہی زبردست تھا لیکن اڑتیس سال پہلے سینڈوچ ہوتا تھا کیا؟ کہانی اڑتیس سال پہلے کی لگ ہی نہیں رہی تھی میں نے بیس پچیس سال پرانے رسالے پڑھے ہیں۔ کہانیوں کے کرداروں کا لائف اسٹائل بہت مختلف سا ہوتا تھا۔ عثمان کی فاطمہ سے محبت فلمی سی لگی۔

سائرہ کے افسانہ کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔ سائرہ! آپ اتنا اچھے کیسے لکھ لیتی ہیں۔ پلیز سائرہ خواتین کے لیے قسط وار ناول لکھیں۔ "رنگ ریز میرے" میرے خیال میں ختم کردینا چاہیے۔ اس کی جگہ نمل کا پارٹ ٹو شروع کرنا چاہیے۔ تمیرا حمید نے 2020 میں نہیں لکھا کیا وجہ سمیرا؟ اس کے لیے آپ کو کیا سزا دینی چاہیے۔ آپی نمرہ احمد کا تفصیلی انٹرویو لیں۔ چراغ آخر شب کتنے کا مل جائے گا۔ آپی عائزہ خان، ہمایوں سعید، ماہرہ خان، کترینہ کیف کے تفصیلی انٹرویو لیں۔ اس ماہ پورا ڈائجسٹ نہیں پڑھ سکی۔ ان شاء اللہ اگلے ماہ تفصیلی تبصرہ کروں گی۔

☆ پیاری سارہ! نمرہ احمد آپ کو پسند ہیں ہمیں بھی پسند ہیں۔ حالم کے ختم ہونے پر اداس نہ ہوں۔ آپ جلد نمرہ کا نیا ناول پڑھیں گی۔

سینڈوچ اڑتیس کیا سو سال پہلے بھی موجود تھے۔ ڈبل روٹی کے دو پیس کے درمیان ابلا انڈا، پنیر یا آملیٹ رکھ کر ایک صدی پہلے بھی کھایا جاتا تھا۔ اڑتیس سال پہلے سب کچھ ایسا ہی تھا جیسا آج ہے۔ بس کمیونیکیشن کے ذرائع میں تبدیلی آئی ہے۔ موجودہ دور میں انفارمیشن ٹیکنالوجی بہت ترقی کرگئی ہے۔

بقیہ سروے

ج: "نورین! جتنے خوب صورت انداز میں آپ نے سوال پوچھا ہے، مجھے شک ہے کہ میں اس خوب صورت انداز میں جواب نہیں دے سکوں گی۔ لیکن میں کوشش کرتی ہوں۔ میں سارا قصہ سنا دیتی ہوں، شاید آپ کو نقطہ آغاز سمجھ میں آجائے۔

اگر کچھ عرصہ پہلے مجھ سے طواف عشق کے بارے میں پوچھا جاتا تو میں مکمل لاعلمی کا اظہار کرتی۔ جن فیوچر ناولز کا یارم میں ذکر ہے، میرے پاس ان کے واضح پلاٹس موجود ہیں، وہ لکھے نہیں گئے اور جو لکھے گئے وہ گمان میں بھی نہیں تھے۔ خصوصی طور پر طواف عشق۔ اور میں تین لڑکیوں کی کہانی پر اس لیے بھی کام نہیں کرنا چاہتی تھی کہ توبہ باف بھی لڑکیوں کی ہی کہانی ہے۔ وہ بھی زمانہ قدیم، (زمانہ جدید بھی) کی کہانی ہے تو اس صورت میں، مجھے طواف عشق لکھنا ہی نہیں تھا نا۔

طواف عشق کا خیال رات کے درمیانی پہر میں وژن کی طرح آیا تھا۔ ان دنوں میں دبیسا جیسی ایک لڑکی، اور تین لڑکوں کے خزانہ تلاش کرنے کی زمانہ قدیم کی کہانی پر کام کر رہی تھی۔ چونکہ ان سب کا گروہ تقریباً مسخروں کا ٹولہ ہے، اس لیے مجھے لکھتے ہوئے مزا آرہا تھا۔ کہانی چل رہی تھی، چل رہی تھی اور وہ عین موقع پر آکر رک گئی۔ لفظوں کا بت ہی بن گئی۔

میری سمجھ میں آگیا کہ ابھی یہ کہانی نہیں لکھی جائے گی۔ کیونکہ یہی واقعہ راہ نور، ام الیقین لکھے جانے سے پہلے بھی پیش آیا تھا۔ ایسی وارداتیں اب اجنبی نہیں رہیں۔ پر اس بار میں نے ہٹ دھرمی سے کام لیا اور دوسری کہانی کو پکڑ لیا۔

یہ اہرام مصر پر ایک میجر ناول ہے۔ میں نے پہلی قسط تقریباً پوری لکھ لی، لیکن عین وقت یعنی جب وہ امتل کو بھیجی جانی تھی، وہ فریز ہوگئی، کہتی تھی نہ آگے جاؤں گی نہ پیچھے آؤں گی، تم ہی اپنا راستہ بدل لو۔ یہ ٹھیک اسی دن کی رات کا قصہ ہے کہ مجھے وژن دکھائی دیا۔ یہ صحرا تھا، تین لڑکیاں، کچھ اونٹ، اور حج کا احساس۔ یہ کل منظر تھے جو میرے ذہن کے پردے پر ابھرے۔ مجھے کوئی مافوق الفطرت ہستی نہ سمجھیں، ایسے وژن نظر آنا غیر معمولی نہیں ہوتا۔ خاص کر ان لوگوں کے لیے جو تصورات کے عادی ہوں۔ تو ہر تخلیق کار اپنے مزاج اور کیفیت کے مطابق ان تجربات سے گزرتا ہی رہتا ہے۔

تو اگلے دن صبح میں نے گوگل پر صرف حج لکھا تھا۔

اس سے پہلے مجھے بھی معلوم نہیں تھا کہ یہ مصر ہی تھا جس نے پہلی بار خانہ کعبہ کے لیے سیاہ غلاف تیار کرنے کی سعادت حاصل کی تھی، ورنہ پہلے کعبہ کو مختلف رنگوں کے کپڑوں سے ڈھانپ دیا جاتا تھا۔ تو میں بھی اس تحریر کی قاری ہی تھی۔ توبہ ایسا دروازہ ہے جس میں داخل ہونے پر پرانا انسان باہر چھوڑنا پڑتا

ہے۔ وہ تینوں جب اس دروازے سے اندر گئیں تو پرانی زندگی اور فطرت پیچھے چھوڑ گئیں۔ ورنہ منصور جیسے لوگوں اور ایسی صورتحال کو سنبھالنا ان کے لیے زیادہ مشکل نہ ہوتا۔ لیکن وہی بات کہ توبہ کا عہد تھا، اور حج کی نیت کہ جس پر قائم رہنے کے لیے وہ حقیر ترین قیمت کے عوض بک کر رب کی محبت پانے کے لیے تیار ہو گئیں۔ نیت اور ارادہ ہی منزل ہے۔ باقی سب کچھ تو درمیان کا قصہ ہے۔ تو نقطہ آغاز الہام تھا، اور باقی کا قصہ بھی عطا کا ہی ہے۔ اور یہ ہر تخلیق کار کے ساتھ ہوتا ہے، کہ پاؤلو کوئیلہو تک کہتا ہے۔

"ساری صلاحیت اور سارا علم رب العالمین کی طرف سے ہے۔"

سوال: "خنسا احمد نے پوچھا ہے کہ آپ کی بہت سی کہانیاں عربی پس منظر لیے ہوتی ہیں۔ کیا اس کی وجہ آپ کی ان روایات اور عربی تاریخ میں دلچسپی ہے یا آپ نے عربی زبان سیکھی ہوئی ہے کیوں کہ آپ کی تحریروں میں عربی اور فارسی کے الفاظ بھی نظر آتے ہیں؟"

جواب: "اکثر پرانی کہانیوں کو عرب پس منظر سمجھا جاتا ہے، لیکن زمانہ قدیم کی ہر کہانی عرب پس منظر میں نہیں تھی، جیسے دبیسا، عشق آمد و من وغیرہ۔ مجھے پرانے وقت پسند ہیں۔

میرا زیادہ وقت اس عہد کے لوگوں کے رہن سہن کے بارے میں سوچتے ہوئے گزرا۔ پھر میں نے بہت سی تصویریں دیکھیں، کتابیں پڑھیں، اور ظاہر ہے فلمیں دیکھیں۔ والد کے سنائے قصے، اور بچپن کے تصورات بھی وجہ بنے۔ تو یہ تصورات کی دنیا تھی جس نے مجھے بہت پیچھے کے وقت میں رکھا، ورنہ بہت آگے کے وقت میں۔ جس چیز کے بارے میں زیادہ سوچیں گے، اس کی کھوج کریں گے تو وہ ظاہر ہونے لگے گی۔ تو "ظاہر" کا یہ اظہار قلم سے بیاں ہونے لگا۔

قدیم وقت عرب، دمشق، برصغیر کا ہی نہیں، مجھے دنیا کے ہر کلچر، ہر خطے کا پرانا وقت بہت متاثر کرتا ہے۔ وہ قبیلوں کا ہو، محلوں کا یا پھر گاؤں دیہات کا۔ میری شدید ترین خواہش ہے کہ مجھے ٹائم مشین ملے اور میں ہر عہد میں دندناتی ہوئی پہنچ جاؤں۔ ایک تصویر ایک ہزار لفظ کے برابر ہوتی ہے، سوچیں ذرا ٹائم مشین کے ذریعے جب میں مطلوبہ وقت میں پہنچ جاؤں گی تو زیادہ بہتر انداز سے لکھ سکوں گی۔

جس وقت میں نے پہلی بار شیش محل دیکھا تھا، میں تب تک وہاں سے باہر نہیں نکلی تھی جب تک تصور میں محل کو شہزادیوں سے ہنستا بستا نہیں دیکھ لیا تھا۔ تصور کریں! محل آپ کے سامنے ہے، لیکن محل کا وہ ماحول وقت کی دھول میں اُڑ چکا ہے۔ تو ذہن کے پردے پر زور ڈال کر تصور کی قوت کو پوری شدت سے جگائیں۔

کبھی شیش محل کے جھروکوں سے وہ دریا دکھائی دیتا تھا جس نے اب اپنا رخ بدل لیا۔ کیا یہ شدید خواہش نہیں جاگے گی کہ محل سے بہتے ہوئے دریا کو دیکھیں، اور محل کی رہنے والیوں کی موجودگی کا احساس کریں کہ جن کی سواریاں ہاتھیوں پر آیا کرتی تھیں۔ ہاتھیوں کی آمد و درفت کے لیے شیش محل کی طرف خاص سیڑھیاں بنائی گئی تھیں تاکہ پردہ بھی قائم رہے اور ہاتھی پک اینڈ ڈراپ محل کے دروازے سے ہی کر لیں۔

مجھے تو چند ہاتھی ان سیڑھیوں پر چڑھتے اُترتے ہوئے دکھائی دے گئے تھے، اب آپ اپنی تخلیقی قوت آزما کر دیکھ لیں۔ (ہاہا)

میں جن جن تاریخی مقامات پر گئی، وہاں تب تک رہی جب تک وہاں رہنے والوں کو تصور کی آنکھ سے دیکھ نہیں لیا۔ پہلے یہ اس لیے تھا کہ مجھے اچھا لگتا تھا، آج کل اس لیے کہ مجھے اپنی کہانیوں کے لیے ان کی ضرورت رہتی ہے۔

ایسے ہی کسی محل کے کچن میں دینار آئے گی۔

اور ہاں! میرے اندر ایک ڈائریکٹر کی روح تھی جو ہر چیز کیمرہ فریم میں دیکھتا ہے۔ پھر میں فلم کے سیٹ سے فلم کے اسکرپٹ یعنی کہانیوں کی طرف آ گئی۔ جب میں لکھتی ہوں تو بڑے پردے پر چلتی دوڑتی فلم دیکھتی ہوں، اور پھر قلم بند کرتی ہوں۔ ظاہر ہے کہ میری تحریروں کا بڑا پردہ خواتین ڈائجسٹ ہے۔ (میں بہت زیادہ بول رہی ہوں نا؟)

دیکھیں کہ پاؤلو نے الف لیلیٰ پڑھی، ایک واقعہ اس کی نظر سے گزرا، اور پوری دی الکیمیسٹ وجود میں آ گئی۔ یہ وقت کے ساتھ روحانی یا جذباتی تعلق کی بات بھی ہے۔ یہ گئے وقتوں کے لوگوں کا حق ادا کرنا بھی ہوتا ہے، جو نئے زمانوں تک پہنچا کر کیا جاتا ہے۔

میں نے عربی نہیں سیکھی، مجھے فارسی بھی نہیں آتی۔ جو آپ کو عربی اور فارسی لگتی ہے، وہ اردو ہی ہے، چونکہ ہماری زبان ان ہی زبانوں سے مل کر بنی ہے۔ بہت سے قارئین کو یہ الفاظ نئے یا اجنبی لگتے ہیں، اس لیے انہیں عربی یا فارسی کا گمان ہوتا ہے۔ میری خواہش تو بہت ہے کہ میں فارسی سیکھوں۔ مجھے یہ زبان سننے میں بہت پیاری لگتی ہے۔ لیکن بہتر ہے کہ میں پہلے اُردو ہی ٹھیک سے سیکھ لوں۔

سوال: حبیبہ خان نے کراچی سے سوال کیا ہے۔

"شیف دینا کریم آپ کی کہانی کا ایسا کردار ہے جو مجھے بہت زیادہ پسند ہے۔ مسلسل محنت، جدوجہد اور پھر پے در پے ناکامی، پھر ان ناکامیوں اور رویوں پر صبر کرنے کے بعد ایک بہت بڑی کامیابی۔ کیا یہ کردار حقیقی ہے یا تخلیقی؟"

جواب: "عظیم کامیابیاں "عظمت" کے بغیر ناممکن ہیں۔ کامیاب ہونے اور عظیم ہونے میں "عظمت" کا ہی فرق ہے۔

مجھے دینا کو یہی کردار بنانا تھا جس میں ٹیلنٹ اور عاجزی ہے، مکاری اور چالاکی نہیں۔ اسے کسی کو ہرانا، اور پیچھے نہیں چھوڑنا۔ وہ حسد سے دوسروں کے لیے گڑھے نہیں کھودتی۔ مجھے یہ تاثر زائل کرنا ہے کہ اچھا انسان کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا کیونکہ اچھوں کے ساتھ ہمیشہ برا ہوتا ہے۔ مجھے اسٹریٹ اسمارٹ لوگوں اور "عظیم" انسانوں میں فرق واضح کرنا ہے۔

اس لیے دینا کی جو جدوجہد ہے، وہ ظاہری نہیں، باطنی بھی ہے۔ میں اس انسان کو کامیاب سمجھتی ہوں جس کے پاس ہزار ٹرافیاں ہوں، اور اس کی ذات بھی کھوکھلی نہ ہو۔ جس کی شخصیت پُرنور، زبان سچی اور نیت شفاف ہو۔ ورنہ دنیا میں کامیاب لوگوں کا ڈھیر لگا ہوا ہے۔ لیکن وہ لوگ انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں جو کامیاب ہوئے اور عظمت بھی پائی۔

کامیابی کا تعلق اشیاء سے نہیں صفات سے ہے۔ ایک بہت بڑے بزنس کا مالک، اگر صفات میں فرعون ہے تو وہ ناکام ہے۔ کامیابی کا صرف ایک ہی راستہ ہے، وہ ہے صراط مستقیم، یعنی بس سیدھی راہ، سیدھی چال، سیدھی ترکیب، صاف سیدھی نیت۔ تو انسان کو کوشش اور جدوجہد کے لیے پیدا کیا گیا ہے، چالاکی اور مکاری کے لیے نہیں۔

یہ کردار مکمل خیالی نہیں ہے، اور پورا حقیقی بھی نہیں ہے۔ اس کی شخصیت کے مختلف رنگ، مختلف لوگوں میں مشاہدہ کیے گئے ہیں۔ آپ جب دینا اور دنیا زکو پڑھ لیں گے تو جان جائیں گے کہ ان

کرداروں کی خوبیوں کے حامل لوگ آپ کے آس پاس ہی موجود ہیں۔ اگر دیکھا جائے تو دینا ظاہری لحاظ سے ہر پہلو سے ”صفر“ تھی۔ پھر اس نے اپنی محنت، ٹیلنٹ اچھائی کو ہر صفر کے آگے لگا دیا۔ اور بس یہی اس کہانی کا سبق تھا اور آگے بھی ملے گا کہ کچھ بھی ہو جائے، ہر صفر کے آگے ”اپنی لگن اور ٹیلنٹ“ لگا دیں۔ ہر گول دائرہ، ”ستارے“ اور عروج میں بدل جائے گا۔

دینا، دبیسا، مہر، میراں، عزیزہ، آمنہ وغیرہ کے کردار، ان کی کہانیاں، جدوجہد اور ان کے اصول، اشارے ہیں کہ بحیثیت انسان ہم خود اپنی ذات کے کارواں کے ”امیر“ ہیں۔ ہمیں کسی اور امیر یا ہیرو کی ضرورت نہیں ہے۔

میں دینار کا ذکر کر رہی ہوں لیکن شاید آپ کو الجھا رہی ہوں تو سیدھی طرح سے بتاتی ہوں کہ آپ اس عہد کی دینا، اور پرانے وقت کی دینار کی کہانی ایک ساتھ پڑھیں گے اور جانیں گے کہ مختلف ادوار کی دو لڑکیوں نے کتنے پاپڑ بیلے اور پشت پر کتنے وار سہے۔ اور کب پڑھیں گے؟ جب میں کھانوں اور مسالوں کے بارے میں تھوڑی سی بہتر انفارمیشن اپنے اندر ضم کر لوں گی۔

پھر آپ کو ماریہ یاد ہے؟ اسے بھولنا نہیں ہے کیونکہ اس کے بورشے سے نئے سیاز نکلنے والے ہیں، اور اس بار جگنو کے ساتھ کچھ اور بھی رقص کرے گا۔

چند سوال جو بار بار کیے جاتے ہیں، میں جلدی سے ان کے مختصر جواب دیتی ہوں۔

میں لکھ کیوں نہیں رہی، کیا میں نے لکھنا چھوڑ دیا ہے کا جواب ہے کہ ایسی خوف ناک باتیں نہ کیا کریں، میں تو اپنی سواری تیار کر رہی ہوں، بہتر الفاظ، خیالات، مشاہدات، تجربات اور کچھ نئے جہاں...... ابھی تو مجھے اس سواری پر سوار ہونا ہے۔

دوسرا کہ کوئی تحریر کب آرہی ہے؟

پرانے لاہور میں، نئے عشق کا ناول پورے بائیس صفحات تک لکھا ہوا ہے اور آپ کے لیے ہی لکھا تھا لیکن وہی کہ جس طرف کہانی جانے لگی تھی وہ سمت مجھے پسند نہیں آئی تو میں نے کہانی کو ”وقت“ دے دیا۔ کوشش ہو گی کہ جلد یہ عشق آپ کو پڑھنے کے لیے دے دوں۔ کب دوں گی، وقت بتا دیا اور پورا نہیں کیا تو بری بات ہو گی۔ لیکن کبھی بھی کچھ بھی سامنے آسکتا ہے۔

آج کل کیا لکھ رہی ہوں کا جواب ہے کہ میں آج کل ”دعا“ کے موضوع پر فکشن اور نان فکشن ٹائپ کی بک پر کام کر رہی ہوں، ساتھ ہی راہ نورد کتاب پر۔ اور کچھ اہراموں کے راز زبردستی جاننے کی کوشش میں ہوں، جیسے ہی کوئی راز ہاتھ لگا، وہ آپ کو دے دوں گی۔ آپ سمجھ ہی گئی ہوں گی۔

اور اگر لکھتی نہیں ہوں تو کیا کرتی ہوں؟۔

تو کافی کچھ کر لیتی ہوں، فارغ بھی بہت رہتی ہوں لیکن فی الحال اپنے لیدر کے ننھے سے بزنس میں مصروف (خوار) ہوں۔ بہت سی نئی سمتیں ہیں، لیکن مقصد ایک ہے، کچھ کر جائیں، کچھ کروا جائیں۔

اقتل نے کہا کہ قارئین سے کچھ کہنا چاہو تو ضرور کہنا۔

تو میں نصیحت نہیں بلکہ پرزور اصرار کرنا چاہتی ہوں، اتنا پرزور کہ جب تک آپ اس پر عمل نہ کر لیں میں اصرار کرتی رہوں۔

کہ آپ جہاں کہیں بھی ہیں، کم عمر یا میچورڈ، شادی شدہ، غیر شادی شدہ، خوش حال یا مالی مسائل کا شکار، یا بہت زیادہ پڑھی لکھی، کچھ بھی ہیں، آپ کوئی نہ کوئی ہنر ہر حال میں سیکھیں۔ وہ کچھ بھی ہو سکتا ہے، کوکنگ، سلائی کڑھائی، ڈیزائنگ، پینٹنگ، نئی زبان سیکھنا، وغیرہ کچھ بھی۔ آج اسی وقت سے سیکھنا شروع کر دیں۔

ہنر کو کبھی زنگ نہیں لگتا۔ ہنر وہ سکہ ہے جو ہر زمانے میں ”چلتا“ ہے، کبھی کھوٹا نہیں ہوتا۔ کرونا وائرس کے دنوں میں پوری دنیا میں بڑے بڑے

سرورق کی شخصیت

ماڈل ---------- حمیرا مغل

میک اپ ---------- روز بیوٹی پارلر

فوٹو گرافی ---------- موسیٰ رضا

اداروں نے اعلا تعلیم یافتہ ورکرز کو کھڑے کھڑے نکال دیا۔ لیکن ہنر مند یا ہاتھ سے کام کرنے والے لوگ نہ صرف بچ گئے بلکہ ایک رپورٹ کے مطابق، کرونا کے دنوں میں جب دولت مند افراد تک انتہائی مشکل وقت دیکھ رہے تھے، اس وقت غریب ملکوں کے تارکین وطن اپنے ملکوں میں ریکارڈ پیسے بھجوا رہے تھے۔

اور جو بھی کام سیکھیں، وہ مٹی کے برتن بنانا ہی کیوں نہ ہو، اسے پوری طرح سے سیکھیں۔ ایویں کیویں گزارے لائق نہ سیکھیں۔ کبھی کوئی بھی کام گزارے لائق نہ کریں۔ جو کام کریں، اس میں لکیر کھینچ دیں۔ سب سے زیادہ بے ثبت چیز مال و دولت ہے، اس کے آنے کا بھی پتا نہیں چلتا اور جانے کا بھی، اس لیے کبھی بھی "مال" پر انحصار نہ کریں۔ آپ کے پاس سیکھنے کی جو بھی سہولت موجود ہے، وہ سیکھ لیں۔ وقت اور صحت سے بڑی کوئی دولت نہیں ہوتی، اسے ضائع نہ کریں۔

دوسری چھوٹی سی درخواست ہے کہ ناولز اور ڈائجسٹ کے علاوہ دوسری علمی کتابیں بھی پڑھیں۔ نان فکشن پڑھیں۔ ایک زبردست علم یافتہ انسان بن جائیں بس۔ علم صرف ڈگریوں سے نہیں ملتا۔ اسے چلتے پھرتے، غور و فکر کرتے ہوئے پایا جا سکتا ہے۔ کبھی بھی سیکھنے اور علم حاصل کرنے کا راستہ بند نہ ہونے دیں۔

اپنی شناخت، بیک گراؤنڈ، شہر اور کلچر پر فخر کریں۔ کیونکہ یہ سب ہماری تقدیر ہوتے ہیں، اور تقدیر، خالق کی عطا ہوتی ہے اور ان کے پیچھے بہت سی وجوہات ہوتی ہیں۔ یہ وجوہات آسمانی ہوتی ہیں۔ جو لوگ غلام ملکوں میں غلام پیدا ہوئے ان کی نسلوں سے آزادی کے زبردست انقلابی لیڈر نکلے۔ تو ہر چیز کے پیچھے ایک حکمت ہوتی ہے۔ اس لیے اپنی چیزوں سے محبت کریں۔ اپنے گاؤں، قصبے، شہر، اپنے خاندانی پیشے، اپنے ماحول اور اپنی ذات سے۔ کبھی ناامید اور مایوس نہ ہوں اور مسکراتے رہیں کہ رونے کے لیے کوئی دن، کوئی لمحہ نہیں بنا۔

☆☆

موسم کے پکوان

خالدہ جیلانی

رمضان کے بابرکت اور پُررونق مہینے کی آمد کے ساتھ ہی خواتین کی ذمہ داریوں میں کئی گنا اضافہ ہوجاتا ہے۔ عبادات کے ساتھ ساتھ سحری اور افطاری پر بھی خوب اہتمام کیا جاتا ہے۔ آپ کے رمضان دسترخوان کے لیے مزے دار پکوان حاضر ہیں۔

روغنی پراٹھے

ضروری اشیاء:

سفید آٹا	آدھا کلو
میٹھا سوڈا	آدھا چائے کا چمچہ
نمک	حسب پسند
پسی چینی	ایک کھانے کا چمچہ
گھی	حسب ضرورت
نیم گرم دودھ	گوندھنے کے لیے

ترکیب:

آٹے میں میٹھا سوڈا، نمک، چینی اور چار کھانے کے چمچے گھی ملا کر نیم گرم دودھ سے گوندھ لیں (دودھ نہ ہو تو پانی سے گوندھ لیں) اور ڈیڑھ گھنٹے کے لیے رکھ دیں۔ توے پر گھی گرم کریں، آٹے کے پیڑے بیل لیں اور توے پر ڈال کر دونوں طرف سے سنہرا ہونے تک تل لیں۔ مزے دار روغنی پراٹھے تیار ہیں۔

چنے اور میکرونی کی چاٹ

ضروری اشیاء:

میکرونی	ڈیڑھ کپ
سفید چنے	ایک کپ
پیاز	آدھا کپ
ٹماٹر	ایک عدد
ہرا دھنیا	دو کھانے کے چمچے
املی کا رس	چوتھائی کپ
کالا نمک	آدھا چائے کا چمچہ
ہری مرچیں	دو عدد
کُٹی لال مرچ	ایک چائے کا چمچہ

ترکیب

میکرونی ابال کر پانی نتھار لیں۔ اس کے بعد اس میں ابلے ہوئے چنے، باریک کٹی پیاز، ٹماٹر، ہرا دھنیا، ہری مرچیں، املی کا رس، کالا نمک، کٹی مرچ شامل کر کے اس کو مکس کر لیں اور پیش کریں۔

قیمہ بھرے کرسپی سموسے

ضروری اشیا:

قیمہ	ایک کلو
پسی لال مرچ	ایک چائے کا چمچہ
پسا گرم مسالا	آدھا چائے کا چمچہ
پیاز	ایک عدد
ہری مرچیں	تین عدد
بریڈ سلائس	بارہ عدد
دہی	دو کھانے کے چمچے
انڈا	ایک عدد
نمک	حسب ذائقہ
تیل	حسب ضرورت

ترکیب:

ایک برتن میں تیل گرم کر کے پیاز تل لیں، ہلکی براؤن ہوجائے تو قیمہ، پسی لال مرچ، پسا گرم مسالہ، نمک، ہری مرچیں اور دہی ڈال کر مکس کر لیں اور ڈھک کر پکائیں۔ پانی خشک ہوجائے تو چولہے سے اتار کر ٹھنڈا کر لیں۔ ڈبل روٹی کے سلائس کو بیل کر قیمہ بھر کر سموسے کے شیپ میں فولڈ کر لیں۔ انڈا لگا کر کنارے بند کریں۔ کڑاہی میں تیل گرم کر کے سموسے ڈال کر تلیں۔ سرونگ پلیٹ میں رکھ کر کیچپ یا

چٹنی کے ساتھ سرو کریں۔

کھجور کے پکوڑے

ضروری اشیاء:

کھجور	آدھا کلو
سوکھا میدہ	آدھا کپ

بیٹر بنانے کے لیے:

میدہ	آدھا کپ
کارن فلور	دو کھانے کے چمچے
چینی	دو کھانے کے چمچے
انڈا	ایک عدد
نمک	ایک چٹکی
پانی	تین کھانے کے چمچے
تیل	تلنے کے لیے

ترکیب:

میدے میں کارن فلور، چینی انڈا ڈال کر پھینٹ لیں۔ ضرورت کے مطابق پانی ڈالیں اور فریج میں ڈیڑھ گھنٹہ رکھیں۔ کھجور میں کٹ لگا کر بیج نکال لیں اور کھجور کو صاف کر کے دھو لیں۔ خشک کرلیں سوکھے میدے میں کھجوریں رول کریں۔ تیل گرم کریں۔ کھجور کو بیٹر میں ڈپ کر کے فرائی کریں۔ ہلکی سنہری ہوجائے تو ٹشو پیپر پر نکال لیں اور سرو کریں۔

مزیدار دہی بڑے

ضروری اشیاء

دہی کے لیے:

دہی	ایک کلو
نمک	حسب ذائقہ
لال مرچ	ڈیڑھ چائے کا چمچہ
سفید زیرہ پسا ہوا	دو چائے کے چمچے
پانی	دو کپ

بڑوں کے لیے:

بیسن	ایک پاؤ
مسور کی دال	آدھا پاؤ
سفید زیرہ	ایک چائے کا چمچہ
پسی لال مرچ	ایک چائے کا چمچہ
نمک	حسب ذائقہ
ہری مرچ	چھ عدد

ترکیب:

دہی کو خوب پھینٹ کر اس میں پانی، پسی لال مرچ، نمک، سفید زیرہ ڈال کر ایک بار پھر سے خوب ملا کر رکھ دیں۔ اب دال کو ابال کر ہی پیس لیں۔ ٹھنڈی کر کے بیسن میں ڈال لیں اور ساتھ ہی لال مرچ، نمک، ہری مرچ، سفید زیرہ پسا ہوا ملا کر پانی ڈال کر گاڑھا آمیزہ بنا لیں۔ اب ایک کڑاہی میں تیل گرم کریں۔ جب گرم ہوجائے تو ایک بڑے چمچے سے اس میں بڑے ڈال لیں۔ جب ایک طرف سے سرخ ہوجائیں تو پلٹ دیں اور پھر ایک ڈش میں نکال کر اوپر سے دہی ڈالیں۔ چاہیں تو ہرا دھنیا باریک کٹا ہوا ڈال کر چاٹ مسالہ ملا لیں۔

سینڈوچز

ضروری اشیاء:

ڈبل روٹی کے سلائس	آٹھ عدد
انڈے	چار عدد
ہری پیاز	آدھا کپ
مایونیز	آدھا کپ
مکھن	حسب پسند
نمک	حسب ذائقہ
تیل	حسب ضرورت

ترکیب:

پیالے میں انڈے، ہری پیاز، گاجر اور نمک ڈال کر اچھی طرح پھینٹ لیں۔ فرائی پین میں تیل گرم کر کے انڈوں کا آمیزہ ڈال کر آملیٹ تل کر پلیٹ میں نکال لیں۔ ڈبل روٹی کے کنارے کاٹ کر سلائس تکون شکل میں کاٹ لیں۔

مکھن اور مایونیز لگا کر آملیٹ کی فلنگ کر کے سرونگ پلیٹ میں رکھ کر کیچپ کے ساتھ سرو کریں۔

سبین ...... کراچی

س: عدنان بھائی! مجھے پتا ہے کہ میرا مسئلہ پڑھ کر آپ مجھ پر خفا ہوں گے۔ مجھے نصیحت کریں گے لیکن پلیز ایک بار سوچیے گا ضرور کہ اپنے موقف میں حق بجانب ہوں یا نہیں۔ شادی سے پہلے میں خاندان میں سب سے حسین لڑکی مانی جاتی تھی۔ میں صرف حسین ہی نہیں، حسن پرست بھی ہوں۔

پہننے اوڑھنے کا سلیقہ تھا۔ ذہین اور پراعتماد تھی۔ ہر موضوع پر بڑی روانی سے بولتی۔ ہر محفل کی جان تھی۔

میرے شوہر ہماری برادری سے ہیں۔ ان لوگوں کا بڑا بزنس ہے۔ بہت دولت مند خاندان ہے۔ خود بھی فوج میں بڑے عہدے پر ہیں۔ شادی سے پہلے میں نے انہیں دیکھا نہیں تھا۔ گھر والوں نے تصویر دکھائی تھی۔ تصویر میں ٹھیک ٹھاک لگے۔ شادی ہوئی، ان کے گھر سے شان دار بری آئی۔ بھاری زیور...... میں رخصت ہو کر شوہر کے گھر آ گئی۔ ان کو گورنمنٹ کی طرف سے شان دار گھر ملا ہوا تھا۔ تین چار نوکر...... خانساماں۔ میں بھی بہت خوش تھی۔ لیکن جب میں نے انہیں دیکھا تو مجھ پر بجلی سی گر پڑی۔ ان کی صورت شکل معمولی سے بھی کم درجے کی تھی۔ جو تصویر دکھائی گئی تھی، وہ فوٹو گرافر کی مہارت کا شاہکار تھی۔ میری بددلی کو انہوں نے محسوس کر لیا لیکن کچھ بولے نہیں

میں نے گھر والوں سے احتجاج کیا تو انہوں نے مجھے برا بھلا کہا اور سختی سے کہا اگر تم لوٹ کر اس گھر میں آئیں تو اس گھر کے دروازے تمہیں بند ملیں گے۔ شوہر میری بیزاری اور بددلی کو محسوس کر چکے ہیں۔ انہوں نے مجھ سے کہا ہے کہ میں اپنی مرضی سے اپنی زندگی کا فیصلہ کر سکتی ہوں۔ وہ بھی اب مجھ سے بیزار نظر آتے ہیں۔ کئی بار کہہ چکے ہیں کہ مجھ سے شادی ان کی زندگی کا سب سے غلط فیصلہ ہے۔

ج: اچھی بہن! میں آپ کو ڈانٹوں گا۔ یہ کام تو آپ کے گھر والے پہلے ہی کر چکے ہیں اور اس کا آپ پر کوئی اثر بھی نہیں ہوا۔

آپ کو شوہر کی صورت پسند نہیں ہے تو آپ ان سے خلع لے سکتی ہیں۔ شوہر خود بھی طلاق دینے پر آمادہ ہیں۔ لیکن یہ سوچیے کہ پھر آپ کہاں جائیں گی۔ گھر والے تو آپ کو پہلے ہی منع کر چکے ہیں۔ تنہا زندگی گزاریں گی۔ تعلیم بھی آپ کی واجبی سی ہے۔ تھوڑا سا خود کو سمجھائیں۔ آپ کے شوہر میں ظاہری شکل و صورت کے سوا اور کوئی کمی نہیں ہے۔ سوچیں کہ آپ کسی خوب صورت لڑکے سے شادی کرتی ہیں، وہ بداخلاق، بدچلن نکلے۔ نشہ کرتا ہو، کسی مہلک بیماری کا شکار ہو، کماتا نہ ہو تو اس اچھی صورت سے کیا فائدہ ہو گا۔

نفیسہ علی ...... کراچی

میری شادی صرف ایک سال رہی۔ شوہر نے شادی کی پہلی رات ہی بتا دیا تھا کہ اس شادی میں ان کی مرضی شامل نہیں ہے۔ وہ اپنی پھوپھی کی بیٹی سے شادی کرنا چاہتے تھے لیکن ان کی والدہ کو اپنی نند سے خدا واسطے کا بیر تھا۔ وہ کسی قیمت پر نند کی بیٹی سے شادی نہیں کرنا چاہتی تھیں۔ میں ٹکر ٹکر ان کی شکل دیکھ رہی تھی۔ ان ماں بیٹے کی نفرت اور محبت میں میرا مقام کہاں تھا؟ انہوں نے میری نظروں کی زبان پڑھ لی لیکن جواب ان کے پاس نہیں تھا اس لیے نظریں چرا گئے۔

وقت گزرتا رہا۔ وہ گم صم رہتے۔ ساس ہر طرح سے میری دل جوئی کی کوشش کرتیں لیکن شوہر کی بے رخی اسی طرح قائم رہی۔ جوں توں کر کے ایک سال گزرا۔ میں نے حالات سے سمجھوتا کر لیا تھا۔ میں امید سے ہوئی تو امید بندھی ان کے رویہ میں تبدیلی آ جائے گی لیکن میری بدنصیبی میرا پیچھا کہاں چھوڑنے والی تھی۔ ایک رات میری ساس سوئیں تو پھر اٹھ نہ سکیں۔ ساس کے چہلم کے بعد میرا بیٹا پیدا ہوا۔ شوہر کا رویہ ناقابل فہم تھا۔ ان کے چہرے پر کوئی تاثر نہ تھا۔ انہوں نے بچے کی شکل دیکھنا بھی گوارا نہ کیا۔ بچے کی پیدائش کے صرف دو ماہ بعد انہوں نے مجھے طلاق نامہ پکڑا دیا۔ میں ہکا بکا انہیں دیکھ رہی تھی لیکن اس شخص سے کچھ کہنا فضول تھا۔ میں نے بچے کو لیا اور بھائی کے گھر آ گئی (والدین کا انتقال ہو چکا تھا)۔

بھاوج نے جس طرح خیر مقدم کیا، وہ وقت یاد آتا ہے تو آج بھی دل کٹنے لگتا ہے۔ بھائی خاموش تماشائی بنا رہا۔ میرا بچہ

چھوٹا تھا، مجھے کسی بھی طرح کچھ وقت گزارنا تھا۔ میں نے بھائی سے درخواست کی، مجھے گھر کے کسی کونے میں جگہ دے دیں۔ اپنا اور اپنے بچے کا خرچ میں خود اٹھالوں گی۔ بمشکل مجھے ایک کوٹھڑی میں جہاں گھر کا فالتو سامان پڑا رہتا تھا وہاں پناہ ملی۔ شوہر نے گھر سے نکالتے وقت ایک احسان کیا تھا، مہر کی رقم مجھے تھمادی تھی۔ اکیس ہزار روپے۔

میں نے سال بھر ان سے کام چلایا۔ اس وقت آج جیسی مہنگائی بھی نہ تھی۔ میں بی اے پاس تھی چھوٹی موٹی نوکری مل سکتی تھی، لیکن بچے کو کس کے پاس چھوڑ کر جاتی۔ بھاوج تو شکل دیکھنے کی روادار نہ تھی۔ میں نے محلے کے دو تین گھروں میں بات کی۔ ان کے بچے میرے پاس ٹیوشن پڑھنے آنے لگے۔ مجھے کپڑے سلائی کرنا بھی آتا تھا، دن بھر میں ایک سوٹ سی لیتی تھی۔ اس طرح مجھے اتنی آمدنی ہونے لگی کہ میں اپنے اور اپنے بچے کے اخراجات کے لیے کسی کی محتاج نہ رہی لیکن بھابھی میرے گھر میں رہنے سے خوش نہ تھی۔ کسی نہ کسی بہانے فساد کھڑا کیے رکھتی۔ بچہ چار سال کا ہوا تو میں نے اسے اسکول میں داخل کرادیا اور خود بھی اسی اسکول میں نوکری کرلی تھی۔ بھابھی کا گھر چھوڑنے کا تقاضا بڑھ گیا تھا۔

یہاں قسمت نے میرا ساتھ دیا۔ میں نے اپنی ساتھی ٹیچر سے اپنی پریشانی کا ذکر کیا۔ ان سے میری کافی دوستی ہوگئی تھی۔ ٹیچر کے شوہر کو پاکستان کے باہر نوکری مل گئی تھی۔ وہ باہر جارہی تھیں، ان کا ایک چھوٹا سا دو کمروں کا مکان تھا۔ جسے وہ بیچنا نہیں چاہتی تھیں، خالی چھوڑتیں تو کوئی بھی قبضہ کرسکتا تھا۔ اس وقت کراچی میں ایسے حالات تھے کہ پلاٹوں اور گھروں پر قبضہ عام بات تھی۔ انہوں نے مجھ سے کہا کہ میں چاہوں تو اس گھر میں رہ سکتی ہوں۔ اندھا کیا چاہے دو آنکھیں...... میں فوراً راضی ہوگئی۔ اب زندگی میں اتنا سکون ضرور آگیا تھا کہ بھابھی کی باتوں سے نجات مل گئی تھی۔

میں صبح اسکول میں نوکری کرتی۔ شام کو گھر پر بچوں کو پڑھاتی۔ محنت مشقت کرکے بیٹے کو پروان چڑھایا۔ میرا بیٹا بھی بہت محنتی اور ذہین تھا۔ اس نے ہر کلاس میں امتیازی نمبروں سے کامیابی حاصل کی۔ میٹرک کے بعد اس نے ایک اکیڈمی میں پڑھانا شروع کردیا تھا۔ وہ ڈاکٹر بننا چاہتا تھا۔ جس دن اسے میڈیکل کالج میں داخلہ ملا۔ اس دن میری خوشی کا ٹھکانا نہیں تھا۔ یہاں یہ بتادوں کہ اس پورے عرصے میں اس کے باپ نے کبھی اس کی خبر لی، نہ کبھی ملنے کی کوشش کی۔

میرا بیٹا اب میڈیکل کے سیکنڈ ایر میں ہے۔ میری عمر اس وقت بیالیس سال ہے۔ جس اسکول میں جاب کرتی ہوں، اس میں ایک صاحب اکاؤنٹنٹ ہیں۔ عمر تقریباً پینتالیس سال ہے۔ بیوی کا انتقال ہوگیا ہے۔ ایک بیٹی ہے، جس کی شادی ہوچکی ہے۔ وہ میرے حالات سے واقف ہیں۔ پہلے بھی ہمدردی کا اظہار کرتے رہتے تھے۔ اب بیوی کے انتقال کے بعد وہ مجھ سے شادی کرنا چاہتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں، خوشیوں پر میرا بھی حق ہے۔ ان میں کوئی اخلاقی برائی نہیں ہے۔ نہایت شریف آدمی ہیں۔ ذاتی گھر ہے۔ میں فیصلہ نہیں کرپارہی ہوں، کیا کروں۔ مجھے یہ خدشہ ہے کہ میرا بیٹا اس بات کو قبول نہیں کرپائے گا۔ بھائی! مجھے مشورہ دیں، میں کیا کروں۔ بیٹا میری عمر بھر کی کمائی ہے۔ میں اسے کھونا نہیں چاہتی۔

ج: اچھی بہن جو زندگی آپ نے اب تک گزاری ہے، اسے جہد مسلسل ہی کہا جاسکتا ہے۔ شادی کے بعد جو ایک سال شوہر کے ساتھ گزارا، اس کی کوئی اچھی یاد بھی آپ کے پاس نہیں ہے۔ وہ صاحب صحیح کہتے ہیں زندگی کی خوشیوں پر آپ کا بھی حق ہے۔ آپ کا معاملہ تو بالکل مختلف ہے، اس معاشرے میں تو ایسی مثالیں بھی ہیں کہ خواتین نے چالیس پچاس سال ازدواجی زندگی کے گزار کر صرف دل کے کہنے پر شوہر سے خلع حاصل کی۔ اور بچوں، نواسوں، پوتوں کو چھوڑ کر پچاس ساٹھ سال کی عمر میں شادی کرلی۔

ایک بات، بہت ضروری ہے کہ آپ ان صاحب کے متعلق تحقیق کرلیں کہ ان کا رویہ اپنی سابقہ بیوی کے ساتھ کیسا تھا۔

بیٹے کے متعلق آپ کا خدشہ بجا ہے لیکن یہ بھی سوچیں، چند سال کے بعد اس کی شادی ہوجائے گی۔ وہ اپنے گھر اور بچوں میں مگن ہوجائے گا تو تنہائی آپ کا مقدر ہوگی یا اسے اعلا تعلیم کے لیے باہر جانے کا موقع ملا تو آپ تنہا کیسے رہ پائیں گی؟

اپنے بیٹے کو اعتماد میں لیں۔ اسے سمجھائیں۔ ان صاحب کو بھی گھر بلوا کر بیٹے سے ملوائیں۔ آپ کے بیٹے کے سامنے آپ کی پوری زندگی ہے۔ وہ جانتا ہے کہ آپ نے اس کے لیے کتنی قربانیاں دی ہیں۔ وہ آپ کی خوشیوں کی راہ میں رکاوٹ نہیں بنے گا۔

☆

ثمینہ شاہد.... پشاور

س۔ میری عمر بائیس سال ہے۔ شادی شدہ ہوں۔ قد پانچ فٹ دو انچ اور وزن ساٹھ کلو گرام ہے۔ وزن کم کرنے کے لیے مجھے کیا کرنا چاہیے۔ پلیز ایسا مشورہ دیں جس پر میں عمل کرسکوں؟

ج۔ سب سے پہلے یہ سمجھ لیں کہ موٹا ہونے کا سب سے بڑا سبب ہے ضرورت سے زیادہ کھانا یا ایسی چیزیں کھانا جن میں چکنائی اور مٹھاس زیادہ ہو۔ گھی، بیکری کی اشیاء کیک، پیسٹری وغیرہ۔ بالائی، کریم، مٹھائیاں بالکل ترک کردیں۔

دوسری بات یہ ہے کہ وزن آہستہ آہستہ کم کیا جائے۔ بہت تیزی سے وزن کو بڑھانا یا گھٹانا دونوں ہی جلد کے لیے اچھے نہیں ہوتے کیونکہ اس سے جلد لٹک جاتی ہے اور اس پر جھریاں پڑ جاتی ہیں۔

وزن کم کرنے کے لیے سب سے ضروری بات یہ ہے کہ چہل قدمی کی جائے۔ روزانہ ایک گھنٹہ چہل قدمی کریں۔ اس کے لیے آرام دہ جوتوں کا انتخاب کریں۔ شروع میں کم از کم آدھے گھنٹے تک چہل قدمی کریں پھر آہستہ آہستہ بڑھاتی جائیں۔

آپ کو ایک مکمل ڈائٹ لکھ رہی ہوں جس سے وزن کم کیا جاسکتا ہے۔ اس ڈائٹ میں چینی کسی بھی شکل میں ممنوع ہے۔ چینی کا کوئی متبادل بھی استعمال نہ کیا جائے۔

ناشتہ

چائے یا کافی دودھ کے ساتھ لیکن چینی کے بغیر، مکھن لگے ہوئے توس کا ایک سلائس اور ایک پھل۔

لنچ

دال، سبزیاں، دہی، ایک چپاتی اور کوئی بھی موسمی پھل یا آدھا کپ چاول ساتھ دال یا گوشت کا سالن اور سبزیاں، ڈبل روٹی کا ایک سلائس۔

سہ پہر

چائے دودھ کے ساتھ لیکن چینی کے بغیر۔ ایک نمکین بسکٹ۔

رات کا کھانا

سادہ سوپ، چکن یا مچھلی یا دال اور سبزیاں، چاول یا چپاتی ہرگز نہ لیں۔

رات میں کوئی اناج بالکل نہ لیں۔ کھانا گھی یا تیل میں پکایا جاسکتا ہے لیکن گھی یا تیل بہت کم مقدار میں استعمال کریں۔

ساس، جام، جیلی استعمال نہ کی جائے کیونکہ اس میں چینی ہوتی ہے۔

اس ڈائٹ پر عمل کرکے آپ ایک ہفتہ میں دو پونڈ وزن کم کرسکتی ہیں۔ چینی کے استعمال پر پابندی سے کیلوریز خود بخود محدود ہوجائیں گی۔ پیٹ خالی محسوس ہو تو کھیرا، ککڑی، ٹماٹر وغیرہ استعمال کرسکتی ہیں۔

☆☆